شرحِ دیوانِ فانیؔ

ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

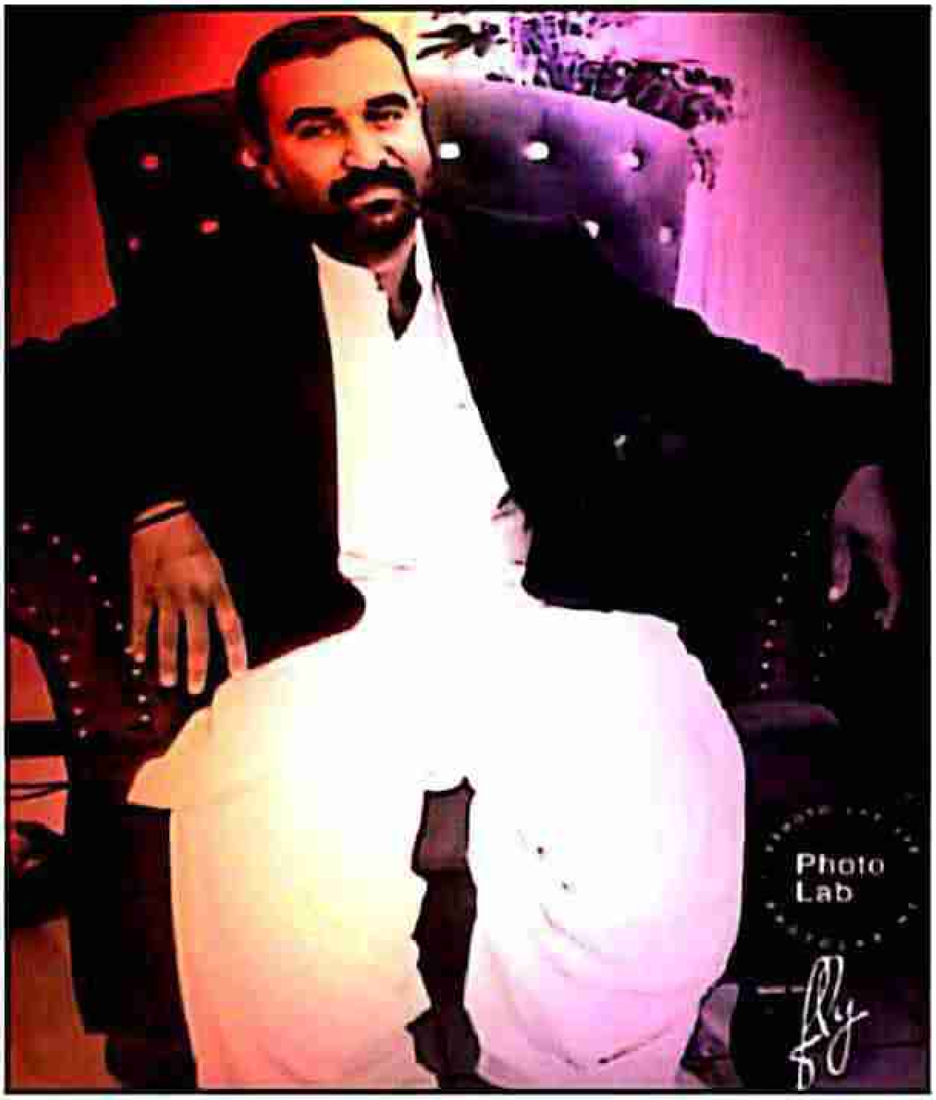

PDF By :
Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

شرحِ دیوانِ فانی

ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی
شعبۂ اُردو۔ ذاکر حسین کالج۔ دہلی

تقسیم کار
ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ

۱۹۸۴ء

rekhta

سالِ اشاعت ——— ۱۹۸۴ء
تعداد ——— ۶۰۰
قیمت ——— ۵۰ روپے
کاتب ——— سید ابوجعفر زیدی
مطبع ——— جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

تقسیم کار

ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ

rekhta

انتساب

خاکِ پاکِ بدایوں کے نام
جس سے
فانیؔ اور مجھے دونوں کو نسبت ہے۔

افتخار بیگم صدیقی

rekhta

ترتیب

پیش لفظ ۲۵

نمبر شمار مصرعِ ثانی صفحہ

ردیفِ الف

۱- آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا ۲۷
۲- احسان مند ہوں الم جاں گداز کا ۳۱
۳- دردِ جگر یہ تجھے کیا ہو گیا ۳۳
۴- دم تو نکلا مگر آزردۂ احساں نکلا ۳۴
۵- ہوش کا سودا جنونِ عاشقی سے کم نہ تھا ۳۷
۶- ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا ۳۹
۷- توفیقِ اضطراب کو ایمان بنا دیا ۴۳
۸- بشر کو زیست ملی موت کو بہانا ملا ۴۶
۹- خود شعلہ بن اور وادیٔ سینا سے گذر جا ۴۸
۱۰- چونک اُٹھا گھبرا کے ہر حلقہ میری زنجیر کا ۵۱
۱۱- تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا ۵۴
۱۲- نہ خاطر بے قرار میری، نہ دیدۂ اشکبار میرا ۵۷
۱۳- قسمت کو رسائی نہیں منظور مگر جا ۵۹
۱۴- اس تیرِ بے خطا کا نشانہ خطا ہوا ۶۰

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۱۵-	وہ بھی دن تھے کہ خود اپنا بھی تجھے ہوش نہ تھا	۶۲
۱۶-	کوئی ستم کبھی تقریبِ الاماں نہ ہوا	۶۴
۱۷-	وہ اک اک ذرۂ دنیائے دل کا طور ہو جانا	۶۶
۱۸-	دولتِ دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا	۶۷
۱۹-	اب یہ بھی زندگی کا سہارا نہیں رہا	۷۰
۲۰-	دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رو دیا	۷۲
۲۱-	یاس و امید، شادی و غم کیا	۷۳
۲۲-	دنیا ہے مری عالمِ امکانِ تمنّا	۷۵
۲۳-	پشیمان سا وہ پشیمان ہو گا	۷۶
۲۴-	آغازِ جنوں گو نہیں پایانِ تمنّا	۷۷
۲۵-	دل میسر ہے، لذّتِ غم کیا	۷۹
۲۶-	اب کوئی تمنّا ہے، نہ سامانِ تمنّا	۸۱
۲۷-	جاوداں ہو تو عیش ہے، غم کیا	۸۲
۲۸-	ہم قفس رازِ اسیری کیا کہیں کیوں کر کھلا	۸۴
۲۹-	جو خاک کا ذرّہ تھا وحشت کدۂ دل تھا	۸۸
۳۰-	ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا	۸۹
۳۱-	مگر منجملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا	۹۰
۳۲-	عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا	۹۳
۳۳-	موت رازِ عاشق ہے، زندگی ہے راز ان کا	۹۵
۳۴-	عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا	۹۷
۳۵-	داغِ وجودِ حسرت سے تب دل کا دامن پاک ہوا	۱۰۰
۳۶-	کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اُجڑ گیا	۱۰۱
۳۷-	نہ پایا مدّعا ہم نے تو گویا مدّعا پایا	۱۰۲
۳۸-	مار ڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا	۱۰۵

rekhta

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۳۹-	نویدِ مرگ و وعیدِ حیات نے مارا	۱۰۸
۴۰-	اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا	۱۰۹
۴۱-	غم نے دل کو دل بنایا ورنہ کیا تھا، کچھ نہ تھا	۱۱۱
۴۲-	لاش کی صورت زباں تھی اور میں خاموش تھا	۱۱۳
۴۳-	حسرت اب کوئی نہیں صبر کی حسرت کے سوا	۱۱۵
۴۴-	وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا	۱۱۵
۴۵-	راضی برضائے یار ہو جا	۱۱۹
۴۶-	مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا	۱۲۰
۴۷-	درد میں دل ڈوب کر قطرہ سے دریا بن گیا	۱۲۲
۴۸-	اک مٹایا داغ اک پیدا کیا	۱۲۴
۴۹-	عالمِ ہوش کا ہر ذرہ ہے صحرا اپنا	۱۲۶
۵۰-	نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا	۱۲۸
۵۱-	شمع جسے ہم سمجھے تھے شمع نہ تھی پروانہ تھا	۱۳۰
۵۲-	ہم تو چمن پرست ہیں، پھول کہاں کے خار کیا	۱۳۱
۵۳-	وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مڑ کر دیکھنا	۱۳۴
۵۴-	کلیم! برقِ طور تھی کہ تار تھا نقاب کا	۱۳۶
۵۵-	ترے آغوش میں بیگانۂ آغوش ہو جانا	۱۳۹
۵۶-	سامنا فانی مجھے دل کا بھی مشکل ہو گیا	۱۴۱
۵۷-	اس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا	۱۴۳
۵۸-	وہ نظر فریب جلوہ جو نظر نواز ہوتا	۱۴۵
۵۹-	عقلِ کج فہم نے دیوانہ بنانا چاہا	۱۴۶
۶۰-	دل اس کے ساتھ نکلے گا اگر یہ دل سے نکلے گا	۱۴۶
۶۱-	جنھیں مٹا کے رہا حوصلہ خیالوں کا	۱۴۸
۶۲-	پیامِ حسن، محبت کی داستاں ہوتا	۱۴۹

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۶۳۔	غیرت ہو تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا	۱۵۱
۶۴۔	مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا	۱۵۴
۶۵۔	مرتے مرتے یہ درد کم نہ ہوا	۱۵۶
۶۶۔	جا پڑیں جس تار پر نظریں رگِ جاں ہو گئیں	۱۵۸
۶۷۔	اللہ کیا ہوا وہ زمانہ بہار کا	۱۶۰
۶۸۔	ایسا بھی ترے حسن کا عالم نہ ہوا تھا	۱۶۲
۶۹۔	ہر سحر اُٹھ کے غمِ شام اُٹھا	۱۶۵
۷۰۔	ہر آنکھ برق پاش تھی، ہر ذرّہ طور تھا	۱۶۶
۷۱۔	ارمان بھرے دل سے ارمان نکل آیا	۱۶۸
۷۲۔	کوئی دیوانہ مگر یاد آیا	۱۶۹
۷۳۔	پھر دل نے لیا دردِ محبت کا سہارا	۱۷۱
۷۴۔	جی ہی جب ہو گیا نڈھال اپنا	۱۷۲
۷۵۔	کاش تو نے مجھے دیوانہ بنایا ہوتا	۱۷۳
۷۶۔	ہر محبت کا فسانہ حسن کا افسانہ تھا	۱۷۴
۷۷۔	جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا	۱۷۶
۷۸۔	اُڑ گیا ایک اشارہ میں نشانہ دل کا	۱۷۸
۷۹۔	وہ بھی اک رُخ ہے تری انجمن آرائی کا	۱۷۹
۸۰۔	حال دیکھو میری تباہی کا	۱۸۰
۸۱۔	کوئی تماشا دیکھنے والا چاہیے اس بربادی کا	۱۸۲
۸۲۔	وہ میرے دل سے کیا چھپتے آنکھوں سے بھی پردا ہو نہ سکا	۱۸۳
۸۳۔	ایک ایک حقیقت کو افسانہ بنا ڈالا	۱۸۵
۸۴۔	دل ہی نذرِ نگہٗ ناز نہ کر جان بھی لا	۱۸۵
۸۵۔	تیرے بیمار کا اچھا نہیں اچھا ہونا	۱۸۷
۸۶۔	فرصت ہو تو دل پر بھی پھر قصدِ نظر فرما	۱۸۹

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۸۷-	عمر بھر کیا ناحق ہم نے انتظار اپنا	۱۹۰
۸۸-	ہر سکوتِ بے جا کی تہ میں تھا بیاں اپنا	۱۹۲
۸۹-	جب تمھیں اعتبار ہی نہ رہا	۱۹۴
۹۰-	دل پہ کچھ اختیار تھا، نہ رہا	۱۹۴
۹۱-	سوا پہر رُخِ روشن کا آفتاب آیا	۱۹۶
۹۲-	ہر نفس سے پیامِ یار آیا	۱۹۷
۹۳-	اب ان سے کوئی کیوں کر کہہ دے کہ نہیں آیا	۱۹۸
۹۴-	روتے روتے آنسوؤں کو رو لیا	۱۹۹
۹۵-	حیران ہوں کہ دوں انھیں اس کا جواب کیا	۲۰۰
۹۶-	وہ سراپا حشر جب ہنگامہ آرا ہو گیا	۲۰۱

ردیف 'ب'

۹۷-	پھر تمنّا ہے کسی کی میہمانِ اضطراب	۲۰۳
۹۸-	آپ ہی اپنی تمنا کیا خوب	۲۰۵

ردیف 'پ'

۹۹-	کہ آفتاب قمر میں ہے، آفتاب میں سانپ	۲۰۶

ردیف 'ت'

۱۰۰-	مٹنے والی آرزوئیں لے چلیں پھر سوئے دوست	۲۰۷
۱۰۱-	سر سلامت چاہیے قاتل بہت	۲۰۸
۱۰۲-	آئے گی مگر دیکھیے کب آئے قیامت	۲۰۹

ردیف 'ٹ'

۱۰۳-	پڑ گئی آنکھ، دل پہ آئی چوٹ	۲۱۰

نمبر شمار مصرعِ ثانی صفحہ

ردیف 'د'

۱۰۴- کہ پھر رہے نہ رہے طاقتِ بیانِ صیّاد ۲۱۲
۱۰۵- طوفانِ محبّت کی ہے زد میں فریاد ۲۱۴
۱۰۶- کچھ آپ بھی کہیں گے میری التجا کے بعد ۲۱۵

ردیف 'ر'

۱۰۷- کیا یاد آگیا مجھے زنجیر دیکھ کر ۲۱۶
۱۰۸- یہ دردِ بے دوا احسان ہے تقدیرِ درماں پر ۲۱۸
۱۰۹- انتہا ہوئی غم کی، دل کی ابتدا ہو کر ۲۲۰
۱۱۰- درد بن کر دل بے درد میں گھر پیدا کر ۲۲۳
۱۱۱- نازپروردۂ غم ہے اسے برباد نہ کر ۲۲۴
۱۱۲- بنتی نہیں اجل سے تقاضا کیے بغیر ۲۲۵
۱۱۳- جی لرز جاتا ہے ان غنچوں کو خنداں دیکھ کر ۲۲۶
۱۱۴- اس آپ کی زمیں سے الگ، آسماں سے دور ۲۲۸
۱۱۵- رہا محشر میں اپنا خونِ ناحق اپنی گردن پر ۲۳۰
۱۱۶- مٹا کر دم لیا پتھر پڑیں دردِ محبّت پر ۲۳۲
۱۱۷- مجھے اب بہار سے کیا غرض کہ خزاں ہے اپنی بہار پر ۲۳۳
۱۱۸- دل میرا لوٹ ہے کافر پہ، مسلماں ہو کر ۲۳۵
۱۱۹- نازِ ستم اٹھائے جا، رازِ ستم نہ فاش کر ۲۳۵

ردیف 'ز'

۱۲۰- دل ستم دوست، وہ رقیب نواز ۲۳۷
۱۲۱- دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز ۲۳۸
۱۲۲- ہے مری خاک سجدہ گاہِ نماز ۲۴۰

ردیف 'ش'

۱۲۳- ہوش اور مست ہو کے اتنا ہوش ۲۴۲

نمبر شمار — مصرعِ ثانی — صفحہ

۱۲۴- دل اگر عالمِ مستی ہے تو سر عالمِ ہوش ۲۴۴
۱۲۵- ٹوٹا ہے میرے عہد میں نیرنگِ نامِ عیش ۲۴۶

ردیف 'غ'

۱۲۶- دل رہ گیا ہے نام کو باقی نشانِ داغ ۲۴۷

ردیف 'ک'

۱۲۷- ہم بھی ہیں تیری بدگمانی تک ۲۴۹
۱۲۸- نہ مرنے دے گی مجھے ستم گر تیری تمنائے خام کب تک ۲۵۰
۱۲۹- اس بزم میں خدمت پسندی کب تک ۲۵۱

ردیف 'گ'

۱۳۰- نہ گئی دل کے ساتھ دل کی امنگ ۲۵۲
۱۳۱- محرمِ رازِ ناز ہیں ہم لوگ ۲۵۴

ردیف 'ل'

۱۳۲- ہر سجدہ سے پیدا کر اک سجدۂ مستقبل ۲۵۵
۱۳۳- کہ موت کی یہ تمنا ہے زندگی کی دلیل ۲۵۷

ردیف 'م'

۱۳۴- رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم ۲۵۹
۱۳۵- بے خودی کچھ تو بتا کس کے گنہ گار ہیں ہم ۲۶۱
۱۳۶- دل جفا دوست ہے خدا کی قسم ۲۶۳
۱۳۷- نالۂ دل کے جتنے تھے اجزا، ہو گئے سارے درہم برہم ۲۶۵
۱۳۸- حذر اے آہ! الاماں انجام ۲۶۷
۱۳۹- خوں شدہ دل تجھ سے حنا اور ہم ۲۶۸
۱۴۰- سینے میں حشر لے کے چلے ہیں جہاں سے ہم ۲۶۹
۱۴۱- آ نہ جائے زباں پہ تیرا نام ۲۷۰

ردیف 'ن'

نمبر شمار	مصرع ثانی	صفحہ
۱۴۲-	اب ہوش وحواس بھی آٹھ پہر کچھ کھیۓ ہوئے سے رہتے ہیں	۲۷۱
۱۴۳-	رہی ہے ان کو خونِ آرزو کی آرزو برسوں	۲۷۲
۱۴۴-	دل پہ خدا کی مار کہ پھر بھی چین نہیں آرام نہیں	۲۷۵
۱۴۵-	دیکھوں اُلٹ کے پردۂ داغِ جگر کو میں	۲۷۷
۱۴۶-	بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں	۲۷۹
۱۴۷-	ترے شریک دلِ بے قرار ہم بھی ہیں	۲۸۲
۱۴۸-	رحمت کی بجلیوں سے معمور ہیں فضائیں	۲۸۴
۱۴۹-	زخمِ دل پیدا کریں یا زخمِ دل اچھا کریں	۲۸۶
۱۵۰-	وہ مری بے خبری کی بھی خبر رکھتے ہیں	۲۸۸
۱۵۱-	ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں	۲۸۹
۱۵۲-	میں ہوں حدِ امتیاز جلوہ و جمال میں	۲۹۰
۱۵۳-	یادِ وصال مختصر مل کے شب دراز میں	۲۹۲
۱۵۴-	اس تکلف سے ہے بیداد کہ بیداد نہیں	۲۹۵
۱۵۵-	ہر داغِ خوں ہے دیدۂ خوں بارِ آستیں	۲۹۷
۱۵۶-	دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں	۲۹۸
۱۵۷-	ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں	۲۹۹
۱۵۸-	کم ہے آج آنکھ میں اک قطرۂ دریا دامن	۳۰۰
۱۵۹-	میں ہوں وہ دردِ غمکدۂ روزگار میں	۳۰۱
۱۶۰-	دل اب زندگی سے خفا چاہتا ہوں	۳۰۲
۱۶۱-	دلِ بے تاب کو بھی دیدۂ حیراں کرلیں	۳۰۵
۱۶۲-	اب اضطراب کی صورت میں اضطراب نہیں	۳۰۶
۱۶۳-	یہ عالمِ دل ہے یعنی وہ آنکھوں میں نہیں جو دل میں نہیں	۳۰۸
۱۶۴-	اک بات نکلتی ہے مری لغزشِ پا میں	۳۱۰

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۱۶۵-	وہ حیا پرور نگاہیں مسکرا کر رہ گئیں	۳۱۱
۱۶۶-	اس طرح دُور ہیں کہ دُور نہیں	۳۱۳
۱۶۷-	اپنے جلووں میں چھپے جاتے ہیں	۳۱۴
۱۶۸-	اس جنوں کو امتیازِ عاشقی حاصل نہیں	۳۱۵
۱۶۹-	وہ نقشِ کفِ پا ہوں تیری راہ گذر میں	۳۱۷
۱۷۰-	شوخی ہے جو بہ سلسلۂ امتحاں نہیں	۳۱۹
۱۷۱-	دشمن کا نصیب چاہتا ہوں	۳۲۱
۱۷۲-	گم ہو گئی ہے ان کی تجلی جمال میں	۳۲۲
۱۷۳-	آغوشِ اضطراب میں سوئے ہوئے سے ہیں	۳۲۴
۱۷۴-	آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں	۳۲۶
۱۷۵-	تھی فرشِ راہ چشمِ تماشا کہاں کہاں	۳۲۷
۱۷۶-	عکسِ محبوب ہے دل، محوِ تماشا میں ہوں	۳۲۸
۱۷۷-	عزیز خاطرِ نامہربانِ سخت جانی ہوں	۳۲۹
۱۷۸-	یاں ہر ذرّہ کہتا ہے، میں ذرّہ نہیں اک دنیا ہوں	۳۳۰
۱۷۹-	میں تیرے قریب آ رہا ہوں	۳۳۱
۱۸۰-	یہ بھی تو بتا کہ میں کہاں ہوں	۳۳۲
۱۸۱-	کیوں کر تیری خوشی کو اپنی خوشی بنا لیں	۳۳۴
۱۸۲-	لاؤ اسے شہیدِ غم آرزو کریں	۳۳۵
۱۸۳-	ان کی نظر نے کیا کیا، ان کی نظر سے کیا کہیں	۳۳۶
۱۸۴-	اب ہم کہیں ہیں، دام کہیں، آشیاں کہیں	۳۳۸
۱۸۵-	بندھتی ہیں کہیں ظالم ٹوٹی ہوئی امیدیں	۳۳۹
۱۸۶-	خدا کی شان رہزن بھی کبھی رہبر نکلتے ہیں	۳۴۰
۱۸۷-	آخر اسی نے ہم کو آنکھیں دکھائیاں ہیں	۳۴۱
۱۸۸-	بیداد ہے، بیداد کے انداز نہیں ہیں	۳۴۳

نمبر شمار	مصرع ثانی	صفحہ
۱۸۹-	دل کی سزا یہی ہے، تمھاری خطا نہیں	۳۴۴
۱۹۰-	پھر کہاں ہے جو تیرے حلقۂ گیسو میں نہیں	۳۴۵
۱۹۱-	خاک اُڑائی جس میں برسوں، اب وہ صحرا ہی نہیں	۳۴۶
۱۹۲-	یاروں سے ہمدموں سے کیوں بدگمانیاں ہیں	۳۴۷
۱۹۳-	شاید اب رازِ خموشی برملا کہنے کو ہیں	۳۴۸
۱۹۴-	جو فروش زہد کو گندم نما کہنے کو ہیں	۳۵۰
۱۹۵-	کوئی بہار کی سی بات اب کے بہار میں نہیں	۳۵۱
۱۹۶-	اس کرم کی کچھ انتہا ہی نہیں	۳۵۲

ردیف 'و'

نمبر شمار	مصرع ثانی	صفحہ
۱۹۷-	بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ	۳۵۳
۱۹۸-	نصیب تو خیر ہے جو کچھ ہے نصیب کا اہتمام دیکھو	۳۵۵
۱۹۹-	وہ چھیڑنا چاہتے ہیں، نوکِ نشتر سے رگِ جاں کو	۳۵۶
۲۰۰-	بلا سے حالِ دل کچھ بھی سہی، ناگفتنی کیوں ہو	۳۵۹
۲۰۱-	اتنی بھی آدمی کو امیدِ کرم نہ ہو	۳۶۰
۲۰۲-	دعا چلی ہے مری قسمت آزمانے کو	۳۶۱
۲۰۳-	مجھ کو خیالِ یار کہیں ڈھونڈھتا نہ ہو	۳۶۳
۲۰۴-	آئے جاؤ مجھے دیوانہ بنائے جاؤ	۳۶۴
۲۰۵-	تم سے رخصت ہو رہا ہے میہمانِ لکھنؤ	۳۶۴

ردیف 'ہ'

نمبر شمار	مصرع ثانی	صفحہ
۲۰۶-	ہے ایک شمع، رونقِ محفل جگہ جگہ	۳۶۶
۲۰۷-	ترک مئے و مینا کرا اسے جرأتِ رندانہ	۳۶۸
۲۰۸-	الم لامتناہی کو نہ پوچھ	۳۷۱
۲۰۹-	آئینہ دیکھ اور ذرا مسکرا کے دیکھ	۳۷۲

ردیف "ی"

۲۱۰- درد دنیا میں جب آیا تو دوا بھی آئی ۳۷۵
۲۱۱- بے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی ۳۷۷
۲۱۲- میں محوِ تماشا ہوں دنیا ہے تماشائی ۳۷۹
۲۱۳- اب تو جینا ہی پڑے گا، شاد بھی ناشاد بھی ۳۸۰
۲۱۴- غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی ۳۸۱
۲۱۵- کوچۂ یار میں چل دیکھ لے جنت میری ۳۸۴
۲۱۶- محبت بھی کوئی تقصیر تھی اے آسماں میری ۳۸۵
۲۱۷- کہ روشناسِ اجابت نہیں دعا میری ۳۸۷
۲۱۸- اللہ رے کرم ہم اور توفیقِ گنہ گاری ۳۸۷
۲۱۹- زندگی کس عذاب میں گزری ۳۸۹
۲۲۰- دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی ۳۹۱
۲۲۱- بچھاؤ تم نہ بزم ناز میں صف میرے ماتم کی ۳۹۲
۲۲۲- کیا بات ہے تری نگہِ انتخاب کی ۳۹۴
۲۲۳- شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی ۳۹۵
۲۲۴- یہ ہے اپنی کہانی قصہ کوتہ زندگی بھر کی ۳۹۷
۲۲۵- دامنوں کی ہے خبر اب نہ گریبانوں کی ۳۹۸
۲۲۶- کہ دل میں اب نہیں برداشت غم اُٹھانے کی ۴۰۰
۲۲۷- زمیں تک ہے رسائی آسماں کی ۴۰۲
۲۲۸- کہ دل میں اب نہیں طاقت ستائے جانے کی ۴۰۳
۲۲۹- عمر تیرے ہی غم میں گذرے گی ۴۰۵
۲۳۰- مُنھ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی ۴۰۷
۲۳۱- پھر ہماری خبر ہی جائے گی ۴۰۸
۲۳۲- دنیا مری راحت کی قسمت نے مٹا ڈالی ۴۰۸
۲۳۳- ہم نے دنیا میں قیامت دیکھ لی ۴۰۹

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۲۳۴-	اللہ رے ترا اے دل اندازِ پریشانی	۴۱۰
۲۳۵-	دل کو آخر لہو کیے ہی بنی	۴۱۳
۲۳۶-	تم وجہ بے خودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی	۴۱۴
۲۳۷-	جو عمر صرف تماشائے حسنِ یار ہوئی	۴۱۷
۲۳۸-	یاد تیری کسی عنواں نہ فراموش ہوئی	۴۲۰
۲۳۹-	کچھ تمھیں کو میری خبر نہ ہوئی	۴۲۱
۲۴۰-	اور شفا قصہ مختصر نہ ہوئی	۴۲۳
۲۴۱-	تدبیر کا حاصل کیا کہیے تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی	۴۲۴
۲۴۲-	مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی	۴۲۵
۲۴۳-	پہلو میں تجھے ڈھونڈھے اے درد کہاں کوئی	۴۲۷
۲۴۴-	دستِ وحشت میں ہے دامن نہ گریباں کوئی	۴۲۸
۲۴۵-	پھر ظلم کی راہ تک رہا ہے کوئی	۴۳۰
۲۴۶-	یعنی وہ اضطراب کی صورت نہیں رہی	۴۳۲
۲۴۷-	دل کی بستی خراب ہو کے رہی	۴۳۵
۲۴۸-	رہ رہ کے ٹوٹتی ہیں امیدیں رہی سہی	۴۳۷
۲۴۹-	فتنۂ شامِ غم کے بعد فتنۂ حشر ہی سہی	۴۳۸
۲۵۰-	مشقِ خرامِ ناز گرداں نہ سہی یہیں سہی	۴۳۹
۲۵۱-	اور بے وفا جو کل بھی نہ یہ آج کل گئی	۴۴۰
۲۵۲-	آخری صورت نکل کر رہ گئی	۴۴۳
۲۵۳-	دردِ جگر کی ہر دوا دردِ مآل ہو گئی	۴۴۴
۲۵۴-	تمام عمر کا قصہ تمام ہو جائے	۴۴۵
۲۵۵-	تیرا تو اے ستم گر ارمان رہ نہ جائے	۴۴۶
۲۵۶-	گھر وہ ترا کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے	۴۴۷
۲۵۷-	تو آئے نظر جدھر نظر جائے	۴۵۰

نمبر شمار	مصرع ثانی	صفحہ
۲۵۸	خلوتِ یادِ یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے	۴۵۱
۲۵۹	قاتل کی نگاہوں کے تیور ہی بدل جاتے	۴۵۴
۲۶۰	تو ذرا تم نے سی دیئے ہوتے	۴۵۴
۲۶۱	مر کے شرمندۂ قاتل نہیں ہونے پاتے	۴۵۵
۲۶۲	کرتے تو ہم اپنا ہی کچھ تم سے گلا کرتے	۴۵۷
۲۶۳	کچھ تو اپنی سی چارہ گر کرتے	۴۵۸
۲۶۴	مجبورِ غم اتنے بھی مجبور نہیں ہوتے	۴۶۰
۲۶۵	ہم تجھ سے چھپا کر بھی ترا نام نہ لیتے	۴۶۲
۲۶۶	وہ آپ اپنے تصور میں آ کے آئے تھے	۴۶۴
۲۶۷	آسماں ٹوٹ پڑے دستِ دعا گر اُٹھتے	۴۶۵
۲۶۸	کدھر گیا ہمہ تن اضطراب کر کے مجھے	۴۶۷
۲۶۹	جنونِ چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے	۴۶۷
۲۷۰	آنے لگی ہے ذکرِ وفا سے حیا مجھے	۴۷۰
۲۷۱	جب مجھے منزل نے کھویا، مل گئی منزل مجھے	۴۷۱
۲۷۲	ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے	۴۷۱
۲۷۳	برق جب جسم سے وابستہ ہوئی جاں سمجھے	۴۷۳
۲۷۴	ہاں نظر دے تو مجھے فرصتِ حیرانی دے	۴۷۴
۲۷۵	مری نظر میں مرا اعتبار رہنے دے	۴۷۷
۲۷۶	دیوانہ ہشیار کو دیوانہ بنا دے	۴۷۸
۲۷۷	اے دستِ کرم پردۂ تدبیر اُٹھا دے	۴۸۰
۲۷۸	لوٹتا ہے دل مرا دوزخ میں جنت کے مزے	۴۸۱
۲۷۹	سو کام لگے ہیں دلِ ناکام کے دم سے	۴۸۳
۲۸۰	گرے کیوں برق بچ کر آشیاں سے	۴۸۴
۲۸۱	اکثر صفیں نظر کی اُلٹ دیں نقاب سے	۴۸۵

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۲۸۲-	ملتی ہے زمانے کی نظر ان کی نظر سے	۴۸۶
۲۸۳-	وہ وارداتِ قلب، تمنا کہیں جسے	۴۸۹
۲۸۴-	کشتی کو ملا ساحل، ٹکرا گئی ساحل سے	۴۹۱
۲۸۵-	نیند اُچٹتی ہے اس کہانی سے	۴۹۳
۲۸۶-	جی بہل جاتا کسی تدبیر سے	۴۹۴
۲۸۷-	آئنہ طلب فرما کثرت تماشا سے	۴۹۶
۲۸۸-	آسماں پر اکھڑے جاتے ہیں قدم تاثیر کے	۴۹۹
۲۸۹-	مری نظر میں ہیں جلوے کسی کی قامت کے	۵۰۱
۲۹۰-	رکھنا قدم تصوّرِ جاناں سنبھال کے	۵۰۲
۲۹۱-	کیا کیا ستم گر نے خوگرِ جفا کر کے	۵۰۳
۲۹۲-	یہ دونوں عالم کچھ بھی نہیں ٹکڑے ہیں مرے افسانے کے	۵۰۴
۲۹۳-	آخری کچھ پیام بجھتے دل کے	۵۰۶
۲۹۴-	سر کے بل یہ جائے یا بے سر چلے	۵۰۷
۲۹۵-	ہم نے گن گن کے لیے خونِ وفا کے بدلے	۵۰۹
۲۹۶-	جُدا ہو رہے ہیں جدا ہونے والے	۵۱۰
۲۹۷-	مجھے قرار سے دیکھا تو مُسکرا کے چلے	۵۱۱
۲۹۸-	ارمانِ دل بقدرِ یک آہ بھی نہ نکلے	۵۱۳
۲۹۹-	جب تک رحمت کا ہر پہلو دل کا دامن تھام نہ لے	۵۱۵
۳۰۰-	زندگی درد بنائی تھی دوا سے پہلے	۵۱۷
۳۰۱-	پھر تم اُمیدوار کر کے چلے	۵۱۹
۳۰۲-	اتنا تو کرو کرم سے پہلے	۵۲۰
۳۰۳-	زلفِ جاناں سے بنا ہے کوئی سودا نہ بنے	۵۲۲
۳۰۴-	شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے	۵۲۲
۳۰۵-	یوں کر نہ لیے پیدا دو پھول بھی گلشن نے	۵۲۴

نمبر شمار	مصرع ثانی	صفحہ
۳۰۶-	دم توڑ دیا گیا ترے قدموں پہ کسی نے	۵۲۵
۳۰۷-	میری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے	۵۲۷
۳۰۸-	ناموسِ عشق ہدیۂ مژگاں کیے ہوئے	۵۲۹
۳۰۹-	ذرّے ہیں اک جہانِ حقیقت لیے ہوئے	۵۳۲
۳۱۰-	وہ دامنِ نگاہ میں ہیں بجلیاں لیے ہوئے	۵۳۴
۳۱۱-	آشوب صد جہانِ تماشا لیے ہوئے	۵۳۶
۳۱۲-	تیری مشکل ہو آساں اے دلِ ناداں یہ مشکل ہے	۵۳۸
۳۱۳-	میان سے نکلے تو میں سمجھوں کہ خنجر دل میں ہے	۵۳۹
۳۱۴-	بخت کی ناسازگاری اور ہے	۵۳۹
۳۱۵-	خلش ہوتی ہے لیکن کس قدر پُر لطف ہوتی ہے	۵۴۰
۳۱۶-	دل کا آجانا کسی بے درد پر کیا چیز ہے	۵۴۲
۳۱۷-	تری خدائی کے قربان ماسوا کیا ہے	۵۴۳
۳۱۸-	وہ دریا ہے یہ قطرہ، لیکن اس قطرہ میں دریا ہے	۵۴۴
۳۱۹-	دل آئنہ ہے کہ منہ آئنہ کا تکتا ہے	۵۴۷
۳۲۰-	نذرِ اربابِ درد رہتا ہے	۵۴۹
۳۲۱-	چشم بددور دلہن بن کے شباب آتا ہے	۵۵۰
۳۲۲-	میں ہی میں ہوں میرے ماسوا کیا ہے	۵۵۲
۳۲۳-	ہر سانس کے پردے میں قاتل نظر آتا ہے	۵۵۳
۳۲۴-	کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی، کچھ درد سوا ہو جاتا ہے	۵۵۶
۳۲۵-	یہ کیوں کہوں کہ ان کی تمنا عذاب ہے	۵۵۷
۳۲۶-	جو آپ سے مل گیا بہت ہے	۵۵۹
۳۲۷-	زیست کا ہم پہ گماں دیکھیے کب تک رہے	۵۶۰
۳۲۸-	اس میں اب شاد رہے یا کوئی ناشاد رہے	۵۶۰
۳۲۹-	بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے	۵۶۲

نمبر شمار	مصرع ثانی	صفحہ
۳۲۰ -	رند مشقِ ہائے ہو کرتے رہے	۵۶۴
۳۲۱ -	تو اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار ہے	۵۶۵
۳۲۲ -	جو جس قدر قریب ہے اتنا ہی دور ہے	۵۶۷
۳۲۳ -	خاکِ دل اللہ اکبر کیا ہی کافر خیز ہے	۵۶۹
۳۲۴ -	تو ہی جنوں کا آسرا، تو ہی سکوں کی آس ہے	۵۷۲
۳۲۵ -	اس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے	۵۷۴
۳۲۶ -	صبح کہتے ہیں جسے وہ شام کا پیغام ہے	۵۷۶
۳۲۷ -	خندۂ تصویر انبساط نہیں ہے	۵۷۷
۳۲۸ -	اللہ ری تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے	۵۷۸
۳۲۹ -	سوائے عیش، سو تقدیر انتظار میں ہے	۵۷۹
۳۴۰ -	خموشی اہلِ دل کی داستاں ہے	۵۸۲
۳۴۱ -	اب دل کا یہ عالم ہے نہ دنیا ہے نہ دیں ہے	۵۸۳
۳۴۲ -	پیمانہ بہ اندازۂ پیمانہ نہیں ہے	۵۸۴
۳۴۳ -	صبر رخصت ہو رہا ہے، اضطراب آنے کو ہے	۵۸۶
۳۴۴ -	کہنے کو جو میں نہیں وہ تو ہے	۵۸۹
۳۴۵ -	دم محبت میں نکل جانے کو ہے	۵۹۰
۳۴۶ -	کیا تماشا ہے کہ دل کا چور بھی دزدیدہ ہے	۵۹۱
۳۴۷ -	ہم ہیں اور عمرِ ابد اور حسرتِ یک سجدہ ہے	۵۹۲
۳۴۸ -	کیا تیری شان کبریائی ہے	۵۹۳
۳۴۹ -	وہ اک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے	۵۹۵
۳۵۰ -	موت ملے تو مفت نہ لوں، ہستی کی کیا ہستی ہے	۵۹۷
۳۵۱ -	مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے	۶۰۰
۳۵۲ -	جفا کم کر جفا اب روح پرور ہوتی جاتی ہے	۶۰۱
۳۵۳ -	طبیعت بے نیازِ کفر و دیں معلوم ہوتی ہے	۶۰۲

نمبر شمار	مصرعِ ثانی	صفحہ
۳۵۴-	لازم نہیں کہ خونِ تمنّا نہ کیجیے	۶۰۴
۳۵۵-	مہرباں سمجھا کیے نامہرباں دیکھا کیے	۶۰۶
۳۵۶-	ہر قدم پر نقشِ پائے راہبر دیکھا کیے	۶۰۸
۳۵۷-	تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے	۶۰۹
۳۵۸-	میں جو رو دیا مسکرا کر رہ گئے	۶۱۱
۳۵۹-	پھر کوئی چھیڑ زخمِ جگر سے نکالیے	۶۱۲
۳۶۰-	ہر نفس اک آہ ہے اس رنجِ پنہاں کے لیے	۶۱۳
۳۶۱-	جب گلستاں چاہیے تھا اب بیاباں چاہیے	۶۱۵
۳۶۲-	ہے شمع بھی پروانہ، پروانہ کو کیا کہیے	۶۱۶
۳۶۳-	تدبیر مقدر تھی، تقدیر کو کیا کہیے	۶۱۸
۳۶۴-	اس حسنِ تجاہل کو کس طرح کرم کہیے	۶۱۹
۳۶۵-	دیوانے کا خواب اور وہ بھی خواب قیامت کیا کہیے	۶۲۰
۳۶۶-	حد سے گذری دل کی خرابی، دل کی خرابی کیا کہیے	۶۲۱
۳۶۷-	للہ الحمد کہ پھر غم کی فراوانی ہے	۶۲۳
۳۶۸-	مرے حواس ٹھکانے لگا دیئے تو نے	۶۲۵
۳۶۹-	یعنی جو سحر ہو بھی گئی، شام نہیں ہے	۶۲۷
۳۷۰-	یہ زندگی تو اب تک امیدِ زندگی ہے	۶۲۹
۳۷۱-	زندگی رو براہ ہوتی ہے	۶۳۰
۳۷۲-	جو گل ہے تیرے گوشۂ داماں کے لیے ہے	۶۳۱
۳۷۳-	مجالِ دیدہ یہ بجلی گرائی جاتی ہے	۶۳۲
	متفرقات	۶۳۴

پیش لفظ

جدید غزل گو شعرا میں فانی کو کئی اعتبار سے امتیاز حاصل ہے۔ اگر ایک طرف انھوں نے اُردو غزل کو جذبہ کی شدت اور خیالات کی گہرائی دے کر اسے نئی بلندیوں سے آشنا کیا تو دوسری طرف ان کے یہاں زبان و بیان کی نزاکتیں اور کلاسکی حسن بھی موجود ہے۔ ان کے فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار نے شاعری کو مالا مال کیا اور لب و لہجہ نے اُردو شاعری کو ایک نئی آواز بخشی۔ یونی ورسٹی کے ہر نصاب میں اس کو شامل کیا گیا ہے، وہ ان کی اہمیت کی دلیل ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ ان کے اشعار کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے میرا تجربہ یہ ہے کہ غالب اور مومن کے بعد جس شاعر کے کلام کو سمجھنا اور ان کے بنیادی خیال تک پہنچنا ایک عام قاری کے لیے مشکل ہے، وہ فانی ہیں۔ ان کی غزلوں میں فارسی تراکیب اور الفاظ، فلسفہ اور تصوف اور زندگی کے دوسرے تصورات اور مسائل کی جو فراوانی ہے ان تک عہدِ حاضر کے طالب علم کے ذہن کی رسائی ممکن نہیں۔ غالب، مومن اور اقبال کی طرح فانی کے اشعار کو بھی ”گنجینۂ معنی کا طلسم“ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے حل کرنے کے لیے کسی با ذوق رہنما یا شرح کی کلید ہونا ضروری ہے۔ غالب اور اقبال کی شرحیں تو موجود ہیں جن سے ہمارے اساتذہ اور طلبہ استفادہ کر سکتے ہیں مگر فانی کی شرح کی کمی عرصے سے محسوس ہو رہی تھی۔

یہی جذبہ تھا جس نے مجھے اس طرف متوجہ کیا اور اللہ کا نام لے کر اس کام کی ابتدا کر دی مگر ذاتی مصروفیات کے باعث اس کو تکمیل تک نہ پہنچا سکی۔ بہر نوع خدا کا شکر ہے کہ اب یہ کام مکمل ہو گیا اور آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ یہ شرح پیش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوں، اس کے بارے میں کوئی

دعویٰ نہیں کرنا چاہتی، اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے۔ البتہ یہ اعتماد ہے کہ فانیؔ شناسی میں یہ شرح ضرور ممد گار ثابت ہوگی۔ مجھے اس کا کوئی دعویٰ نہیں کہ یہ شرح فانیؔ کے ذہن کا مکمل احاطہ کرے گی۔ البتہ یہ یقین ہے کہ فانی پر کام کرنے والوں کے لیے راستہ ہموار کرنے میں یہ معاون ثابت ہوگی۔ ع سخنِ دوست گراں بود فراواں کردم

اشعار کی تشریح میں عام طور پر اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن جہاں تفصیل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں اجمال سے گریز کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کوشش کی ہے کہ شاعر نے کسی خاص نظریہ یا تصور کو پیش کیا ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی جائے۔ مشکل الفاظ کے معنی کے ساتھ ہم مفہوم شعر ذہن میں آیا تو اس کو بھی تحریر کر دیا ہے۔ ایسے اشعار کی بھی نشان دہی کر دی ہے جن میں کسی استاد کا رنگ یا اثر نمایاں ہے۔

اس سلسلہ میں چند لوگوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کے مشورے اور ہدایات نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ شرح کی ابتدا خال محترم مولانا ضیاء احمد بدایونی (خدا ان کی تربت کو عنبریں کرے) کی حیات میں ہوگئی تھی اور شروع کا حصہ ان کی نظر سے گذر چکا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بتائے ہوئے راستے پر اس شرح کی تکمیل کی ہے۔ میں اپنے برادر بزرگ پروفیسر ظفر احمد صدیقی (سابق صدر شعبۂ فلسفہ۔ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ) اور برادر محترم پروفیسر اختر اقبال کمالی (سابق استاد شعبۂ انگریزی پنجاب یونی ورسٹی۔ لاہور) کی ممنون ہوں جنھوں نے شرح کے دوران بعض مشکل اشعار کو حل کرنے اور فلسفیانہ نکات کو سمجھنے میں میری مدد کی۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے شوہر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی) کے تعاون اور مدد کا ذکر نہ کروں جنھوں نے دیوان کی ترتیب اور شرح کی تکمیل کے سلسلے میں نہ صرف میری مدد کی بلکہ مفید مشورے بھی دیئے۔ اگر وہ اس کام میں میری ہمت افزائی نہ کرتے تو شاید میرے دوسرے منصوبوں کی طرح یہ بھی نامکمل رہتا اور منصۂ شہود پر نہ آتا۔

دہلی
۱۲ر اگست ۱۹۸۴ء

افتخار بیگم صدیقی

ردیف الف

(۱)

تیرا نگاہِ شوق کوئی رازداں نہ تھا   آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا

اے نگاہِ شوق دنیا میں کوئی تیرا محرمِ راز نہ تھا جو جلوۂ یار میں تیری مدد اور مساعدت کرتا ورنہ اس کا جلوہ کائنات میں کس جگہ موجود نہیں۔

غالبؔ نے اسی خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عالم جز اعتبارِ نہاں و عیاں نہ تھا   یعنی کہ تو عیاں نہ ہوا اور نہاں نہ تھا

عیاں و نہاں (ظاہر و باطن) محض اعتباری مفاہیم ہیں اور عالم انہی اعتباری مفاہیم کا نام ہے۔ لیکن ذاتِ باری تعالیٰ پر عیاں اور نہاں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عیاں اُس کو کہا جا سکتا ہے جو "کسی" پر ظاہر ہو اور نہاں وہ ہے جو "کسی" سے پوشیدہ ہو لیکن صوفیاء کے نظریہ ہمہ اوست کے مطابق یہاں "کسی اور" کا وجود ہی کہاں ہے جو نہاں اور عیاں کا سوال پیدا ہو۔

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں   اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا

شعراء کے نزدیک تمام آلام و مصائب آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ شاعر کو محبوب

کی گلی میں جو ذلتیں اور رسوائیاں اٹھانا پڑتی ہیں تو اس کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب سے پہلے یہاں یہ رسوائیاں نہ تھیں۔ شاید اب اس سرزمین پر آسمان کا عمل دخل ہو گیا ہے۔

کیا دن تھے جب مآلِ وفا کی خبر نہ تھی
وہ دن بھی تھے کہ حالِ وفا داستاں نہ تھا

مآل : انجام

شاعر ابتدائے وفا کا زمانہ یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ بھی کیا دن تھے جب ہم عشق کے انجام اور اس کی دشواریوں سے بے خبر تھے اور ہماری محبت کی کہانی اس طرح خلق میں مشہور نہ ہوئی تھی۔

زمانۂ حال کے ایک شاعر کا شعر ہے۔

تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے
خوار ہوئے، بدحال ہوئے، بدنام ہوئے، رنجور ہوئے

تلقینِ صبر دل سے کوئی دشمنی نہ تھی
دیکھا یہ حال قابلِ شرح و بیاں نہ تھا

شاعر اپنے ہمدرد غم گساروں سے کہتا ہے کہ میں تمھیں الزام نہیں دیتا۔ تم نے تلقینِ صبر دشمنی کی بنا پر نہیں کی تھی۔ لیکن میں جو اپنے دل کی حالت ظاہر نہ کر سکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ قابلِ بیاں نہ تھی تو اس میں میرا بھی قصور نہیں۔ بہرحال اب تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو تم کو یقین آیا۔

مفہوم کائنات تمھارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

محبوب کی ہستی ہی عاشق کے لیے سب کچھ ہے جب وہ نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے تو ساری دنیا اس کے نزدیک معدوم ہو جاتی ہے۔ اس شعر کو حقیقی معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ جس طرح آئنہ کے سامنے اصلی وجود دیکھنے والے کا ہے نہ کہ اس کے عکس کا جب وہ سامنے سے ہٹ گیا تو عکس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا

لاگ = دشمنی

اپنی بدنصیبی کا بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ بجلیوں نے چمن میں صرف اس شاخ اور اس شجر کو تاکا جس پر ہمارا آشیانہ تھا کیونکہ انھیں تو صرف ہمیں ہی ستانا مقصود تھا اوروں سے کوئی دشمنی نہ تھی۔

آغوشِ موت میں تہِ دامانِ یار ہوں
وہ دن گئے کہ مجھ پہ کوئی مہرباں نہ تھا

مرنے کے بعد عاشق پر محبوب مہربان ہوگیا ہے۔ گویا موت کے آغوش کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب کے دامن کا سایہ بھی میسّر آگیا اور اس کی یہ شکایت دُور ہوگئی کہ میرا کوئی غم خوار نہیں۔

آزردہ تھا کہ ضبطِ فغاں میں اثر نہیں
شرمندہ ہوں کہ ضبطِ فغاں رائیگاں نہ تھا

آزردہ = غمگین
رائگاں = بے کار

شاعر نے عشق میں نالہ و فغاں کی جگہ ضبط اور صبر کیا اور اسے یقین تھا کہ یہ ضبط اپنا اثر دکھائے گا۔ جب تک اس کے ضبطِ فغاں میں اثر پیدا نہ ہوا تھا وہ غمگین تھا لیکن جب ضبطِ فغاں نے اثر دکھایا تو بھی اسے بجائے خوشی کے شرمندگی ہوئی کیونکہ اب محبوب اپنے طرزِ عمل پر متاسف ہے اور عاشق کو محبوب کا یہ رنج گوارا نہیں۔ کسی کا شعر ہے۔

وہ بھی با دیدۂ تر آج ادھر سے گذرے
ہم تو اے جذبۂ دل ایسے اثر سے گذرے

ہو بھی چکے تھے دامِ محبّت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقیدِ زماں و مکاں نہ تھا

ہماری عاشق مزاجی کوئی نئی بات نہیں۔ ہم اس وقت سے اسیرِ عشق ہوئے ہیں جب اس عالمِ امکاں کا وجود بھی نہ تھا۔ قیدِ تعینات سے پہلے اعیان[1] کو ذاتِ حق سے جو وابستگی تھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

بیش از ظہور جلوۂ خانانہ سوختیم
آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

---

[1] اعیان، عین کی جمع۔ حقایق۔ جو مظاہر کی شکل میں ظاہر ہیں۔

اللہ رے بے نیازیٔ آدابِ التفات
دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا

دوست محبت اور التفات کے ظاہری آداب سے بے نیاز ہے یعنی اس کے ربطِ نہاں کے لیے ظاہری نظر کی حاجت نہیں۔ وہ ہماری طرف نظرِ لطف کرتا ہے تو نظر کا وجود بھی درمیان سے اُٹھ جاتا ہے۔ بقول غالبؔ :

کس منھ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

میرے دلِ غیور کا حُسنِ طلب تو دیکھ
گویا زباں پہ حرفِ تمنّا گراں نہ تھا

غیور = غیرت مند
حسن طلب = لطیف انداز یا کنایہ میں خواہش کا اظہار کرنا

قاعدہ ہے کہ جب زبان پر حرفِ مدّعا لانا خلافِ مصلحت یا ناگوار ہوتا ہے تو حسنِ طلب سے کام لیا جاتا ہے۔ میرے دل کی خودداری دیکھو کہ اس بے نیازی سے معشوق سے حسن طلب کرتا ہے گویا زبان پر حرفِ تمنا گراں نہ تھا بلکہ کنایتہً گراں گذر رہا ہے۔ یعنی ناگوار گذر رہا ہے۔

تو نے کرم کیا تو بہ عنوانِ رنجِ زیست
غم بھی مجھے دیا تو غمِ جاوداں نہ تھا

اس شعر سے فانیؔ کے فلسفۂ غم اور ایذا پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ غم کو اپنے محبوب (اللہ تعالیٰ) کا عطیہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے غمِ زیست عطا کر کے ہم پر کرم و احسان کیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ شکایت ہے کہ یہ غم جاوداں نہیں اور عارضی ہے جو عمرِ دو روزہ کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ فانیؔ نے ہی دوسری جگہ اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے :

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

فانیؔ فسونِ موت کی تاثیر دیکھنا
ٹھہرا وہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا

فسوں = جادو

اپنے دل کی بے چینی و بے تابی کو دیکھ کر ہم کو گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ کبھی سکون پذیر ہو سکے گا لیکن موت کی فسوں گری دیکھو کہ اس نے اس کو بھی خاموش کر دیا۔ ایک اور جگہ

فانی کہتے ہیں :

لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی
دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

(٢)

ٹوٹا طلسمِ ہستیِ فانی کے راز کا
احسان مند ہوں المِ جاں گداز کا

جاں گداز = جان لیوا

فانی کی زندگی کا راز ایک ایسے طلسم سے مشابہ تھا جس کا توڑنا بہت مشکل ہو۔ میں ان روح فرسا غموں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس طلسم کو توڑ دیا اور ہمیں اس سے آزادی دلا دی۔ شاعر نے لفظ "فانی" سے فائدہ اٹھایا ہے۔

تمہیدِ صد ہزار قیامت ہے ہر نفس
عنوانِ شوق ہوں گلہ ہائے دراز کا

میرا وجود گویا سیکڑوں شکووں کی داستانوں کا عنوان ہے جو شوق (عشق) کی بدولت ظہور میں آیا ہے یعنی میرے وجود میں بکثرت شکوے پوشیدہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری ہر سانس (مراد آہ) ہزاروں قیامتوں کا پیش خیمہ ہے۔

عبرت سرائے دل میں ہوں آوازِ دور باش
مارا ہوا ہوں خاطرِ حسرت نواز کا

دور باش = دور رہو، بچو ہٹو
خاطرِ حسرت نواز = وہ دل جو حسرتوں کی آماجگاہ ہے۔

میں اپنی حسرت نواز اور غم پسند طبیعت کی وجہ سے عبرت کا ایک نمونہ بن گیا ہوں اور دل کے عبرت کدے میں میرا وجود گویا دور باش کی آواز ہے جو دوسروں کو ہوشیار کرتی رہتی ہے کہ مجھ کو دیکھ کر انجام پر نظر کرو۔ غالب نے اس خیال کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے :

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال
منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

نظارہ ساز = نظارہ کو وجود میں لانے والا۔
منہ دیکھنا = مایوسی بے بسی اور حیرت کی علامت ہے۔

لوگ مجھ پر نظارۂ جمالِ دوست کی تہمت لگاتے ہیں لیکن مجھ سے یہ تہمت برداشت نہیں ہوتی۔ میں حیرت اور بے چارگی کے عالم میں اس جلوے کا منھ تک رہا ہوں جو خود ہی خالقِ نظارہ بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر وہ خود ہی تابِ دید عطا نہ کرے تو اس کو دیکھنا ممکن ہی نہ ہو۔

نا آشنائے لطف ہوں بیگانۂ عتاب
صورت شناس ہوں نگہِ امتیاز کا

صورت شناس = جو زیادہ واقفیت نہ رکھتا ہو محض صورت آشنا ہو۔
نگہِ امتیاز = اچھے بُرے میں فرق کرنے والی نظر۔

میں محبوب کے لطف و غضب دونوں کو ابھی پہچانتا نہیں ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ ہنوز اس کی نگاہِ امتیاز کا صرف روشناس ہوا ہوں۔ اس کی اداؤں کو پہچاننے کے لیے تو ایک طویل عرصہ درکار ہے۔

احساس غیر بادہ گوارا ہوا مجھے
لا جام ساقیا! مئے مینا گداز کا

مئے مینا گداز = ایسی تیز شراب جو صراحی کو پگھلا دے۔

میری مستی ناقص ہے کیونکہ مجھے ابھی شراب کے علاوہ اور چیز (مثلاً صراحی) کا احساس باقی ہے لہذا ایسی شراب دے جس کی تیزی صراحی کو بھی پگھلا کے فنا کر دے۔ شراب سے ذات لاتعین[1] اور صراحی سے تعینات[2] مراد ہیں۔

فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

چارہ ساز = معالج، طبیب۔

میرے چارہ ساز کا ہاتھ دوا دینے میں کیوں کانپ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میری حالتِ تباہ نہ دیکھ سکتا ہو اور دوا کے بہانے زہر دیکر میری تکلیف کا خاتمہ کرنا چاہتا ہو۔

---

[1] لاتعین: جو حد سے آزاد ہو اور محدود نہ ہو۔ مراد ذات باری تعالیٰ۔
[2] تعین: جو محدود ہو۔ مراد کائنات یا ماسوا اللہ۔

دردِ جگر یہ تجھے کیا ہوگیا   اور تسلی سے سوا ہوگیا

سوا = زیادہ

دوست کی تسلی سے درد کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ کسی کی ہمدردی سے غم کا احساس زیادہ ہوجاتا ہے۔ بقول حسرتؔ :

دردِ دل اس نے تو حسرتؔ اور دونا کر دیا   سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں

غیب سے سامانِ شفا ہوگیا   موت کی نیند آگئی بیمار کو

بیمار کو نیند آنا صحت کی علامت ہے۔ جب بیمارِ غم کو کوئی دوا راس نہ آئی تو قدرت کو اس پر رحم آیا اور موت نے آکر اس کو سکون بخش دیا۔ گویا موت ہی اس کے مرض کا علاج تھی۔

کون گرفتارِ بلا ہوگیا؟   اور ہی بل ہیں تمہاری زلفوں میں آج

آج تمھاری زلفوں کے بَل میں عجیب نرالا انداز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص تازہ گرفتارِ محبت ہوا ہے جس پر زلفیں غرور سے بل کھا رہی ہیں۔

زہر بھی کمبخت دوا ہوگیا   چارۂ تپ ہجر کا اب کیا کروں

غمِ جُدائی کی تکلیفوں سے تنگ آکر ہم نے زہر کھایا مگر موت کو بھی ہم پر رحم نہ آیا، اور زہر کا کچھ اثر نہ ہوا۔ "زہر بھی دوا ہوگیا" کا ٹکڑا لطافت سے خالی نہیں۔ مراد یہ ہے کہ زہر بھی دواؤں کی طرح بے اثر نکلا۔

موت کا وعدہ تو وفا ہوگیا   اب بھی ترا وعدہ وفا ہو نہ ہو

غمِ ہجر سے نجات کی دو ہی صورتیں تھیں۔ دوست کی آمد یا موت۔ دوست نے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کا انتظار کرتے کرتے آخر اجل آگئی۔ کون جانے اب بھی وہ اپنا

وعدہ پورا کرتا ہے یا نہیں۔

مفتِ دوعالم ہے وہ تیرِ نگاہ
جو میری شامت سے خطا ہو گیا

تیر خطا ہونا = نشانہ غلط ہونا

معشوق کی نگاہوں کا تیر ہمارے لیے تھا۔ بدقسمتی سے ہم اس کا ہدف نہ بن سکے اور اب وہ دونوں عالم کے حصہ میں مفت آگیا۔ مراد یہ ہے کہ دوست کے فیضان یا توجہ کا اصل مورد تو میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں بدقسمتی سے محروم رہ جاؤں اور دوسرے فائدہ اٹھالیں۔ یہ ادب کا تقاضا ہے کہ شاعر اس حادثہ کو دوست کی بے التفاتی پر نہیں بلکہ اپنی بدقسمتی پر محمول کرتا ہے۔

عام ہے اس کا تو احسان شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہوش ہی تھا ہجر کہ میں آپ سے
آپ میں آتے ہی جُدا ہو گیا

آپ میں آنا = ہوش میں آنا

ہم عالم بے خودی میں دوست کو اپنے سے قریب محسوس کر رہے تھے لیکن جوں ہی ہوش آیا، اس سے جدا ہو گئے۔ گویا ہوش میں آنا ہجر کے مترادف تھا۔

(۴)

بے اجل کام نہ اپنا کسی عنواں نکلا
دم تو نکلا مگر آزردۂ احساں نکلا

آزردۂ احساں = احسان کا بار لیے ہوئے۔

ہم نے چاہا تھا کہ محبت میں کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہونا پڑے لیکن ایسا نہ ہو سکا اس زندگی کے غموں سے نجات پانے کے لیے موت کا احسان اُٹھانا پڑا۔

ہے ترے بیمار کے منھ پر رونق
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

مرکر تیرے بیمار کے منھ پر رونق آگئی ہے۔ موت نے آکر اس کی جان جسم سے کیا نکالی گیا اس کا بہت بڑا ارمان پورا کر دیا۔ موت کی یہ تمنا فانی کی شاعری کی خصوصیت ہے۔

دلِ آگاہ سے کیا کیا ہمیں امیدیں تھیں   وہ بھی قسمت سے چراغِ تہِ داماں نکلا

چراغِ تہِ داماں = جس چراغ کو ہوا سے بچانے کے لیے دامن میں چھپا لیا جائے۔

ہم کو اپنے دل کی دانائی پر بڑا ناز تھا اور اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن بدقسمتی سے وہ چراغِ تہِ داماں ثابت ہوا جو کسی کو روشنی نہیں پہنچا سکتا۔ دل سینے میں چھپا ہوا ہے نیز وہ اسرار ازل تک شاعر کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے اس لیے اسے چراغِ تہِ داماں قرار دیا ہے۔

دل بھی تھا منہ سے بس اک آہ نکل جانے تک   آگ سینے میں لگا کر غمِ پنہاں نکلا

جب تک ہم نے آہ نہ کی دل سلامت تھا۔ جوں ہی آہ کے ذریعے سے ہم نے غمِ پنہاں کو سینے سے نکالنا چاہا، سینے میں آگ لگ گئی اور دل بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

چارہ گر، ناصحِ مشفق، دلِ بے صبر و قرار   جو ملا عشق میں غمخوار، وہ ناداں نکلا

مشفق = مہربان

قسمت تو دیکھو کہ عشق میں ہمیں جتنے ہمدرد اور غمخوار ملے سب کے سب نادان ملے خواہ وہ معالج ہوں یا ناصح یا ہمارا دل۔

شکوہ منظور نہیں تذکرۂ عشق نہ چھیڑ   کہ وہ در پردہ میرا حالِ پریشاں نکلا

تذکرۂ عشق جب بھی چھڑے گا تو لازماً میرا حالِ پریشاں بھی زیرِ بحث آئے گا کیونکہ عشق کا ذکر بغیر میرے تذکرے کے ممکن نہیں دونوں مترادف ہیں اور میری تباہی و پریشاں حالی کے ذکر میں شکوۂ یار کا پہلو نکلتا ہے اس لیے یہ تذکرہ ہی ہمیں پسند نہیں۔ محبوب کی مرضی کا احترام قابلِ دید ہے۔

حضرت رضی بدایونی کا شعر ہے:

ہے اس میں رضی شکوۂ دلدار کا پہلو
لب پر گلۂ گردشِ ایام نہ آئے

بجلیاں شاخِ نشیمن پہ پھی جاتی ہیں
کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

سوختہ ساماں = بے سروساماں، بدنصیب۔
سوختہ سامانی کی انتہا ہے کہ جب تک بے چارہ آشیاں میں رہا، بجلیوں نے بھی ادھر کا رُخ نہ کیا (بجلیاں کسی چیز کو جلانے آتی ہیں جہاں پہلے ہی کچھ نہ ہو وہاں آکر اُن کو کیا حاصل ہوتا) اور اِدھر وہ نکلا، اُدھر بجلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر شاخِ نشیمن پر گرنے لگیں۔

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی
چاکِ دامن بھی بہ اندازۂ داماں نکلا

ہم نے سمجھا تھا کہ جنون میں ہمیں ہر پابندی اور رکاوٹ سے آزادی حاصل ہو جائے گی مگر یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ ہم نے دامن جو چاک کیا تو یہ چاک بھی دامن کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مراد یہ کہ جنون کی بھی کچھ حدود ہیں جن کو توڑنا ممکن نہیں۔

ہائے وہ وعدہ فردا کی مدد وقتِ اخیر
ہائے وہ مطلبِ دشوار کہ آساں نکلا

عمر بھر ہم دوست کے وعدۂ فردا (کل آنے کا وعدہ) کے سہارے جیے مگر چونکہ یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا اس لیے زندگی بڑی دشواری سے گذری البتہ اس وعدۂ فردا نے نزع کے وقت بڑی مدد کی کہ اس کے بھروسہ پر ہم نے جان آسانی سے دے دی۔ گویا جان دینا وہ مطلبِ دشوار تھا جو محبوب کے وعدۂ فردا کی بدولت آسان ہو گیا۔

شوقِ بے تاب کا انجام تحیّر پایا
دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

صوفیہ کے نزدیک عشق کے مقامات میں ایک مقام تحیّر ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے اللّٰھم زدنی حیرۃً فیک۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے شوق کی بے تابیاں بالآخر مقامِ حیرت تک پہنچ کے سکون پذیر ہو گئیں۔ گویا عشق کی بے تابی کا آخری نتیجہ تحیّر تھا اور دلِ بیتاب نہ تھا بلکہ ایک دیدۂ حیراں تھا۔

اس نے کیا سینۂ صد چاک سے کھینچا فانیؔ
دل میں کہتا ہوں، وہ کہتا ہے کہ پیکاں نکلا

پیکاں = تیر کی نوک

شاعر پہلے مصرع میں سوال کر کے دوسرے میں خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔ معشوق نے میرے سینے سے کوئی چیز کھینچ کر نکالی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ جو تیر دل میں پیوست تھا وہ نکالا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ دل ہی نکل گیا ہے۔ اس میں لطافت یہ ہے کہ پیکان عاشق کو دل کی طرح عزیز تھا کیونکہ وہ دل میں اس طرح پیوست تھا کہ جدائی ممکن نہ تھی۔

(۵)

زندگی کا کوئی پہلو ہی نہ تھا جو غم نہ تھا
ہوش کا سودا جنونِ عاشقی سے کم نہ تھا

سودا = جنون

زندگی کا کوئی پہلو غم سے خالی نہ تھا۔ ہم نے ہوش کی تمنا کی کہ شاید وہ ہمارے غم کا مداوا بن سکے مگر یہ تمنا بھی دیوانگی ہے کیونکہ ہوش کے عالم میں غموں کا احساس اور قوی ہو جاتا ہے۔

یوں نہ تھے محرومِ مرگِ ناگہاں بیمارِ عشق
وہ بھی دن تھے جب مزاجِ زندگی برہم نہ تھا

مرگِ ناگہاں = اچانک موت

وہ بھی ایک زمانہ تھا جب عشق کے بیماروں پر زندگی اتنی نامہربان نہ تھی اور مرگِ ناگہاں کی امید غموں کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی تھی۔ لیکن اب زندگی ہم پر نامہربان ہے کہ اذیتیں اٹھاتے ہیں مگر موت نہیں آتی۔

مجھ سے ہر جلوہ نے سیکھا امتیازِ قلب و سنگ
ورنہ حسنِ دوست کا آگے تو یہ عالم نہ تھا

قلب سے مراد مرکزِ شعور ہے جو انسان ہی کی خصوصیت ہے۔ اور سنگ سے وہ تمام اشیاء مراد ہیں جو شعور سے خالی ہیں۔

شاعر کا دعویٰ ہے کہ مجھ سے جلوہ ہائے حسن کو قلب اور سنگ میں امتیاز کرنا آیا ہے ورنہ مجھ سے پہلے اس کے جلوے امتیاز سے بیگانہ تھے۔ غالب کے اس شعر میں اسی امتیاز کی جانب طنزیہ اشارہ ملتا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دل کی قسمت ہی بری تھی ورنہ کوئے دوست میں
تھا کوئی ذرہ جو دل کے درد کا محرم نہ تھا

یوں تو کوئے دوست کا ایک ایک ذرہ ہمارے دل کے درد سے واقف تھا لیکن ہماری بدقسمتی کا اثر تھا کہ ہمارے دل کو کوچۂ یار میں بھی کوئی ہمدم اور ہمدرد نہ مل سکا۔

رسمِ خودداری سے گو واقف نہ تھی دنیائے عشق
پھر بھی اپنا زخمِ دل شرمندۂ مرہم نہ تھا

عشق فطرتاً نیاز اور سپردگی کا طالب ہے اور عشق کی دنیا میں خودداری ایک اجنبی چیز ہے پھر بھی ہمارا زخمِ دل سعیٔ درماں سے اس قدر بے نیاز تھا کہ کبھی مرہم کا احسان مند نہ ہوا۔

رفتۂ بیمِ خزاں تھی اس چمن کی ہر بہار
خندۂ گل تھا مگر بے گریۂ شبنم نہ تھا

رفتۂ بیمِ خزاں = خزاں سے خوف زدہ

گلستانِ جہاں میں ہر بہار کے ساتھ خزاں کا ڈر بھی لگا ہوا تھا اور حسنِ بہار کے ساتھ زوالِ حسن کا تصور بھی وابستہ تھا۔ ایک طرف پھولوں کی ہنسی تھی تو دوسری طرف شبنم کے آنسو خزاں کی یاد دلا رہے تھے۔

عشق کی منزل بھی تھی کیا بارگاہِ قلبِ دوست
کیا اب اتنا بھی اس آہِ نارسا میں دم نہ تھا

نارسا = نہ پہنچنے والی، ناکام۔

اگر ہماری آہِ نارسا محبوب کے دل تک نہیں پہنچتی یعنی اس پر اثر نہیں کرتی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اتنی گئی گزری ہے کہ عرش تک بھی نہ پہنچ سکے گی۔ یعنی آہ کا اثر اگر محبوب پر نہ ہوا نہ سہی وہ آسمان تک تو پہنچ سکتی ہے۔

دل میں فانی اک نہ اک ہنگامہ برپا ہی رہا
شوق تھا جب تک کسی کے شوق کا ماتم نہ تھا

ہمارا دل ہمیشہ کسی نہ کسی غم کی آماجگاہ بنا رہا ہے اور اس میں ہنگامے برپا ہوتے رہے ہیں۔ پہلے اس میں دوست سے ملنے کی تمنا جاگزیں تھی۔ اب اس تمنا کی ناکامی کا غم ہے۔ بقول میر:

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا   دم کے جانے کا نہایت غم رہا

(۶)

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا   ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

ہمارا دل جو بظاہر ایک مختصر اور اُجڑی ہوئی بستی کے مانند ہے۔ اپنے دامن میں اتنی وسعت رکھتا ہے کہ یہ دنیا بھی اس کی وسعتوں کے آگے ہیچ ہے۔ اس شعر میں شاعر غمِ عشق کی اہمیت و عظمت دکھانا چاہتا ہے کہ دیوانگانِ عشق کا دل ایک وسیع دنیا ہے کہ ساری کائنات اس کے ایک گوشہ میں سما سکتی ہے۔

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا   زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی ایک خواب کی طرح بے اصل و بے حقیقت اور دیوانے کے خواب کی طرح بے ربط و بے معنی ہے جس کو نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ سمجھا سکتا ہے۔ گونگے کا خواب محاورہ ہے یعنی ایسا خواب جو کسی دوسرے کو سنایا نہ جا سکے مگر فانی نے دیوانے کا خواب کہہ کر اس پر اور ترقی کی ہے کیونکہ گونگا خود تو سمجھ لیتا ہے، دیوانہ نہ آپ سمجھ سکے نہ دوسرے کو سمجھا سکے۔ تشبیہ نہایت مکمل ہے۔

حُسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

فانی نے اس شعر میں مسئلہ وحدت الوجود پر روشنی ڈالی ہے۔ عالم میں دوئی کا وجود نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ بہ ظاہر دنیا میں دوئی کا دھوکا ہوتا ہے لیکن دراصل یہ محبوب (محبوبِ حقیقی) ہی ہے جس نے عاشق کا بھیس بدل لیا ہے ورنہ حسن اور عشق دو جدا ہستیاں نہیں۔

دوسری جگہ اس خیال کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

عشق ہے پرتوِ حُسنِ محبوب
آپ ہی اپنی تمنا کیا خوب

کعبہ کو دل کی زیارت کے لیے جاتا ہوں
آستانہ ہے حرم میرے صنم خانے کا

شاعر اپنے دل کو صنم خانہ سے تعبیر کرتا ہے اس لیے کہ اس میں بُت (معشوق) نہیں۔ لیکن اس صنم خانہ کی عظمت کا یہ حال ہے کہ کعبہ بھی اس کا آستانہ ہے اور کعبہ کے سفر سے اس کا مقصد دراصل دل کی زیارت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل چونکہ مرکزِ تجلیاتِ الٰہی ہے اس لیے عرشِ الٰہی سے کم نہیں۔ کعبہ منزل نہیں صرف نشانِ منزل ہے۔

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

کونین = دونوں جہان

قصۂ غم کی تفصیل میں کون جائے۔ مختصراً یہ کہنا کافی ہے کہ دل رکھتا ہوں۔ دل کو اگر کسی نے سمجھ لیا تو گویا رازِ کونین کو سمجھ لیا۔

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

دنیا میں انسان کی زندگی کی حقیقت موت کے انتظار سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ شاعر اپنے تجربۂ زندگی کے حوالے سے کہتا ہے کہ میری تباہ حالی اب اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ زندگی بھی مجھے دنیا میں لا کر پچھتا رہی ہے اور میری موت کے لیے بہانے تلاش کر رہی ہے۔

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

اگر تم نے آبادی کو ویرانے میں بدلتے ہوئے نہیں دیکھا تو آ کر میرے غم کدے کو دیکھ لو کہ کیسا آبادِ گھر کس طرح اُجڑ گیا۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب تم آؤ گے تو تمھارے قدمِ ناز سے میرے گھر کا نقشہ ہی کچھ اور ہو جائے گا اور یہ ویرانہ آبادی سے بدل جائے گا۔

اب اسے دار پہ لیجا کے سُلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچّھا ترے دیوانے کا

دار = سولی

اس شعر میں منصور کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عشقِ الٰہی میں ایسا بے خود ہوا تھا کہ "انا الحق" (میں خدا ہوں) کہہ اُٹھا اور آخر اسی جرم میں سولی پر لٹکایا گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ اے ساقی تیرا یہ دیوانہ بھی محبت میں بہکنے لگا ہے اس کو بھی دار پر لے جا کر سلادے ایسا نہ ہو کہ یہ مستی میں رازِ حقیقت فاش کر دے۔

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشہ سے ملتا تو ہے پیمانے کا

شاعر نے دل کو شیشہ اور آنکھوں کو پیمانہ قرار دیا ہے جس طرح شراب پہلے شیشہ (صراحی) میں ہوتی ہے پھر اس سے جام میں ڈالی جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارا دل اشکِ خونیں بن کر آنکھوں تک پہنچ رہا ہے اس طرح شیشہ اور پیمانہ میں ایک ربط قائم ہو گیا ہے۔ مراد یہ کہ غمِ عشق اب سینے سے باہر آ کر سب پر ظاہر ہو رہا ہے۔

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لیے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

دیوانگانِ عشق کے لیے قید اور زنجیر کی ضرورت غزل کا معروف مضمون ہے۔ شاعر کو اس کے جنونِ عاشقی کے باعث زنجیروں میں باندھا گیا تھا۔ قید کی اذیت سے اس نے جان دے دی۔ جب اس کا جنازہ نکالا تو لاغری کے باعث زنجیروں میں چند ہڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وحدتِ حُسن کے جلووں کی یہ کثرت اے عشق   دل کے ہر ذرّہ میں عالم ہے پری خانے کا

پری خانہ = پرستان

وحدت و کثرت تصوّف کی اصطلاحیں ہیں۔ صوفیا کے نزدیک حقیقتِ مطلق صرف ایک ذاتِ واحد ہے۔ کائنات میں مظاہر کی یہ کثرت اسی ایک حقیقت کے مختلف جلوے ہیں ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوبِ حقیقی کے حسن کے جلوے اس قدر ہیں کہ دل کا ہر ذرّہ ان جلووں کے عکس سے پرستان نظر آتا ہے۔ شاعر کا عشق سے خطاب بہت معنی خیز ہے کیونکہ حُسن کا اپنی ذات سے عشق ہی اس کثرتِ جلوہ (ایجادِ عالم) کا سبب بنا۔

چشمِ ساقی اثرِ مے سے نہیں ہے گلرنگ   دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

گلرنگ = سُرخ

ساقی کی آنکھوں میں جو سُرخ ڈورے نظر آرہے ہیں یہ شراب کا اثر نہیں ہے بلکہ اس کی آنکھوں کے پیمانے میرے خون سے لبریز ہیں۔ مراد یہ کہ میرا خونِ ناحق رنگ لاکر رہا اور چشمِ ساقی بھی اس سے متاثر ہوگئی۔

لوحِ دل کو، غمِ الفت کو قلم کہتے ہیں   "کُن" ہے اندازِ رقم حُسن کے افسانے کا

کُن = ہو جا۔ اس سے تخلیقِ عالم کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے "کُن" کہتے ہی دنیا وجود میں آگئی۔ لوح سے لوحِ محفوظ مراد ہے، وہ تختی جس پر ہر چیز کی تقدیر لکھی ہوئی ہے۔

شاعر نے انسان کے دل کو لوح سے؛ عشق کو قلم سے اور حُسن کا جو نقش دل پر ہے اس کو لفظ "کُن" سے تعبیر کیا ہے۔ عاشق کا دل ایک تختی ہے جس پر محبت کے قلم سے افسانۂ حُسن لکھا گیا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے عاشق کا دل حسنِ ازل کے تمام رازوں کا امین ہے۔

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں   کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

دیر و حرم = مندر و کعبہ۔ مراد مذہبوں کے طریقے۔

ہم نے دیر و حرم دونوں کی بہت خاک چھانی لیکن دونوں میں سے کہیں بھی تیرے دیوانے کو جگہ نہ مل سکی۔ کیونکہ یہ ہوش والوں کی دنیا ہے جہاں رسمیات کی پابندی ہوتی ہے اور دیوانۂ عشق ان سے بے نیاز ہے۔

دیر و حرم میں بحث ہوئی دل کہاں رہے
آخر یہ فیصلہ ہوا بے خانماں رہے

کس کی آنکھیں دمِ آخر مجھے یاد آئی ہیں　　دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

مرتے وقت محبوب کی حسین آنکھیں جو شراب کے جام سے مشابہ ہیں ہم کو یاد آگئیں اور ان کے تصوّر سے ہمارا دل ایک چھلکتے ہوئے پیمانہ کی طرح بھر آیا ہے۔

کہتے ہیں کیا ہی مزہ کا ہے فسانہ فانیؔ　　آپ کی جان سے دور آپ کے مرجانے کا

محبوب نے فانیؔ کے مرنے کی اُڑتی سی خبر سنی ہے اس پر وہ خود فانیؔ سے گفتگو کرتا ہے۔ شعر میں طنز ہے خصوصاً "آپ کی جان سے دور" کا جواب نہیں ہو سکتا۔ جس کی خاطر عاشق جان سے جا رہا ہے، وہ اس کے مرنے کا ذکر کس مزے سے کرتا ہے۔

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانیؔ　　زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

مصیبت کی شدت میں لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو مر مر کے جی رہے ہیں۔ فانیؔ نے اپنے طرز استدلال کی ندرت سے اس محاورہ میں جان ڈال دی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر سانس جو سینہ سے نکلتی ہے گویا گزرے ہوئے لمحات کا جنازہ ہے اس لیے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ ہماری زندگی کا ہر ہر لمحہ موت سے دوچار ہے۔

(۷)

ہر دل کو تیرے غم نے مسلماں بنا دیا　　توفیقِ اضطراب نے ایماں بنا دیا

عشق میں تڑپنے کی توفیق ہر عاشق کا ایمان ہے اور ایمان مسلمان کی شان ہے

نوٹ: غزل ۷ میں غلطی سے دو غزلیں یکجا ہو گئیں۔

اسی بنا پر شاعر کہتا ہے کہ غمِ عشق نے ہر دل کو مسلمان بنادیا ہے۔

رگ رگ کو دردِ دل نے رگِ جاں بنا دیا   اس کفرِ ماسوا کو بھی ایماں بنا دیا

ماسوا = غیر حق۔ جس کے وجود کو ماننا عاشق کے نزدیک کفر ہے۔
رگِ جاں = وہ رگ جس کو کاٹنے سے موت واقع ہوتی ہے۔

شاعر کی مراد یہ ہے کہ دردِ عشق کی برکت سے اب ہر رگِ جسم رگِ جاں کی طرح اہم اور حساس ہو گئی ہے اور عشق کی بدولت کفر بھی ایمان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یعنی اپنی ہستی کا احساس (جو ایک طرح کا کفر ہے) ختم ہو کر صرف تو اور تیرا غم باقی رہ گیا ہے۔

شہ رگ یا رگِ جاں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ محبوب (حقیقی) کا مسکن و مقام ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں ہے کہ ہم تمھاری شہ رگ سے بھی نزدیک تر ہیں۔

جب درد کو امانتِ درماں ہوئی سپرد   درمانِ عشق کو غمِ درماں بنا دیا

درماں = علاج   غمِ درماں = علاج کی فکر

خدا نے جہاں درد پیدا کیا ہے وہاں اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔ البتہ عشق اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا علاج بھی فکرِ علاج سے کم اذیت کا باعث نہیں۔ درد کو امانتِ درماں سپرد ہونے میں یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ عشق خود ہی اپنا درماں بھی ہے اس لیے کسی اور درماں کی طلب غمِ درماں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

میری نگاہ معترفِ عجزِ خاک تھی   تیری نظر نے خاک کو انساں بنا دیا

معترف = اقرار کرنے والی   عجز = کم مائگی

میری نگاہوں کو اپنے خاکی وجود کی کم مائگی و عاجزی کا اعتراف تھا لیکن تیرا کرم کہ تو نے اپنی نگاہ سے سرفراز کر کے اس حقیر مشتِ خاک کو انسان بنا دیا۔ مراد یہ کہ باوجود خاکی ہونے کے انسان تمام کائنات سے افضل ہے۔ یہ فضیلت و شرف اسے محبوب (اللہ تعالیٰ) کی نگاہ نے بخشا ہے۔

جب اس نے غم سے پردہ اُٹھایا تو عشق تھا   جب دل کو بے نقاب کیا جاں بنا دیا

حیاتِ انسانی کا غم سے عبارت ہونا فانیؔ کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ غم کے مظاہر بے شمار ہیں لیکن ان تمام مظاہر کو وحدت اور معنویت عطا کرنے والا عشق ہے گویا غم کے پردے اُٹھ جانے پر عشق کی تجلّی نمودار ہوتی ہے۔ یہ انکشاف محبوب کی نظروں کا مرہونِ منّت ہے کہ اس نے جب عشق کا پردہ اُٹھا دیا تو غم کی صورت جلوہ گر ہوئی۔ اسی طرح دل جو جذبات کا مرکز تھا جب اس کی حقیقت بے نقاب ہوئی تو معلوم ہوا کہ جذبۂ عشق ہی عینِ زندگی ہے۔

کیفیتِ نگاہِ سرور آفریں نہ پوچھ ق
شبنم کو جس نے بادۂ عرفاں بنا دیا
ہر روئے گل کو جلوہ گہِ کیفِ صد بہار
ہر بوئے گل کو میکدۂ جاں بنا دیا

سرور آفریں = مستی پیدا کرنے والی
بادۂ عرفاں = شراب معرفت

ان دونوں اشعار میں نگاہِ حقیقت بیں کی کرشمہ سازی کا بیان ہے۔ انسان کو جو سرور و کیف مظاہرِ فطرت سے حاصل ہوتا ہے خارجی اشیاء کا مرہونِ منّت نہیں بلکہ اس کی اپنی نگاہِ سرور آفریں کا کرشمہ ہے۔ شاعر اپنی نگاہ کی اس سرور آفرینی پر سر دھنتا ہے کہ اس کی بدولت شبنم کے قطرے شرابِ معرفت کے جام بن جاتے ہیں۔ ہر پھول میں سیکڑوں بہاروں کی رنگینی اور کیف مل جاتے ہیں۔ ہر پھول کی خوشبو اس کی روح کو مہکا کر اسے شرابِ حقیقت سے سرشار کر دیتی ہے۔

غم کو بنا کے محرمِ اسرارِ کائنات
ہر نقشِ غم کو پیکرِ انساں بنا دیا

محرمِ اسرار = بھیدوں کا جاننے والا۔

شاعر کے نزدیک غم زندگی و کائنات کا حقیقی راز داں ہے یعنی غم کے بغیر کائنات کے رازوں سے آگاہ ہونا ممکن نہیں اور غم کی یہ دولت انسان ہی کے حصہ میں آئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہستئ انسان دراصل ایک نقشِ غم ہے جو پیکرِ انسان میں صورت پذیر ہو گیا ہے۔

دے کر دلِ فسردۂ فانیؔ کو سوزِ عشق
ہر آرزو کو شعلہ بداماں بنا دیا

شعلہ بداماں = آگ سے بھرا ہوا۔

فانی کا دل جو کہ افسردگی کی آماجگاہ تھا محبوب نے اسے عشق کی گرمی اور تڑپ دیکر اس کی آرزوؤں کو بھی سوزش و اضطراب کا حامل بنا دیا۔

(۸)

کسی کے ایک اشارہ میں کس کو کیا نہ ملا   بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

محبوب کی نگاہوں کا ایک اشارہ عاشق کی موت کا سبب بن گیا لیکن یہ موت اس کے لیے عینِ زندگی ہے۔ گویا اس کے ایک اشارہ نے عاشق کو ابدی زندگی عطا کردی اور موت جو اس کی جان لینے کے لیے بہانہ کی تلاش میں تھی اس کو یہ بہانہ مل گیا۔

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا   بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

ہمیں فطرت سے ایسا اذیت پسند دل ملا کہ اس کو زندگی کی لذت بھی صرف اس لیے گوارا تھی کہ اس کے ساتھ مرگ کی تلخی بھی شامل ہے۔

ع : نہ ہونا مرنا تو جینے کا مزا کیا

دبی زباں سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ   بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

قاعدہ ہے کہ بیمار کے سامنے اس کی خراب حالت کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ یہ اس کی حالت کے اور بگڑنے کا سبب بن سکتا ہے۔ اسی لیے چارہ ساز بیمارِ محبت کا حال آہستہ آہستہ اس کے تیمارداروں کو بتا رہا ہے لیکن وہ اپنی حالت خود سمجھ رہا ہے اسی لیے کہتا ہے کہ تجھے جو کچھ کہنا ہے زور سے کہہ دے اور حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہ کر۔ شعر میں اس صورت حال کی بڑی سچی مصوّری ہے۔

خدا کی دین نہیں ظرفِ خلق پر موقوف   یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

ظرفِ خلق = مخلوق کی صلاحیت

خدا جب کسی کو نوازتا ہے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ وہ اس کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ اس کی بخشش کی مثال یہ ہے کہ دل کو اس نے غم جیسی گرانبہا دولت عطا کر دی۔

دعا گدائے اثر ہے گدا پہ تکیہ نہ کر
کہ اعتمادِ اثر کیا، ملا ملا نہ ملا

دعا پر بھروسہ کرنا بیکار ہے کیونکہ دعا خود اثر کی دست نگر ہے اور جو دوسرے کا محتاج ہو وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ تاثیر کا کیا بھروسہ کہ دعا کو تاثیر ملے یا نہ ملے۔

ظہورِ جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار
کوئی اجل کی طرح دیر آشنا نہ ملا

ظہورِ جلوہ = محبوب کے جلووں کا اظہار
دیر آشنا = دیر میں دوستی کرنے والا

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اس زندگی میں دوست (محبوب حقیقی) کے جلووں کو دیکھنا ممکن نہیں۔ موت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو محبوب سے ملا سکتا ہے مگر موت اس قدر دیر آشنا ہے (یعنی جب موت کی تمنا کی جاتی ہے تو وہ بہت انتظار دکھاتی ہے) اس لیے محبوب کے جلوہ کو دیکھنے کے لیے ایک طویل مدت (ساری زندگی کا عرصہ) چاہیے۔

تلاشِ خضر میں ہوں روشناسِ خضر نہیں
مجھے یہ دل سے گلہ ہے کہ رہنما نہ ملا

خضرؑ = ایک پیغمبر جو بھولے بھٹکوں کو راہ دکھاتے ہیں۔
روشناس = پہچاننے والا

میں خضر کی تلاش میں ہوں کہ وہ مجھے میری منزلِ مقصود تک پہنچا دیں لیکن میں اس تلاش میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں مجھے اپنے دل سے شکایت ہے کہ اس نے رہنما تک پہنچنے میں مجھے مدد نہ دی۔ دل سے گلہ ہونے میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی ہے کہ حقیقتاً رہنمائی کرنا تو دل کا کام تھا۔ روشناس کے لفظ میں یہ نکتہ ہے کہ ممکن ہے خضرؑ پاس سے گذرے ہوں اور میں انھیں پہچان نہ سکا ہوں۔

نشانِ مہر ہے ہر ذرّہ ظرفِ مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

مہر = سورج مراد محبوب
ظرف = جو شے کسی چیز کو اپنے اندر سمو لے

اگرچہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ خدا کے نور سے روشن ہے یعنی اس کے وجود کی طرف اشارہ کر رہا ہے لیکن کسی چیز کو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی ہمارا مطلوب ہے۔ اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ کوئی شے اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس میں تجلّیٔ الٰہی کا نشان نہ ملتا ہو لیکن

چونکہ ذاتِ مطلق محدود نہیں اس لیے ہمیں کہیں خدا نہ مل سکا۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عینِ اوست
لیکن نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات   وہ رہ گذر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

میری زندگی کو کبھی مقصد زندگی نصیب نہ ہوا یا میری زندگی ایسی ہے جس کے سامنے کوئی مقصد نہیں۔ ہماری مثال ایسی رہگذر کی سی ہے جو نام کی رہگذر ضرور ہے مگر اس پر کبھی کسی کا گذر نہ ہوا۔

وہ نامرادِ اجل بزمِ یاسؔ میں بھی نہیں   یہاں بھی فانیؔ آوارہ کا پتا نہ ملا

نامرادِ اجل = بدنصیب جس کی آرزوئے مرگ بھی پوری نہ ہو۔
یاسؔ = یاسؔ عظیم آبادی، فانیؔ کے ایک دوست۔ مایوسی

فانیِ آوارہ کو ہر جگہ تلاش کیا۔ اُمید تھی کہ وہ بزمِ یاس میں ہوگا مگر وہاں بھی اس کا پتہ نہ مل سکا۔ اس میں پہلو یہ ہے کہ یاس سے واسطہ تو اس کو ہو جس کے دل میں کبھی کوئی آرزو رہی ہو۔ یہاں تو ایک اجل کی آرزو تھی سو وہ بھی پوری نہ ہوئی اس لیے بزمِ یاس میں بھی فانیؔ کا ہونا معلوم۔ لفظ "یاس" سے شاعر نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ آوارہ اس لیے کہا کہ امید و یاس دونوں مقامات سے آگے گذر چکا ہے۔

(۹)

خود برق ہو اور طورِ تجلّا سے گذر جا   خود شعلہ بن اور وادئ سینا سے گذر جا

برق = وہ تجلّی جو حضرت موسیٰ کو طور پر نظر آئی۔ شعلہ سے بھی وہی مراد ہے۔
وادئ سینا = وہ وادی جہاں کوہِ طور ہے اس کو وادئ ایمن بھی کہتے ہیں۔

عشق کے اس درجہ پر پہنچ جا کہ تجھے محبوب کا جلوہ دیکھنے کے لیے وادئ سینا یا طور کی حاجت نہ رہے بلکہ خود تجھ میں برقِ تجلّی کی شان پیدا ہو جائے۔ بقول اقبالؔ:

تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم   اپنی ہستی سے عیاں شعلہ سینائی کر

بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ　　آئنہ اٹھا، حسنِ خود آرا سے گذر جا

عام طور سے صوفی شعرا اپنے وجود نیز کائنات کی تمام اشیاء کے وجود کو محبوب حقیقی کا آئنہ قرار دیتے ہیں اور اس آئنہ میں محبوب کے حسنِ خود آرا کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ فانی اس سے بھی زیادہ بلند نظری کی تعلیم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مشاہدۂ حقیقت میں خود نگری کا راستہ اختیار کرنا بھی ماسوا کے وجود کا اقرار کرنے کے مترادف ہے۔ تیرے وجود کی حقیقت اور وجود حقیقی میں کوئی غیریت نہیں ہے لیکن اس راز کی تہ تک پہنچنے کے لیے ماسوا کے آئینوں یا واسطوں کی ضرورت نہیں بلکہ ان سے بالاتر ہو کر ہی اس کے حسن کا نظارہ ممکن ہے۔ اس شعر میں وحدت الوجود کے نظریہ کی ترجمانی ہے۔

یہ نقشِ قدم ہیں رہ بے منزل دل میں　　فردا تو ہے فردا پسِ فردا سے گذر جا

فردا = کل　　پسِ فردا = پرسوں

یہاں دل کو صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق لطیفۂ ربانی یا عرش الہٰی سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا دل زمان و مکاں کی قیود سے ماورا اور منزل کے تعین سے بے نیاز ہے۔ فردا (کل) سے قیامت اور پسِ فردا سے وہ زمانہ مراد ہے جو قیامت سے بھی ماورا ہے۔ فانی کے نزدیک فردا و پسِ فردا بھی عشق کی آخری منزل نہیں بلکہ یہ صرف دل کے سفر کی راہ کے نشانات ہیں۔

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک　　اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گذر جا

سعیٔ تماشا = دیکھنے کی کوشش

عاشق جو محبوب کے جلوؤں کو دیکھنے کی خواہش کرتا ہے اور اس کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم محبوب کا جلوہ خود اسی کے حسنِ نظر کا دوسرا نام ہے اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لے تو پھر اس سعیٔ تماشا سے بے نیاز ہو جائے جس کا حاصل اپنی ہی نظروں کا تماشا ہے۔

ذرہ میں ہے گم وسعتِ صد عالمِ صحرا　　ذرہ کو سمجھ وسعتِ صحرا سے گذر جا

تو جو اپنی وحشت کی گرم جولانی کے لیے صحرا کا متلاشی ہے اس کی بجائے ذرہ کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر کیونکہ ہر ذرہ میں سیکڑوں صحراؤں کی وسعتیں پوشیدہ ہیں۔ ذرہ سے مراد مظہر ہے اور صحرا سے ذاتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ واضح رہے کہ فانی نے صد صحرا نہیں کہا صد عالم صحرا کہا ہے جس سے مراد تجلیات الٰہی ہیں۔

کر قطع نظر وسوسۂ قلب و نظر سے
ہر جلوۂ پوشیدہ و پیدا سے گذر جا

وسوسہ = گمان، شک
پیدا = ظاہر

نگاہ اور قلب کے ذریعہ انسان جن کیفیات کا مشاہدہ یا احساس کرتا ہے ان کی حیثیت شاعر کی نگاہ میں وسوسوں سے زیادہ نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اپنے وجود کو قلب و نگاہ کے وسوسوں اور شکوک سے بلند کر اور خود کو عشق و معرفت کی اس منزل پر پہنچا دے جہاں تجلیات سے گذر کر طالب خود مظہرِ تجلیات بن جائے۔

کعبہ ہو کہ ہو دَیر وہ دنیا ہو کہ عقبیٰ
ہر منزل و ہر جادہ و ہر جا سے گذر جا

عقبیٰ = آخرت
جادہ = راستہ

تو عشق کا راہی ہے۔ تیری منزل کعبہ ہے نہ دیر۔ دنیا ہے نہ عقبیٰ۔ یہ سب تیرے نشانِ راہ ہیں اصل منزل ان سب سے آگے ہے۔

اے عزم خبر ہوش کے پردوں کو الٹ دے
اے ذوقِ نظر محملِ لیلا سے گذر جا

محبوب کو حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ عاشق کی آگہی اور ہوش ہے۔ اگر تو اس کی معرفت کا خواہاں ہے تو ہوش کو خیرباد کہہ اور وہ ذوقِ نظر پیدا کر کہ محملِ لیلا کی طرف بھی نگاہ نہ اٹھے۔ ظاہر ہے کہ جب تک عاشق محبوب کے محمل کا جویا ہے اس کو احساسِ دوئی باقی ہے۔

یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے
دنیا ہی میں رہنا ہے تو دنیا سے گذر جا

بقا حاصل کرنے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ سالک دنیا میں رہتے ہوئے اس کے

بندھوں سے خود کو آزاد رکھے اور مقصد کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی دھن میں خود کو بھی فراموش کر دے۔

اُٹھ بزمِ تحیّر سے وہ کہتے ہیں ادھر آ
جا اور حدِ امکانِ تمنّا سے گذر جا

عارفین کے نزدیک عشق کی آخری حد یا منزل حیرت ہے۔ مگر شاعر اس پر قانع نہیں اور اپنے دل سے کہتا ہے کہ جب محبوب خود جلوؤں کی دعوت دیتا ہے تو کہاں کی حیرت اور کیسی حد دو۔ اُٹھ اور تمنّا کی تمام حدوں کو پار کر کے اس محبوبِ حقیقی تک پہنچ جا۔

لے دیدۂ دل کھول وہ کہتے ہیں ادھر دیکھ
دیکھ! اور حدِ آدابِ تماشا سے گذر جا

حسن خود دعوتِ نظّارہ دے رہا ہے اور اس نے اپنے جلوؤں کو عام کر دیا ہے۔ دل کی آنکھوں سے اسے دیکھ اور ظاہری قیود و رسوم سے آزاد ہو جا۔ یہ شعر بھی پہلے شعر سے ربط رکھتا ہے۔

کشتی کا سہارا ہی تو گرداب ہے فانیؔ
دریا ہی میں تو ڈوب کے دریا سے گذر جا

گرداب = بھنور

انسان کے لیے ماسوا کا سہارا تباہی کا سبب ہوتا ہے جس میں پھنس کر وہ اپنی منزلِ مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔ زندگی کے سمندر سے پار اُترنے کی صورت یہ ہے کہ بے دھڑک اس میں کود کر اس کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرے۔ موجِ بلا اور گرداب کا خطرہ اسی وقت تک رہتا ہے جب تک دریا کو عبور کرنے والا کشتی کے سہارے کا محتاج رہتا ہے۔ ایک اور شعر میں فانیؔ نے یہی بات کہی ہے

اس بحرِ بے کراں میں ساحل کی آرزو کیا
کشتی کی جستجو کیا! ڈوب اور پار اُتر جا

(۱۰)

ہل گیا زنداں بُرا ہو نالۂ شبگیر کا
چونک اُٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

نالۂ شبگیر = پچھلے پہر کا نالہ

میں نے رات جو نالے کیے تو زنداں میں ہلچل پڑ گئی اور زنجیر جو میرے پیروں میں باندھی گئی تھی اس کے حلقے بھی اس شور سے چونک پڑے۔ زنجیر کے حلقے کو آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر
کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا

میری تدبیریں کبھی کامیاب نہ ہوئیں اور ہمیشہ تقدیر کی دست نگر رہیں۔ خدایا اب تو ان کو اس حالت سے آزاد کر کے ان کی مشکل حل کر دے۔ اس شعر میں اپنی تدبیروں کی ناکامی اور تقدیر کے سامنے اپنی بے بسی کی طرف اشارہ ہے۔

میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہِ خلش
یاد ہے گم ہو گیا تھا کوئی پیکاں تیر کا

خلش = چبھن پیکاں = تیر کی نوک

محبوب تجاہل سے کام لے کر عاشق سے اس کی بے چینی کی وجہ دریافت کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے اس کی وجہ آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ خود یاد کیجیے کہ کبھی آپ کے تیر کا کوئی پیکاں غائب ہوا تھا (وہی ہماری خلش کا باعث بنا ہوا ہے)۔

عشق کا بھی کیا تصرف ہے کہ دل اب دل نہیں
آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا

تصرف = استعمال

جو دل عشق کے تصرف میں آتا ہے دل نہیں رہتا بلکہ غم و اندوہ کا مرقع بن جاتا ہے۔

آپ کی آزردگیٔ بے سبب بھی خوب ہے
کیا مزے کا ہے تقاضا عذرِ بے تقصیر کا

عذرِ بے تقصیر = بغیر قصور کے معذرت طلب کرنا۔

ہم نے کوئی قصور نہیں کیا مگر محبوب کا اصرار ہے کہ ہم معذرت پیش کریں اور اسی لیے وہ ہم سے بے وجہ خفا ہے۔

کس نظر سے اُس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف
کانپ اٹھا ہر ذرّہ میری خاکِ دامن گیر کا

دامن گیر ہونا = دامن پکڑنا، دادخواہ ہونا

محبوب نے عاشق کو خاک میں ملا دیا۔ اس کی خاک دادخواہی کے لیے محبوب کے دامن سے لپٹ گئی ہے لیکن اس کو یہ بھی ناگوار ہے اور وہ ایسی قہر آلود نگاہوں سے اپنے دامن کی طرف دیکھتا ہے کہ اس کی نگاہ کے عتاب کے اثر سے عاشق کی خاک کا ہر ذرہ کانپ اٹھتا ہے۔ شعر سے یہ اظہار مقصود ہے کہ ہم تو اس کی خاطر خاک ہو گئے مگر اس پر کوئی اثر نہیں۔

برق کو اب کیا غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا
جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا

خرمن - کھلیان

بجلیوں کو صرف مجھ سے دشمنی تھی۔ انھوں نے خرمن میں سے میری قسمت کا جو بھی تھا جلا دیا۔ اب انھیں کوئی پروا نہیں کہ کیا رہ گیا کیا جلا۔

فکرِ راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

راحت و آرام سے محرومی ہمارا مقدر تھی۔ جب تک ہم آرام کی تلاش میں سرگرداں رہے وہ ہاتھ نہ آیا لیکن جب ہم نے اس کی فکر اور تلاش چھوڑ دی تو آرام مل گیا یعنی حصولِ راحت کی تگ و دو سے چھٹکارا نصیب ہونا ہی باعثِ راحت بن گیا گویا جو چیز تدبیر سے حاصل نہ ہو سکی تقدیر سے مل گئی۔ یہ ایک نیچرل حقیقت بھی ہے اور بہ ظاہر ایک دلچسپ PARADOX بھی۔

نامرادی حد سے گذری حالِ فانیؔ کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

فانیؔ کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اس کی نامرادی حد سے گذر چکی ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ ہر ہر سانس کے ساتھ آہوں کا جنازہ نکلتا ہے۔ سانس زندگی کی علامت ہے مگر فانیؔ کی سانس آہ بے تاثیر کا جنازہ بن کر نکلتی ہے اور اس میں زندگی کا شائبہ تک نہیں۔

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

(۱۱)

رازِ دل سے نہیں واقف دلِ ناداں میرا
تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا

عرفاں = شناخت، پہچان

میرا دل اب تک خود اپنی حقیقت کو نہیں سمجھ سکا ہے اور اپنے کو سمجھنا تجھے سمجھنے سے بھی دشوار تر نکلا۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان کے لیے سب سے نزدیک خود اس کی ذات ہے۔ اس بنا پر اس کو سمجھنا آسان ہوگا لیکن شاعر کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ مغرب کے فلسفی ڈیکارٹ نے یہ کہہ کر کہ "میں سوچتا ہوں اس لیے میں موجود ہوں" وجود انسانی کا اعلان کیا تھا لیکن یہ بھی محض انا کے وجود کا اعلان تھا۔ اس کا عرفان پھر بھی ممکن نہ ہو سکا۔

اُڑ چلے کیوں میری وحشت کے بکھرے ہوئے تار
کس کے دامن سے اُلجھتا ہے گریباں میرا

اُڑ چلنا = ہوا میں اڑنا، مغرور ہونا۔

ہم نے وحشت میں جو اپنے گریباں کو چاک کر دیا تھا اس کے تار اُڑ رہے ہیں۔ یہ کس کے دامن تک پہنچنے کا شوق ہے جو ان کو کشاں کشاں لیے جا رہا ہے۔ اُڑ چلنے میں ایک مفہوم مغرور ہونے اور اترا جانے کا بھی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میرا

چاک گریباں کس کے دامن سے الجھا ہے (اس سے وابستہ ہوا ہے) جو اس قدر مغرور ہے۔

جلوۂ آتشِ پنہاں جسے غم کہتے ہیں
دل ہوا بجھ کے وہی شعلۂ عریاں میرا

میری روح میں جو سوزِ عشق پوشیدہ تھا اس کا اظہار غم کی صورت میں ہوا۔ اب وہی شعلۂ عریاں (غم) بجھ کر میرا دل بن گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آتشِ غم نے بجھ کر دل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ فانیؔ کے عقیدے میں دل غم ہی کا ایک نام ہے۔ دوسرے مصرع میں تعقید ہے جس نے شعر کو بے لطف بنا دیا ہے۔

کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو
بڑھ چلا ہے میرے دامن سے گریباں میرا

موسمِ بہار میں عاشق کا جنون بڑھ جاتا ہے اور وہ عالمِ جنوں میں اپنے گریبان کو چاک کر دیتا ہے۔ فانیؔ کہتے ہیں کہ شاید پھر بہار آنے کو ہے اسی لیے میرا گریبان دامن کی حدود کو بھی پار کر رہا ہے۔ شعر میں لطیف اشارہ یہ ہے کہ عاشق بہار و خزاں سے اس درجہ بے نیاز ہے کہ اس کی آمد کی اطلاع اسے صرف اپنے چاکِ گریباں سے ملتی ہے۔

میرؔ کہتے ہیں:
کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

کھول دے رازِ فریبِ غم و راحت نہ کہیں
خندۂ عیش پہ یہ گریۂ حیراں میرا

خندۂ عیش = اطمینان و راحت کی ہنسی   گریۂ حیراں = گریہ جو حیرت کا نتیجہ ہے۔

شاعر جو خوشی و غم کی ماہیت سے واقف ہے اور دونوں کو بے اصل خیال کرتا ہے جب لوگوں کو عیش میں ہنستے دیکھتا ہے تو ہنسی کے انجام کے خیال سے جیران ہو کر رونے لگتا ہے کہ یہ اس عیش ناپائدار پر خوش ہیں۔ مگر ساتھ ہی اس کو یہ خدشہ بھی ہے کہ کہیں اس کے رونے سے غم و مسرت کا یہ راز فاش نہ ہو جائے اور دنیا والوں کے ہاتھ سے یہ عارضی

دل بہلاوے کا سامان بھی جائے۔ فانی کا شعر ہے:

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حال انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسم، یہ شادابی کیا کہیے

فطرتِ عشق کی آزاد اداؤں کو تو دیکھ
وسعتِ عالمِ تخئیل ہے زنداں میرا

عشق کی فطرت آزاد ہے۔ اسی آزاد فطرتی کا نتیجہ ہے کہ عاشق کو عالمِ خیال کی وسعت بھی اپنے جنون کی جولانی کے لیے زنداں کی طرح تنگ معلوم ہوتی ہے۔ غالب کو تو صرف عالمِ امکاں کی تنگی کا شکوہ تھا فانی ان سے بھی آگے ہیں اور عالمِ تخئیل کو بھی اپنے عشق کی وسعت کے آگے ہیچ جانتے ہیں۔ غالب کا شعر ہے:

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا　　ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

آ، دمِ نزع اور اک وعدۂ فردا بھی سہی
جان کے ساتھ نکل جائے نہ ارماں میرا

وقتِ آخر عاشق کو محبوب کی دید کا ارمان ہے جس کی وجہ سے دم آنکھوں میں اٹکا ہوا ہے۔ اگر وہ آیا تو دید کا ارمان اور جان دونوں ساتھ نکل جائیں گے۔ مگر یہ بات معشوق کو پسند نہیں۔ وہ تو چاہتا ہے کہ عاشق اسی طرح سسکتا رہے۔ اس لیے عاشق کہتا ہے کہ لو میں تمھیں ترکیب بتاتا ہوں۔ آج دمِ نزع آؤ اور کل کے ملنے کا وعدہ کر جاؤ تاکہ اس وعدے کے ایفا کے انتظار میں ہم اسی طرح تڑپتے رہیں۔ جہاں تم نے اور جھوٹے وعدے کیے ہیں ایک اور سہی۔ یہ تکرار شاعرانہ ہے۔

چشمِ تر حاملِ آثارِ جنوں ہے شاید
کھو گیا ہے اسی دریا میں بیاباں میرا

اس شعر میں اپنے آنسوؤں کی طغیانی کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ عموماً جنون کے جوش کا اظہار بیاباں میں ہوتا ہے لیکن میرا بیاباں میرے آنسوؤں کے سیلاب میں غرق

ہو گیا ہے اور اب میری رونے والی آنکھیں ہی میرے جنون کا ثبوت ہیں۔

(۱۲)

یہ کس قیامت کی بے کسی ہے نہ میں ہی اپنا نہ یار میرا
نہ خاطرِ بے قرار میری، نہ دیدۂ اشکبار میرا

اشکبار = آنسو بہانے والا

ہماری بے کسی کا یہ عالم ہے کہ کوئی ہمارا ساتھی نہیں۔ ہمیں نہ اپنی ذات پر اختیار ہے نہ محبوب پر۔ انتہا یہ ہے کہ ہمارا دلِ بے تاب اور آنسو بہانے والی آنکھیں بھی اپنے بس میں نہیں ہیں۔

نشانِ تربت عیاں نہیں ہے، نہیں کہ باقی نشاں نہیں ہے
مزار میرا کہاں نہیں ہے، کہیں نہیں ہے مزار میرا

اگرچہ ہماری قبر کا نشان مٹ چکا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری ہستی کا نشان بھی مٹ گیا ہے۔ ہماری کوئی یادگار نہ ہوتے ہوئے بھی دنیا میں ہر جگہ ہماری یادگاریں موجود ہیں۔ یعنی ہمارا عشق زمانہ کو یاد ہے۔ فانی کے یہاں اس اعتماد کا اظہار کئی جگہ ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

میں ہوں فانی صحیفۂ باقی
حرفِ بے معنیٔ فنا قسم

وصال تیرا خیال تیرا جو ہو تو کیوں کر نہ ہو تو کیوں کر
نہ تجھ پہ کچھ اختیار دل کا نہ دل پہ کچھ اختیار میرا

تیرا ملنا یا تیرے خیال کو دل سے نکالنا دونوں باتیں ناممکن ہو گئی ہیں۔ تجھ پر دل کا بس نہیں چلتا ہے جو تیرے وصال کی صورت پیدا ہو اور نہ دل پر ہمارا ہی قابو ہے کہ تیرے خیال کو اس سے نکال دیں۔

نگاہِ دل دوز کی دہائی، جمالِ جاں سوز کی دہائی
رہِ محبت میں غم نے لوٹا شکیب و صبر و قرار میرا

دل دوز = دل کو چھید ڈالنے والی
جاں سوز = جان جلانے والا
شکیب = صبر

ہم نے اپنا ضبط و صبر و قرار جو محبوب کی نگاہ اور حسن کی امانت کے طور پر سنبھال کر رکھا تھا اُسے غموں نے لوٹ لیا۔

میں دردِ فرقت سے جاں بہ لب ہوں تمھیں یقینِ وفا نہیں ہے
مجھے نہیں اعتبار اپنا، تمھیں نہیں اعتبار میرا

جاں بہ لب = ہونٹوں پر جان ہونا، قریب المرگ

ہم تمھاری محبت میں قریب مرگ ہو گئے ہیں پھر بھی تمھیں ہماری وفاؤں کا یقین نہیں۔ ہماری زندگی کا بھروسہ نہیں کہ کب ختم ہو جائے مگر تمھیں ہم پر اعتبار نہیں اور ہماری جاں کنی کو بہانہ ہی سمجھے ہو۔

قدم نکال اب تو گھر سے باہر کہ دم بھی سینہ سے سہل نکلے
دکھا نہ اب انتظار اپنا، لحد کو ہے انتظار میرا

عشق میں ہم لب گور پہنچ چکے ہیں اور قبر ہمارا انتظار کر رہی ہے لیکن ہمارا دم تمھارے دیدار کی تمنا میں اٹکا ہوا ہے۔ اب تو زیادہ انتظار نہ دکھا اور گھر سے جلد نکل کر اپنے دیدار سے عاشق کو شاد کر تاکہ جان آسانی سے نکلے۔

سنا ہے اٹھا ہے اک بگولہ جلو میں کچھ آندھیوں کو لے کر
طوافِ دشتِ جنوں کو شاید گیا ہے فانی غبار میرا

جلو میں لے کر = ساتھ لے کر

لوگ کہتے ہیں کہ ایک بگولہ آندھیوں کو ساتھ لے کر اٹھا ہے۔ شاید یہ فانیؔ کی خاک ہے جو دشت جنوں کے طواف کو گئی ہے۔ مراد یہ کہ مرنے کے بعد ہماری خاک میں بھی وہی بے قراری ہے۔ یاسؔ کا شعر ہے:

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولہ
مرنے یہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گی

(۱۳)

تو اور درِ جاناں! مگر اپنی سی تو کر جا   قسمت کو رسائی نہیں منظور مگر جا

شاعر اپنے سے مخاطب ہے کہ اگرچہ تو درِ جاناں تک پہنچنے کے لائق نہیں ہے اور قسمت کو بھی وہاں تک تیری رسائی منظور نہیں مگر پھر بھی اپنی سی کوشش تو کر دیکھ ۔

کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی (رومی)

ہستی و فنا، راحت و ایذا سے گذر جا   جب منزلِ دل سامنے آ جائے، ٹھہر جا

راہِ محبت کے مسافر موت زندگی، غم و خوشی کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ نہ ان رکاوٹوں سے اپنی منزل کھوٹی کرتے ہیں۔ ان کی منزلِ مقصود دل (عرفانِ دوست) ہے اس لیے سرحدِ دل پر جا کر ہی دم لیتے ہیں۔

بھر لے نگہِ آخرِ بے رنگ میں ہر رنگ   دنیا کو بھی لیتا ہوا دنیا سے گذر جا

دمِ نزع اپنی بے نور نگاہِ واپسیں میں دنیا کی ساری دلکشیوں اور رنگینیوں کو سمو لے اور دنیا کے حسن کو اس طرح اپنی نگاہ کا جز و بنا لے کہ دنیا سے گذرنے کا کوئی غم نہ ہو۔ یا دیکھنے والے تیری حسرت بھری نگاہوں سے تیری زندگی کی داستان پڑھ لیں۔

خالی لیے بیٹھا ہوں تری بزم میں ساغر   مے میرے مقدر میں نہیں، زہر ہی بھر جا

میں تیری بزم میں خالی جام لیے بیٹھا رہوں یہ تیری توہین ہے۔ اگر میرے حصّے کی شراب تیرے یہاں نہیں تو میرے جام کو زہر سے ہی بھر دے کہ تیرے ہاتھ سے وہ بھی پینے کو تیار ہوں۔

ہے موت ہی اک زندگئ دل کا سہارا   جینے کی جو ایسی ہی تمنّا ہے تو مر جا

شاعر کے نزدیک دراصل زندگی کا انحصار موت پر ہے اس لیے وہ موت کو دل کا سہارا قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دل کی زندگی (حقیقی زندگی) کو صرف موت کا آسرا ہے اگر زندگی کی خواہش ہے تو موت سے ہم کنار ہو جاؤ۔ مراد یہ کہ شاعر اوّل تو جینے کا

آرزومند نہیں اور جینا بھی چاہتا ہے تو موت کے وسیلے سے۔

سرکارِ محبت میں خبر بے ادبی ہے
اے نشۂ دیوانگیٔ ہوش، اُتر جا

خبر = بے خبری کی ضد۔ یعنی احساسِ خودی

شاعر نے ہوش کو دیوانگی کا نشہ قرار دیا ہے "نشۂ دیوانگیٔ ہوش" بڑی معنی خیز اور نئی ترکیب ہے۔ دنیا والوں کے نزدیک خبر (ہوش) فرزانگی کی علامت ہے اور محبت دیوانگی کی۔ مگر شاعر اس کے برعکس خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ محبت میں ہوش میں رہنا بے ادبی ہے اس لیے ہوش کو وہ دیوانگی کے نشہ (از خود رفتگی) سے تعبیر کرتا ہے اور اس کو خیرباد کہنا چاہتا ہے۔

اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا
اے زلفِ سیہ ماتمِ فانی میں بکھر جا

فانی ایک عمر شبِ ہجر کا قدردان رہا گویا اس کی پرستش کرتا رہا۔ اس کی اس وفاداری کا تقاضا ہے کہ اب محبوب اس کے ماتم میں اپنی زلفوں کو بکھیر دے۔ زلفِ سیاہ اور شبِ ہجر کی مناسبت ظاہر ہے۔

(۱۴)

قربانِ عشق، موت بھی آئی تو کیا ہوا
اس تیرِ بے خطا کا نشانہ خطا ہوا

تیرِ بے خطا سے موت کے تیر کی طرف اشارہ ہے جس کا وار خالی نہیں جاتا۔ عشق میں مرنا عین زندگی ہے لہٰذا عاشقوں کو موت بھی آئی تو زندگی کا پیام لے کر۔ عشق کی کرامت کے قربان جائیے کہ اس نے موت کے تیرِ بے خطا کو بھی بے اثر بنا دیا۔

کیوں خونِ دل لگی ہی رہے گی جگر میں آگ
اے ننگِ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا

عشق کی بدولت دل وجگر میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ عاشق کی تمنا ہے کہ اس طرح سلگنے کی بجائے اس کا دل ایک ساتھ خون ہو جائے اور اس کے اثر سے یہ آگ بھی بجھ جائے کیونکہ اس طرح گھل گھل کر زندگی گزارنا عاشقی کے لیے باعثِ ذلت ہے۔

ننگِ عاشقی خونِ دل کو کہا ہے۔

قاتل سنبھل کہ یہ نگہِ واپسیں نہیں
خنجر ہے میرے دل کے لہو میں بجھا ہوا

نگہِ واپسیں = آخری نظر

عاشق نے زخمی ہو کر جو آخری نگاہ محبوب کے دل پر ڈالی ہے وہ نگاہ نہیں بلکہ اس کے دل کے خون میں بجھا ہوا خنجر ہے جو محبوب کے دل میں چبھ کر ہمیشہ خلش پیدا کرتا رہے گا۔ مرنے والے کی حسرت زدہ اور شکایت آمیز نظروں کے لیے بڑی موزوں تشبیہ ہے۔

اے جذبِ بیخودی ترے قربان جائیے
پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈھتا ہوا

عاشق نے اپنے کو عشق میں فراموش یا گم کر دیا ہے۔ اس کی بے خودی میں یہ تاثیر پیدا ہوئی کہ خود محبوب اس کے دل میں اس کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کو پانے کے لیے خود کو کھونا ضروری ہے۔

طوفاں ہی ایک کیا مجھے طوفاں سے کم نہیں
لنگر ہوا، سفینہ ہوا، ناخدا ہوا

شاعر کی ایذا پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ طوفان سے بچنا نہیں چاہتا بلکہ اس کے تھپیڑوں میں ہی اُسے لطف آتا ہے۔ اس کے برخلاف لنگر، سفینہ اور ناخدا جو اسے بچانے کی سعی کر رہے ہیں اسے طوفان کی طرح ناگوار ہیں۔ اس میں فانیؔ کے اس عقیدے کا اظہار ہے کہ محبت میں ساحلِ مراد ڈوب کر ہی ملتا ہے۔

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

روزِ ازل جب سب کو ان کا حصہ دیا جا رہا تھا میری ہوس عیشِ دو عالم قبول کرنے کو تیار تھی مگر تیرے کرم نے مجھے اس پر گرنے سے بچا لیا اور دردمند دل جیسی بے بہا دولت عطا فرما دی۔ اہلِ نظر کے نزدیک غمِ زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے جو صاحبِ دل لوگوں ہی کو ملتی ہے۔ ایک اور جگہ فانیؔ کہتے ہیں :

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا
دولتِ دوجہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا

فانی طلسمِ راز حقیقت یہ ہے کہ ہے
تجھ پر تری نگاہ کا پردہ پڑا ہوا

انسان کی نگاہ ہی خود اس کی ہستی کا پردہ بنی ہوئی ہے یعنی اس کی ہی بدولت وہ من و تو کے امتیازات میں گرفتار ہے۔ اگر یہ پردہ اُٹھ جائے تو ہر راز آشکارہ ہو جائے اور حقیقت سامنے آجائے (یہ کہ اس کی ہستی جمالِ یار ہی کا ظہور ہے)۔

(١٥)

کیوں جفا کیش کبھی تو بھی جفا کوش نہ تھا
وہ بھی دن تھے کہ خود اپنا بھی تجھے ہوش نہ تھا

جفا کوش = ظلم ڈھانے والا

جفا کیش = جس کا مسلک ظلم ہو

ایک وہ زمانہ بھی تھا جب محبوب نے عاشقوں پر ظلم کرنا نہ سیکھا تھا اور خود اپنی حشر سامانیوں سے بھی بے خبر تھا۔ یہ عشقیہ انداز کی مسلسل غزل ہے جس میں شاعر ابتدائے الفت کی مہربانیوں کو یاد کر رہا ہے۔

اب جو ہیں تو نے وہ کی تھیں نہ بلائیں نازل
زلف بر دوش نہ تھا، غیر سے ہم دوش نہ تھا

ہم دوش = ساتھ رہنے والا

زلف بر دوش = زلفیں کاندھوں پر بکھیرے ہوئے۔

شاعر ابتدائے الفت کا زمانہ یاد کرتا ہے جب محبوب عاشق پر اس طرح ظلم نہ ڈھاتا تھا۔ نہ اس کے کافر گیسو اس طرح شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور نہ وہ رقیبوں کو ساتھ لیے پھرتا تھا۔

بھول جانے کے سوا اب تجھے کچھ یاد نہیں
کل کی ہے بات کہ تو وعدہ فراموش نہ تھا

کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے جب تجھ کو اپنے کیے ہوئے وعدوں کا پاس رہتا تھا

لیکن اب یہ حال ہے کہ بھولنے کے علاوہ گویا اب تجھے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔

بے تکلّف نگہِ مست یہ جھکا دیتی تھی
میں تری بزم میں حسرت زدۂ نوش نہ تھا

یہ جھکا دینا = سیراب کرنا حسرت زدۂ نوش = پینے کی حسرت لیے ہوئے

آج میں تیری بزم میں شراب سے محروم حسرت سے سب کا منھ تکا کرتا ہوں۔ کل تک تو یہ بات نہ تھی اور تو بڑی فیاضی سے اپنی بدمست نظروں سے مجھے سرشار کر دیتا تھا۔

نگہِ شوق نہ تھی کیفِ اثر سے محروم
میری قسمت میں غمِ بادۂ سرجوش نہ تھا

بادۂ سرجوش = اُبلتی ہوئی شراب

التفاتِ محبوب کے بادۂ سرجوش سے محرومی آج اس کا مقدر بن چکی ہے لیکن ایک وقت وہ بھی تھا جب اسے اس محرومی سے سابقہ تھا نہ اس کا غم تھا بلکہ اس کی پُرشوق نگاہوں میں اثر تھا جو اسے مست و سرشار رکھتا تھا۔

دل مشتاق نہ تھا شکوہ طرازِ تبِ ہجر
گلۂ غم کا مرقع لبِ خاموش نہ تھا

شکوہ طراز = شکایت گذار مرقع = تصویروں کی کتاب

آج ہمارا دل جدائی کی آگ میں جل رہا ہے اور اس کی فریاد کر رہا ہے۔ ہمارے لب اگرچہ خاموش ہیں لیکن اس خاموشی میں بھی سیکڑوں فریادیں اور شکوے پوشیدہ ہیں۔ ہمارا یہ حال ہمیشہ سے نہ تھا۔

ظلمتِ شام میں تھا نورِ سحر کا عالم
آسمان صبح کے ماتم میں سیہ پوش نہ تھا

آج یہ حال ہے کہ ہمیں ہر چیز پر افسردگی طاری نظر آتی ہے۔ ہماری زندگی میں

صبح کی روشنی ایسی عنقا ہے کہ آسمان کی تاریکی پر بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ صبح کا سوگ منا رہا ہے لیکن جب تو مہربان تھا تو ہماری راتیں بھی صبح کی مانند روشن اور منور تھیں۔

تجھ میں اور تیرے تصوّر میں جدائی تھی محال
درمیاں کوئی حجابِ غمِ آغوش نہ تھا

شاعر ابتدائے عشق کی گرم جوشیوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک وہ بھی دن تھے جب تیرا قرب میسر تھا اور تیرا تصور اس طرح ہمیں نصیب تھا کہ جدائی کا تصور بھی ذہن میں نہ آتا تھا اور کوئی غم (خاص طور پر خالی آغوش کا غم) پردہ بن کر میرے اور تیرے درمیان حائل نہ ہوتا۔ یعنی آغوش خالی بھی ہوتا تب بھی تیرا تصور ہمیں دوری کا احساس نہ ہونے دیتا تھا۔

یادِ ایام کہ فانؔی کے سوا تیرا ذکر
فتنۂ ہر لب و آوارۂ ہر گوش نہ تھا

وہ بھی کیا دن تھے جب تیری محبت و عنایت فانؔی تک محدود تھی اور تو اس طرح عالم آشنا نہ ہوا تھا کہ تیرا ذکر ہر کہہ و مہ کے لب پر آتا اور ان کے کانوں تک پہنچتا[1]

(۱۶)

یہ ضبط بھی ادب آموزِ امتحاں نہ ہوا
کوئی ستم کبھی تقریبِ الاماں نہ ہوا

الاماں = خدا کی پناہ

محبوب نے ہم پر کتنے ہی ظلم و ستم کیے مگر ہم کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے اور ضبط ہی کرتے رہے مگر یہ ضبطِ غم بھی ہمیں محبت کے آداب سکھانے میں ناکام رہا اور ہم محبت کے امتحان سے عہدہ برا نہ ہوئے۔

---

[1] یہ غزل گذرے ہوئے عہد کی خوشگوار یادوں کا سلسلہ ہے۔ یہ غزل اپنے مضمون اور حسرت آمیز لہجہ کی بنا پر مومؔن کی اس مشہور غزل کی یاد دلاتی ہے جس کی ردیف ہے "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"۔

سبک سری ہے ترے عشق سے سبکدوشی   بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

سبک سری = ذلت   سبکدوشی = خالی ہو جانا

تیرے سودائے عشق سے خالی ہونا ہم اپنے لیے باعثِ ذلت سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دل کو اپنے لیے مصیبت جانتے ہوئے بھی ہم اس کو عزیز رکھتے ہیں اور دل کے آزارِ عشق سے آزاد ہو جانے کو بلائے جاں سمجھتے ہیں۔

اجل کے زیرِ اثر ہو وہ نقشِ ہستی کیا   ہوا کہ برق کے سایہ میں آشیاں نہ ہوا

شاعر ایسی زندگی کو قبول نہیں کرنا چاہتا جو موت کے زیرِ نگیں ہو۔ اسی لیے وہ آشیاں نہ ہونے پر بھی کوئی افسوس نہیں کرتا کہ اگر آشیاں ہوتا تو اس پر بجلیاں بھی سایہ کیے رہتیں اس لیے اس کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہیں۔

کسی کی پرسشِ پنہاں سے کیوں ہو دادطلب   وہ حال جو کبھی منّت کشِ زباں نہ ہوا

پرسشِ پنہاں = خاموش پرسش   منّت کشِ زباں = زبان کا احسان مند ہونا یعنی زبان سے ادا ہونا۔

شاعر کی خودداری کا یہ حال ہے کہ اس نے اپنے درد کے لیے کبھی دوا کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے اس ضبط اور وفا کی داد بھی محبوب سے لینا پسند نہیں کرتا۔ محبت خود اپنا انعام ہے۔

فغاں نے کوئی اثر تو کیا یہ کیا کم ہے   یہی سہی کہ وہ آزردۂ فغاں نہ ہوا

محبوب عاشق کی فریاد و فغاں سن کر غصہ ہونے کی بجائے خاموش ہو گیا ہے، وہ اسی کو بہت سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بھی کیا کم ہے کہ میری فریاد اس کی ناراضگی کا سبب تو نہ بنی۔

جہانِ جاں میں نہیں یادِ یار دل میں نہیں   جمالِ یار کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

حسنِ محبوب کے چرچے اور اس کی یاد کہاں نہیں پائی جاتی۔ عاشق کی جان ہو یا

دل، سب پر اسی کا قبضہ ہے۔

دل آپ یار سے رودادِ غم کہے تو کہے
میری زباں سے تو یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

ہماری زبان تو محبوب کے سامنے کھل سکی ہے نہ کھلے گی۔ دل ہی اگر اس کو یہ غم کی داستان سنا دے تو وہ ہمارے حال سے باخبر ہو سکتا ہے ورنہ اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ ایک اور جگہ فانی کہتے ہیں:

نگاہِ شوق میرا مدعا تو ان کو سمجھا دے
میرے منھ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا

ہر آن فتنہ ہے ہر فتنہ اک قیامت ہے
ترا شباب ہوا دورِ آسماں نہ ہوا

آسمان کی گردش شعرا کے نزدیک تمام آفتوں اور فتنوں کا سبب ہے۔ آسمان ہر لحظہ و ہر آن ایک نیا فتنہ برپا کرتا رہتا ہے اور ہر فتنہ قیامت ہوتا ہے۔ گویا آسمان کی گردش بھی تمھارے شباب کی طرح فتنہ خیز ہے۔ خیال رہے کہ آسمان کے فتنہ کو محبوب کے شباب سے مثال دے کر یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ محبوب کا شباب زیادہ فتنہ خیز ہے کیونکہ مثال ہمیشہ چھوٹی چیز کو بڑی چیز سے دی جاتی ہے۔

ہمیں ابھی تیرے اشعار یاد ہیں فانی
ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

اگرچہ فانی کی ہستی کا نشان مٹ چکا ہے پھر بھی دنیا میں اس کے اشعار یادگار ہیں بقول میر: ع: برسوں رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

(۱۷)

فضائے شوق کا وہ شعلہ زارِ نور ہو جانا
وہ اک اک ذرۂ دنیائے دل کا طور ہو جانا

شعلہ زار = شعلوں سے بھری ہوئی، منور

شاعر دوست کے جلوؤں کی اس کیفیت کو یاد کرتا ہے جب اس کی دنیا محبوب کے

جلووں سے منوّر ہوگئی تھی اور اس کے دل کی وادی کا ایک ایک ذرہ طور بن گیا تھا (محبوب کے جلووں کا حامل تھا)۔

مجھی پر منحصر ٹھہرا میرا مہجور ہو جانا
میری ہستی ہے خود اپنی نظر سے دور ہو جانا

ہجور = جدائی میں مبتلا۔

محبوب کا وصل یا ہجر دونوں ہمارے اپنے اوپر ہی منحصر ہیں۔ ہم اپنے وجود کے (ماسوا کے) احساس کو دور کر کے حقیقی زندگی (یا وصال یار) بھی حاصل کر سکتے ہیں اور خودی کے پھندے میں گرفتار ہو کر اس سے اور بھی دور ہو سکتے ہیں یعنی ہستی کا احساس ہی ہمیں محبوب سے جدا کر دیتا ہے اور ہم اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

اسیرِ بندِ دل ہو کر غمِ دنیا سے فارغ ہوں
میری آزادیوں کا راز ہے مجبور ہو جانا

محبت انسان کو دنیا کے تمام غم و آلام سے بے پروا کر دیتی ہے اور ہر پابندی ے نجات دلا دیتی ہے۔ میری آزادی کا راز بھی یہی ہے کہ میں محبت کی قید میں آ کر ہر غم ے آزاد ہو گیا ہوں۔ حسرتؔ کے یہاں یہ اظہار ان الفاظ میں ہے:

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

(۱۸)

کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا
دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا

مبتلا = دل جو عشق میں مبتلا ہے۔

ایک غم آشنا دل دنیا کی ساری دولت پر بھاری ہے اس لیے میرے نصیب نے ن عطا کر کے گویا مجھے سب کچھ دیدیا۔ یہ فانیؔ کا پسندیدہ مضمون ہے۔

ہی ادائے ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا

دل کو طور اور محبوب کے جلووں کو برقِ طور کہا ہے۔ محبوب کے جلووں نے دل کو جلا ڈالا اور یہ بھی نہ سوچا کہ ایک دل ہی تو ایسا تھا جو اس کے حسن کی اداؤں کا واقف کار اور شناسا تھا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جلوۂ طور نے طور کو ناحق جلایا۔ وہ بھلا تیرے جلووں کی تابانی کیوں کر برداشت کر سکتا تھا۔ تیری اداؤں کو پہچاننے والا اور ان سے آشنا صرف ہمارا دل تھا اس لیے تجلی اس کا حصہ تھی۔ بقول غالب :

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ نہ کم ہوئی
یادِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا

خرامِ ناز = محبوب کی حسین رفتار۔

قبر میں بھی ہم تڑپتے رہے اور محبوب کی یاد بے چین کیے رہی۔ مگر چونکہ محبوب کی حسین رفتار کا تصور ہمارے دل میں تھا اس نے قیامت کے آنے کی اُمید بندھائی کہ وہاں اس کا دیدار ہو جائے گا۔ خرامِ ناز سے قیامت کا یاد آنا پُرلطف بھی ہے اور فطری بھی۔

روزِ جزا گلہ تو کیا شکرِ ستم ہی بن پڑا
ہائے کہ دل کے درد نے درد کو دل بنا دیا

روزِ جزا = روزِ قیامت جب ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ ملے گا اور مظلوم کی فریاد سُنی جائے گی۔

محبوب نے ہم پر جو ظلم و ستم کیے اور جو درد دیا، محبت نے اس کو دل کی طرح عزیز اور قیمتی بنا دیا۔ قیامت کے دن جب ہمیں دوست کے مظالم کی داد مل سکتی تھی۔ ہم اس کے گلے کی بجائے اس کا شکر ادا کرنے لگے۔

اب میری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں
آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

جب عاشق نے جان دے دی تب محبوب کو اس کی وفاؤں کا یقین آیا اور وہ اس کی لاش پر آ کر افسوس کرتا اور موت کو کوستا ہے لیکن اس کو یہ خبر نہیں کہ یہ نامراد موت کا نہیں اسی کے ظلم و ستم کا شکار ہوا ہے۔

دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی
آج نگاہِ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا

محبوب نے پہلے تو ہماری طرف محبت بھری نگاہ ڈالی جس نے ہماری مُردہ امیدیں یں جان ڈال دی اور ٹوٹا ہوا دل پھر سے جوڑ دیا۔ لیکن اس کی نگاہیں جب بیگانہ وار وٹ گئیں تو دل ٹوٹ گیا۔ دل کو توڑنے کو کعبہ ڈھانے سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ دونوں خدا کا مقام ہیں اور ان کا توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔

اُف کے گناہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف   آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

ہم کو تسلیم ہے کہ محبت کے مصائب سے گھبرا کر "اُف" کرنا بھی ایک خطا ہے مگر کیا کریں جب مصائب حد سے سوا ہو گئے تو مجبور ہو کر درد کا اظہار کر بیٹھے۔ فانی کا لہجہ عاجزی و تاسف سے پُر ہے مگر غالب نے اسی بات کو زیادہ بہتر انداز سے ادا کیا ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

پ ہم اپنی آگ میں اے غمِ عشق جل بجھے   آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا

غمِ عشق کا بُرا ہو کہ اس نے ہماری زندگی کا ہی خاتمہ کر دیا اور ہمیں پھونک کر خاک ر دیا۔

ب نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات   چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سُلا دیا

شاعر کے نزدیک زندگی ایک طویل و تاریک رات کی مانند ہے جو غمِ محبت کے بغیر ربھی نہیں سکتی۔ ہمیں شب زندگی گذارنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن بھلا ہو دل کا کہ اس نے ستانِ غم چھیڑ دی جس کی وجہ سے ہمیں نیند آ گئی اور یہ طویل رات آسانی سے گذر گئی۔

آتشیں کی داد دے شبِ غم تو کون دے   خود سرِ شام کیا بجھی شمع نے دل بجھا دیا

جدائی کی شب میں ہمارے آتشیں آنسوؤں کو دیکھنے والا اور ان کی داد دینے ا اگر کوئی ہو سکتا تھا تو ایک شمع ہو سکتی تھی کہ وہ خود بھی اسی آگ میں جلتی ہے مگر شمع سرِ شام سے ہی بجھ کر ہمیں اس سہارے سے بھی محروم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ہجر کی رات

کی تاریکی میں شمع کا کیا کام۔

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیؔ ناامید کو موت کا آسرا دیا

ناامیدی ہر ایک کے لیے تکلیف کا سبب ہوتی ہے مگر شاعر کہتا ہے کہ اس نے مجھے درد ہی نہیں بخشا بلکہ اس کی دوا بھی فراہم کر دی۔ یعنی زندگی سے مایوس کر کے موت کا آسرا دے دیا۔

(۱۹)

لے! اعتبارِ وعدۂ فردا نہیں رہا
اب یہ بھی زندگی کا سہارا نہیں رہا

وعدۂ فردا = کل آنے کا وعدہ

ہم اب تک تیرے وعدوں کے سہارے زندہ تھے لیکن تجھے یہ بھی گوارا نہ ہوا اور تو نے وعدۂ فردا سے بھی گریز کیا چنانچہ یہ اعتبار بھی ختم ہوگیا اور ہماری زندگی کا یہ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔

تم مجھ سے کیا پھرے کہ قیامت سی آگئی
یہ کیا ہوا کہ کوئی کسی کا نہیں رہا

قیامت کے ساتھ یہ تصور وابستہ ہے کہ اس دن کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے گا۔ محبوب کے بے رخی اختیار کرنے سے عاشق کو محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا اس سے پھر گئی۔ وہ سوچتا ہے کہ جب محبوب ہی ہمارا نہ ہوا تو اب کون کسی کا ہوگا۔ گویا دنیا ہی میں قیامت آگئی۔ قیامت سی آنے میں مصیبت ٹوٹ پڑنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

کیا کیا گلے نہ تھے کہ اِدھر دیکھتے نہیں
دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

جب تک دوست نے ہماری طرف نگاہ نہیں کی تھی ہمیں اس کی بے التفاتی کی شکایت تھی لیکن جب اس نے دیکھا تو اس کی ایک ہی نظر نے ہماری ہستی کو فنا کر دیا۔ غالبؔ کے اس شعر میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے:

پرتوِ خود سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

آہیں ہجومِ یاس میں کچھ ایسی کھو گئیں   دل آشنائے درد ہی گویا نہیں رہا

انتہائے یاس میں انسان رونا اور آہیں بھرنا بھی چھوڑ بیٹھتا ہے۔ شاعر بھی مایوسیوں میں ایسا گھرا ہے کہ آہیں اور نالے تک بھول گیا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کبھی غم سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔

انتہائے یاس ہے یا عالمِ دیوانگی
ہنس رہے ہیں غم کے ماروں کو نہ جانے کیا ہوا

اللہ رے چشمِ ہوش کی کثرت پرستیاں   ذرّے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

کثرت پرستی = وحدت و کثرت تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ کثرت پرستی سے مراد اشیاءِ عالم کی محبت ہے۔

ذرّے مظاہرِ عالم کی نمائندگی کرتے ہیں اور صحرا سے مراد وہ وجودِ واحد ہے جو ان تمام مظاہر کی ہستی کا ضامن اور ان کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اہلِ ہوش نے جلوۂ کثرت کو ہی سب کچھ سمجھ لیا اور ان کی پرستش میں اس درجہ غرق ہو گئے کہ اس وحدت کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے جو کثرت کے ان مظاہر میں پوشیدہ ہے۔

ے اس بیچ جان جس کو غرض ہو کہ دل کے بعد   ان کی نگاہ کا وہ تقاضا نہیں رہا

جب تک محبوب نے عاشق کا دل اپنے قبضہ میں نہیں کیا تھا اس وقت تک اس کی نگاہیں عاشقوں سے تقاضا کرتی تھیں۔ دل دینے کے بعد عاشق کی تمنا ہے کہ محبوب اس کی جان بھی قبول کرے لیکن اب اس کی نگاہوں کا تقاضا ختم ہو چکا ہے۔ جس کو غرض پڑی ہو خود جان نذر کر دے۔

تم دو گھڑی کو آئے نہ بیمار کے قریب   بیمار دو گھڑی کو بھی اچھا نہیں رہا

بیمارِ غم کی حالت لحہ بہ لمحہ بگڑ رہی ہے۔ اگر تم دو گھڑی کو اس کے پاس آجاتے تو

شاید اس کی حالت کچھ سنبھل جاتی۔

فانیؔ بس اب خدا کے لیے ذکرِ دل نہ چھیڑ
جانے بھی دے بلا سے رہا یا نہیں رہا

فانیؔ کا حالِ زار سنتے سنتے سب تنگ آ چکے ہیں۔ اس سے کہو جو ہونا تھا ہو چکا۔ خدا کے لیے اب دل کا ذکر ختم کر دے۔

(۲۰)

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بے قرار رویا
دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

ہماری بربادی اب اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ دشمنوں کو بھی رحم آتا ہے اور رقیب بھی ہماری حالت پر بے اختیار رو دیتے ہیں۔

کیا اس کو بے قراری یاد آ گئی ہماری
مل مل کے بجلیوں سے ابرِ بہار رویا

بادلوں کے برسنے کو ان کا رونا کہا ہے۔ یہ بادل عاشق کی حالتِ زار کو یاد کر کے اس پر آنسو بہا رہے ہیں۔ بے بسی کی انتہا یہ ہے کہ اس کے حال پر رونے والا بادلوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں
دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

غم میں آنسو نکلنے کی توجیہہ فانیؔ یوں کرتے ہیں کہ دل ایک مدت سے غم کا منتظر تھا۔ اب اسے غم ملا ہے تو دونوں بچھڑے دوست گلے مل رہے ہیں اور یہ آنسو جو بہہ رہے ہیں دکھ کے نہیں مسرت کے ہیں۔

نازک ہے آج حالت شاید مریضِ غم کی
کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں زار زار رویا

مریضِ غم کی حالت شاید آج بہت خراب ہے جبھی تو چارہ گر بھی آنسو بہا رہا ہے۔

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بے قرار تڑپا اک دل فگار رویا

برق و باراں = بجلی اور بارش
دل فگار = زخمی دل

برق و باراں کی حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن شاعر کے نزدیک بجلی کسی دل جلے کی تڑپ ہے اور بارش کسی محبت کے مارے کے آنسو۔

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے   کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

کل فانی کو دیکھا کہ تیرا نام لے لے کر بے اختیار رو رہا تھا۔ یہ رونا یا تو محبت کی علامت ہو سکتا ہے یا دیوانگی کی۔

(۲۱)

واہمہ کی یہ مشقِ پیہم کیا   یاس و امید، شادی و غم کیا

زندگی میں جو یاس و امید اور غم و خوشی کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ جاری ہے۔ اس کی اور کوئی حقیقت نہیں صرف انسان کے اپنے واہمہ کی تکرار ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا خود ہی موہوم ہے تو اس کے غم و خوشی بھی واہمہ ہیں۔

تم کو اس رازِ ماسوا کی قسم   تم پہ چھایا ہوا ہے عالم کیا

ماسوا = خدا کی ذات کے علاوہ دوسری چیزیں   عالم = مراد صفات الٰہی

شاعر محبوب حقیقی سے مخاطب ہے کہ جب کائنات میں تیرے سوا کوئی چیز موجود نہیں (رازِ ماسوا سے یہی مراد ہے) تو پھر یہ کائنات اور اس کی نسبتیں کیا ہیں؟ غالب کا یہ شعر بھی اسی مفہوم کا حامل ہے۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ان کے آگے غم اک فسانہ ہے   ان سے کہیے فسانۂ غم کیا

محبوب کے آگے اپنی داستانِ غم بیان کرنے سے کیا حاصل کہ وہ تو محبت کو قصہ کہانی کی طرح بے حقیقت خیال کرتا ہے۔

عیشِ رفتہ کی یاد سے حاصل؟   قصۂ خلد و ذکرِ آدم کیا

عیشِ رفتہ ۔ گذری ہوئی خوشیاں

آدم کے جنت میں رہنے کی داستان اور وہاں کے عیش و آرام کا ذکر کرنے سے کیا حاصل۔ وہ زندگی تو عیشِ رفتہ بن چکی ہے۔

تا کجا آہ زیرِ لب آخر
انتہائے سکوتِ برہم کیا

تا کجا = کب تک
سکوتِ برہم = وہ خموشی جس کے اندر طوفان پوشیدہ ہیں۔ برہم زا سکوت۔

محبت میں کب تک ہم ضبط کریں گے اور اپنی آہوں کو روکے رہیں گے۔ اس طوفان خیز خاموشی کی آخر کوئی حد بھی ہوگی؟

غمِ دنیا بقدرِ ظرف نہیں
حسرتِ بیش و شکوۂ کم کیا

بقدرِ ظرف = صلاحیت و اہلیت کے مطابق
حسرتِ بیش = زیادہ پانے کی حسرت

ہمیں جو غم ملا ہے اگرچہ وہ ہمارے حوصلہ اور خواہش کے مطابق نہیں پھر بھی ہمیں کوئی غم یا گلہ نہیں۔ کیونکہ دنیا کے غم و آلام بہر حال عارضی ہیں اس لیے ایسے غم کی تمنا کرنا بھی فضول ہے۔

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

سوزِ غم کی حدیں نہیں ملتیں
بجھ گئی آتشِ جہنم کیا

ہم سمجھتے تھے کہ جہنم کی آگ سب سے زیادہ تیز ہے مگر جب سے آتشِ غم سے پالا پڑا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ آتشِ جہنم بھی سرد ہو گئی ہے۔

گرم و سردِ زمانہ جو کچھ ہو
ورنہ فردوس کیا جہنم کیا

اس دنیا کی خوشیاں اور غم ہی اصل جنت و دوزخ ہیں ورنہ دونوں کا اور کوئی وجود نہیں۔

موت جس کی حیات ہو فانیؔ
اس شہیدِ ستم کا ماتم کیا

محبت کے ستائے ہوئے لوگوں کی موت پر ماتم نہیں اظہارِ مسرت کرنا چاہیے

کیونکہ موت ان کے حق میں زندگی کی طرح پرسکون ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ محبت میں شہید ہوئے ہیں اور شہید مرتے نہیں امر ہو جاتے ہیں۔

(۲۲)

کہتا ہے غمِ یار میں ہوں جانِ تمنّا   دنیا ہے مری عالمِ امکانِ تمنّا

غمِ محبت انسان کی زندگی کا مقصد وحاصل ہے اور اس کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ انسان کی خواہشوں کا سلسلہ ہو سکتا ہے۔

مضمون تو مکتوبِ ازل کا نہیں معلوم   لکھّا ہے مرے خون سے عنوانِ تمنّا

مکتوبِ ازل = لوحِ محفوظ۔ وہ کاغذ جس پر اللہ تعالےٰ نے روزِ ازل ہر چیز کا مقدّر تحریر کر دیا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میرے نوشتۂ قسمت میں کیا لکھا ہے یہ تو نہیں معلوم، ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اس کے سرِ عنوان "تمنّا" کا لفظ تحریر ہے جس کو میرے خون سے لکھا گیا ہے۔ مراد یہ کہ محبّت میری تقدیر ہے اور ناکامی محبّت کا انجام۔

آہستہ گذر صرصرِ غم وادیٔ دل سے   برباد نہ کر خاکِ شہیدانِ تمنّا

صرصر = آندھی

دل کی وادی میں سیکڑوں تمنّائیں اور آرزوئیں دفن ہیں۔ غم کی آندھیاں یہاں ذرا آہستہ چلیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان شہیدانِ تمنّا کی خاک منتشر ہو کر بکھر جائے۔

جز داغ نہیں کوئی چراغِ سرِ تربت   سینہ ہے مرا گورِ غریبانِ تمنّا

میرے سینے میں سیکڑوں تمنّائیں دفن ہیں جن کی وجہ سے میرا سینہ گویا قبرستان بن گیا ہے اور اس گورِ غریباں میں کوئی چراغ بھی نہیں ہے بس ایک داغِ محبّت ہے جو روشن ہے۔

ہے یاد تری رونقِ خلوت گہِ خاطر   ہے ذکر ترا شمعِ شبستانِ تمنّا

خلوتِ گہ = تنہائی کی جگہ   شبستان = رات گذارنے کی جگہ

ہمارے دل کی تنہائیاں تیری یاد سے آباد ہیں اور ہم نے اپنی تاریک راتوں میں تیرے ذکر کے دیئے جلائے ہیں اور تیری یاد سے اپنی خلوت گاہ کو سجایا ہے۔

نالے ہیں نہ آہیں نہ خلش ہے نہ تپش ہے   باقی نہ رہا کوئی زبان دانِ تمنا

زبان دان = بات سمجھنے والا مراد دوست

محبت میں ہماری آہیں، نالے اور تپش و چبھن ہی ہماری مونس و ہمدم تھیں لیکن اس دشوار گذار راہ میں ان دوستوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اب کوئی ہمارا ساتھی نہیں۔ ؏ تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

کیفیتِ ناکامیٔ دل کیا کہوں فانیؔ   دل ٹوٹ گیا توڑ کے پیمانِ تمنّا

دل کی ناکامی کی داستان بس اتنی ہی ہے کہ پیمانِ محبت کے ٹوٹتے ہی دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یعنی تمنائیں دل کی زندگی کی ضامن تھیں اور تمنا سے دست کش ہونا اس کے لیے شکستگی اور موت کا باعث بن گیا۔

(۲۳)

جسے ترکِ حسرت کا ارمان ہوگا   پشیمان سا وہ پشیمان ہوگا

جو شخص محبت ترک کرنے کا خواہش مند ہے اس کی پشیمانی کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ نہ جانے اس پر کیا کیا بیتی ہوگی جو وہ محبت سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔

ترے عہدِ آزاد میں جوشِ وحشت   گریبان گویا گریبان ہوگا

جنوں کا دور دورہ ہے اور عاشق کو تمام پابندیوں سے آزادی حاصل ہے۔ اب وہ جنون کے جوش میں گریبان چاک کرے گا تو گریبان کو اس کا حقیقی مرتبہ حاصل ہوگا۔ مراد یہ کہ عشق میں چاک ہونا ہی گریبان کی اصل قیمت ہے۔

جسے لوگ کہتے ہیں عشاق کا دل   وہ تیرے ہی ملنے کا ارمان ہوگا

عاشقوں کا دل ان کے سینے میں نہیں ہوتا، وہ تو محبوب کے پاس رہتا ہے۔ جسے لوگ ان کا دل سمجھتے ہیں وہ دراصل دوست سے ملنے کی تمنا ہے جو عاشق کے سینے میں رہ کر اس کی زندگی کا سبب بن گئی ہے۔

اداے تغافل کے مارے ہوؤں پر   ستم بھی کروگے تو احساں ہوگا

محبوب کی بے توجہی عاشق کے لیے سب سے زیادہ جان لیوا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ اس کے ظلم وستم کو بھی احسان تصور کرتا ہے۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

نہیں کچھ وفاؤں پہ موقوف ظالم   مرے بعد تو بھی پشیماں ہوگا

میرے مرنے کا ماتم محبت اور وفا ہی نہیں کریں گی بلکہ محبوب بھی اپنی جفاؤں پر پشیمان ہوگا۔

برا تو نہیں خواہ کچھ بھی ہو فانیؔ   وہ کافر نہ ہوگا مسلماں ہوگا

مانا فانیؔ کافر نہیں مسلمان ہے پھر بھی اسے اپنانے میں کیا بُرائی ہے۔ وہ ایسا بُرا تو نہیں۔

(۲۴)

کچھ کم تو ہوا رنجِ فراوانِ تمنّا   آغازِ جنوں گو نہیں پایانِ تمنّا

زاداں = کثرت۔ بڑھا ہوا   پایان = انجام

اگرچہ جنون محبت کی آخری منزل نہیں لیکن چلو اتنا تو ہوا کہ جنون کی وجہ سے محبت کا بڑھا ہوا غم کسی قدر کم ہوگیا۔

پھر یاس نے رکھا ہے قدم خانۂ دل میں   یعنی ہے اب اللہ نگہبانِ تمنّا

ناامیدی دل میں آجائے تو آرزوئیں اور تمنائیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اسی بات کو

شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ہمارے خانۂ دل میں ناامیدی نے قدم رکھا ہے۔ اب خدا ہی ہماری آرزوؤں کا محافظ و نگہبان ہے۔

گو چاک ہوا دل مگر ارمان نہ نکلے
بے فائدہ کھولا درِ زندان تمنّا

ہمارا دل آرزوؤں اور تمناؤں کا قید خانہ بن کر رہ گیا تھا۔ ہم نے اپنا دل اس امید پر چاک کر ڈالا کہ شاید اس طرح یہ حسرتیں باہر نکل جائیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ گویا قید خانے کا دروازہ کھولنا بیکار ہی ثابت ہوا۔ مراد یہ کہ مرنے پر بھی آرزوؤں سے نجات نہ ملی۔

افسانہ میرا خوابِ زلیخائے محبت
جلوہ ہے ترا یوسفِ کنعانِ تمنّا

خوابِ زلیخا = زلیخا نے حضرت یوسف سے ملنے سے پہلے ہی انھیں خواب میں دیکھ لیا تھا اور ان پر عاشق ہو گئی تھیں۔

کنعان = حضرت یوسف کا وطن۔

زلیخا جو عشق کی نمائندگی کرتی ہے وہ میری داستانِ محبت کی ترجمان ہے اور تیرا جلوہ میری تمنّاؤں کی دنیا کو اسی طرح روشن کیے ہوئے ہے جیسے یوسف نے زلیخا کی دنیا کو روشن کر دیا تھا۔

جز وعدۂ باطل نہیں بنیاد کچھ اس کی
دل کانپ اُٹھا دیکھ کے ایوانِ تمنّا

عاشق کی تمناؤں کا محل بہت کمزور بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے یعنی محبوب کے جھوٹے وعدوں پر وہ اپنی آرزوؤں کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ اس کے انجام پر نگاہ کر کے ہمارا دل لرز اٹھتا ہے۔

اک جان ہے وہ خیر سے وارفتۂ غم ہے
اک دل ہے سو ہے سوختہ سامانِ تمنّا

جان اور دل یہی دو چیزیں ہماری کل کائنات تھیں سو ان کا بھی یہ حال ہے کہ جان غم و الم میں گرفتار رہے اور دل تمنّاؤں اور ارمانوں کا مارا ہوا ہے۔

دل کی یہ تمنا ہے اب اے جانِ تمنا　　　فانی کا دم اک دن ترے قدموں پہ نکل جائے

ہماری ساری آرزوئیں خاک میں مل چکی ہیں۔ بس ایک آخری ارمان یہ باقی رہ گیا ہے کہ ہماری جان اس جان آرزو (محبوب) کے قدموں پہ نکلے۔

(٢٥)

جستجوئے نشاطِ مبہم کیا　　　دل میسر ہے لذتِ غم کیا

نشاطِ مبہم = غیر یقینی خوشی

ہم خوشی اور غم دونوں سے بے نیاز اور بے پروا ہو چکے ہیں۔ خوشی کی تمنا اس لیے نہیں کہ دنیا کی ہر خوشی غیر یقینی اور ناپائدار ہے۔ غم کی خواہش اس لیے نہیں کہ جب دل جیسی دولت میسر ہے تو پھر غموں کی آرزو کیسی۔

مستیٔ ہوش کے فسانے ہیں　　　جشنِ پرویز و عشرتِ جم کیا

پرویز وجم = خسرو پرویز اور جمشید۔ ایران کے دو مشہور و طاقتور بادشاہ

دنیا کے عیش و عشرت اور جاہ و جلال کی طلب بھی ایک عارضی نشہ ہے جس میں اہل ہوش مبتلا ہیں۔

ایک عالم کو دیکھتا ہوں میں　　　یہ تیرا دھیان ہے مجسم کیا

عاشق کے نزدیک سارا عالم محبوب حقیقی کے جلووں کا عکس ہے وہ کہتا ہے کہ میں تیرے دھیان میں اس قدر ڈوب گیا ہوں کہ تیرا تصور میرے لیے جہاں نما بن گیا ہے گویا تیرے حسن کے تصور کی بدولت مجھے تمام عالم کا نظارہ میسر ہے۔

اذنِ ہنگامۂ نگاہ نہ دے　　　کیا ہماری بساط اور ہم کیا

اذن = اجازت

محبوب اپنا جلوہ دکھانے کو تیار ہے لیکن عاشق کو اپنی تابِ دید کا بھروسہ نہیں

وہ کہتا ہے کہ ہماری بساط ہی کیا ہے جو تیرے جلووں کا نظارہ کر سکیں۔ اس لیے ہماری تابِ نظر کو آزمائش میں نہ ڈال۔

ننگِ رحمت ہے احتیاجِ دعا
انتظارِ گدائے مبرم کیا

ننگ = ذلت
احتیاج = ضرورت
مبرم = یقینی

شانِ رحمت تو یہ ہے کہ سائل کی جانب سے طلب کا انتظار کیے بغیر عطا کر دے گدا کی طلب تو یقینی ہے مگر رحمت اس کی منتظر رہے تو یہ اس کے شایانِ شان نہیں۔

میری فطرت ہے گوش بر آواز
سُن رہا ہوں نوائے محرم کیا

نوائے محرم = آشنا آواز
گوش بر آواز = آواز پر کان لگائے ہوئے

محبوب کی آشنا آواز کو سننے کے لیے میں ہمہ تن گوش بنا ہوا ہوں۔ مراد یہ کہ اس دنیا کے ہنگاموں میں بھی ہم اپنے محبوب کی آواز کو پہچان سکتے ہیں لیکن اس کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ ہم اپنے سارے وجود کو اس کے لیے ہمہ تن گوش بنا دیں۔

مٹ گیا نامِ عاشقی، اب اور
چاہتا ہے وہ حُسن برہم کیا

محبوب کے ظلم و ستم نے عاشق کی جان لے لی اور اس کے ساتھ وفا کا نام بھی دنیا سے مٹ گیا۔ معلوم نہیں کہ اب وہ اور کیا چاہتا ہے۔

کاش پوچھو تو کچھ بتائیں ہم
حاصلِ شکوہ ہائے باہم کیا

اگر محبوب ہم سے پوچھے تو ہم اسے بتائیں کہ عاشق کے شکووں سے چاہے اس کی پریشانی کا تدارک نہ بھی ہو تب بھی صرف محبوب سے شکایت کر کے اور اس کو اپنا حال سُنا کر بھی جو سکون ملتا ہے وہ بھی غنیمت ہے۔

دل کمالِ حیات ہے فانیؔ
دل کے مارے ہوؤں کا ماتم کیا

جو لوگ جذبۂ دل کی خاطر جان دیتے ہیں ان کی موت پر غم نہیں کرنا چاہیئے۔ انھیں زندگی نہ ملی تو کیا ہوا، دل تو مل گیا جو زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے۔

مدت سے ہے دل خانۂ ویرانِ تمنا   اب کوئی تمنا ہے نہ سامانِ تمنا

میری ساری تمنائیں اور ارمان خاک میں مل چکے ہیں اور دل ایک ایسے ویران گھر کی مانند ہے جس کے مکین اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔ غالبؔ نے اسی خیال کو زیادہ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

سمجھو تو بہت فرق ہے اغیار میں، مجھ میں   میں آپ پہ قربان وہ قربانِ تمنا

تم ہمیں اور رقیب کو یکساں اپنا عاشق خیال کرتے ہو حالانکہ ہماری اور اس کی محبت میں زبردست فرق ہے۔ ہم صرف تم پر جان قربان کرتے ہیں اور تمھارے سامنے اپنی ہر خواہش کو ہیچ جانتے ہیں جبکہ رقیب کو تمھاری کوئی پروا نہیں۔ وہ تو اپنی خواہشات پر مرتا ہے۔

پہلو بھی بدلنے نہیں پاتے مرے ارماں   اب ضبط سے دل ہے ادبستان تمنا

ادبستان = مدرسہ۔ جہاں ادب سکھایا جاتا ہے۔

ہمارے صبر و ضبط کا یہ حال ہے کہ دل میں ارمان سر اٹھانا تو کجا پہلو بھی نہیں بدل پاتے۔ گویا ہمارا دل محبت کا ایک مدرسہ بن گیا ہے جہاں ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔

کیا چارہ گر اب بھی تجھے اُمیدِ شفا ہے   یہ زخم ہے، یہ دل ہے، یہ پیکانِ تمنا

عاشق کا دل محبت کے تیروں سے زخمی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے چارہ گر کی کوششوں پر حیرت کرتا ہے جو دل کے زخم اور اس میں چبھے ہوئے تمناؤں کے تیر دیکھنے کے بعد بھی سعیِ مداوا میں مصروف ہے اور شفا کی امید رکھتا ہے۔

آلودہ نہیں خونِ تمنا سے وہ دامن   رنگیں ہے میرے خون سے دامانِ تمنا

شاعر کی وفا کا یہ حال ہے کہ وہ محبوب کو اپنی تمنّاؤں کے خون کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا بلکہ خود اپنی محبت اور آرزوؤں کو اپنی ناکامی کا سبب قرار دیتا ہے۔

اللہ بچائے نظرِ یاس سے دل کو
امید ہے پھر سلسلہ جنبانِ تمنّا

سلسلہ جنبان = تعلق پیدا کرنا۔

ہمارے دل میں پھر سے امیدوں نے سر اُٹھایا ہے اور تمنّاؤں کا سلسلہ نئے سر سے قائم ہو رہا ہے لیکن ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ناامیدی کو نہ خبر ہو جائے اور ہماری امیدوں کو اس کی نظر نہ لگ جائے۔ اس میں اشارہ یہ بھی ہے کہ انسان کی امیدیں اور آرزوئیں ہی ناامیدی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اگر آرزوئیں نہ ہوں تو مایوسی پاس نہیں آ سکتی۔

یہ سحر ہے کہ غمِ عشق ہے کیا ہے
دل قطرۂ خوں جس میں یہ طوفانِ تمنّا

سحر = جادو

دل جو بظاہر اتنی بے حقیقت چیز ہے کہ ایک قطرۂ خون سے زیادہ نہیں۔ اس میں اتنی تمنّائیں جمع ہیں کہ ایک حشر برپا ہے۔ یہ سب عشق کا کرشمہ ہے :

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا قطرے کو دریا کر دیا

(۲۷)

غمِ فانی و عیشِ برہم کیا
جاوداں ہو تو عیش ہے غم کیا

عیشِ برہم = بکھر جانے والی یا ختم ہو جانے والی خوشی۔

دنیا کا غم اور خوشی دونوں عارضی اور فانی ہیں اس لیے ہمیں دونوں منظور نہیں ہاں اگر غمِ جاوداں ملے تو ہم اسے عیش سمجھ کر قبول کرنے کو تیار ہیں۔

ہر تجلّی ہے اک نظامِ جمال
لاکھ عالم ہیں ایک عالم کیا

نظامِ جمال = حُسن کی کائنات۔

دنیا کی ہر شے میں خدا کا جلوہ ہے۔ انسان کے پاس دیدۂ بینا ہو تو اس کو ہر ذرہ میں حُسن کی دنیا دکھائی دے اور اس ایک عالم میں لاکھ عالموں کی سیر کرلے۔

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا   ہم تمھارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

صوفیاء کے نزدیک کائنات کی حیثیت حقیقت کے عکس کی ہے۔ خالق کائنات اپنا عکس دیکھ رہا ہے جس نے مختلف مظاہر نیز انسان کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اگر یہ ذات آئینہ کے سامنے سے ہٹ جائے تو عکس بھی ختم ہو جائیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ہمارا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ ہمارا وجود ذاتِ باری سے وابستہ ہے بلکہ یہی نسبت ہمارے وجود کی ضامن ہے۔

غم تو واعظ غمِ بہشت بھی ہے   امتیازِ غمِ جہنم کیا

غم کسی چیز کا بھی ہو آخر غم ہی ہے خواہ جنّت کے حصول کا ہو یا جہنّم سے گریز کا۔ اس لیے واعظ ہمیں ناحق ڈراتا ہے۔ اگر ہمیں دوزخ کا غم ہے تو وہ بھی ہم سے بہتر حالت میں نہیں کہ بہشت کی خواہش میں خراب ہے۔

لاگ ہے اپنی زندگی سے مجھے   اور ناسازگاریٔ غم کیا

لاگ = دشمنی

ہم غم سے اس لیے گریزاں نہیں کہ غم ہماری زندگی کو راس نہیں آتا بلکہ ہم تو خود زندگی سے بیزار ہیں۔ غم کی اس سے زیادہ شدّت اور کیا ہوگی کہ انسان زندگی سے بیزار ہو جائے۔

یہ بھی اک التفات ہے ورنہ   دعوتِ نالہ ہائے پیہم کیا

محبوب جو ہم پر مسلسل جفا و ستم کرکے ہمیں نالوں پر مجبور کرتا ہے یہ اس کی عنایتِ خاص ہے کیونکہ ؎

اسی کو غم بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

یہ حجابات بھی اٹھا آخر　　دلِ پُر درد و چشمِ پُرنم کیا

عاشق اور محبوب (محبوبِ حقیقی) کے درمیان سب سے بڑا پردہ خود اس کے چشم و دل یا احساسات ہیں۔ ان حجابات کو ہٹا کر ہی وہ اس کے جلوے پا سکتا ہے۔

پھر ملی غیب سے نویدِ نشاط　　غم کے ساماں ہوئے فراہم کیا

شاعر کے نزدیک غم ایک دولت ہے۔ چنانچہ جب غیب سے اس کو کوئی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ شاید نئے غموں کا نزول ہونے والا ہے:

رنج و غم کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا' دامن بھی پھیلاتا جا

یادِ فانی بخیر کیوں اے موت!　　اُٹھ رہا ہے یہ شورِ ماتم کیا

ماتم کی آواز کان میں آتے ہی معاً یہ خیال آتا ہے کہ یہ فانی کی موت کا ماتم تو نہیں۔ شاعر موت سے ہی سوال کرتا ہے کہ کیوں فانی تو خیریت سے ہے؟ شعر میں اشارہ یہ ہے کہ فانی کی حالت اس قدر نازک ہو چکی ہے کہ اس کی موت یقینی ہے۔ شعر میں انتہائی بے ساختگی ہے۔

(۲۸)

وائے نادانی یہ حسرت تھی کہ ہوتا در کھلا　　ہم قفس رازِ اسیری کیا کہیں کیونکر کھلا

قفس کے بند دروازے اسیری کا سبب نہیں بلکہ طائر کے حوصلۂ پرواز کی کمی اس کی اصل وجہ ہے۔ ہم اپنی نادانی سے اس راز سے ناواقف تھے اسی لیے یہ حسرت تھی کہ کاش قفس کا در کھلا ہوتا۔ مگر جب در کھلنے پر بھی ہم پرواز نہ کر سکے تو اصلیت ہم پر ظاہر ہوئی۔

فرصتِ رنجِ اسیری دی نہ ان دھڑکوں نے ہائے　　اب چھری صیاد کی اب قفس کا در کھلا

شاعر کی غم پسند طبیعت قید کی تکلیفوں سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی لیکن افسوس کہ اسے اس کی فرصت ہی نہ مل سکی اور ان دھڑکوں نے کہ اب قفس کا در کھلے گا اور اب صیاد چھری لے کر آتا ہوگا اسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ غمِ اسیری سے لطف اندوز ہوتا۔ فانی کو قید کا غم نہیں قید سے رہائی (چاہے وہ موت کی شکل میں ہو) کا دھڑکا رہتا ہے۔

اللہ اللہ اک دعائے مرگ کے دو دو اثر
واں کھلا بابِ اجابت، یاں قفس کا در کھلا

بابِ اجابت = قبولیت کا در

ہم نے مرنے کی دعائیں مانگی تھیں۔ ان دعاؤں نے دوہرا اثر کیا۔ اوّل تو قیدِ قفس سے آزادی ملی دوسرے قیدِ حیات سے۔

اُف اس آزادیٔ بے ہنگام کی مجبوریاں
میں قفس کے پاس یوں بیٹھا ہی رہتا پر کھلا

بے ہنگام = بے وقت

ہم کو آزادی ملی بھی تو کس وقت جبکہ قوتِ پرواز جواب دے چکی تھی ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ میں آزادی پانے کے بعد بھی قفس کے پاس یوں مجبور بیٹھا رہتا۔

عجلتِ پرواز جب ملنے بھی نہ دے راہِ گریز
یوں تو کھلنے کو قفس کا در کھلا اکثر کھلا

عجلت = جلدی   راہِ گریز = بچنے کا راستہ

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے قفس کا دروازہ کبھی کھلتا ہی نہ ہو۔ یہ دروازہ اکثر کھلا ہے مگر ذرا سی دیر کو اور چونکہ ہم اڑنے کے لیے بے تاب تھے اس لیے اس جلدی میں اِدھر اُدھر پَر مار کر رہ گئے اور دروازہ دکھائی نہ دے سکا۔ خوشی کی زیادتی اور شدتِ جذبات میں انسان کی جو کیفیت ہو جاتی ہے، شاعر نے اس کی بڑی اچھی مصوری کی ہے۔

بند ہے بابِ قفس، ہو بس تو بچ کے جائیے
ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھلا

اگر انسان میں ذوقِ آزادی ہو تو زنداں کی بندشیں بھی اسے اسیر کر کے نہیں رکھ سکتیں اور وہ بند تیلیوں سے ٹکرا کر آزاد ہونے کا راستہ نکال سکتا ہے۔ شعر میں جد جہد

کا پیغام ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :

صبا جو گلشن سے آج آئی وہ راہ کمبخت کو دکھائی
کہ ایک کھڑکی نئی نکالی قفس میں بلبل نے سر پٹک کر

کم تو کیا صیاد بے تابی سوا ہو جائے گی
تو نے ناحق تیلیوں میں رکھ دیا خنجر کھلا

صیاد نے تیلیوں میں خنجر کھول کر رکھ دیا ہے تاکہ اس کے خوف سے طائر کی تڑپ اور بے چینی بند ہو جائے لیکن اس کو نہیں معلوم کہ اس کی بے تابی اس سے کم ہونے کی بجائے اور بڑھ جائے گی کیونکہ وہ تو موت کا طالب ہی ہے۔

آسماں گرم تلافی چاہیے کیسا قفس
بجلیوں کے اک اشارہ میں قفس کا در کھلا

گرم تلافی : = بدلے پر آمادہ

اگر قسمت مہربان ہو اور آسمان اپنے ظلم و ستم کی تلافی پر آمادہ ہو تو ہمارا قفس سے رہا ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ بجلیاں آسمان سے اگر ایک لمحہ میں ہمارے قفس کو جلا کر اس میں در پیدا کر سکتی ہیں۔ اسیری کے رنج اس قدر شدید ہیں کہ ان کے مقابلہ میں شاعر موت کو خوش آمدید کہنے کو تیار ہے اور اسے آسمان کی مہربانی پر محمول کر رہا ہے۔

ہجر ساقی میں ہمارے گھر کی کیفیت نہ پوچھ
بند در، ہر شیشہ خالی، دل بھرا، ساغر کھلا

دوست کی جدائی میں ہمارے گھر کا یہ عالم ہے کہ دروازے بند پڑے ہیں۔ شراب کے خم اور پیمانے خالی اور کھلے ہیں اور دل غم و الم سے چور ہے۔

لکھ چکے ہم جا چکا خط، گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

ہماری بے تابی کا یہ عالم ہے کہ جہاں محبوب کو خط لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا پھر دو چار باتیں لکھنے پر قناعت نہیں ہوتی بلکہ شوق کا دفتر کھل جاتا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو دوست تک خط پہنچنا معلوم۔ کیونکہ نہ داستان شوق کبھی ختم ہوگی نہ خط اس تک پہنچے گا۔

دل میں زخم، اشکوں میں خوں، صورت ببیں عالم مپرس   وہ نگہ اُف وہ مژہ، ناوک چھپا نشتر کھلا

صورت ببیں عالم مپرس = صورت دیکھو حال مت پوچھو۔   مژہ = پلکیں

محبوب کی نگاہیں اور پلکیں تیر و نشتر بن کر ہمارے دل کو زخمی کر گئی ہیں اور دل کے لہو سے آنسو بھی رنگین ہو گئے ہیں۔ اب ہمارا حال کسی بیان کا محتاج نہیں رہا بلکہ صورت سے ظاہر ہے۔ پلکیں سب کی نظر کے سامنے ہیں اس لیے انھیں کھلا ہوا نشتر کہا ہے۔ نگاہیں چھپ کر وار کرتی ہیں اس لیے انھیں چھپا ہوا تیر کہا ہے۔

دم بخود، سکتہ کا عالم، مُردنی چھائی ہوئی   رنگ میری زندگی کا میری میّت پر کھلا

ہم زندگی بھر اپنی حالت چھپائے رہے اور کسی کو اپنی کیفیت کا اندازہ نہ ہونے دیا لیکن ہماری ساری زندگی جس انداز سے گذری اس کی تصویر ہماری لاش پیش کر رہی ہے۔ یعنی دم بخود، خاموش اور مضمحل۔ یہ ہی ہماری زندگی کا اصلی رنگ تھا جو مرنے پر ظاہر ہوا۔

دیکھیے کیا گُل کھلاتی ہے بہار اب کی برس   خواب میں فانی نے دیکھا ہے قفس کا در کھلا

فانی نے خواب میں قفس کے در کو کھلتے دیکھا ہے۔ ویسے تو قفس کا کھلنا ممکنات میں سے نہیں شاید یہ خواب اس بات کا اشارہ ہو کہ دیوانہ قیدِ حیات سے نجات پا جائے گا۔ چنانچہ وہ اس امید میں ہے کہ شاید اب کی برس بہار اس کے لیے نئی خوشیوں (موت) کا پیغام لائے۔

(۲۹)

جن خاک کے ذرّوں پر وہ سایۂ محمل تھا   ہر خاک کا ذرّہ تھا وحشت کدۂ دل تھا

جس جگہ محبوب کے محمل کا سایہ پڑا ہے وہاں کا ہر ذرّہ دل بن گیا ہے اور اس میں دل کی سی وحشت و دیوانگی نمایاں ہو گئی ہے۔

بیداد کی ہر تہ میں سو طرح سے شامل تھا   وہ جان کا دشمن جو کہنے کو مرا دل تھا

دل جو بظاہر انسان کا غمگسار اور ساتھی ہوتا ہے وہ ہی اس کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ

دنیا میں جتنے غم و الم کا انسان کو سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سب دل کے اور اس کی تمناؤں کے سبب سے ہی ہوتے ہیں۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں :

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

غمِ حُسنِ مکمّل تھا دلِ حیرتِ کامل تھا
تصویر کا آئینہ تصویر کے قابل تھا

غم (یا عشق) حُسن ہی کا ایک نام ہے۔ اسی لیے شاعر اسے محبوب بھی رکھتا ہے۔ اور اس حُسن کے قرب نے شاعر کے دل پر حیرانی کا عالم طاری کر دیا ہے۔ حیرانی کی وجہ سے اس کو آئینہ کہا ہے اور دل کے علاوہ کوئی آئینہ اس کا اہل نہ تھا کہ اس حُسنِ مکمّل (غم) کے روبرو ہو سکے۔

آئینہ و دل دونوں کہنے ہی کی باتیں تھیں
تیری ہی تجلّی تھی اور تو ہی مقابل تھا

اہلِ معرفت کے نزدیک مظاہرِ کائنات کی حیثیت آئینۂ تجلیاتِ الٰہی کی ہے۔ لیکن فانی کی نگاہ میں عکس اور جلوے کا امتیاز بھی محض کہنے کی باتیں ہیں۔ جب کوئی چیز خدا سے جدا نہیں ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کون سی تجلّی ہے اور کون سی شے اس کا عکس ہے : ع اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔

ہر باطل ہر ناحق اک رازِ حقیقت ہے
جس شکل میں حق آیا وابستۂ باطل تھا

کسی چیز کی حقیقت و اہمیت کو پہچاننے کے لیے اس کی ضد کا وجود ضروری ہے۔ اسی طرح حقیقتِ حق کو سمجھنے کے لیے لازمی ہے کہ ہم باطل کو بھی سمجھیں۔ گویا حق و باطل لازم و ملزوم ہیں۔ اس طرح باطل بھی حق کی طرح ایک رازِ حقیقت ہے۔

ع : پستی ہے تو بلندی ہے، رازِ بلندی پستی ہے

ہاں آپ کسی کو یوں برباد نہیں کرتے
یہ فانیٔ ناکارہ سچ ہے اسی قابل تھا

دوست کے عذرِ جفا سے جل کر شاعر طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ آپ کا یہ کہنا بالکل

بجا و درست ہے کہ آپ کسی کو بے وجہ نہیں ستاتے۔ فانی تو تھا ہی اس قابل کہ اس کو برباد کردیا جائے۔

(۳۰)

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

عشق میں ناکامی کے سبب سے ہم محبت سے ہی مایوس ہو گئے ہیں اور اپنے دل سے بھی بیگانہ ہو گئے ہیں جو شوق و تمنا کا مرکز تھا۔ مسلسل ناکامیاں، انسان میں ہر چیز سے بے زاری و بے دلی پیدا کر دیتی ہیں۔

فصلِ گُل آئی یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

حالتِ اسیری میں زنداں کا دروازہ کھلتا دیکھ کر شاعر کو حیرت ہے کہ آخر آج یہ دروازہ کیوں کھولا جا رہا ہے۔ اس کے کھلنے کی دو ہی ممکن صورتیں ہیں۔ یا تو بہار کے اثر سے وحشیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور کسی نو وارد کو لانے کے لیے یہ دروازہ کھولا جا رہا ہے یا پھر موت نے کسی کو قیدِ قفس سے آزاد کر دیا ہے۔ قیدِ محبت سے جیتے جی رہائی کے ناممکن ہونے کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گذری چھوٹ گیا

محبت میں گرفتار ہو کر جب دل کا دامن ہی ہاتھ سے چھوٹ چکا ہو (دل ہاتھ سے جا چکا ہو) تو پھر دامن کی فکر کرنے اور جنون میں ہاتھوں کو چاکِ دامن سے روکنے سے کیا حاصل۔ اسی لیے ہم دونوں سے بے پروا ہو گئے ہیں۔

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

راہِ عشق کی دشواریوں میں سارے ساتھی ایک ایک کرکے جواب دیتے گئے۔ آرزوئیں اور تمنائیں جو اس راستہ کی ابتدا میں عاشق کی ساتھی تھیں انھوں نے بھی منزل تک پہنچتے پہنچتے ساتھ چھوڑ دیا۔

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ہماری زندگی موت کی طرح عبرت کا نمونہ ہے۔ وطن اس امید پر چھوڑا تھا کہ شاید غربت میں کچھ قدر ہو مگر پردیس بھی ہمیں راس نہ آیا۔ ہم بے آس و بے سہارا ہیں۔ یہ شعر محض شاعری نہیں، فانیؔ کی زندگی کی سچی تصویر اور ان کے نشتروں میں سے ایک ہے۔ اسی خیال کو فانیؔ دوسری جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

گردش وہی یہاں بھی سپہرِ کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

(۳۱)

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر منجملۂ آدابِ غم خواری ہے غم میرا

مگر = شاید
منجملۂ آدابِ غم خواری = غم گساری کے طریقوں میں سے ایک

"وہ" سے مراد محبوبِ حقیقی ہے۔ محبوب کہتا ہے کہ میں غمگین دلوں پر کرم کرتا ہوں لیکن کرم کے طریقے جدا جدا ہیں۔ انہی طریقوں میں سے ایک غم عطا کرنا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر غم کو مصیبت نہیں سمجھتا بلکہ محبوب کی عنایت خیال کرتا ہے۔

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اُٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبّت میں قدم میرا

قدسی = فرشتہ

انسان کی عظمت اس کے جذبۂ عشق کی مرہونِ منّت ہے۔ جس جگہ عاشق کے قدم

پڑتے ہیں وہ فرشتوں کی عبادت گاہ بن جاتی ہے۔ اپنی معنویت کے اعتبار سے شعر بے پناہ ہے۔

زہے تقدیرِ ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری
تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

میں اپنی اس ناکامی پر کیوں نہ ناز کروں جو تیری مرضی و مصلحت کی تابع ہوا اور غم کو کیوں عزیز نہ رکھوں جو تیرا دیا ہوا ہے۔ محبت کی یہی شان اصغرؔ کے اس شعر میں بھی ہے۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

نہ جانے اس سفر کی منزلِ اوّل کہاں ہوگی
فنا کی آخری منزل میں ہے پہلا قدم میرا

فنا عام انسانوں کے نزدیک زندگی کے سفر کی آخری منزل ہے لیکن محبت کے راہی کا سب سے پہلا قدم وہاں پڑتا ہے جہاں فنا کی آخری منزل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جس کی ابتدا یہ ہو اس کی انتہا کا کون تصور کر سکتا ہے۔ مراد یہ کہ محبت انسان کو فنا سے محفوظ کر کے اس کو ابدیت عطا کرتی ہے۔

مرے جوشِ طلب کی شانِ استغنا کوئی دیکھے
کہ میں رہبر سے آگے مجھ سے آگے ہے قدم میرا

استغنا = بے نیازی

راہِ محبت میں میرا جوشِ جستجو ہر سہارے سے بے نیاز ہے۔ یہ عالم بھی دیدنی ہے کہ جوشِ طلب میں مَیں راہ بر سے بھی آگے چل رہا ہوں اور میرے قدموں میں مجھ سے بھی زیادہ بے تابی ہے کہ وہ مجھ سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ چلنے میں قدموں کے آگے بڑھنے کی دلچسپ توجیہ کی ہے۔

میں وہ آزردۂ وہمِ مسرت ہوں معاذ اللہ
کہ غم کو غم سمجھنے سے بھی گھبراتا ہے دم میرا

آزردۂ وہم مسرت = جس کو خوشی کا تصوّر بھی ناگوار ہو   معاذاللہ = خدا پناہ میں رکھے

میری ام پسند طبیعت خوشی کے تصوّر سے بھی گریزاں ہے۔ اس کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہے کہ چونکہ غم کو بھی میں غم نہیں عیش سمجھتا ہوں اس لیے اب غموں سے بھی دم الجھنے لگا ہے۔ یعنی غموں سے بھی میری طبیعت گریزاں ہے کیونکہ غم بھی بالواسطہ خوشی کا سبب ہیں۔

یہ محرومِ تبسّم، میر سامانِ تبسّم ہے
تری بزمِ طرب میں معتبر ہے اشکِ غم میرا

میر ساماں = مہتمم و منتظم

میں اگرچہ خود خوشی اور تبسّم سے محروم ہوں مگر پھر بھی دوسروں کے لیے تبسّم کا سامان فراہم کرتا ہوں کیوں کہ میرے اشکِ غم کو تیری محفل میں اعتبار حاصل ہے اور وہ لوگوں کی ضیافتِ طبع کا سبب ہے۔ عاشق کے آنسوؤں پر خندۂ محبوب کا ذکر کس انداز سے کیا ہے۔

اب آگے کس سے لکھا جائے، آغازِ محبت پر
فسانہ ختم کر دیتے ہیں اربابِ قلم میرا

ہمارا فسانۂ محبت اس قدر دردناک ہے کہ کسی میں اس کو بیان کرنے کی طاقت نہیں لکھنے والا اس کے انجام تک پہنچنے کی ہمت نہیں رکھتا اور اس کو آغاز پر ہی ختم کر دیتا ہے۔

مری آوارگی ہر قید سے بیزار ہے شاید
کہ اب اس کی گلی میں بھی قدم جاتا ہے کم میرا

میری آزادروی کو ہر قید اور رسم سے بیزاری ہے، یہاں تک کہ اپنے محبوب کی گلی میں بھی میرے قدم کم ہی جاتے ہیں کیونکہ کوچۂ محبوب میں آوارہ گردی محبت کی قدیم رسم ہے اور میں رسموں سے بیزار ہوں۔

بقا کہتے ہیں جس کو وہ مرا احسان ہے فانی
وہ حادث ہوں کہ دنیائے قِدم بھرتی ہے دم میرا

بقا = زندگی   حادث = وہ شے جو فنا پذیر ہو اور جس کا پہلے وجود نہ رہا ہو۔
قِدَم = وہ شے جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ مراد وجودِ باری تعالیٰ۔

ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ روشنی کی اہمیت اندھیرے کے سبب سے ہے۔ زندگی کی قدر موت کی وجہ سے ہوئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قدیم ہونے کا احساس و اعتراف بھی اس وقت ہوتا ہے جب ماسوا اللہ ہر چیز کو فنا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ گویا میں نے فنا ہو کر بقا پر احسان کیا اور حادث ہو کر قدیم کی اہمیت کو ظاہر کیا۔

(۳۲)

حاصلِ علم بشر جہل کا عرفاں ہونا   عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا

جہل = لاعلمی   عرفاں = سمجھ، واقفیت

علمِ انسانی کی معراج اور ماحصل یہی ہے کہ اسے اپنے جہل سے آگاہی ہو جائے یعنی علم کی آخری حد تک پہنچ کر یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ ہم نے کچھ نہ جانا۔ چنانچہ زندگی بھر عقل سے راہ نمائی حاصل کر کے ہم جس نتیجہ پر پہنچے وہ یہی تھا کہ ہم کچھ نہیں جانتے:

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی راز داں نہیں ملتا

چار زنجیرِ عناصر یہ ہے زنداں موقوف   وحشتِ عشق ذرا سلسلہ جنباں ہونا

چار زنجیرِ عناصر = آب و خاک و باد و آتش۔ قدیم حکمت کی رو سے ان چار عناصر سے عالمِ مادی اور انسان کے مادی وجود کی تشکیل ہوئی ہے۔
سلسلہ جنباں ہونا = حرکت میں لانا۔ زنجیر کی مناسبت سے یہ لفظ نہایت برمحل ہے۔ انسانی زندگی کی قید کا انحصار ان چار عناصر پر ہے لہٰذا اسے وحشتِ عشق آگے بڑھ کر ان زنجیروں کو توڑ دے تاکہ میں اس قید سے نجات پا جاؤں۔ مراد یہ کہ عشق انسان کو مادی قیود سے آزادی دلاتا ہے اور اس میں روحانیت و ماورائیت کا انداز پیدا کر دیتا ہے۔

دل بس اک لرزشِ پیہم ہے سراپا یعنی　　تیرے آئینہ کو آتا نہیں حیراں ہونا

حیرت کی حالت میں انسان ساکت ہوجاتا ہے۔ آئینہ میں جو عکس ہوتا ہے وہ بھی ساکت ہوتا ہے اس لیے آئینہ کو حیران کہا جاتا ہے۔ دل اگرچہ جمالِ دوست کا آئینہ ہے مگر اس آئینہ کو حیران ہونا نہیں آتا بلکہ وہ مسلسل تڑپتے رہنے سے سراپا لرزش بن گیا ہے۔

فالِ افزونیِ مشکل ہے ہر آسانیِ کار　　میری مشکل کو مبارک نہیں آساں ہونا

فال افزونیِ مشکل = دشواری میں اضافہ کا شگون یا پیش خیمہ۔

میری مشکلوں کو آسانی راس نہیں آتی بلکہ ہر آسانی دشواریوں میں اضافہ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

راحتِ انجامِ غم اور راحتِ دنیا معلوم　　رکھ دیا دل کے مقدّر میں پریشاں ہونا

کہا جاتا ہے غم کا نتیجہ ہمیشہ خوشی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے مگر دنیا کی خوشی کی کیا حقیقت ہے یہ سب ہی جانتے ہیں گویا پریشانی ہر حال میں دل کا مقدّر بن چکی ہے کہ وہ پریشان ہی رہے گا خواہ وہ غم کی حالت میں ہو یا خوشی کی۔

دے ترا حُسنِ تغافل جسے جو چاہے فریب　　ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا

محبوب کے تغافل پر لوگوں کو شرمندگی کا گمان ہو رہا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ اس نے جفاؤں سے شرمندہ ہوکر یہ روّیہ اختیار کیا ہے لیکن شاعر جو اس کی عادت سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ محبوب کبھی اپنی جفاؤں پر شرمندہ نہیں ہوسکتا۔

ہائے وہ جلوۂ ایمن وہ نگاہِ سرِ طور　　فتنہ ساماں سے ترا فتنۂ ساماں ہونا

جلوۂ ایمن = وہ وادی جہاں کوہِ طور واقع ہے۔　　طور = وہ پہاڑ جہاں حضرت موسیٰؑ

نے خدا کا جلوہ دیکھا تھا۔ فتنہ ساماں = فتنے برپا کرنے والا۔ فتنۂ ساماں = سازو ساماں کو تباہ کرنے والا۔

حسنِ محبوب ہمیشہ عاشق کے لیے تباہی کا موجب اور فتنہ ساماں ہوتا ہے لیکن طور پر حُسن کی جو تجلی ظاہر ہوئی وہ حضرت موسیٰ کے علاوہ بھی دوسری چیزوں (طور) کی بربادی کا سبب بن گئی۔ گویا اب حسن فتنہ ساماں سے فتنۂ ساماں ہو گیا۔

خاکِ فانیؔ کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں کس سے سیکھا ترے ذرّوں نے بیاباں ہونا

جس بیاباں میں فانیؔ عالمِ جنوں میں خاک اُڑاتا تھا اور مر کر جہاں اس کی خاک برباد رہی اس کے ایک ایک ذرّے میں صحرا کی سی وسعت پیدا ہو گئی۔ شاعر اس صحرائے جنوں سے سوال کرتا ہے کہ تیرے ذرّوں میں یہ وسعت کہاں سے آئی۔ خاکِ فانیؔ کی قسم دے کر پوچھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ صحرا کے ذرّوں کی یہ وسعت خاکِ فانیؔ ہی کی بدولت ہے۔

(۳۳)

یہ نیازِ عاشق ہے اور وہ ہے ناز ان کا
موت رازِ عاشق ہے زندگی ہے راز ان کا

"یہ" سے موت کی طرف اشارہ مقصود ہے اور "وہ" سے زندگی کی طرف۔ شاعر کے نزدیک عشق کی نیازمندی کی انتہا یہ ہے کہ محبوب کی خاطر جان دے دی جائے لیکن محبوب کا ناز عاشق کو زندہ رہنے اور غمِ ہجر سہنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ زندگی جو عاشق اور محبوب کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہے محبوب کا راز بن جاتی ہے جس طرح موت عاشق کا راز ہے۔

لطفِ اضطراب اُٹھے یا مرا نقاب اُٹھے
کیا پیام لائی ہے اے شبِ دراز ان کا

انتظار کی شبِ دراز محبوب کی طرف سے کوئی پیام (پیامِ وصل) لے کر آئی ہے لیکن شاعر کیفِ انتظار کا دلدادہ ہے اور اس کو ملاقات منظور نہیں۔ کیونکہ اس سے

عاشق اس لذّت سے محروم ہو جائے گا جو اس کو تڑپنے سے حاصل ہے اور ہجر میں جو اپنی ہستی کا احساس ہے وہ ختم ہو کر گویا اس کی ہستی فنا ہو جائے گی (اس پر سے نقاب اُٹھ جائیگا)

دل پہ جو نگاہیں تھیں رفتہ رفتہ آہیں تھیں
عشق بن گیا آخر حُسنِ جلوہ ساز ان کا

جلوہ ساز = جلووں کی تخلیق کرنے والا

محبوب کی نگاہِ ناز جب دل پر پڑی تو اس سے جذبۂ عشق کو تحریک ملی اور عاشق آہیں بھرنے پر مجبور ہو گیا۔ گویا محبوب کا حُسن جو نت نئے جلووں کا خالق ہے، اب عشق کی بے تابی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اہلِ عرفان کے نزدیک کائنات کی تمام اشیاء اور جلوے حسنِ ازل ہی کے جلوے ہیں۔ تو پھر عاشق کی ہستی بھی اس سے الگ نہیں۔ وہ خود ہی معشوق ہے اور خود ہی عاشق۔

وہ نگاہ پھر اُٹھ کر آئینے سے ٹکرائی
صرفِ تازیانہ ہے پھر سمندِ ناز ان کا

صرفِ تازیانہ = کوڑا لگایا جانا   سمند = گھوڑا

محبوب جو پہلے ہی ناز و ادا کا عادی تھا پھر آئینہ دیکھ رہا ہے۔ اپنے بے مثال حسن کو دیکھ اس کے عشوہ و ناز میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ گویا اپنے حسن کا نظارہ اس کے سمندِ ناز پر تازیانے کا کام دے گا۔

وہ ستم نہیں کرتے، یوں کرم نہیں کرتے
لطفِ خاص بے منّت چاہتا ہے ناز ان کا

عاشق صرف محبوب کے کرم ہی کو اس کا احسان نہیں خیال کرتا بلکہ اس کے ستم پر بھی خوش اور محبوب کا احسان مند ہے اور جب محبوب نے کرم و ستم دونوں ترک کر کے غفلت کا انداز اختیار کیا ہے تو وہ اس کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ اس نے یہ انداز اس لیے اختیار کیا ہے کہ وہ ہم پر لطفِ خاص کرنا چاہتا ہے اور ہمیں کرم یا ستم کا زیرِ بارِ احسان نہیں کرنا

چاہتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ کرم ہماری غیور طبیعت کے لیے ستم کے مترادف ہوگا۔ محبوب کی غفلت کی کیا توجیہہ کی ہے۔

رفتۂ نظر ہو جا سب سے بے خبر ہو جا
کھُل گیا ہے راز اپنا، کھُل نہ جائے راز ان کا

رفتۂ نظر = محبوب کی نگاہوں سے بے خود

عاشق جمالِ محبوب کے اثر سے اس قدر وارفتہ و بے خود ہوا کہ لوگوں کو اس کے رازِ محبت کا علم ہو گیا۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو متنبہ کرتا ہے کہ خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری زبان پر محبوب کا نام آجائے اور یہ راز بھی لوگوں پر فاش ہو جائے۔ یعنی محبت میں بیخودی اتنی بڑھ جانا چاہیے کہ عاشق صرف اپنے کو ہی نہیں محبوب کو بھی بھول جائے۔

موت کو تو یوں فانؔی جان دی نہیں جاتی
ڈھونڈھ لے کوئی حیلہ یہ بہانہ باز ان کا

زندگی جیسی چیز موت کے حوالے کر دیں، یہ ہم سے نہیں ہوگا۔ ہاں اگر موت (جو کسی نہ کسی حیلے یا بہانے کی محتاج ہے) محبوب سے کوئی کارگر حیلہ سیکھ نے یا اس کے بہانہ سے جان طلب کرے تو ہم خوشی سے دے دیں گے۔ مراد یہ کہ عاشقوں پر موت کا وار یوں نہیں اثر کر سکتا بلکہ وہ موت کو محبوب کا اشارہ یا اس کی مرضی جان کر خود ہی گلے سے لگا لیں تو لگا لیں۔

(۳۴)

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گذر گیا   عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

نوید = خوشخبری

عشق میں جان دینا عینِ زندگی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مریضِ محبت نے عشق میں جان دے دی گویا اس کو حیاتِ جاوید مل گئی۔ حضرتِ عیسیٰؑ کو خوش خبری (طنزاً) سناؤ کہ جس مریض کو آپ اچھا نہ کر سکے موت نے اس کو اچھا کر دیا۔ اگر عیسیٰؑ سے مراد محبوب ہے تو یہ بھی مطلب

ہو سکتا ہے کہ محبوب کو مژدہ کہ اس کا عاشق ختم ہو گیا۔

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی
یعنی جمالِ یار کا صدقہ اُتر گیا

کسی چیز کا صدقہ اتارنے کے لیے قیدیوں کو یا اسیر پرندوں کو آزاد کیا جاتا ہے شاعر کہتا ہے کہ کچھ محبت کے اسیروں نے آج جان دے دی ہے اور قیدِ حیات سے رہائی پا گئے ہیں گویا انھوں نے محبوب کے حسن کا صدقہ اتارا ہے۔ طنز نے اس شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

دنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا، بے خبر گیا

انسان کا دنیا میں آنا اور جانا دونوں انسان کے اپنے اختیار اور مرضی سے نہیں۔ آتا ہے تو بغیر اپنی مرضی کے اور جاتا ہے تو اس سے بھی بے خبر کہ اس کے آنے اور جانے کا مقصد کیا تھا۔ مسئلۂ جبر اردو شاعری کا خاص موضوع رہا ہے۔ ذوق کہتے ہیں:

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

شاید کہ شامِ ہجر کے مارے بھی جی اُٹھے
صبحِ بہارِ حشر کا چہرہ اُتر گیا

فراق کے ماروں کے لیے قیامت کی صبح بھی صبحِ بہار کی مانند ہے کیونکہ دیدارِ دوست حشر پر موقوف ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ صبحِ محشر، اگر کہیں دوسرے تمام انسانوں کے ساتھ ساتھ عاشقوں کو بھی زندہ کر کے اُٹھا دیا گیا تو قیامت بھی گھبرا جائے گی کیوں کہ یہ لوگ، ایک نئی قیامت برپا کر دیں گے اور ان کے ہنگامے کے آگے قیامت کا ہنگامہ سرد پڑ جائے گا۔

آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں
یہ جانتا ہوں دل اِدھر آیا اُدھر گیا

دل آنا = محبت میں مبتلا ہونا۔

ہمارا دل کب محبوب پر آیا اور کب ہمارے ہاتھ سے گیا یہ تو ہمیں نہیں خبر۔ ہاں اتنا

جانتے ہیں کہ جیسے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہوا ہمارے ہاتھ سے بھی جاتا رہا۔ شعر میں کوئی خاص حسن نہیں الفاظ کی بازی گری ہے۔

میں نے دیا کہ تم نے لیا دل تمہیں کہو
تم دل میں پہلے آئے کہ دل پیشتر گیا

دوست کہتا ہے کہ میں نے دل نہیں لیا تم نے خود ہی مجھے دیا ہے۔ عاشق اس بات کو ماننے کو تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے خود ہی دل تمہیں نہیں پیش کر دیا تھا بلکہ پہلے تم دل میں آ کر بسے تھے پھر دل گیا ہے۔ کسی فارسی شاعر کا شعر ہے:

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود
تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

ہاں سچ تو ہے شکایتِ زخمِ جگر غلط
دل سے گذر کے تیر تمہارا کدھر گیا

محبوب کو اس کا تو اقرار ہے کہ اس نے تیر چلایا ہے مگر زخمِ جگر سے وہ لاعلمی ظاہر کرتا ہے اور عاشق کی اس شکایت کو غلط بتاتا ہے۔ اس پر چل کر عاشق کہتا ہے کہ چلو میری زخمِ جگر کی شکایت جھوٹی سہی مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر تمہارا تیر دل سے گذر کے جگر تک نہیں گیا تو پھر آخر کہاں گیا۔

دل کا علاج کیجیے اب یا نہ کیجیے
اپنا جو کام تھا وہ غمِ یار کر گیا

غمِ یار نے جس مرض میں دل کو مبتلا کیا ہے اس کی کوئی دوا نہیں اور اس کے حق میں برابر ہے کہ علاج کرو یا نہ کرو۔ نتیجہ ایک ہی رہے گا۔

کیا کہیے اپنی گرم روی ہائے شوق کو
کچھ دور میرے ساتھ مرا راہ بر گیا

گرم روی = تیز رفتاری

ہمارے شوق کی تیزی دیکھنے کے قابل ہے کہ راہِ محبت میں ہمارا راہ بر بھی تھوڑی ہی دور تک ہمارا ساتھ دے سکا۔ اس کے بعد پیچھے رہ گیا۔

فانی کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود — شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

شیرازہ: جزوبندی۔ وہ ڈورا جس سے اوراق کو یکجا کیا جاتا ہے۔

دنیا میں فانی کی ذات غم و آلام کا مسکن و مرکز تھی مگر آج اس کے مرنے سے غم کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ یعنی کوئی اب ایسا نہیں جو دولتِ غم کا امین بن سکے۔

(۳۵)

غم کے بھڑکتے شعلوں سے جب جل کے کلیجہ خاک ہوا
داغِ وجودِ حسرت سے تب دل کا دامن پاک ہوا

غم، دل اور روح کی صفائی کا بہترین و واحد ذریعہ ہے۔ خواہشیں اور تمنائیں عشق کی خامی کی دلیل ہیں اور عاشق کے لیے بدنما داغوں کی مانند ہیں۔ ان داغوں کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ عاشق دل کو غم کی بھٹی میں جلا کر خاک کر دے۔

حال پہ میرے فرش کے ذرّے عرش کے تارے روتے ہیں
آپ کی پلکیں تر کیا ہوتیں، کوئی پلک نمناک ہوا!

ہماری حالت اس قدر تباہ ہے کہ ساری دنیا یہاں تک کہ خاک کے ذرے اور آسمان کے تارے بھی آنسو بہاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس تباہ حالی پر متاسف نہیں تو وہ محبوب ہے کہ اس کی آنکھ میں آنسو تو کیا اس کی پلکیں تک نمناک نہیں ہوئیں۔

میرے سوا تھے اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا کوئی دم میں چاک ہوا

ہمارے اور محبوب (حقیقی) کے درمیان جو بھی پردے اور حجابات حائل تھے ہم سب کو چاک کر چکے ہیں لیکن ایک آخری رکاوٹ اور پردہ باقی رہ گیا ہے اور وہ ہے ہمارا وجود اور اب اس کے ختم ہونے میں بھی دیر نہیں۔ مراد یہ کہ محبوب کا وصال بغیر اپنی ہستی کو فنا کیے اور دوئی کے احساس کو ختم کیے ممکن نہیں ہے۔

(۳۶)

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا
کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اُجڑ گیا

میری بدنصیبی کا یہ عالم ہے کہ جس باغ پر میرے آشیاں کا سایہ بھی پڑ جاتا ہے وہ باغ ہی ویران و برباد ہو جاتا ہے۔ ناکامی و نامرادی کی بہت پُراثر تصویر کھینچی ہے۔

تو نے سب اپنے کام بگڑ کر بنا لیے
میری وفاو کام جو بن کر بگڑ گیا

محبوب کی برہمیٔ مزاج سے اس کی سب باتیں بن جاتی ہیں اور جو چاہتا ہے اسے حاصل ہوتا ہے اور ایک ہم بدنصیب ہیں کہ بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ہم نے تمام زندگی اپنی وفا کا بھرم رکھا مگر محبوب کی تند مزاجی کے آگے ہماری کچھ نہ چلی۔

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے
اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

دل کی جُدائی کا صدمہ کس طرح برداشت ہو۔ ساری عمر کے ساتھی کی مفارقت پر صبر کرنا آسان نہیں۔

صیاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں کیا
بے درد، بند بند کسی کا جکڑ گیا

صیاد نے اس بے دردی سے بازؤں کو جکڑا ہے کہ اُڑنے کا تو ذکر کیا بند بند جکڑ کر رہ گیا ہے۔

ہوتا ہے آج فیصلہ یاس و اُمید کا
مٹتا ہے اب وہ دل جو بسا اور اُجڑ گیا

مدتوں سے ہمارے دل میں یاس و اُمید کی کشمکش جاری تھی۔ کبھی اُمیدیں بندھتی تھیں اور کبھی محبوب کی بے التفاتی سے ٹوٹ جاتی تھیں لیکن آج زندگی کے خاتمہ کے ساتھ یہ کشمکش بھی ختم ہو گئی۔

بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کیے بغیر
کام ان کی بیقرار نگاہوں سے پڑ گیا

محبوب کی نگاہیں اس قدر فتنہ خیز اور بے چین ہیں کہ اس سے نگاہیں ملانے کے بعد صبر و قرار رخصت ہو جاتے ہیں۔

بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا

آج آنسوؤں کا رنگ بدلا نظر آ رہا ہے اور ان میں سرخی بھی شامل ہے۔ شاید دل کے زخم پھر سے تازہ ہوئے ہیں جن سے یہ خون رِس رِس کر آ رہا ہے۔

اللہ رے جوشِ بادِ بہاری ترا اثر پیمانہ لڑکھڑا کے صراحی سے لڑ گیا

بہار کے اثر سے ہر چیز میں مستی اور جوش ہے۔ پیمانے اور صراحی تک اس کے اثر سے بدمست ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ یہ شعر غزل کے باقی اشعار سے مختلف جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔

وعدے کی رات گردشِ افلاک رک گئی جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

خدا خدا کر کے محبوب مہربان ہوا اور اس نے عاشق کے غم کدے میں آنے کا وعدہ کیا۔ لیکن عاشق کی خوشی قسمت کو منظور نہ تھی۔ چنانچہ وقت کی رفتار اس روز تھم گئی اور وہ وقت ہی نہ آسکا جس وقت محبوب نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔

اک حشر اور چاہیے اس روسیاہ کو فانیؔ زمینِ حشر میں غیرت سے گڑ گیا

روسیاہ = گناہگار

مجھے اپنے گناہوں پر اس قدر ندامت تھی کہ میں شرم سے زمینِ محشر میں گڑ گیا۔ اب میرے واسطے ایک اور حشر برپا ہونے کی ضرورت ہے تاکہ میرے گناہوں کا حساب ہو سکے۔ مراد یہ کہ میرے گناہوں کے حساب کے لیے حشر کا طویل دن بھی ناکافی ہے۔

(٣٧)

ہمیں کھوئے گئے تجھ میں نہ جب تیرا پتا پایا
نہ پایا مدعا ہم نے تو گویا مدعا پایا

محبوب کی تلاش میں ہم اپنے سے بے خبر ہو گئے اور اپنے وجود کو فراموش کر بیٹھے۔ اس طرح گویا ہم نے اپنی ہستی اور وجود کو اس کی ہستی میں گم کر دیا اور عشق کی منزل کو پا لیا۔ گویا اسے نہ پا کر بھی ہم نے عشق کی معراج حاصل کر لی۔ غالب کا شعر ہے:

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
جب پا نہ سکے اس کو تو اپنے ہی کو کھو آئے

ازل میں اہلِ دل نے بابِ رحمت سے نہ کیا پایا
دُعا پائی، دُعا کے واسطے دستِ دُعا پایا

روزِ ازل جب ہر شخص کی قسمت مقرر کی جا رہی تھی اور خدا تعالیٰ اپنی نعمتیں تقسیم کر رہا تھا تو عاشقوں کو اس کے دَر سے صرف دُعا کے واسطے پھیلا ہوا ہاتھ ملا اور ان کی قسمت میں دعا مانگنا مقرر کر دیا گیا۔ یعنی عاشقوں کی قسمت میں روزِ ازل سے ہی آرزومندی اور محرومی لکھ دی گئی تھی۔ شعر کا انداز طنزیہ ہے۔

فریبِ جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزمِ عالم سے اُٹھا پایا

فریبِ جلوہ = دنیا کے جلووں کے دھوکے
معاذ اللہ = خدا کی پناہ

دنیا کے مظاہر میں صوفیا کے نزدیک تجلّیٔ الٰہی جلوہ گر ہے۔ فانی ان مظاہر کو تجلّی نہیں خیال کرتے بلکہ صرف دھوکا یا فریب جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کے مظاہر پر ہمیں جلوۂ محبوب کا گمان ہوتا تھا۔ یہ فریب اس قدر مکمل تھا کہ دل ان میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے دل کو دنیا کی رنگینیوں سے بے نیاز کر سکے۔

یہ ہے رودادِ غم اوّل سے آخر تک کہ ظالم کو
ستم نا آشنا دیکھا، کرم نا آشنا پایا

ہمارے غم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا محبوب کرم کرنا تو جانتا ہی نہیں لیکن اسے ظلم ڈھانا بھی نہیں آتا۔ مراد یہ کہ محبوب کا تغافل عاشق کے لیے ستم سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

مرا دردِ نہاں رسوائے اقصائے دوعالم ہے
چھپا کر تو نے جو بخشا وہ میں نے برملا پایا

اقصاء = وسعت   برملا = اعلان کے ساتھ

میرے دردِ محبت کے چرچے دونوں عالم میں ہو رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ دینے والے (خدا تعالیٰ) نے درد کو دل میں چھپا کر رکھا تھا تاکہ سب سے پوشیدہ رہے لیکن وہ دونوں جہاں میں رسوا ہو چکا ہے۔

یہ ہے محشر میں دیدِ یار و وصلِ یار کا حاصل
کوئی دیکھا ہوا دیکھا، کوئی پایا ہوا پایا

صوفیہ کے عقیدے کے مطابق کائنات میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا جلوہ ہے اور ہم دل کی آنکھوں سے دیکھیں تو ہر چیز میں اسے جلوہ گر پا سکتے ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ جب روز حشر ہمیں اپنے محبوب (اللہ تعالیٰ) کا دیدار ہوا تب معلوم ہوا کہ وہ ہمارے لیے نیا نہیں بلکہ اس کا حسن تو دیکھا ہوا اور جانا پہچانا ہے۔ یعنی محبوبِ حقیقی جس کی ہمیں تلاش تھی اس کو پہلے ہی پا چکے تھے۔

ع: سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

مرے شکوے سپاسِ غم کی لے میں دل سے اٹھتے ہیں
فغاں کو میں نے آہنگِ طرب کا ہم نوا پایا

سپاس = شکر گذاری   آہنگِ طرب = خوشی کا ساز

شاعر کے نزدیک غم اور خوشی میں کوئی فرق نہیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ زندگی کے ساز سے غم کے جو نغمے نکلتے ہیں ان میں اور خوشی کی تانوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ شدتِ درد سے جو نالے اور آہیں میرے لبوں سے نکلتے ہیں وہ شکوے نہیں بلکہ شکر ہیں۔ جو میرا دل غم کے عطیے کے لیے ادا کرتا ہے اور میری شکایتوں میں احساسِ تشکر بھی شامل ہے۔

تیرے مظلوم کی فریاد کام آہی گئی آخر
دلِ مرحوم نے اک نالہ تو آخر رسا پایا

تمہارا عاشقِ نامراد ساری زندگی آہ و فریاد کرتا رہا۔ اگرچہ تمام عمر تو اس کے نالے تاثیر سے محروم رہے مگر چلو اس کی ایک فریاد کو تو شرفِ قبولیت حاصل ہوگیا یعنی اس نے موت کی تمنا کی اور وہ پوری ہوگئی۔

وفا کے نام سے بیزار ہے وہ بے وفا فانیؔ
وفا میں اس نے کیا پندارِ ترکِ مُدّعا پایا

پندار = غرور

عاشق جو وفا کا بندہ ہے محبوب سے صرف وفا کرتا ہے اور اس کے عوض کوئی آرزو یا خواہش محبوب سے نہیں رکھتا۔ اس کی اس بے غرضی و مدعا وفا کو محبوب غرور سے تعبیر کرتا ہے اور اسی لیے وفا کے نام سے بھی بیزار ہوگیا ہے۔

(۳۸)

اے اجل اے جانِ فانی تو نے یہ کیا کر دیا
مار ڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا

موت نے ہماری زندگی ہی ختم نہیں کی بلکہ ہمارے غموں کا خاتمہ کرکے ہمیں سکون بخش دیا ہے۔ لیکن یہ غم ہی ہماری زندگی کا مقصد و مراد تھے تو گویا موت نے ہمدردی نہیں کی بلکہ ہمارے ساتھ دشمنی کی ہے۔ موت کو "جانِ فانی" کہنا اور اچھا کرنے کو مار ڈالنا قرار دینے میں جدت ہے۔

جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتاً چُپ ہو گئے
یوں چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

افشا = ظاہر

ہم نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں پر ہمارا حالِ دل ظاہر ہو، اسی لیے ہم نے تیرے ذکر سے بھی پرہیز کیا اور اگر کسی اور نے بھی یہ ذکر چھیڑا تو ہم اچانک خاموش ہو گئے لیکن ہماری اس خاموشی نے ہی ہمارا راز سب پر ظاہر کر دیا۔

یوں چرائیں اس نے آنکھیں سادگی تو دیکھیے
بزم میں گویا مری جانب اشارا کر دیا

محفل میں محبوب نے ہم سے بے تعلقی کا اظہار کرنے کے لیے آنکھیں چرائیں لیکن اس سے لوگ اصل بھید سے واقف ہو گئے۔ گویا اس نے اپنی سادگی کی وجہ سے خواہ مخواہ بے زاری کا اظہار کر کے لوگوں کو میری طرف سے شک میں مبتلا کر دیا۔ یہ دونوں شعر اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کو ایک شعر میں غالبؔ نے یوں پیش کیا ہے:

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی　　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

کس قدر بیزار تھا دل مجھ سے ضبطِ شوق پر
جب کیا دل کا کہا ظالم نے رسوا کر دیا

دل کو ہمارے ضبطِ شوق سے ضد تھی اور وہ ہم سے اظہار چاہتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر ہم نے دل کا کہا کیا اور اظہارِ غم کر بیٹھے لیکن اس سے رسوائی و بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

دردمندانِ ازل پر عشق کا احساں نہیں
درد یاں دل سے گیا کب تھا کہ پیدا کر دیا

دردمندانِ ازل = وہ لوگ جو ازل سے غم زدہ دل لے کر آئے ہیں۔

عشق نے ہمیں مبتلائے غم کر کے ہم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے کیونکہ ہم تو ازلی دردمند ہیں کہ کبھی ہمارا دل غم سے خالی نہیں رہا۔

دل کو پہلو سے نکل جانے کی پھر رٹ لگ گئی
پھر کسی نے آنکھوں آنکھوں میں اشارا کر دیا

عاشق کی بے چینی و بے کلی محبوب کے اشارے کے بغیر نہیں ہے۔ اگرچہ محبوب بہ ظاہر خاموش رہتا ہے لیکن اس کی قاتل نگاہیں عاشق سے دل کا نذرانہ طلب کر رہی ہیں اور اس کا دل بے قابو ہو کر پہلو سے نکلا جا رہا ہے۔

بچ رہا تھا ایک آنسو دار و گیرِ ضبط سے
جوششِ غم نے پھر اس قطرہ کو دریا کر دیا

دار و گیر = ہنگامہ   جوشش = جوش

ہم نے محبت کی تکلیفوں پر ضبط کی کوشش کی۔ ضبط و بیتابی کی کش مکش میں ہمارے سارے آنسو خشک ہو گئے۔ پھر بھی ایک آنسو بچ رہا تھا اور اب اس ایک قطرہ نے دریا کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مراد یہ کہ محبت میں صبر و ضبط کی کوششیں ناکام رہتی ہیں اور وقتی طور پر آنسو خشک بھی ہو جائیں مگر ان کی طغیانی میں کمی نہیں آتی۔

فانیؔ مہجور تھا آج آرزو مندِ اجل
آپ نے آ کر پشیمانِ تمنّا کر دیا

مہجو = فراق کا مارا ہوا۔

ہجر کی اذیتوں سے گھبرا کر عاشق موت کی تمنّا کر رہا تھا کہ محبوب آ گیا اور اس نے اجل کا انتظار ترک کر کے پھر سے تمنّائیں کرنا شروع کر دیں۔ مگر اسے اُمید کا احسان اٹھانا گراں ہے اسی لیے وہ محبوب سے شکایت کرتا ہے کہ آپ نے مجھے اُمید کا مرہونِ احسان بنا دیا۔

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق محبوب سے شرمندہ ہو گیا کہ اس کے دل میں محبوب کے علاوہ دوسری کوئی تمنّا کیوں پیدا ہوئی۔

(٣٩)

ادائے ہر نگہِ التفات نے مارا
نویدِ مرگ و وعیدِ حیات نے مارا

وعید = سزا کی خبر (نوید اس کی ضد ہے)
نوید = خوش خبری

ہم محبوب کی نگاہِ لطف کے مارے ہوئے ہیں جو ہمارے لیے بہ یک وقت موت کا پیغام بھی ہے اور زندگی کی خوش خبری بھی ہے۔۔

یہی نہ ایک حقیقت کہ بے نیاز ہے تو
دلِ غیور کو اتنی سی بات نے مارا

محبوب کی ایک صفت بے نیازی ہے لیکن وہ بے نیاز و بے پروا ہے تو عاشق بھی غیور و خوددار ہے اور اسی لیے محبوب سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ گویا محبوب کی بے نیازی عاشق کی بربادی کا سبب بن گئی۔

کسی کے جلوۂ طاقت رُبا کو کیا دیکھیں
شکستِ رنگِ رُخِ کائنات نے مارا

عاشق کی زبوں حالی سے محبوب کے حُسن کے ہوش رُبا ہونے کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ شاعر کے نزدیک اس کائنات کی ہر چیز حُسنِ ازل کے عشق میں گرفتار ہے۔ اس کی حالتِ غیر اور اُڑے ہوئے رنگ کو دیکھ کر شاعر سوچتا ہے کہ اس کے محبوب کے جلوے عاشق کے تاب و تواں کے دشمن ہیں اسی لیے وہ اس کے دیدار کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا۔

جمالِ مطلق بے نام کی دہائی ہے
فریبِ ذات نے لوٹا، صفات نے مارا

جمالِ مطلق = مراد جمالِ باری تعالیٰ۔ بے قید جمال
ذات = حقیقت۔ مراد ذاتِ باری
صفات = اللہ تعالیٰ کی دو حیثیتیں ہیں ایک ذات جو اس کی اپنی حقیقت ہے اور دوسری صفات جس میں بندے بھی شریک ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی حُسنِ مطلق ہے جس کا کوئی ادراک نہیں کر سکتا۔ یہ دنیا صرف اس کی صفات کا عکس ہے۔ یہاں کی کوئی شے عینِ ذات نہیں بلکہ ایک فریب ہے یا ایک پردہ ہے۔ لیکن عاشق کی تباہی کے لیے یہ فریب بھی کافی ہے۔

ہلاکِ تلخیٔ تاخیرِ موت ہوں فانی
ثباتِ زندگیٔ بے ثبات نے مارا

ثبات = پائداری   بے ثبات = ناپائدار

لوگ زندگی کو بے ثبات و ناپائدار جانتے ہیں لیکن فانی کہتے ہیں کہ ہمیں تو زندگی کے ثبات اور پائداری کی شکایت ہے اور موت کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس نے ہمیں ہلاک کر رکھا ہے۔ موت کی اتنی شدید خواہش شاعر کی شدتِ غم کی گواہ ہے۔

(۴۰)

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

حسن کے حضور عاشق ہر چیز سے بے خبر ہو گیا اور اس کی تمام ہستی عشق کے جوش کا اظہار بن کر رہ گئی۔ اُدھر حسن کا بھی یہ عالم ہوا کہ وہ بھی اپنے ناز اور حسن کو فراموش کر کے عشق کی کیفیت میں ڈوب کر رہ گیا اور دونوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت
تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا

محشرِ سکوت = خاموشی کا ہنگامہ

جب کوئی مارا جاتا ہے تو اس کی لاش پر گریہ و ماتم کا ایک شور برپا ہو جاتا ہے لیکن دل جو تیرے ناز و ادا پر شہید ہوا اس کی لاش پہ رونے والا بھی کوئی نہ تھا، بلکہ شور و شیون کی جگہ بلا کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دل کی بے بسی کی بڑی مؤثر تصویر پیش کی ہے اور محشر اور سکوت کا تضاد قابلِ غور ہے۔

امیدِ عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

عفو = معافی   شاہد = گواہ   پردہ پوش = پردہ ڈالنے والا

شاعر کے نزدیک انسان اپنے گناہوں کے لئے خود ذمہ دار نہیں کیونکہ وہ تو تقدیرِ خداوندی کے آگے مجبور ہے اور فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ جب انسان اپنے افعال کا مختار نہیں تو پھر اس کے انصاف سے توقع ہے کہ وہ انسان کے گناہوں کو معاف

کر دے گا۔ اگر اس کی پردہ پوشی پر اعتماد نہ ہوتا تو ہم گناہ کی جرات نہ کر سکتے تھے۔

فردائے حشر خیر سے آنکھوں کا تھا قصور   ہر رخ مری نگاہ کا تصویرِ دوش تھا

فردا = آنے والا کل   دوش = گذرا ہوا کل

قیامت کے دن جو کچھ ہم نے دیکھا وہ ہو بہو وہی سب کچھ تھا جس کو ہم دنیا میں دیکھ چکے تھے مگر یہ ہماری آنکھوں کا تصور ہے کہ ہم اس کو پہچان نہیں پائے کیونکہ ہماری نگاہوں میں ماضی (دنیوی زندگی) کی تصویریں بسی ہوئی ہیں۔ قرآن و حدیث میں بھی اس قسم کے اشارے ملتے ہیں کہ جنت میں جو چیزیں ملیں گی وہ دنیا کی اشیاء سے ملتی جلتی ہوں گی۔ اصغر کا شعر ہے:

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

ہر مژدۂ نگاہ غلط، جلوہ خود فریب   عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

دنیا کی دلکشی و رنگینی انسان کے احساسات کو گمراہ کر دیتی ہے اور اسے محبوب (حقیقی) سے دور کر دیتی ہے۔ یہاں کے تمام نظّارے بے حقیقت اور ہر جلوہ ایک دھوکا ہے۔ جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ فریب ہے اور جو کچھ سُن رہے ہیں وہ دھوکا ہے۔

وحشت بقیدِ چاک گریباں روا نہیں   دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

وحشت کا تقاضا ہے کہ عشق میں عاشق ہر پابندی اور قید سے آزاد ہو جائے۔ جو لوگ اپنی وحشت کو چاکِ گریباں تک محدود رکھتے ہیں اور اہلِ ہوش کی مقرر کی ہوئی پابندیوں پر عمل کرتے ہیں وہ وحشت کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ دیوانہ یہاں نادان کے معنی میں اور اہلِ ہوش رسم پرستوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

پی اور وہ پی ازل میں کہ اُتری نہ حشر تک   یادش بخیر دل بھی عجب بادہ نوش تھا

ہم نے ازل کے روز معرفت کی شراب اس قدر پی کہ اس کا نشہ حشر تک نہ اُتر سکا۔

خدا رحمت کرے ہمارا دل بھی کس بلا کا بادہ نوش تھا۔ مراد یہ کہ ہم روزِ ازل حسن کے جلووں سے ایسے سرشار ہوئے کہ اس کا نشہ حشر تک باقی رہا اور ہمارا عشق کچھ آج کی چیز نہیں بلکہ کائنات کی طرح قدیم ہے۔

محرومیاں ذریعۂ الہام ذکر تھیں   نالوں پہ انحصارِ پیامِ سروش تھا

الہام = جو باتیں خدا کی طرف سے نازل ہوں۔   سروش = فرشتہ۔

محبت کی محرومیاں اسرارِ حقیقت کی نقاب کشائی کا ذریعہ تھیں۔ میں اپنی محرومیوں کو اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ ان کے ذریعہ مجھ پر الہام کے دروازے کھلتے ہیں یعنی میں محبوبِ حقیقی کی یاد میں اس سے نزدیک ہو جاتا ہوں اور میرے نالے فرشتۂ غیبی کی طرح اُس کے پیغام کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے "عرفت ربی بفسخ العزائم" یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔

فانیؔ تنک بضاعتیِ غم کا کیا کروں   ہر قطرہ خونِ دل کا تمنّا فروش تھا

تنک بضاعتی = کم مائگی   تمنّا فروش = تمناؤں کو رسوا کرنے والا

میں اپنے غم کی کم مائگی کا کیا مداوا کروں کہ اس کے پاس میری آرزوؤں کو پورا کرنے کی کوئی صورت نہیں اور میرے خونِ دل کا ہر قطرہ اپنی تنک مائگی کی وجہ سے میری تمنا کی رسوائی کا سبب بنا ہوا ہے۔ مراد یہ کہ محبت میں ہمارا خونِ دل قطرہ قطرہ ہو کر بہہ رہا ہے اور ہماری کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی۔

(۴۱)

زیست کا حاصل بنایا دل جو گویا کچھ نہ تھا
غم نے دل کو دل بنایا ورنہ کیا تھا، کچھ نہ تھا

انسانی زندگی کا ماحصل اور سرمایہ دل ہے۔ اور اگرچہ دل بہ ظاہر ایک مضغۂ گوشت سے زیادہ نہ تھا مگر اس کو غم کی دولت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے عظمت و اہمیت بخش دی۔

وہ تو میرے سامنے تھے دیکھنے کی دیر تھی
میں نے آنکھیں بند کر لیں ورنہ پردا کچھ نہ تھا

محبوب کے جلوے ہر طرف بے نقاب ہیں اور اس کے حسن پر کوئی پردا نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے۔ یہ ہماری اپنی غفلت اور کوتاہی ہے۔ بقول غالبؔ:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یا الم کوشی رہی یا خود فراموشی رہی
دل کسی دن دل نہ تھا، یا درد تھا یا کچھ نہ تھا

الم کوشی = غم پسندی۔

ہمارا دل ایک دن بھی صحیح حالت میں نہیں رہا۔ ابتدا میں تو اس نے وہ غم اٹھائے کہ سراپا درد بن گیا۔ پھر غم کے گذرنے کے بعد خود فراموشی کی یہ حالت ہوئی کہ پہلو میں دل کا ہی پتہ نہ رہا۔

کچھ سمجھ کر خود ہی ہم نے جان دے دی دل کے ساتھ
ان کی نظروں کا ابھی ایسا تقاضا کچھ نہ تھا

دوست نے ہم سے صرف دل طلب کیا تھا۔ جان کا تقاضا ابھی اس نے نہیں کیا تھا لیکن ہم نے دل کے ساتھ ہی جان کو بھی اس پر قربان کر دیا۔

آپ کا دیوانہ تھا یہ اِدّعا باطل سہی
فانیِ دیوانہ دیوانہ بھی تھا یا کچھ نہ تھا

اِدّعا = دعویٰ

محبوب فانیؔ کا یہ دعویٰ غلط قرار دیتا ہے کہ اس کا جنون محبوب کے باعث ہے۔ اس پر فانیؔ جل کر کہتے ہیں کہ اچھا یہ دعویٰ غلط سہی مگر یہ تو کہیے کہ اس کی دیوانگی پر تو آپ کو

یقین ہے یا اس کی دیوانگی بھی بہانہ ہے۔

(۴۲)

خونِ ناحق کا گلہ تھا کچھ ادب کا جوش تھا
لاش کی صورت زباں تھی اور میں خاموش تھا

محبوب نے ہمیں ناحق اور بے جرم قتل کیا۔ اگرچہ اس کے پاسِ ادب سے ہم اپنی زبان نہ کھول سکے لیکن بے گناہ کا خون رنگ لا کر رہتا ہے۔ چنانچہ ہماری لاش زبانِ حال سے دوست سے خونِ ناحق کا گلہ کر رہی ہے۔

نورِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے
ورنہ پہلے سوزِ غم، اک شعلۂ بے ہوش تھا

غم کا شعلہ ہمارے اندر پہلے بھی موجود تھا مگر یہ ایک راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح سرد اور خاموش تھا۔ جب غم کا تعلق دل سے ہوا تو اس نے اس کو برقِ معرفت کی تابانی عطا کردی۔ مراد یہ کہ غم کو غمِ عشق میں تبدیل کر دینا میرے دلِ حق بین کا کام تھا۔

ہائے کیا دن ہیں کہ نقشِ سجدہ ہیں اور سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا

وبالِ دوش = کاندھوں پر بار

جب تک محبت کا سودا سر میں نہیں سمایا تھا زندگی مصیبت تھی اور سر کاندھوں پر بوجھ بنا تھا۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ درِ محبوب پہ سجدہ ریزی کرتے کرتے سر کا پتہ نہیں رہا۔ صرف نشانِ سجدہ باقی رہ گئے ہیں۔ اس شعر میں انتہائے بے خودی کی کیفیت کا اظہار پایا جاتا ہے۔

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

شاعر عشق کی اس منزل کا ذکر کر رہا ہے جب کہ عاشق کو اپنی شدتِ شوق کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ زمین سے آسمان تک ہر چیز (محبوب کے سوا) ایک آغوشِ کشادہ نظر آتی ہے جو محبوب کی پذیرائی کے لیے بے تاب ہے۔

دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی
ہائے ان دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

دل جو بظاہر چند قطرے خون سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا' اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی ہر کروٹ (بدلتی ہوئی کیفیت) کے ساتھ ایک نئی دنیا وجود میں آتی ہے اور ایک دنیا مٹ جاتی ہے۔ یعنی زندگی کے تمام ہنگامے اور ہلچل دل کی بدولت ہے۔

سرگذشت عمر کہیے اس کو یا رودادِ عشق
دل کے لب جنبش میں تھے اور میں سراپا گوش تھا

انسان کی زندگی کا مدار دل کی دھڑکنوں پر ہے۔ نیز عشق کا خزانہ بھی دل ہی میں پوشیدہ ہے۔ دل کے دھڑکنے کو شاعر اس کے لبوں کی جنبش سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارا دل کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ یہ کہانی عشق کی روداد بھی تھی اور زندگی کا فسانہ بھی۔ ہم تمام عمر دنیا کی ہر دوسری چیز سے بے نیاز ہو کر اسی کہانی کو سنتے رہے۔

کیا یہ فانی کر رہا تھا عالمِ ہستی کی سیر
آگے آگے بیخودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

فانی نے کائنات کی سیر اس طرح کی ہے کہ اس کی راہ نمائی کے لیے آگے آگے بے خودی چل رہی تھی اور پیچھے پیچھے ہوش آ رہا تھا۔ اس دیوانہ کی بے خودی کا کیا کہنا جس کے جلو میں ہوش چلے۔

(۴۳)

مشغلہ چاہیے کوئی غم و راحت کے سوا   حسرت اب کوئی نہیں صبر کی حسرت کے سوا

شاعر جو غم اور خوشی دونوں کی حقیقت کو سمجھ چکا ہے ان دونوں سے بے زار ہے اور ان کے علاوہ کوئی اور مشغلہ چاہتا ہے۔ اب اس کے دل میں صبر کی آرزو کے سوا کوئی آرزو نہیں۔

جب یہ کہتا ہوں، محبت ہی سوا ہوتی ہے   "غم کوئی اور عنایت ہو محبت کے سوا"

ہماری دعاؤں کی بے اثری کا یہ عالم ہے کہ ہم کوئی دعا کرتے ہیں تو اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ جب ہم یہ دعا مانگتے ہیں کہ خدا ہمیں غم محبت کے سوا کوئی دوسرا غم عطا کرتے تو بجائے اس کے محبت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس میں اپنی بدنصیبی اور محبت کی اذیتوں سے تنگ آکر گھبرانے کا اظہار ہے۔ مومن کا شعر ہے:

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر کو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

کیا ہوئیں داورِ محشر وہ خطائیں میری   کچھ نہیں فردِ عمل میں تری رحمت کے سوا

داورِ محشر = روزِ حشر کا مالک یعنی اللہ تعالیٰ   فردِ عمل = اعمال نامہ

اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھو کہ اس نے میرے اعمال نامہ سے میرے سارے گناہ دھو کر مجھ جیسے گناہ گار کو بخش دیا۔ میرا اعمال نامہ میرے گناہوں کا نہیں، اس کی رحمت کی وسعت و فراوانی کا گواہ ہے۔

(۴۴)

خوشی سے رنج کا بدلا یہاں نہیں ملتا   وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہر غم کے بعد اس کا بدلا خوشی کی شکل میں ملتا ہے لیکن شاعر کا تجربہ اس کی تائید نہیں کرتا۔ پہلے تو اسے دوست کی بے خبری کا غم تھا۔

اب محبوب مل گیا تب بھی وہ خوشی کو حاصل نہ کر سکا کیونکہ اب آسمان دشمنی پر کمر بستہ ہے۔

ہزار ڈھونڈیئے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

اس دنیا میں محبوب کے جلووں (اس کے آستانے) تک رسائی ناممکن ہے۔ اگر ذوق سجدہ نصیب بھی ہو جائے تو بھی اس کے آستانہ تک پہنچنا اور اس کو پانا ممکن نہیں۔ حافظؒ کہتے ہیں: ع

یا من خبر نہ دارم یا او نشاں نہ دارد

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

مجاز کے معنی ہیں ظاہر۔ یہاں مجاز محبوب کی باتوں کو ٹھہرایا ہے کیوں کہ وہ کھلی ہوئی ہیں اور اس کی نگاہوں کو حقیقت قرار دیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ نگاہیں انسان کے دلی خیالات کی ترجمان ہوتی ہیں۔

شاعر کو گلہ ہے کہ محبوب کے ظاہر و باطن (مجاز و حقیقت) میں بڑا فرق ہے۔ اس کی نگاہوں میں اور اس کے بیان میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔ وہ زبان سے کچھ کہتا ہے مگر اس کی نگاہیں کچھ اور ہی کہتی ہیں۔

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

شاعر کی ایذا پسندی کا یہ حال ہے کہ بجلیوں کا رُخ اس کے آشیانے کی طرف نہیں تو وہ پھولوں کی رنگینی سے مدد کا طالب ہوتا ہے کہ وہ ہی بھڑک کر اس کے نشیمن کو آگ لگا دے۔ پھولوں کی سرخی کو آگ سے تشبیہ دینا شاعری میں عام ہے۔

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

میرے محبوب کو (محبوب حقیقی) یہ بدگمانی ہے کہ میں غم زیست کو برداشت نہیں کر سکتا، اس لیے مضطرب و بے چین ہوں لیکن حقیقت میں میرے غم کی وجہ یہ ہے کہ

غمِ زیست ناپائدار ہے اور میں ایسا غم چاہتا ہوں جو لافانی ہو۔ اقبالؔ نے اسی بات کو اس طرح پیش کیا ہے:

کر پہلے مجھ کو زندگیِ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے   کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

فی الجملہ = مختصر الفاظ میں۔

محبوب حقیقی کی تلاش کا نتیجہ مختصراً یہ ہے کہ اس کا نشان مفقود ہے۔ حرم میں تلاش کیا جائے یا دیر میں، دونوں جگہ اس کی تلاش کا نتیجہ ناکامی ہے۔

بتا اے جرس دور میں کدھر جاؤں   نشانِ گردِ رہِ کارواں نہیں ملتا

جرس = قافلہ کی گھنٹی

شاعر زمانہ کے کارواں سے بچھڑ گیا ہے اور کارواں اتنی دور جا چکا ہے کہ راہ میں گرد بھی نہیں جو اسے بتا سکے کہ کارواں کس سمت کو گیا ہے۔ وہ حیران و پریشان تنہا کھڑا ہے اور دور سے آنے والی صدائے جرس سے کہتا ہے کہ تو ہی میری رہنمائی کر دے کہ میں کس سمت کو جاؤں۔

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی   وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

اس دنیا میں انسان کی حیثیت مہمان کی سی ہے اور میزبان خدا ہے جو اس کا مالک ہے۔ مگر ستم کی بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو دنیا میں آنے کی دعوت دی اور خود چھپ گیا۔ گویا میں ایسا مہمان ہوں جس کو میزبان نہ مل سکا۔ دنیا میں آن کر انسان کی بدحالی کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر   بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

شاعر کا دل بہت دن سے لاپتہ ہے۔ اسے محبوب پر شبہ ہے مگر براہ راست اپنے

شبہ کا اظہار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے ایک نئے انداز سے اس سے دریافت کرتا ہے کہ خدا آپ کے تیرِ نظر کو سلامت رکھے، میرا دل عرصہ سے نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ کہیں آپ کے تیرِ نظر نے تو اس کو اپنا نشانہ نہیں بنا لیا۔ داغؔ کا شعر ہے:

اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہو گے
پہلو میں ہمارے دلِ مضطر نہیں ملتا

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا   یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا

حقیقتِ حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی تجھ تک نہیں پہنچ سکا ہے لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو اپنی اس نارسائی کا احساس ہو اور ہر ایک اپنے طور پر اس زعم میں مبتلا ہے کہ اس کو تیری معرفت حاصل ہو گئی۔ یہ بات بھی ایک راز بنی ہوئی ہے کہ دنیا میں کوئی تیرا رازداں (تجھے پہچاننے والا) ہے ہی نہیں۔

مجھے عزیز سہی، قدرِ دل، تمھیں کیوں ہو   کمی تو دل کی نہیں، دل کہاں نہیں ملتا

دل ہمارے لیے خواہ کتنا ہی قیمتی اور عزیز کیوں نہ ہو محبوب کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں کیونکہ اس کے لیے دل کی کمی نہیں۔ وہ جتنے دل چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ بقول سیمابؔ:

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

دیارِ عمر میں اب قحطِ مہر ہے ثاقبؔ   کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

دیارِ عمر = مراد دنیا

دنیا میں محبت اور ہمدردی نام کی چیز اب باقی نہیں رہی۔ قحطِ مہر کی وجہ سے کوئی ایسا نہیں جو ہمارا پرسانِ حال ہو۔ ایک موت ہے جس سے امیدِ وفا باقی ہے۔

(۴۵)

بیگانۂ اختیار ہو جا   راضی برضائے یار ہو جا

محبت کا تقاضا ہے کہ عاشق اپنی مرضی و اختیار سے بے نیاز ہو کر اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی سے ہم آہنگ کر دے، تب ہی اسے عشق کی منزل مل سکتی ہے۔

جینے کو یہ آسرا بہت ہے   اچھا ہے امیدوار ہو جا

دوست کے وعدۂ وصل کا سہارا ہی زندگی گذارنے کو بہت ہے۔ اس سے مطلب نہ رکھو کہ وہ وعدہ وفا کرے گا بھی یا نہیں۔ اس کی امید پر ہی زندگی گذار دے۔

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر   ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

غیرت اور ہمت کا تقاضا ہے کہ دنیا کے غموں سے فرار حاصل کرنے کے بجائے غم کو خوش آمدید کہا جائے اور دل کی بے قراری کا مداوا ڈھونڈھنے کے بجائے اس کو گلے سے لگا لیا جائے۔

اے درد یہ چٹکیاں کہاں تک   اٹھ اور جگر کے پار ہو جا

عاشق کے دل میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں جو اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک بار درد ایسی شدت سے اُٹھے کہ جگر ٹکڑے ہو جائے۔ غالب کہتے ہیں:

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ ہجر میں ستم ہے
کوئی ظلم مجھ پہ ہوتا مگر ایک بار ہوتا

ماتم کدۂ وفا ہے عالم   فانؔی دلِ سوگوار ہو جا

زمانہ سے وفا کا خاتمہ ہو گیا ہے اور دنیا میں اس کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ اے فانؔی تجھے بھی لازم ہے کہ اس ماتم میں شریک ہو۔

(۴۶)

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اُٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اُٹھا

شاعر دوست سے ملاقات کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے سامنے سے اُٹھ کر جانے سے ایسا محسوس ہوا گویا سیکڑوں بجلیاں عاشق کے وجود پر ٹوٹ پڑیں اور اس کی نگاہیں ایک بار عاشق کی جانب اُٹھ گئی تھیں کہ دِل جل کر خاک ہوگیا اور اس سے دھواں نکلنے لگا۔

جلوہ محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر
قیدِ آدابِ تماشا بھی تو محفل سے اُٹھا

دنیا میں ہر سو خدا کے جلوے عیاں ہیں لیکن پھر بھی ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے کیونکہ اُس نے ہماری نگاہ پر پابندیاں لگا دی ہیں اور اپنے دیکھنے کے لیے کچھ ضابطے اور قوانین مقرر کر دیئے ہیں (مثلاً یہ کہ اسے دیکھنے کے لیے کعبہ یا دیر میں جانا چاہیے) اسی لیے شاعر خدا سے ہی التجا کرتا ہے کہ تو ہمیں ان آداب و قیود سے بے نیاز کر دے تاکہ ہم تجھے ہر جگہ دیکھ سکیں۔ مراد یہ کہ خدا کے جلوؤں کو دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اوّل نگاہ و دل کو ہر ظاہری امتیاز سے بالاتر کر لیا جائے۔

پھر تو مضرابِ جنوں سازِ انا لیلیٰ چھیڑ
ہائے وہ شور انا القیس کہ محمل سے اُٹھا

مضراب = ساز کے تاروں کو چھیڑنے کا آلہ   انا لیلیٰ = میں لیلیٰ ہوں
انا القیس = میں قیس ہوں

محبت کی معراج یہ ہے کہ عاشق اور محبوب میں دوئی باقی نہ رہے اور دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گم ہو جائیں کہ قیس انا لیلیٰ پکارے اور لیلیٰ کے محمل سے آوازیں بلند ہوں کہ "انا القیس" (میں قیس ہوں)۔

اختیار ایک ادا تھی مری مجبوری کی
لطفِ سعئ عمل اس مطلبِ حاصل سے اُٹھا

اللہ تعالیٰ نے ہماری مجبوری پر اختیار کا پردہ ڈال دیا ہے۔ مجبوری کو اختیار کی صورت دینے سے یہ مقصد تھا کہ زندگی کی جدوجہد میں ہماری دلچسپی قائم رہے اور ہم مایوس ہو کر سعی و عمل سے ہاتھ نہ اُٹھائیں۔

عمرِ امید کے دو دن بھی گراں تھے ظالم
بار فردا نہ ترے وعدۂ باطل سے اُٹھا

محبوب نے عاشق سے کل آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اگرچہ اس کا وعدہ جھوٹ تھا مگر عاشق اس امید پر زندہ رہنے کو تیار تھا۔ محبوب کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ عاشق دو روز امید پر زندگی گذارے اس لیے وہ فوراً ہی وعدہ سے مکر گیا۔

خبرِ قافلۂ گم شدہ کس سے پوچھوں
اک بگولہ بھی نہ خاکِ رہِ منزل سے اُٹھا

بگولہ = گرد باد۔ خاک کا جھونکا

قافلہ گذرنے کے بعد اس کے پیچھے راستے میں خاک اُڑتی رہتی ہے جس سے قافلے کی سمت منزل کا اندازہ لگایا جاتا ہے مگر میں اپنے کھوئے ہوئے قافلے کا سراغ کیونکر لگاؤں کیونکہ ان کی منزل کی راہ میں تو خاک کا ایک بگولا بھی نہیں جس سے قافلے کی خبر ملتی۔ مراد یہ کہ راہِ عدم کے مسافر جانے کے بعد اپنا کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔

ہوش جب تک ہے گلا گھونٹ کے مر جانے کا
دمِ شمشیر کا احساں ترے بسمل سے اُٹھا

عشق میں ہمیں جب تک ذرا سا بھی ہوش باقی ہے ہم تلوار کے احسان مند نہ ہوں گے

اس کے بجائے اپنا گلا گھونٹ کر خود ہی جان دے دیں گے کیونکہ تلوار کا احسان ہم سے نہ اُٹھایا جائے گا۔

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ اُٹھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اُٹھا

شاعر کی زندگی موت سے بدتر تھی گویا اس کی زندگی نہیں بلکہ صرف زندگی کا الزام تھا جس کو وہ بڑی مشکل سے اُٹھا سکا۔ اسی طرح موت کو زندگی کے مصائب کا خاتمہ سمجھنا اور اس کا انجام خیال کرنا بھی ایک غلط خیال ہے اور زندگی پر ایک بھاری تہمت ہے مراد یہ کہ موت کے بعد بھی مصائب کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ ؏
صرف اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

کس کی کشتی تہِ گردابِ فنا جا پہنچی
شورِ لبّیک جو فانیؔ لبِ ساحل سے اُٹھا

کون خوش نصیب موت کے طوفان میں غرق ہوا ہے کہ ساحلِ عدم جس کا منتظر ہے اور اس کا استقبال کر رہا ہے۔

(۴۷)

دل کی کایا غم نے وہ پلٹی کہ تجھ سا بن گیا
درد میں دل ڈوب کر قطرہ سے دریا بن گیا

شاعر کے نزدیک غم انسان میں عظمت و بلندی پیدا کر دیتا ہے۔ غم سے پہلے دل ایک بے حقیقت شے تھا لیکن غم نے اس کی عزت اسقدر بڑھائی کہ وہ تیری (محبوب کی) ہمسری کرنے لگا۔ گویا دل جو ایک قطرہ کی طرح بے حقیقت تھا غم کی بدولت ایک دریائے بیکراں ہو گیا۔

ان کی آغوشِ مشیّت میں ہے ناکامی مری
کام کچھ اس طرح بگڑا ہے کہ گویا بن گیا

آغوشِ مشیت ۔ مشیت کی تحویل میں ہونا۔

ہمیں جب سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری ناکامیوں میں محبوب کی مرضی شامل ہے۔ اس وقت سے ہمیں اپنی ناکامیاں کامیابیوں سے زیادہ عزیز ہو گئی ہیں یعنی میرا کام بگڑ کر بن گیا ہے۔

دل کی رُت ایسی تو یادِ یار نے بدلی نہ تھی
یہ چمن اُجڑا ہی اس ڈھب سے کہ صحرا بن گیا

ہمارا دل جو ایک چمن کی طرح شگفتہ تھا اس کا موسم بدلنے (اجاڑنے) میں یادِ یار کا اتنا حصّہ نہیں ہے جتنا خود اس کے اپنے مزاج کا ہے۔ اس کے اُجڑنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ جس نے اسے صحرا بنا دیا۔

نقشِ موہومِ حیات، افسانہ در افسانہ تھا
جب یہ نقش اُبھرا تو اک حرفِ تمنّا بن گیا

انسانی زندگی ایک نقشِ خیالی کی طرح غیر واضح اور مبہم تھی۔ یہ ایک افسانہ تھی جس سے بے شمار دوسرے افسانے وابستہ تھے لیکن جب اس نقشِ موہوم میں عشق نے رنگ بھرا تو اس میں یقین بھی پیدا ہوا اور معنویت بھی۔ افسانہ در افسانہ کہنے میں اشارہ یہ ہے کہ اول تو افسانہ خود ہی غیر حقیقی ہوتا ہے اور پھر جب افسانہ سے افسانہ نکلتا ہے تو اس میں پیچیدگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

تو مبارک لذّتِ غم بھی ہے اس کو ناگوار
دل محبت میں جو بننا چاہیے تھا بن گیا

شاعر کو خوشی اور لذّت کے نام سے اس قدر نفرت ہے کہ جب اس کو غم میں لذت ملنے لگی تو وہ اس سے بھی بے زار ہو گیا۔ اس منزل پر آکر وہ اپنے کو مبارک باد دیتا ہے کہ یہی منزلِ محبت کی معراج ہے کہ لذّاتِ دنیا سے تنفّر اس قدر پیدا ہو جائے کہ لذتِ غم سے بھی بے تعلقی اختیار کر لی جائے۔

جلوۂ کثرت خود اپنا شوقِ بے اندازہ تھا
محملِ لیلیٰ میری نظروں میں لیلا بن گیا

جلوۂ کثرت = خدا کی تجلّی جو عاشقوں کو دنیا کی ہر شے میں نظر آتی ہے۔
نظریۂ ہمہ اوست کے مطابق دنیا کی ہر چیز میں خدا یا اس کا جلوہ موجود ہے اور عاشق اسے ہر چیز میں جلوہ گر دیکھ سکتا ہے۔ مگر فانی اس کثرت کے وجود کے قائل ہی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میرے بڑھے ہوئے عشق نے یہ سارے جلوے خود ہی تراش لیے ہیں۔ مجھے جو ہر چیز میں اپنے محبوب کے حسن کا جلوہ دکھائی دیتا ہے یہ دراصل میرے شوقِ بے حد کی کارفرمائی ہے اور جنھیں میں لیلیٰ (محبوب) سمجھ بیٹھا ہوں وہ دراصل محملِ لیلیٰ سے زیادہ نہیں کہ محبوب کو اپنے اندر چھپائے ہے۔

یہی محرومی بھی رسوا ہے کہ فانی حالِ دل
ان کے کانوں تک نہ پہنچا اور فسانا بن گیا

قسمت تو دیکھو کہ عشق میں ہمیں محرومی کے ساتھ ساتھ رسوائی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ہمارا افسانۂ محبت دنیا میں تو مشہور ہو گیا مگر محبوب کے ہی کانوں تک نہ پہنچ سکا۔

(۴۸)

نذرِ دردِ دل، غمِ دنیا کیا   اک مٹایا داغ اک پیدا کیا

غم اور حسرتوں کے داغ ہمارے دل کی تقدیر ہیں خواہ وہ غمِ روزگار ہو یا غمِ عشق۔ پہلے دنیا کی حسرتوں کے داغ دل پر تھے۔ محبت نے آکر غمِ دنیا سے نجات دلائی تو اب عشق کے داغوں نے اس کی جگہ لے لی۔

رونمائے جوشِ حیرت تھی نگاہ   آئینہ منھ آپ کا دیکھا کیا

رونما = منھ دکھائی۔
محبوب آئینہ کے سامنے آیا تو اس کے حسن کو دیکھ کر آئینہ اس قدر حیران ہوا کہ

اس کا منھ دیکھتا رہ گیا اور رونمائی میں اس نے محبوب کو اپنی نگاہیں ہی پیش کر دیں۔ آئینہ کے لیے دیدۂ حیراں کی تشبیہ عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ نیز یہ کہ اس میں نگاہ نہیں ہوتی۔ میرؔ کے اس شعر میں بھی یہی تصوّر پایا جاتا ہے:

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا   حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

بجلیاں بھر دیں نگاہِ یار میں   تو نے آہِ آتشیں یہ کیا کیا

بجلیاں بھری نگاہیں علامت ہیں غیظ و غضب کی۔ عاشق کی شعلہ بار آہیں سُنکر دوست اور بھی غضب ناک ہو گیا گویا اس کی اپنی آہیں اس کی دشمن ہو گئیں کہ انھوں نے محبوب کی نگاہوں کو اور زیادہ برق پاش بنا دیا۔

وسعتِ دل تھی بقدرِ دادِ عشق   قطرہ دریا تھا جسے دریا کیا

عام خیال کے مطابق دل کی اہمیت و عظمت عشق کی وجہ سے ہے۔ لیکن فانیؔ اس شعر میں کہتے ہیں کہ عشق کا مورد دل کو اس لیے ٹھہرایا گیا کہ اس کی وسعتیں صرف دل ہی میں سما سکتی ہیں۔ دل اگرچہ قطرہ تھا لیکن اس میں پہلے ہی سے دریا بننے کی صلاحیت تھی سو عشق اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آیا اور اسے صحیح معنوں میں دریا بنا دیا۔ میرؔ کے اس شعر میں بھی دل کی اسی بلند ہمتی کی طرف اشارہ ملتا ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی   اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

نالہ کیا، ہاں اک دھواں سا شامِ ہجر   بسترِ بیمار سے اُٹھا کیا

ہمارے سوزِ دل کا اثر اب نالوں میں بھی نمایاں ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محبوب کی جدائی میں ہمارے ہونٹوں سے نالے نہیں نکلتے بلکہ بستر سے ایک دھواں سا اُٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ تپشِ دل کے ساتھ ناطاقتی کا اظہار بھی ہے کہ اب نالے کرنے کی طاقت بھی نہیں۔

سخت نازک تھا مزاجِ دردِ عشق   دل فدائے حسنِ بے پروا کیا

ہم اپنے دل کو غمِ عشق کی نذر کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی نازک مزاجی کو دیکھ کر اسے دل دینے کی جرأت نہ کر سکے بلکہ اسے حُسن پر سے نچھاور کر دیا گو اس کی نظر میں بھی دل کی کوئی قیمت نہ تھی۔ مراد یہ کہ حسن کی چاہت عشق کا ادنا مقام ہے اور اس کی آخری منزل غم ہے۔ فانؔی ہمیشہ غمِ عشق کو حُسن پر ترجیح دیتے ہیں۔

زیست تھی بے کار فانؔی دل کے بعد　　جان بھی قربان کی اچھّا کیا

دل کھونے کے بعد زندگی بے کار ہے، اسی لیے عاشق نے اس کو بھی محبوب پر قربان کر دیا۔

(۴۹)

آشنائے رسمِ جنوں سے نہیں سودا اپنا　　عالمِ ہوش کا ہر ذرّہ ہے صحرا اپنا

سودا = جنون۔

ہمارا جنون کسی رسم کا پابند نہیں اسی لیے ہم عالمِ جنون میں بھی دوسرے عُشّاق کی طرح جنگلوں میں خاک نہیں اُڑاتے۔ ہم نے ہوش کی دنیا میں رہتے ہوئے ہر قید سے آزادی حاصل کر لی ہے اور اسی کے ذرّوں کو صحرا بنا لیا ہے۔

حُسن بیتابِ تجلّی ہے اور آنکھیں محروم　　تھا مگر شوق ہی انکارِ تقاضا اپنا

مگر = شاید۔

محبوب اپنی تجلّی دکھلانے کو بیتاب ہے پھر بھی ہماری آنکھیں اس کی دید سے محروم ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری شدّتِ شوق نے ہمیں تقاضائے دیدار سے روکے رکھا اور ہم اسے دیکھ بھی نہیں پائے۔

کیوں فلک یہ کوئی گردش میں ہے گردش کہ ہنوز　　تجھ سے بدلا نہ گیا رنگِ تمنّا اپنا

اپنا سے مراد ہے شاعر کا۔ آسمان کی گردش دنیا کے انقلاب اور تغیّر کا سبب ہے لیکن ہم ایسی گردش کے قائل نہیں جس سے ہماری محبّت کے انداز کو نہ بدلا گیا اور

نہ ہماری ناکامیوں کو کامیابی میں تبدیل کیا جاسکا۔ مراد یہ کہ زمانہ کے انقلابات اور آسمان کی گردشیں بھی محبت کے مزاج کو بدلنے سے قاصر ہیں۔

جا کے شاید پلٹ آیا تھا کہ منزل کے قریب
نظر آتا ہے مجھے نقشِ کفِ پا اپنا

نقشِ کفِ پا = پیروں کے نشان

بے خودی میں عاشق کو اتنا بھی ہوش نہیں کہ وہ اپنی راہ اور منزل کا پتہ لگا سکے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل کے قریب میرے قدموں کے نشان موجود ہیں۔ شاید میں منزل تک پہنچ کر بے خودی میں پلٹ آیا ہوں۔

دلِ ناکام تری یاد سے نومید نہیں
گل بداماں ہے ابھی خارِ تمنا اپنا

نومید = مایوس   گل بداماں = دامن میں پھول لیے ہوئے

شاعر اپنی ناکام تمناؤں کو کانٹا اور محبوب کی یاد کو پھولوں سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ناکامیوں کے باوجود میں مایوس و محزون نہیں۔ ابھی میری تمناؤں میں تیری یادوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔

عجزِ نظارہ ترے حسن کا پردہ ہے تو خیر
اسی پردہ سے دکھا دے رُخِ زیبا اپنا

عجزِ نظارہ = نگاہوں کی کم مائگی

یہ میری نگاہوں کا عجز اور کم مائگی ہے کہ تیرے حُسن کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتیں اور میری نگاہوں کی یہ نارسائی تیرے حُسن کا پردہ بن گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں تیرے لطف و عنایت سے اُمید رکھتا ہوں کہ تو اسی پردے سے اپنے حسین چہرے کی جھلک مجھے دکھا دے گا۔

دلِ بیتاب کو پیغامِ سکوں ہے فانی
چشمِ بد دور، غمِ حوصلہ فرسا اپنا

حوصلہ فرسا = ناقابلِ برداشت۔ ہمّت شکن۔

ہمارے غم کو کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ اس ناقابلِ برداشت غم نے آج

وہ کام کیا ہے جو کسی سے نہ ہو سکا یعنی دل جسے آج تک کوئی خاموش نہ کر سکا تھا غم نے اسے سکون عطا کر دیا ہے۔

(۵۰)

جمال خود رُخِ بے پردہ کا نقاب ہوا
نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا

ہمارے محبوب کا پردہ دنیا سے نرالا ہے۔ اگرچہ اس کا چہرہ بے نقاب ہے لیکن جلووں کی فراوانی کے باعث کسی کو دیکھنے کی تاب نہیں۔

اصغر کا شعر ہے:

میں کامیابِ دید بھی، محرومِ دید بھی
جلووں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا

غالب کہتے ہیں:

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منھ چھپائے کیوں

کسی شاعر نے کہا ہے:

جلووں سے ڈال دیا چشمِ تماشا پہ حجاب
یہ نئی وضع ہے ظالم ترے شرمانے کی

ملا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض
وہ ایک لمحۂ ہستی کہ صرفِ خواب ہوا

کائنات کے لامتناہی سلسلہ میں انسانی زندگی کی حقیقت ایک لمحۂ مختصر سے زیادہ نہیں اور وہ لمحہ بھی انسان اپنی غفلت سے بے بنیاد چیزوں کی خواہش میں برباد کر دیتا ہے اور خوابوں میں گذار دیتا ہے۔

سکونِ قلب میسر ہے موت ہی سے سہی
غرضکہ خاتمۂ رنجِ اضطراب ہوا

زندگی میں ہم سدا رنج و اضطراب میں مبتلا رہے۔ موت نے آکر ان سارے غم و رنج کا خاتمہ کر دیا۔ چلو سکون تو میسّر ہوا' بلا سے موت کے ذریعے سے ہی سہی۔

وہ جلوہ مفتِ نظر تھا نظر کو کیا کہیے
کہ پھر بھی ذوقِ تماشا نہ کامیاب ہوا

مفتِ نظر = ارزاں

دنیا میں تجلّیاتِ الٰہی ہر جگہ عام تھیں اور ہر شے میں اس کا جلوہ تھا مگر ہماری کوتاہیِ نظر کہ ہم اس کا دیدار نہ کر سکے۔

اُلٹ گئی مری اُمید و بیم کی دُنیا
یہ کیا نظامِ تمنّا میں انقلاب ہوا

بیم = خوف

محبّت نام ہے امید و بیم کا۔ کامیابی کی امید اور ناکامی کا خوف محبت کا لازمی جزو ہیں۔ لیکن نہ جانے ہمارے دل کی دنیا میں کیسا انقلاب آیا ہے کہ ہمارے اندیشوں اُمیدوں کی دنیا ہی درہم و برہم ہو گئی۔

گناہگار سہی دل مگر قصور معاف
ظہورِ شوق بہ اندازۂ حجاب ہوا

اگر دنیا میں آکر میرے شوق اور تڑپ میں کوئی کمی آگئی ہے تو اس میں میرے دل کے ساتھ ساتھ تیری ادائے حجاب بھی خطا وار ہے کہ تو نے اپنے حسن کو حجابات میں مستور کر رکھا ہے اور ہمارا شوق انہی حجابات کے انداز کے مطابق رہا۔

قضا کو مژدۂ فرصت کہ فانیِ مہجور
شہیدِ کشمکشِ صبر و اضطراب ہوا

مہجور = ہجر کا مارا

فانی جو ہجر کی تکلیفوں میں مبتلا تھا، آج اس نے جان دے دی ہے۔ یہ خوش خبری موت کو سنا دو کہ اس کا کام صبر اور اضطراب کی کشمکش نے پورا کر دیا اور موت کو اس کی جان لینے کی زحمت سے بچا لیا۔

(۵۱)

جلوۂ عشق حقیقت تھی، حسنِ مجاز بہانہ تھا
شمع جسے ہم سمجھے تھے، شمع نہ تھی پروانہ تھا

مجاز = ظاہر۔ جو حقیقت نہ ہو

فانی کے اشعار میں یہ خیال جا بجا ملتا ہے کہ حسن اور عشق اصلاً ایک ہی ہیں۔ عشق اس کائنات کی اصل حقیقت ہے جو اپنے اظہار کے لیے حسنِ مجاز کو ذریعہ بنا لیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ حسنِ مجاز کے جلوے حقیقت (عشق) کے ظہور کا وسیلہ تھے۔ گویا حسن بھی عشق ہی کا ایک پہلو تھا اور جسے ہم شمع تصور کرتے ہیں وہ بھی پروانے کی طرح عشق کا ایک مظہر تھی۔ مراد یہ کہ اس کائنات کی اصل عشق ہے اور عاشق اور حسن دونوں اسی حقیقت کے دو روپ ہیں۔

شعبدے آنکھوں کے ایسے ہم نے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی، بند ہوئی افسانہ تھا

بہت سے دوسرے صوفی شعراء کی طرح فانی بھی دنیا کو محض "فریب چشم و گوش" سمجھتے ہیں اور زندگی کو ایک شعبدہ یا تماشا خیال کرتے ہیں کہ جب تک انسان دنیا میں زندہ ہے یہاں کی ہر چیز اس کے لیے حقیقت ہے لیکن جہاں موت کی نیند طاری ہوئی سب چیزیں افسانہ بن جاتی ہیں۔ یاس یگانہ کا شعر ہے:

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش   دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

عہدِ جوانی ختم ہوا، اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مرجانے کا زمانہ تھا

جوانی زندگی کا سب سے دلکش دور ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان کے دل میں حوصلے

اور تمنائیں ہوتی ہیں اور نہ ہمیں جان دینے کی تمنا ہوتی ہے۔ ہمارا وہ دور گزر چکا ہے اور اب یہ حال ہے کہ نہ ہمارا شمار زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔

دل اب دل ہے خدا رکھے ساقی کو مے خانہ کو
ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا پیمانہ تھا

ہمارا دل ایک ٹوٹے ہوئے پیمانے کی طرح بے وقعت و شکستہ تھا لیکن خدا ساقی اور مے خانہ کو سلامت رکھے کہ ان کی بدولت دل، دل بن گیا۔ ساقی سے یہاں مراد ہے محبوب اور مے خانہ سے مے خانۂ محبت۔

فانیؔ گو کیسا ہی سہی، پھر بھی تجھی سے نسبت ہے
دیوانہ تھا، کس کا تھا، تیرا ہی دیوانہ تھا

اگرچہ فانیؔ بدنام و رسوا ہو چکا ہے اور دیوانہ ہو گیا ہے مگر ہے تو آخر تمھارا ہی دیوانہ۔ اس سے اس طرح بے گانگی اور بے رُخی مناسب نہیں ہے۔

(۵۲)

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

ہم چمن کے عاشق ہیں اس لیے اس کی ہر چیز اور ہر روپ کو عزیز رکھتے ہیں۔ ہمیں بہار و خزاں میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا اور صرف پھول ہی نہیں بلکہ کانٹے بھی ہمیں عزیز ہیں۔ جگرؔ مراد آبادی

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

دل ہے تری نگاہ تک جان ہے ایک آہ تک
حوصلۂ اُمید کیا ظرفِ اُمیدوار کیا

ہم کس بھروسے پر دل میں امیدوں کو جگہ دیں کیونکہ نہ ہمارا ہی کوئی اعتبار ہے نہ دل کا۔

جہاں تیری نگاہوں کا تیر چلا دل کا خاتمہ ہے۔ اور زندگی ختم کرنے کو خود ہماری ایک آہ کافی ہے۔

محوِ فروغِ ذات ہوں بے خبرِ صفات ہوں
کوئی ہو، شمع بزم کیا، شمعِ سرِ مزار کیا

ذات سے مراد ذات باری تعالیٰ اور صفات سے مراد ماسوا خدا یعنی کائنات کی تمام چیزیں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ذات کا پرتو ہیں۔ قبر پہ جلنے والی شمع اور محفل میں جلنے والی شمع اگرچہ اپنی صفات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے برعکس ہیں لیکن ہم ان کی ان ظاہری خصوصیات سے بے پروا ہیں اور صرف ان کے اندر چھپے ہوئے نور کو دیکھ رہے ہیں۔ مراد یہ کہ خوشی و غم بہ ظاہر جدا سہی لیکن جن کی آنکھیں بینا ہیں وہ ان دونوں میں ایک ہی حقیقت کو جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

ہوش سے احتراز کر فاش نہ غم کا راز کر
دغدغۂ حساب کیوں، شکوۂ روزگار کیا

احتراز = پرہیز
دغدغہ = خوف، دھڑکا

اہلِ ہوش کے لیے اِس دنیا میں اور اُس دنیا میں سیکڑوں دھڑکے اور فکریں ہیں، اس لیے انسان کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے ہوش سے بچے اور غم کا شکوہ کرنے کی بجائے اسے سینہ سے لگائے رکھے۔ غمِ دنیا ہو یا غمِ عقبیٰ دونوں محبوب (اللہ) کا عطیہ ہیں۔ ان کا شکوہ کر کے اس غم کو رسوا نہ کرو۔

حد سے سوا جفا سہی مجھ پہ ہے غیر پر نہیں
جوششِ سیلِ گریہ کون، ضبط کو ناگوار کیا

جوششِ سیلِ گریہ = آنسوؤں کے طوفان کی شدّت

اگرچہ محبوب کی جفائیں حد سے بڑھ گئی ہیں لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ رقیب پر جفا نہیں کرتا بلکہ ہمیں اس کا اہل سمجھتا ہے۔ جب میں اس کی جفاؤں پر راضی ہوں تو آنسوؤں کے سیلاب کو یا ضبط کو کیا حق ہے کہ اس سے گھبرائیں۔ محبوب کی جفاؤں پہ بے اختیار جو آنسو آنکھ سے

بہتے ہیں شاعر کو ان آنسوؤں پر بھی غصہ ہے۔

جو غم بے اثر نہ ہو جو شب بے سحر نہ ہو
وہ غمِ انتظار کب وہ شبِ انتظار کیا

شاعر کو تڑپنے اور غم اُٹھانے میں ایسی لذت ملتی ہے کہ اب اسے جدائی کی تکلیفوں میں بھی مزا ملتا ہے وہ اس غم کو غم نہیں سمجھتا جو قلب و جگر کو ٹکڑے نہ کر دے۔ نہ اس رات کو انتظار کی رات سمجھتا ہے جس کی صبح ہو جائے۔ اس کے نزدیک انتظار کا لطف ہی یہ ہے کہ وہ کبھی ختم نہ ہو۔ غالبؔ کہتے ہیں :

ہو سکتی ہو جس زخم کی تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیے ، زحمتِ انتظار کیا

محبوب (اللہ تعالیٰ) نے قیامت کے روز اپنا دیدار دکھانے کا وعدہ کیا ہے لیکن اگر عاشق کا جذبۂ شوق مکمل ہے تو اسے حشر تک انتظار کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہے حشر برپا کر کے اس کے جلوے کو دیکھ سکتا ہے۔

کھیل تھا سب امید کا ، یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا
آرزوؤں کی کیا بساط ، شوق کا کاروبار کیا

امید پر ہی دنیا قائم ہے۔ اگر دل سے امیدیں رخصت ہو جائیں تو شوق و تمنا کی کائنات بھی ختم ہو جائے۔

فانیؔ اب اپنی زندگی حسنِ عتاب یار ہے
دیکھیے مرگِ ناگہاں ، لائے پیامِ یار کیا

اس شعر میں آدمؑ کے جرم پر انھیں فردوس سے دنیا میں بھیجے جانے کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم اس دنیا میں سزا کے دن گذار رہے ہیں اور یہ

محبوب کے غصّے کا نتیجہ ہے۔ ہم موت کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہیں کہ شاید اس کے ذریعہ ہمیں پھر سے محبوب کا قرب اور اس کی عنایتیں حاصل ہو جائیں۔

(۵۳)

میں ندامت جان کر خوش ہوں یہ منظر دیکھنا
وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مڑ کر دیکھنا

محبوب عاشق کو ستا کے یوں روانہ ہوا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ عاشق کی وفا پرست طبیعت اس کی اس ادا کو ندامت پر محمول کرتی ہے اور وہ اسی پر خوش ہے۔

دیدنی ہے رنگ دل میں ڈوب کر کھنچنے کے بعد
تم ابھی کیا دیکھتے ہو تھم کے خنجر دیکھنا

محبوب جو وار کرنے سے پہلے خنجر کی طرف دیکھ رہا ہے عاشق اس سے کہتا ہے کہ ابھی تم خنجر کو کیا دیکھ رہے ہو۔ جب یہ ہمارے سینہ میں ڈوب کر خون میں رنگین ہو کر نکلے تب اس کی آب و تاب دیکھنا۔

ذکرِ خورشیدِ قیامت سُن کے واعظ کیا کہوں
خیر اس تر دامنی کو روزِ محشر دیکھنا

تردامنی = گنہگار ہونا۔ (لغوی معنی بھیگا ہوا دامن)

واعظ شاعر کو اس کے گناہوں پر تنبیہ کرتا ہے اور روزِ قیامت کی گرمی سے ڈراتا ہے جب روایات کے مطابق سورج سوا نیزہ کے فاصلے پر آجائے گا۔ اس پر شاعر کہتا ہے کہ ابھی تو میں کیا کہوں تم روزِ محشر میری اس تردامنی کا مرتبہ دیکھنا۔ میری یہی تردامنی خورشید محشر کی آگ کو ٹھنڈا کر دے گی۔ یعنی حشر میں میرے لیے باعثِ رحمت بن جائے گی۔

ماسوائے دل میں اک ہنگامہ برپا کر گیا
چشمِ کافر کا وہ دل لے کر مکرر دیکھنا

ماسوائے دل = دل کے علاوہ اور چیزیں۔

دل تو محبوب کی پہلی نگاہ کی ہی نذر ہو گیا تھا۔ دل لے کر جب اس نے دوبارہ نگاہِ ناز سے عاشق کی طرف دیکھا تو اس کے سارے وجود میں ایک محشر بپا ہو گیا اور جو کچھ بچ رہا تھا وہ بھی اس کی نذر ہو گیا۔

سانس کے جو آخری جھٹکوں میں ٹکڑے ہو گئیں
ہائے ان ناشاد آہوں کا مقدّر دیکھنا

میری بدنصیب آہوں کی قسمت تو دیکھو کہ وہ لبوں تک اس لیے آئی تھیں کہ اثر تک ان کی رسائی ہو جائے۔ مگر ساتھ ہی نزع کی ہچکیاں بھی آنے لگیں اور ان کے جھٹکوں میں آہیں درمیان ہی میں ختم ہو گئیں۔ "جو" کا لفظ "سانس" سے پہلے آنا چاہیے یعنی جو سانس کے آخری جھٹکوں میں ٹکڑے ہو گئیں۔ اس قسم کی تعقید فانیؔ کے یہاں اکثر پائی جاتی ہے۔

میرے دل کو چین آجانے کی ضامن موت ہے
تم کسی دن نبضِ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا

عاشق بے چین و مضطرب ہے اور اسے کسی صورت قرار نہیں۔ وہ محبوب سے سکون کے لئے سینہ پر ہاتھ رکھنے کی التجا کرتا ہے۔ محبوب بہانہ بنانے کے لیے کہتا ہے کہ کیا ضرور ہے کہ میرے ہاتھ رکھنے سے دل کو سکون ہو جائے گا۔ عاشق اپنی بات کی ضمانت میں موت کو پیش کرتا ہے۔ اشارہ یہ کہ محبوب عاشق کے سینہ پر ہاتھ رکھ دے گا تو عاشق وفورِ مسرت سے فوراً جان دیدے گا اور اس کے دل کو سکون مل جائے گا۔

مژدہ فصلِ گل کا لائے تو سہی بادِ بہار
ہر کڑی زنجیر کی زنداں سے باہر دیکھنا

ذرا بادِ نسیم کو بہار کی خوش خبری لے کر آنے دو۔ اُس وقت یہ زنجیریں بھی ہماری راہ میں حائل نہ ہو سکیں گی اور ہم جوشِ جنوں میں ان زنجیروں کو توڑ کر باہر آجائیں گے۔ یہ بات غزل کے مسلمات میں سے ہے کہ موسم بہار میں جوش جنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے سامنے کوئی زنجیر نہیں ٹھہر سکتی۔

جب ذرا پردہ سے جھانکا بجلیاں گرنے لگیں
ہے کوئی یہ دیکھنے میں بندہ پرور دیکھنا

عاشق محبوب سے شکایت گذار ہے کہ جب بھی وہ (محبوب) پردہ سے اپنے حسن کی جھلک دکھلاتا ہے تو اس کے حسن کی بجلیاں عاشق کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہیں اور عاشق محرومِ دید رہ جاتا ہے۔ اس میں اشارہ حضرت موسیٰ کے تجلیٔ الٰہی دیکھنے کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔

تشنہ لب بھی تھا میں ساقی بجان سے بیزار بھی
ساغر اور پھر زہر سے لبریز ساغر دیکھنا

ہم پیاسے بھی تھے اور تکلیفوں سے تنگ آ کر زندگی سے بیزار بھی۔ خوش قسمتی سے ہماری دونوں خواہشیں بہ یک وقت پوری ہو گئیں۔ محبوب نے ہم کو زہر سے لبریز ساغر دیا ہے جس سے تشنگی اور خواہشِ مرگ دونوں کی تسکین کا سامان ہو گیا۔

صبح تک فانیؔ ہر آوازِ شکستِ دل کے ساتھ
کیا قیامت تھا وہ تیرا جانبِ در دیکھنا

محبوب کے انتظار میں عاشق کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہے۔ انتظار کی شدّت کا یہ عالم ہے کہ دل کے ٹوٹنے کی آواز پر اسے محبوب کے قدموں کی آہٹ کا گمان ہوتا ہے اور ہر بار وہ دروازہ کی طرف تکنے لگتا ہے۔ مجبوری اور انتظار کی کیا مؤثر تصویر کھینچی ہے۔

(۵۴)

جمالِ بے حجاب تھا کہ جلوہ تھا حجاب کا
کلیم! برقِ طور تھی کہ تار تھا نقاب کا

طور پر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کا جو جلوہ دیکھا اور جسے دیکھ کر وہ بیہوش ہو گئے وہ بھی شاعر کے نزدیک اس کا جلوہ نہ دیکھ سکے تھے کیونکہ حسن بے نقاب کی تجلیات کی شدت ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان پردہ بن گئی تھیں اور جس کو وہ محبوب کی برقِ حسن خیال

کر رہے تھے وہ دراصل حسن کے چہرہ کی نقاب کا تار تھا۔ مراد یہ کہ کوئی آج تک اللہ تعالےٰ کے حسن کا مشاہدہ نہیں کر سکا ہے۔ جن چیزوں کو عاشق اس کا جلوہ سمجھتا ہے وہ بھی اس کے حسن کے پردہ سے زیادہ نہیں۔

بتائیے نہ حالِ دل، نہ حال پوچھتا ہوں میں
مآل پوچھتا ہوں میں دلِ وفا خراب کا

میں دل کی حالت کے متعلق دریافت نہیں کرتا کہ وہ مجھ سے جدا ہو کر محبوب کے پاس کس عالم میں ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر اس دل کا انجام کیا ہوگا جسے وفا نے تباہ کیا ہے۔

تجلّیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

تجلّیاتِ وہم = وہم کے نظارے   مشاہداتِ آب و گل = دنیا کے مناظر

شاعر کے نزدیک دنیا اور اس کی تمام اشیا، وہم سے زیادہ نہیں۔ ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ ہمارے اپنے تصورات اور وہم کا نتیجہ ہے۔ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے جیسے سوتے میں کسی انسان کے خواب میں کوئی خیال آجائے۔ اوّل تو خیال کا وجود خود ہی بے اصل پھر خواب کے خیال کی تو بے حقیقتی ظاہر ہی ہے۔

دلِ اذیت آفریں رہینِ امتحاں نہیں
خدائے بے نیاز ہے جہانِ اضطراب کا

اذیت آفریں = تکالیف پیدا کرنے والا   رہینِ امتحاں = آزمائش میں مبتلا

دنیوی غم والم کی توجیہ عام طور پر یوں کی جاتی ہے کہ غم دل کی آزمائش کے لیے ہوتے ہیں۔ فانی کے خیال میں غم والم دل کو آزمانے کے لیے نہیں ہیں بلکہ دل خود ہی ان غموں کا خالق ہے۔ دل کو خدائے بے نیاز کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ خود اذیتوں کی تخلیق کرتا ہے کنایہ چاہتے ہیں کہ دل کی ہستی ہی غموں کی ضامن ہے۔

ب روز حشر کی صدائے بازگشت ہوں
جوابِ بے سوال ہوں سوالِ بے جواب کا

قیامت کے دن جب کسی طاقت اور کسی چیز کا وجود باقی نہیں رہے گا اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "لِمَنَ الملك الیوم" (آج کے دن کس کی بادشاہی ہے) پھر خود ہی جواب میں ارشاد ہوگا لِلّٰہِ الواحد القہار (آج کے دن بادشاہی خدائے واحد و غالب کی ہے) شاعر کہتا ہے کہ روز حشر جو سوال کیا جائے گا اس کا جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا اور خدا خود ہی اس کا جواب دے گا۔ لیکن دنیا میں میری ہستی اسی سوال کی آوازِ بازگشت ہے اگرچہ ابھی وہ سوال کیا نہیں گیا۔ مراد یہ کہ میری بے ثباتی و بے حقیقتی نیز میری مجبوری و بے بسی اللہ تعالیٰ کی برتری و قدرت کی کھلی ہوئی شہادت ہے اور میری زندگی اُس سوال کا پیشگی جواب ہے۔ انسان کی مجبوری اور بے ثباتی کے پرانے مسئلہ کو بالکل نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جہانِ بے سکون میں سکون ہی سکون تھا
مری نگاہِ مضطرب ہے رازِ انقلاب کا

یہ دنیا جہاں سکون کا نام نہیں اور جہاں ہر شخص اضطراب و بے چینی میں مبتلا ہے۔ میری آمد (تخلیق آدم) سے پہلے بالکل ساکن و جامد تھی۔ اس میں انقلاب میری نگاہوں کی بدولت آیا یعنی میری سکون ناآشنا فطرت نے اس دنیا کو ہنگاموں سے بھر دیا۔

وہ صرف صد یقیں سہی حیات پھر حیات ہے
کہاں سے لاؤں اعتبارِ مرگِ کامیاب کا

" وہ " کا اشارہ زندگی کے لیے ہے۔ فانی کے مسلک میں موت کو زندگی پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ موت میں جو کامیابی (محبوب سے ملاقات کا یقین) اور ثبات ہے وہ زندگی کو حاصل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی لاکھ دل کش اور یقین کی حامل سہی، بہر حال زندگی ہے۔ اس پر وہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو موت پر کیا جا سکتا ہے۔

(۵۵)

کمالِ ہوش ہے یوں بے نیازِ ہوش ہوجانا
ترے آغوش میں بیگانۂ آغوش ہوجانا

عشق کی معراج اور ہوش مندی کی انتہا فانی کے نزدیک یہ ہے کہ عاشق کو اپنی ہستی کا احساس باقی رہے نہ محبوب کی قربت کا۔ محبوب کے آغوش میں پہنچ کر وہ آغوش اور تمنائے ہم آغوشی سے بھی بے نیاز ہوجائے۔

ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہیں
جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہوجانا

ہمیں محبت میں کبھی مسرت و کامرانی سے واسطہ نہیں پڑا۔ یا تو اشکباری کرتے رہے اور اشکباری سے فرصت ملی تو مجبوراً خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔ محرومی و غم نصیبی کا احساس بہر صورت قائم رہا۔

وہی برقِ تجلّی کارفرما اب بھی ہے لیکن
نگاہوں کو میسّر ہی نہیں بے ہوش ہوجانا

برقِ تجلّی = تجلّیٔ باری تعالیٰ۔

محبوب کی تجلّی اب بھی موجود ہے اور اپنے جلوے دکھا رہی ہے مگر اب دیکھنے والوں میں وہ ذوقِ تماشا نہیں رہا جو اس کو محسوس کریں اور اپنے ہوش و حواس اس پر قربان کردیں۔

بقولِ اقبال : جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

شبِ وعدہ خدا ناکردہ وہ آئیں نہ موت آئے
تو پھر اے زندگی تو موت کا آغوش ہوجانا

خدا نہ کرے اگر ایسا ہو کہ محبوب اور موت دونوں اپنے وعدہ سے پھر جائیں اور ہماری بیتابی بدستور رہے تو اے زندگی تو ہی ہم پر اتنا کرم کرنا کہ موت کی طرح ہمیں سکون سے آشنا

کر دینا۔ مراد یہ کہ وہ زندگی جو محبوب کی جدائی میں گذرے موت سے کم نہیں ہوتی اور موت کا بدل بن سکتی ہے۔

خدا رکھے شرارِ عشق کو، وہ شمعِ سوزاں ہوں
جلے جانا جسے ممکن ہے یا خاموش ہو جانا

عشق کی آگ کی بدولت میری حالت شمع کی سی ہے کہ جب تک دل میں عشق کی آگ لگی ہے میں زندہ ہوں۔ جیسے ہی یہ آگ ختم ہوئی موت آجائے گی۔ مراد یہ کہ عشق کی چنگاری اسی صورت میں بجھ سکتی ہے جب عاشق کی موت آجائے۔

بہار اپنی چمن اپنا قفس کی تیلیوں تک ہے
مبارک نکہتِ گل کو چمن بر دوش ہو جانا

چمن بر دوش ہونا - کاندھوں پر چمن اٹھائے ہوئے۔

چمن میں بہاریں کتنے ہی زور و شور سے کیوں نہ آئیں اور پھولوں کی خوشبو اپنے ساتھ سارے باغ کے حسن کو ہی کیوں نہ لے اڑے ہمیں اس سے کیا۔ ہم تو قفس سے وابستہ ہو چکے ہیں اور ہمارے لیے بہار اور چمن کا تصور قفس کی تیلیوں تک محدود ہے۔

خدا دشمن کو بھی یہ خوابِ محرومی نہ دکھلائے
اُدھر ایمائے پرسش اور اِدھر خاموش ہو جانا

ایمائے پرسش = اشاروں میں حال پوچھنا۔

ہماری بے بسی اور محرومی تو دیکھو کہ محبوب مہربان ہو کر پرسشِ حال کر رہا ہے اور ہم پر موت کی خاموشی طاری ہے۔ خدا یہ بے کسی کا وقت کسی دشمن پر بھی نہ ڈالے :

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب   تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

قیامت ہے یہ ٹکڑا داستانِ عشق کا یعنی
مرے راحت طلب دل کا اذیت کوش ہو جانا

اذیت کوش = تکلیفوں کا عادی۔

میری داستانِ عشق میں سب سے زیادہ عبرت خیز بات یہ ہے کہ میرا دل جو کل تک راحتوں کا جویا تھا اب اذیت کو ہی راحت سمجھنے لگا ہے یعنی عشق کی بدولت راحت اور اذیت کا احساس ہی ختم ہوگیا ہے۔

مرقع ہے کسی کی ہستیٔ موہوم کا فانی
وہ ان کا دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہوجانا

محبوب کا ایک لمحہ کے لیے سامنے آکر چھپ جانا ایسا ہی ہے جیسے انسان (عاشق) کی زندگی کا مختصر عرصہ جو پلک جھپکتے ہی گذر جاتا ہے۔ گویا اس کا ایک لمحہ کے لیے جلوہ نما ہونا ہماری موہوم زندگی ہی کی مثال یا اس کی تصویر ہے۔

(۵۶)

جلوہ گاہِ نازِ جاناں جب مرا دل ہوگیا
سامنا فانیؔ مجھے دل کا بھی مشکل ہوگیا

جب سے میرے دل میں محبوب کے جلوے سمائے ہیں خود دل میں ایسی تابانی پیدا ہوگئی ہے کہ مجھ میں دل کی طرف نظر اُٹھانے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ یعنی جلوۂ ناز کا نظارہ تو بڑی بات ہے میں اب اپنے دل کا بھی سامنا نہیں کرسکتا جو محبوب کی جلوہ گاہ بن گیا ہے۔

مژدۂ تسکیں سے بے تابی کے قابل ہوگیا
دل پہ جب تیری نگاہیں جم گئیں، دل ہوگیا

دل کی حقیقت ایک قطرۂ خون کی تھی مگر جب تو نے اس پر نظر التفات کی تو دل کو اپنا حقیقی مرتبہ حاصل ہوا یعنی اس میں اضطراب و بے چینی کی ایک دنیا پیدا ہوگئی اور گو تیری نگاہیں سکون کا پیغام لے کر آئی تھیں مگر وہ ہی ہماری بے چینی کا سبب بن گئیں۔

کر کے دل کا خون کیا بے تابیاں کم ہوگئیں
جو لہو آنکھوں سے دامن پہ گرا، دل ہوگیا

ہم سمجھے تھے کہ دل خون ہونے پر اس کی بے تابیوں میں کچھ کمی آجائے گی اور اسی توقع پر ہم نے خونِ دل کو آنکھوں کے ذریعہ بہا دیا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ خونِ دل کے جو قطرے آنکھوں سے ٹپک کر دامن پر گرے اس کے ہر قطرہ میں دل کی سی تڑپ اور بے چینی پیدا ہو گئی۔ مراد یہ کہ آنسو بہا کر بھی بے چینی میں کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہو گیا۔

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
لے کے تیرا نام کوئی آج غافل ہو گیا

بیمارِ ہجر کل تک تیرا نام سن کر شوق میں آنکھیں کھول دیتا تھا مگر وہی عاشق آج تیرا نام لیتا ہوا دنیا سے چل دیا۔ اندازِ بیان بے پناہ فطری اور بے ساختہ ہے۔

طور نے جل کر ہزاروں طور پیدا کر دیئے
ذرہ ذرہ میرے دل کی خاک کا دل ہو گیا

جو دل محبت میں فنا ہوتا ہے وہ مٹتا نہیں بلکہ اسے ایسی زندگی حاصل ہو جاتی ہے جو صدہا زندگیوں پر بھاری ہے چنانچہ میرے دل کی خاک سے سیکڑوں دل بن گئے۔ دل کو شاعر نے طور پر اس بنا پر کہا ہے کہ طور کی طرح اس کا دل بھی حسنِ دوست کی تجلی سے فیض یاب ہوا تھا اور وہ بھی طور کی طرح جل کر راکھ ہو گیا۔

موت آنے تک نہ آئے، اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

محبوب عاشق کی زندگی میں کبھی اس کے پاس نہ آیا جس کی وجہ سے اسے زندگی دوبھر رہی۔ اب جبکہ اس کا آخری وقت ہے اور موت اس کی مشکلوں کا خاتمہ کرنے کو ہے تو محبوب ملنے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب تو مرنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ کیونکہ محبوب کی آمد سے زندگی کی تمنا پھر سے پیدا ہو گئی ہے۔

دردِ فرقت کی خلش وابستۂ انفاس تھی
مدعائے زندگانی مر کے حاصل ہو گیا

انفاس = نفس کی جمع۔ سانسیں

دردِ فرقت کی خلش سانس کی آمد و شد سے وابستہ تھی۔ موت کے آنے سے سانس کا یہ رشتہ ٹوٹا اور ساتھ ہی درد بھی ختم ہوگیا۔ گویا مر کر وہ مقصد حاصل ہوگیا جو زندگی میں چاہتے تھے (یعنی سکون)۔

دل سراپا درد تھا وہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانیؔ درد اب دل ہوگیا

شاعر کے نزدیک عشق کی معراج یہ ہے کہ عاشق درد ہی کو دل سمجھے اور اسے زندگی کا حاصل جانے۔ جب تک عاشق کو درد کا احساس باقی رہتا ہے اور وہ اسے دل سے الگ کوئی شے تصور کرتا ہے، عشق میں کامل نہیں ہو سکتا۔

(۵۷)

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
اس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا

عاشق عقل و جنوں کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ ایک طرف یہ خوف ہے کہ محبوب کے حضور میں عالمِ بے خودی میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھے اور دوسری طرف ہوشیار رہتے بھی نہیں بنتی کیونکہ بارگاہِ حسن میں ہوش و خرد کا کیا کام۔

کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے
یہ سُن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

ہم بیمار ہونا چاہتے تھے کہ شاید اس طرح محبوب پرسش کو آجائے لیکن جب سے اس نے وعدۂ پرسش ہی سے انکار کر دیا ہے اُس وقت سے ہم نے بیمار رہنے کی آرزو ترک کر دی ہے۔

دشواریٔ انکار سے طالب نہیں ڈرتے
یوں سہل تو اقرار ہوا بھی نہیں جاتا

ہم جانتے ہیں کہ محبوب ہماری کسی خواہش کو آسانی سے پورا کرنے والا نہیں ہے پھر بھی عشق کا تقاضا ہے کہ ان دشواریوں کو خاطر میں نہ لا کر اس سے تقاضا کیے جائیں۔

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا

غم خواری کا تقاضا ہے کہ مریض کے ساتھ ہمدردی کی جائے لیکن ہمارے احباب جب پرسش حال کو آتے ہیں تو بجائے ہمدردی کے نصیحت کرتے ہیں اور غمخوار کی جگہ ناصح کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ غالب نے کہا ہے:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں
اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

محبوب جاتے وقت پھر آنے کا وعدہ کرتا ہے اور یقین دلانے کو عاشق ہی کی جان کی قسمیں کھا رہا ہے گویا اس کو عاشق کی جان عزیز ہے۔ لہٰذا اب اس کی جدائی میں عاشق اپنی جان دینے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی زندگی محبوب کو پیاری ہے۔

غم کیا ہے اگر منزلِ جاناں ہے بہت دور
کیا خاکِ رہِ یار ہوا بھی نہیں جاتا

اگرچہ منزلِ دوست بہت دور ہے اور اس تک پہنچنا آسان نہیں لیکن ہم یہ سوچ کر اپنے کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر اس زندگی میں اُس تک نہ پہنچ سکے تو مر کر ہماری خاک ہی اس کی رہ گذر میں جگہ پالے گی۔

دیکھا نہ گیا اُس سے تڑپتے ہوئے دل کو
ظالم سے جفا کار ہوا بھی نہیں جاتا

دوست عاشق پر ظلم و ستم کرتا ہے لیکن پھر اس کے دل کے تڑپنے کی تاب نہ لا کر

اپنے کیے پر نادم ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ ندامت عاشق کے لیے جفا سے بھی بڑھ کر جان لیوا ہے۔ گویا اسے ظلم کرنا بھی نہیں آتا۔

یہ طرفہ ستم ہے کہ ستم بھی ہے کرم بھی
اب خوگرِ آزار ہوا بھی نہیں جاتا

طرفہ = عجیب، انوکھا

ہم نے کوشش کی کہ محبوب کے ظلم و ستم کے ہی عادی ہو جائیں مگر اس کی ستم ظریفی دیکھو کہ نہ تو وہ ہمیں جفاؤں کا عادی بننے دیتا ہے نہ لطف و کرم کا۔ جب ہم اس کے کرم کے متمنی ہوتے ہیں وہ جفا کرتا ہے اور جب اس کی جفاؤں کی آرزو کرتے ہیں تو وہ مائل بہ کرم ہو جاتا ہے۔

(۵۸)

سرِ ہوش برق گرتی وہ ہجومِ ناز ہوتا
وہ نظر فریب جلوہ جو نظر نواز ہوتا

محبوب کے نظر فریب جلوے اگر ہماری نگاہوں پر کرم فرماتے اور ہمارے سامنے ہوتے تو اس کے ناز و ادا کی بجلیاں ہمارے خرمنِ ہوش کو جلا کر خاک کر دیتیں۔

خبر اپنی مغفرت کی تو نہیں، یہ جانتا ہوں
مری توبہ چاہتی ہے درِ توبہ باز ہوتا

مجھ کو یہ خبر تو نہیں کہ میرے اعمال کا ثمرہ مجھے کیا ملے گا اور میری توبہ کو شرفِ قبولیت حاصل ہوگا کہ نہیں۔ البتہ مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے اور چاہتا ہوں کہ توبہ کا دروازہ کھلا رہے تاکہ جب کبھی میں اعترافِ جرم کے لیے معذرت چاہوں تو اس کی قبولیت ممکن ہو۔

مرے شوق نے سکھایا اُسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا، نہ وہ بے نیاز ہوتا

دوست کی بے نیازی و بے اعتنائی کا سبب ہماری نیاز مندی و عاجزی ہے۔ نہ ہم اس سے اس قدر نیاز و شوق کا اظہار کرتے، نہ اسے اپنے حسن پر اتنا غرور ہوتا اور وہ یوں ہمارے ساتھ بیگانگی برتتا۔ حسرت کہتے ہیں:

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کر دیا

(۵۹)

وحشتِ عشق نے جب ہوش میں لانا چاہا
عقلِ کج فہم نے دیوانہ بنانا چاہا

کج فہم = جو درست بات کو غلط سمجھے۔

عاشقوں کے نزدیک محبت میں عقل سے بیگانہ ہوجانا ہی عینِ عقل ہے اور ہوش میں رہنا سب سے بڑی دیوانگی۔ شاعر کے ذہن میں عقل و جنوں کی جو کشمکش برپا ہے اس کو ظاہر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ایک طرف تو عشق کی دیوانگی ہمیں اس عالم بے خودی کی جانب کھینچتی ہے جو دراصل ہوش کی بیداری ہے لیکن دوسری طرف عقل ہمیں اُس ظاہری ہوش مندی کی راہ پر چلانا چاہتی ہے جو ہمارے نزدیک سب سے بڑی دیوانگی ہے۔

ہم کو مرنا بھی میسّر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانا چاہا

شاعر موت کا تمنّائی ہے اور اسے عزیز رکھتا ہے لیکن اسے اس بات کا غم ہے کہ موت کے لیے زندگی کا احسان لینا بھی لازمی ہے کیونکہ زندگی کے بغیر موت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی مختصر زندگی ہی موت کا بہانہ تھی۔

پھر کچھ اے بیخبری تجھ میں کمی ہوتی ہے
درد نے کیا مجھے پھر ہوش میں لانا چاہا

بیخودیٔ عشق کا یہ حال ہے کہ اب تک ہمیں درد کا بھی احساس نہ تھا مگر اب شاید ہماری بیخودی میں کچھ کمی ہو رہی ہے جو آہستہ آہستہ درد کا احساس جاگنے لگا ہے۔

(۶۰)

تری ترچھی نظر کا تیر ہے مشکل سے نکلے گا
دل اس کے ساتھ نکلے گا اگر یہ دل سے نکلے گا

محبوب کی ترچھی نظروں کے تیر اس طرح دل میں پیوست ہوئے ہیں کہ ان کے نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے بجز اس کے کہ دل ہی سینہ سے تیر کے ساتھ کھنچ کر باہر آجائے۔

شبِ غم میں بھی مری سخت جانی کو نہ موت آئی
ترا کام اے اجل اب خنجرِ قاتل سے نکلے گا

میں تو اتنا سخت جان تھا کہ شبِ ہجر کی سختیاں بھی جھیل گیا اور موت نہ آئی۔ اب اگر موت کو اپنا کام کرنا ہے تو وہ محبوب کے خنجر سے مدد لے کہ وہ ہی مجھے ہلاک کر سکتا ہے۔

نگاہِ شوق میرا مدّعا تو ان کو سمجھا دے
مرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا

محبوب کے روبرو عاشق کی زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی اور حرفِ مطلب اس کے لبوں تک آکر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی پرشوق نگاہوں سے التجا کرتا ہے کہ تم ہی میری مشکل آسان کردو اور میری داستانِ شوق اسے سُنا دو کہ وہ نگاہوں سے میرے دل کا حال سمجھ لے۔

کہاں تک کچھ نہ کہیے اب تو نوبت جان تک پہنچی
تکلّف برطرف اے ضبط نالہ دل سے نکلے گا

ضبطِ غم سے عاشق کا حال ابتر ہے اور جان پر بن گئی ہے لیکن ضبط کا اب بھی تقاضا یہی ہے کہ نالہ دل سے باہر نہ آنے پائے۔ وہ الجھ کر کہتا ہے کہ اب میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اب تو میں سارے آدابِ تکلفات کو برطرف کر کے نالہ کرنے پر مجبور ہوں۔

تصوّر کیا ترا آیا قیامت آگئی دل میں
کہ اب ہر ولولہ باہر مزارِ دل سے نکلے گا

محبوب کے قد بالا کا تصوّر دل میں آیا تو جتنے ولولے اور خواہشیں دل میں دفن تھیں دل سے اس طرح باہر نکل رہی ہیں جس طرح قیامت کے آنے پر مُردے قبروں سے باہر نکلیں گے۔ گویا تیرا تصوّر دل میں قیامت بن کر آیا ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کے تصوّر نے مُردہ آرزوؤں

کو پھر سے زندہ کر دیا ہے اور دل میں ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔

نہ آئیں گے وہ تب بھی دم نکل ہی جائے گا فانیؔ
مگر مشکل سے نکلے گا بڑی مشکل سے نکلے گا

اگر دمِ نزع دوست سامنے آجاتا تو ہماری مشکل آسان ہوجاتی۔ وہ نہ آیا تب بھی جائے گا مگر بڑی مشکل سے نکل پائے گا۔ دم

(۶۱)

جگر خراش ہے حال ان تباہ حالوں کا
جنھیں مٹا کے رہا حوصلہ خیالوں کا

جگر خراش = دل کو زخمی کرنے والا۔

جو انسان خود اپنے خیالات کی بلند حوصلگی کا شکار ہو کر برباد و تباہ ہو جائے۔ اس کی بربادی دیکھنے والوں کے دلوں کو بھی زخمی کر دیتی ہے۔

کیا سوال تو آوازِ بازگشت آئی
جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا

آوازِ بازگشت = آواز کا ٹکرا کے لوٹنا۔

میں نے خدا تعالیٰ سے سوال کیا (سوال کیا تھا اس بارے میں شاعر خاموش ہے ہوسکتا ہے "ارنی" کا مطالبہ ہو یا اپنی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہو) مگر اُدھر سے میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا اور میری آواز فضا میں گونج کر لوٹ آئی گویا یہ آوازِ بازگشت نہ تھی بلکہ مجھ سے جواب طلب کیا جا رہا تھا کہ میں نے سوال کی جرأت کیوں کی۔ اس شعر میں بھی ہمہ اوست کا عقیدہ پنہاں ہے کہ اس عالم میں بنیادی حقیقت ایک ہی ہے۔ نہ کوئی سائل ہے نہ جواب دینے والا۔

جنونِ شکوۂ بیداد پر خدا کی مار
اثر کے ساتھ گیا اعتبار نالوں کا

محبوب کی بیداد پر بے اختیار نالے لبوں تک آگئے ہیں (ظاہر ہے کہ نالے بے اثر ہی ہیں) اس پر تاسف کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس جنونِ شکوہ سنجی پر لعنت ہو کہ نالوں کا اثر تو پہلے ہی گیا تھا اب ان کا اعتبار بھی ختم ہو گیا یعنی جب تک نالے نہیں کیے تھے ان کی تاثیر پر بھروسہ تھا مگر نالے کر کے دیکھا تو وہ بھروسہ بھی گیا۔

تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

تعینات = تصوّرات کے حدود

ہماری نگاہ اب اِس عالم ظاہری کی حدوں سے گذر کر دوسرے عالم کی سیر کر رہی ہے۔ یہ وہ عالمِ لاہوت ہے جہاں خدا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس عالم میں ہمارے ذوقِ نظر کا خدا ہی حافظ ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں خدا کے سوا کچھ نہیں وہاں نظر یا ذوقِ نظر کا بھی کیا سوال۔ "خدا ہی خدا ہے" محاورہ کی لطافت و معنویت قابل لحاظ ہے۔

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانیؔ
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا

شاعر کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے مبتلائے غمِ محبت ہے اور زندگی اسی غم کی داستان ہے۔ گذرنے والا وقت کشتگانِ محبت کے فسانے کے سوا کچھ نہیں۔ "کسی" سے مراد محبوب ہے جس کا غم زندگی سے عبارت ہے۔

(۶۲)

حجاب اگر منؔ و تو کا نہ درمیاں ہوتا   پیامِ حُسن، محبت کی داستاں ہوتا

من و تو = میں اور تو مراد دوئی۔

میرے اور محبوب (اللہ تعالیٰ) کے درمیان دوئی کا احساس پردہ کی طرح حائل ہے۔ اگر یہ احساس ختم ہو جائے تو دوئی بھی مٹ جائے اور محبت کی کہانی و حُسن کے پیغام میں کوئی فرق اور مجھ میں اور اس میں کوئی امتیاز نہ رہے۔

تری تلاش کا افسانہ گر بیاں ہوتا   رہِ مجاز کا ہر ذرہ اک زباں ہوتا

فانی وحدت الوجود کے قائل ہیں اور اسی لیے مجاز کے وجود کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک عالم مجاز کا ہر ہر ذرہ حقیقت کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تیری تلاش کا افسانہ بیان کیا جائے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ زبان بن جائے۔ مراد یہ کہ اس کائنات کا ہر ذرّہ محبوب حقیقی کی تلاش میں میرا ساتھی اور ہم زبان ہے یعنی حقیقت اور مجاز جدا جدا چیزیں نہیں بلکہ عالم مجاز کی ہر شے اسی کی طرف رہ نمائی کرتی ہے اور پکارتی ہے کہ میرے اندر حقیقت پنہاں ہے۔

مراد جو دہے میری نگاہ خود نشناس   وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

خود نشناس: جو اپنے آپ کو نہ پہچانے
میں اب تک اپنی ہستی کے راز کو نہیں سمجھ سکا ہوں اور یہی میرے وجود کا راز بھی ہے۔ جس دن مجھے اس راز سے آگاہی ہوئی میرا وجود ہی فنا ہو جائے گا (میں محبوب کی ہستی میں گم ہو جاؤں گا) مراد یہ کہ میری ہستی محبوب سے الگ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ میری نافہمی ہے کہ میں نے اسے الگ تصور کر لیا ہے۔ جس دن یہ راز مجھ پر کھلا میرا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

کمالِ ضبطِ غم عشق اے معاذ اللہ   کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا

میں نے غم عشق کو ضبط کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری ہستی ہی مٹ گئی۔ اگر اس غم کا ماجرا میں کہیں کہیں سے بیان کر دیتا تو معلوم نہیں کہ دنیا کا کیا حشر ہوتا۔

بنائے جلوہ گہِ ناز ہے جبینِ نیاز   جو دردِ عشق نہ ہوتا تو دل کہاں ہوتا

محبوب کے حسن کے جلوے میرے جذبۂ شوق کے مرہونِ منت ہیں۔ اگر میری جبینِ نیاز اس کی جلوہ گاہ پر سجدہ ریزی نہ کرتی تو اس کو یہ عظمت نہ حاصل ہوتی۔ اور دل جو محبوب کی جلوہ گاہ ہے اس کی ہستی کا ضامن جذبۂ عشق ہی ہے۔ یعنی اگر عشق نہ ہوتا تو دل بھی نہ ہوتا گویا حسن کے اظہار کا ذریعہ عاشق کا وجود اور عاشق کی ہستی دردِ عشق کی وجہ سے ہے۔

تمام قوتِ غم صرفِ دل ہوئی ورنہ زمیں زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں ہوتا

اس میں قرآنِ پاک کی اُس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے جب آسمان کو یہ بار دینا چاہا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ زمین اور پہاڑوں کو دیا تو وہ متحمل نہ ہو سکے مگر انسان نے بڑھ کر اسے لے لیا۔ فانی کہتے ہیں کہ غم کا بوجھ ایسا تھا کہ اگر زمین و آسمان پر یہ بوجھ ڈالا جاتا تو دونوں اس کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ دل نے اس کو اپنے اوپر لے لیا۔ حافظ کہتے ہیں:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند

میر کہتے ہیں: سب پہ جس بار نے گرانی کی اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار نہ موجِ بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

دنیا میں ایک کا اضطراب دوسرے کے سکون کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ بہار میں پھولوں کی خوشبو جب ہوا کی لہروں کے ساتھ پریشان و منتشر ہوئی تو بلبل کو سکون میسّر آیا۔ اگر یہ موجِ بہار نہ ہوتی تو پھولوں کی خوشبو نہ اٹھتی اور نہ بلبل کو آشیانہ بنانے کی تحریک ہوتی۔

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

محبوب کے پاس صرف جفائیں ہی نہیں بلکہ اس کے ہزاروں انداز اور ادائیں ہیں مگر اس کی کوئی ادا ایسی نہیں جو عاشقوں کی ہمدرد یا مزاج شناس ہو۔

ٹا دیا غمِ فرقت نے ورنہ میں فانی ہنوز ماتمیٔ مرگِ ناگہاں ہوتا

غنیمت ہوا کہ محبوب کی جدائی نے ہمیں ہلاک کر دیا ورنہ ہم ابھی تک موت کے انتظار میں آنسو باتے ہوتے۔ یعنی غمِ ہجر نے ہمیں ہلاک کر کے ہم پر احسان کیا ہے، ظلم نہیں۔

(۶۳)

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا
غیرت ہو تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

موت سے پہلے مر جانے کا مقام فانی کی نظر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ "موتو من قبل أن تموتو" یعنی انسان اگر اپنی ہستی یا خودی کو فنا کر دے تو پھر اسے موت کا احسان مند نہیں ہونا پڑتا یا وہ موت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ خودداری اور غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم موت کا احسان نہ لیں اور مرنے سے پہلے ہی اپنے کو فنا کر دیں۔

اے شوق طلب بڑھ کر مجنونِ ادا ہو جا
اے ہمتِ مردانہ راضی برضا ہو جا

محبت میں طلب کی منزل سے گذر کر محبوب کی اداؤں پر خود کو فدا کر دے اور اگر عشق کا حوصلہ ہے تو اس کی مرضی کو اپنی ہر مرضی اور خواہش پر مقدم بنا لے اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں گم کر دے۔

آغوشِ فنا میں ہم پروردۂ آفت ہیں
اے فتنۂ دوراں اٹھ اے حشر بپا ہو جا

جو شخص اپنی زندگی کو فنا کے آغوش میں دیدے یا جس کی زندگی موت کے زیرِ سایہ گذری ہو اس کے لیے دنیا و عقبیٰ کے مصائب کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی لیے فانی زمانہ کے ہنگاموں اور قیامت کے فتنوں دونوں کو للکارتے ہیں کہ تم جو بھی کر سکتے ہو کر لو۔ ہم کو تمھارا کوئی ڈر نہیں کیونکہ ہم محبت میں پہلے ہی خود کو فنا کر چکے ہیں۔

ضد اور یہ ضد اے دل اچھا تو خدا حافظ
قربان ہی اس بت پر ہونا ہے تو جا ہو جا

دل [illegible]ب پر قربان ہونے پر تُلا ہوا ہے تو اس کو اختیار ہے وہ اپنی ضد پوری کرے ہمارا کام سمجھانا تھا سو ہم سمجھا چکے۔

اس جان تمنا سے بے پردہ نہ شکوہ کر
وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہو جا

محبوب کے سامنے شکایت کرنا آداب محبت کے خلاف ہے۔ اگر وہ تجھ سے خفا ہے

تو تو اپنی خفگی کا اظہار اس طرح کر کہ زندگی سے منہ موڑ لے۔ یعنی اس کی خفگی پر عاشق اور کچھ کر ہی نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ اپنی جان دیدے۔

ہر قافلۂ دل کو تو مژدۂ منزل دے
ہر رہگذرِ غم میں نقشِ کفِ پا ہو جا

نقشِ کفِ پا = پاؤں کے تلووں کے نشان جو منزل کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

محبت میں خود کو اس طرح مٹا دے کہ تیری ہستی دوسرے عاشقوں کے لیے مشعلِ راہ بن جائے۔ محبت میں فنا ہو کر نہ صرف عاشق اپنی منزل کو حاصل کر لیتا ہے بلکہ دوسروں کی رہنمائی کا سبب بھی بنتا ہے جس طرح پیروں کے نشان قافلہ والوں کو منزل کی سمت بتاتے ہیں۔

یہ دردِ محبت بھی کیا شے ہے معاذ اللہ
میں دردِ محبت سے کہتا ہوں سوا ہو جا

معاذ اللہ = خدا پناہ میں رکھے۔

محبت کا درد بھی عجیب نرالا درد ہے کہ اس میں مبتلا ہونے والا درد کے کم ہونے کی دعا نہیں کرتا بلکہ اس میں زیادتی کی دعائیں مانگتا ہے۔

ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پروا کر
تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فدا ہو جا

سچا عاشق وہ ہے جو محبوب کے ظلم و ستم سے بے نیاز رہ کر وفا کیے جائے اور آخر وفا کے نام پر قربان ہو جائے۔

اس ہستئ فانی سے کر قطعِ نظر فانی
تو دوست کا طالب ہے دشمن سے جدا ہو جا

فانی کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی زندگی ہے کیونکہ اس نے محبوب (اللہ تعالیٰ) سے جدا کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے محبوب کو

حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے اس دشمن (زندگی) سے لاتعلقی اختیار کرو۔ یعنی زندگی کو مٹا کے ہی محبوب حقیقی کا وصل ممکن ہے۔ صوفیہ کے نزدیک بقا کی منزل فنا کے بعد ہے۔

(۶۴)

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا

دنیا کی ناکامیوں سے مایوس و ہراساں ہونا اہلِ ہمّت کو زیب نہیں دیتا۔ زندگی میں ناکامیوں کے باوجود انسان ہمّت کرے تو بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے۔ انسان وہ ہی ہے جو بہادری سے زندہ رہے اور بہادری کے ساتھ موت کا مقابلہ کرے۔ فانؔی کے اس شعر میں عمل کی تلقین ہے۔ جو لوگ فانؔی کو یاسیات اور گور و کفن اور بے عملی کا شاعر کہتے ہیں ان کو فانؔی کی یہ غزل فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

دنیائے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے
دنیا کی ہر ادا سے منھ پھیر کر گذر جا

دنیا کی کوئی ادا قابلِ اعتبار نہیں۔ یہاں کے غم کا کوئی بھروسہ ہے نہ خوشی کا۔ اس لیے تو دونوں سے منھ موڑ لے اور غم و خوشی سے بے نیاز یہاں سے گذرتا چلا جا۔ ترکِ دنیا کا یہ فلسفہ اُردو شاعری میں بہت عام رہا ہے۔

اس بحرِ بے کراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار اُتر جا

بحرِ بے کراں = ایسا سمندر جس کا کنارہ نہ ہو، مراد زندگی۔

زندگی ایک بے کنار سمندر کی طرح ہے۔ اس میں ساحل کی جستجو کرنا بے کار ہے۔ اور اس دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتی کی آرزو یعنی سہاروں کی تلاش بھی بے سود ہے۔ اگر تو اس کو پار کر کے اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اس دریا میں ڈوب کر خود کو مٹا دے۔ اس شعر میں بھی وہ ہی فلسفہ ہے کہ موت ہی کے ذریعہ انسان

پنے مقصد حقیقی کو حاصل کر سکتا ہے۔

یہ دعوئ خبر ہی عصیاں بھی ہے سزا بھی
بے ہوش و بے خبر رہ، بے خوف و بے خطر جا

عصیاں ۔ گناہ

محبت میں غیر از محبوب کسی شے کے وجود کا احساس گناہ بھی ہے اور آپ ہی اپنی سزا بھی ہے۔ گناہ اس لیے کہ مذہب عشق میں عظمت و کمال حاصل کرنے کے لیے بیخودی لازمی ہے اور سزا اس لیے کہ ہوش کی بدولت انسان غم دوراں کے شکنجے میں پھنس جاتا ہے اور طرح طرح کے غموں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اگر تو دنیا میں بے ہوش اور بے خبر ہو کر رہے گا تو تجھے یہاں سے جاتے وقت بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔

کثرت میں دیکھتا جا تکرارِ حُسنِ وحدت
مجبورِ یک نظر آ، مختارِ صد نظر جا

کثرت و وحدت تصوّف کی اصطلاحیں ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک یہ دنیا جو کثرت کی لوہ گاہ ہے دراصل وحدت (ذاتِ باری تعالیٰ) سے الگ کوئی شے نہیں بلکہ اسی وحدت ے مختلف جلوے یا صورتیں ہیں (اس کی تکرار ہے) اگر انسان اپنے اندر وہ نگاہ پیدا کرے ذ اس کثرت میں چھپی ہوئی وحدت کو دیکھ سکے تو اسے محسوس ہوگا کہ تجلّی ایک ہی ہے جو ان مام مظاہر میں خود کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس طرح انسان کی مجبور نگاہوں کو وہ آزادی اور اختیار اصل ہوگا کہ وہ بھی اسی غیر محیط حقیقت کا حصہ بن جائے گا۔ اور محدود سے لامحدود ہو جائے گا۔

یہ میکدہ ہے پاسِ آدابِ میکدہ کر
اوّل خراب آ اور آخر خراب تر جا

میکدۂ معرفت میں سرشار ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا خیال ذہن میں لانا بھی آدابِ میکدہ ے خلاف ہے۔ اس میخانہ میں داخل ہونے کے لیے بھی سرشار و مست ہونا لازمی شرط ہے اور اس شراب کا ہر جرعہ مستی و سرشاری میں اضافہ کرتا ہے۔

گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانیؔ
اے نورِ عشق دل کی گہرائیوں میں بھر جا

خرد = عقل

عقل و عشق کی کشمکش میں ہمارے اکثر شعرا عقل پر عشق کو ترجیح دیتے آئے ہیں کیونکہ عقل انسان کو شک و شبہ میں ڈال کر اُسے گمراہ کر دیتی ہے اور عشق اسے یقین اور ایمان عطا کرتا ہے۔ فانیؔ بھی عقل کی گمراہیوں سے گھبرا کر عشق سے روشنی اور ہدایت کے طالب ہیں۔

(۶۵)

دم حریف زوالِ غم نہ ہوا
مرتے مرتے یہ درد کم نہ ہوا

حریف = مدعی، مقابلہ کرنے والا۔

ہر غم وقت کے ساتھ کم ہو جاتا ہے اور اس میں شدّت باقی نہیں رہتی مگر ہمارا غم مرتے مرتے بھی کم نہ ہوا اور ہماری زندگی میں غم کے زوال کی نوبت نہ آئی۔

جُھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر
پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا

جو سر بارگاہِ محبوب پر جُھکا وہ پھر کسی دوسرے کے دروازے پر جھکنے کی ذلّت نہیں گوارا کر سکتا۔ بقول اقبالؔ:

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

اُس کو میرا نصیب کہتے ہیں
جو تری زلف خم بہ خم نہ ہوا

وہ پیچ و خم جو محبوب کی زلفوں تک نہ پہنچ سکے وہ میرا برگشتہ مقدر بن گئے یعنی ہماری قسمت کے پیچ و خم محبوب کی زلفوں کے خم سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ قسمت کے پیچ بدنصیبی کی علامت ہیں اور زلفوں کے پیچ حسن کی۔

نگہِ قہر خاص ہے مجھ پر
یہ تو احساں ہوا ستم نہ ہوا

محبوب نے ستم کے لیے بطور خاص عاشق کو منتخب کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسے ستم کو ستم

کہنا غلط ہے۔ یہ تو اس کی نوازش ہے کہ وہ صرف ہم کو ہی اس کا اہل سمجھتا ہے کیونکہ ع
اسی کو غم بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

رہ گئی حسرتِ وفا باقی   دل کو اندازۂ ستم نہ ہوا

محبوب اپنے سارے ظلم و ستم آزما چکا مگر ہماری حسرت ابھی پوری نہیں ہوئی اور ہمارے دل میں وفا کا حوصلہ باقی رہ گیا کیونکہ ہمیں پہلے سے اندازہ نہ تھا کہ اس کے ستم کا اختتام کہاں ہوگا اس لیے اپنی وفا کا اظہار پوری طرح نہ کر سکے۔ مضمون نیا ہے۔

اب کرم ہے تو یہ گلہ ہے مجھے   کہ مجھی پر ترا کرم نہ ہوا

عاشق کی خوددار طبیعت کو یہ گوارا نہیں کہ محبوب اس کے ساتھ کرمِ عام روا رکھے وہ اس کی عنایت خاص چاہتا ہے اور دوست سے یہ شکایت ہے کہ اس کا لطف و کرم صرف عاشق کے لیے مخصوص کیوں نہیں، سب کے لیے کیوں ہے۔

عشق میں زندگی کا ساری عمر   کوئی سامان ہی بہم نہ ہوا

عشق زندگی کا دشمن ہے چنانچہ تمام عمر ہمیں عشق کے سبب سے زندہ رہنے کا کوئی سامان یا ذریعہ نہ میسر آ سکا۔

بت نے ہر رنگ میں خدائی کی   دل مگر دیر سے حرم نہ ہوا

محبوب نے ہر طرح سے خدا بننے کی کوشش کی اور ہم سے بندگی کا طالب ہوا مگر ہماری کوتاہی یہ کہ ہمارا دل بت خانہ بنا رہا کعبہ نہ بن سکا یعنی وہ بلند نظری ہمارے اندر نہ پیدا ہو سکی جو اس میں خدا کا جلوہ دیکھ سکتی۔ مراد یہ کہ اگر عاشق میں بلند نظری ہو تو مجاز بھی حقیقت بن سکتا ہے۔

دم بھی فانیؔ کسی کے غم تک ہے   دم نہ ہوگا اگر یہ غم نہ ہوا

میری زندگی کا انحصار غمِ محبوب پر ہے۔ جب تک یہ غم ہے میری زندگی بھی ہے۔ جس روز یہ غم ہم سے دور ہوا ہماری زندگی بھی باقی نہ رہے گی۔

جیب و دامن کی حقیقت کا جو عرفان ہو گیا
جا پڑیں جس تار پر نظریں، رگِ جاں ہو گیا

نگاہِ وحدت آشنا ہو تو عاشق کو ہر چیز میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جب ہم پر اپنے وجودِ ظاہری کی حقیقت آشکار ہوئی تو اپنا وجود معدوم ہو گیا اور اپنے جیب و دامن کے تمام تار رگِ جاں کی طرح اہم معلوم ہونے لگے۔ رگِ جاں کی اہمیت یہ ہے کہ یہ محبوبِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کا مقام ہے۔

ماسوا کی راہ سے جانا پڑا ہے سوئے دوست
کفر بھی دل کی بدولت جزوِ ایماں ہو گیا

ماسوا = غیر اللہ۔ خدا کے سوا دوسری موجودات۔

صوفیوں کے نزدیک حقیقت تک پہنچنے کے لیے ماسوا یا مجاز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسلام میں بھی خدا کی توحید کے اقرار سے پہلے دوسری تمام طاقتوں کا انکار ضروری ہے اور لا الٰہ بھی الا اللہ کا لازمی جزو ہے۔ انہی تصورات کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مجھے محبوبِ حقیقی تک پہنچنے کے لیے ماسوا کا سہارا لینا پڑا گویا ماسوا کا احساس جو عشق کی شریعت میں کفر تھا اس کو بھی میرے دلِ حقیقت شناس نے ایمان کا حصہ بنا دیا۔

دشنۂ غم کو مبارک نذرِ خونِ آرزو
زیست کو مژدہ کہ مر جانے کا ساماں ہو گیا

دشنہ = خنجر۔

شاعر غم کے خنجر کو مبارک باد دیتا ہے کہ اس کے پیہم زخموں کی بدولت عاشق کی آرزو کا خون ہو گیا اور اس کے لیے مرنا آسان ہو گیا۔ وہ اپنی آرزو کے خون کو دشنۂ غم کا نذرانہ سمجھتا ہے اور موت کے اس طرح آسان ہو جانے پر اپنی زندگی کو بھی مبارک باد دیتا ہے جو موت کی منتظر تھی۔

ان کے دیکھے تک ہے دل کے آئینہ کی بھی نمود
دیکھ لینا پھر کہ دل تصویرِ جاناں ہو گیا

نمود = وجود کا اظہار۔

جب تک محبوب نے ہمارے دل پر نظر نہیں کی ہے اس وقت تک ہی اس کا وجود بھی الگ قائم ہے۔ جس روز اس کی نگاہ اس آئینہ پر پڑی پھر دل کی جدا گانہ ہستی باقی نہ رہے گی بلکہ وہ فنافی المحبوب ہو کر اس کی تصویر بن جائے گا۔ یا یہ کہ محبوب کی نظر پڑ جانے کے بعد دل میں کسی اور کا عکس سما ہی نہ سکے گا اور دل محبوب کی تصویر بن جائے گا۔

اس دلِ مایوس کی ویران سازی کچھ نہ پوچھ
اس نے جب اور جو چمن تاکا، بیاباں ہو گیا

میرے دل کی بدنصیبی کا یہ حال ہے کہ جس چمن میں رہنے کا ارادہ کیا وہی چمن ویرانی کی زد میں آگیا۔ ایک اور جگہ اسی خیال کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کیا ہے :

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا   کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اُجڑ گیا

اس کے دامن سے الجھتا ہے ادب اے دستِ شوق
یہ بھی دیوانے کوئی میرا گریباں ہو گیا

عالمِ بے خودی میں عاشق کا ہاتھ اپنا گریبان تو تار تار کیا ہی کرتا تھا اب بے خودی یہاں تک بڑھی ہے کہ اس کا ہاتھ محبوب کے دامن کی طرف بھی بڑھنے لگا ہے مگر وہ فوراً اپنے دستِ جنوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ یہ میرا گریبان نہیں محبوب کا دامن ہے یہاں پاسِ ادب لازم ہے اور ایسی جسارت آدابِ عشق کے خلاف ہے۔ میر کے شعر کا درجہ اس شعر سے بلند ہے:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا

جو بہ فتوائے خرد مجنوں نہ ہو کامل نہیں
حیف وہ آزاد جو محرومِ زنداں ہو گیا

بہ فتوائے خرد = عقل کے فیصلہ کے مطابق۔

فانی کے نزدیک صرف وہی عاشق کامل ہے جس کو اہلِ عقل مجنوں ہونے کا فتویٰ دیدیں اور زنداں میں مقید کر دیں اسی لیے زنداں سے رہائی خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی۔

ادعائے ضبطِ غم بالکل بجا یکسر درست
اور جو دل کا حال چہرے سے نمایاں ہو گیا

تم جو محبت میں ضبط غم کا دعویٰ کرتے ہو تمہارا دعویٰ بالکل بجا و درست سہی مگر ضرور نہیں کہ اس کے بعد بھی تمہارا غم چھپا رہے۔ اگر حالِ دل چہرے سے ظاہر ہو گیا تو کیا کرو گے۔

یاد ہے فانی تجھے کوئی کہانی اور بھی
ختم کر افسانۂ غم، دل پریشاں ہو گیا

شاعر کو اپنے اشعار کی غمگین یکسانیت کا احساس ہے۔ وہ خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیرے دا[illegible] غم نے سننے والوں کو پریشان کر دیا ہے۔ اب یہ داستان ختم کر اور کوئی اور کہانی چھیڑ۔

(۶۷)

گل میں وہ اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا   اللہ کیا ہوا وہ زمانہ بہار کا

شاعر گذری ہوئی بہار کو یاد کر کے کہتا ہے کہ کل تک پھول تو پھول کانٹوں میں بھی رعنائی و دلکشی تھی مگر بہار گذرنے کے بعد پھولوں کا حسن بھی نہ جانے کہاں چلا گیا۔

ہر ذرّہ جلوہ گاہ ہے ہر دل ہے چشم شوق   اللہ رے اہتمام تماشائے یار کا

بعض فلسفی مفکرین کے نزدیک کائنات کی تخلیق اس لیے کی گئی ہے کہ محبوب (اللہ تعالےٰ) اپنے حسن کا اظہار کر سکے۔ بقولِ غالب " دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں "۔ فانی کہتے ہیں کہ اس کے حسن نے خود نمائی کے لیے عالم کے ہر ذرّے کو اپنی جلوہ گاہ بنا لیا ہے اور ان جلووں کو دیکھنے کے اشتیاق میں ہر دل چشم شوق بن گیا ہے۔

پاتا ہوں آج بھی خلش نوکِ خار میں   بھولا نہیں ہوں لطفِ تبسم بہار کا

بہار کا موسم گذر چکا ہے۔ اس کے حسن اور دلکشی کی یاد ایک خلش بن کر سینہ میں رہ گئی ہے اور اب جب خزاں کا دور دورہ ہے تو کانٹوں کی چبھن ہمیں گذری ہوئی بہار کی یاد دلاتی ہے۔ شاعر کی نظر میں گذری ہوئی خوشیاں بھی انسان کے غموں میں اضافہ کا سبب ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ خزاں و بہار دونوں سے بے نیاز ہے۔

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم　　آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

معلوم نہیں بہار کا زمانہ کب آیا اور کب رخصت ہوگیا۔ ہم موسم کی کیفیتوں سے بے خبر اپنے آشیاں کے لیے تنکے جمع کرتے رہے۔ مراد یہ کہ زمانہ کی الجھنوں نے ہمیں اس طرح مصروف رکھا کہ زندگی کی رنگینیوں کا زمانہ گذر گیا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

آئی ہے اے نسیم تو اس وقت تک ٹھہر　　جب تک بجھے چراغ ہمارے مزار کا

بادِ صبا جس کا کام شگوفوں کو کھلانا اور مرجھائے ہوؤں کو تازگی بخشنا ہے۔ اس سے بھی شاعر کو کوئی امید نہیں سوائے اس کے کہ وہ اس کے مزار کے ٹمٹماتے ہوئے دیے کو بجھا جائے گی۔ بلکہ وہ اسے خود اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ اب ہمارے مزار پر آئی ہے تو چراغِ مزار گل کیے بغیر نہ جانا۔ اذیت پسندی کا مکمل اظہار ہے۔

میں نزع میں ہوں عہدِ وفا کا محل نہیں　　وعدہ نہ کر کہ وقت نہیں اعتبار کا

محل = موقعہ

عاشق پر نزع کا عالم طاری ہے محبوب اس کی دلجوئی کے لیے وفا کا وعدہ کرتا ہے لیکن عاشق اس کو وعدہ کرنے سے روکتا ہے کہ اب وعدہ کرنے کا وقت نہیں کیونکہ اب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہارے وعدہ پر اعتبار کر کے خوش ہو سکیں۔

جو تیری یاد میں نہ بسر ہو وہ ہر نفس　　اک واہمہ ہے زندگیٔ مستعار کا

مستعار = قرض لی ہوئی۔

زندگی ہمارے پاس محبوب کی امانت ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اسے محبوب کی یاد کے لیے وقف کر دیں۔ حقیقی زندگی وہی ہے جو اس کی یاد میں گذر جائے ورنہ جو لمحے اس کی یاد کے بغیر گذرتے ہیں ان پر زندگی کا اطلاق ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ محض واہمہ (کچھ نہ ہونے کے برابر) ہیں۔

یہ دردِ لاعلاجِ محبت دوا بھی ہے
تھا ورنہ کچھ علاج غمِ روزگار کا

اگرچہ محبت خود ایک لاعلاج مرض ہے لیکن یہ مرض دوسرے غموں کی دوا بھی بن جاتا ہے۔ محبت میں مبتلا ہو کر انسان غمِ روزگار سے آزاد ہو جاتا ہے گویا محبت اس مرض کا علاج بن جاتی ہے جس سے چھٹکارا کسی اور صورت میں ممکن نہ تھا۔

فانی یقینِ وعدۂ فردا کو کیا کہوں
اب زندگی ہے نام فقط انتظار کا

محبوب نے کل آنے کا وعدہ کیا ہے۔ عاشق جانتا ہے کہ یہ وعدہ بھی وفا نہیں ہوگا مگر پھر بھی اس پر اعتبار کرنے کو تیار ہے اور اس کی امید پر زندگی بھر انتظار کرنے پر آمادہ ہے۔

(۶۸)

یوں نظمِ جہاں درہم و برہم نہ ہوا تھا
ایسا بھی ترے حسن کا عالم نہ ہوا تھا

آج سے پہلے تو تیرے حُسن کی حشر سامانی ایسی نہ تھی کہ سارا انتظامِ عالم درہم و برہم ہو جائے

پھر چھیڑ دیا وسعتِ محشر کی فضا نے
سودا ترے وحشی کا ابھی کم نہ ہوا تھا

عشق کی ہمیشہ بیاباں کی تنگی کا گلہ رہتا ہے چنانچہ میدانِ حشر کی وسعت دیکھ کر عاشق کا سودا جاگ اُٹھا اور وہ پھر سے آمادۂ وحشت ہو گیا۔ یعنی دنیا میں اس کی وحشت کا اظہار پوری طرح نہ ہو سکا، شاید قیامت میں یہ ارمان نکل جائے۔

یا عشرتِ دو روزہ تھا یا حسرتِ دیروز
وہ لمحۂ ہستی جو ابھی غم نہ ہوا تھا

دیروز = گذری ہوئی کل

زندگی کے وہ لمحے جو غمِ عشق کی نذر نہیں ہو پائے یا تو دنیا کے ناپائداد عیش میں گذرتے ہیں یا گم شدہ مسرتوں کی حسرت میں۔ مراد یہ کہ مادی غم و خوشی دونوں بے حقیقت اور ناقابلِ اعتبار ہیں اصل زندگی وہی ہے جو غمِ عشق کی نذر ہو جائے، یہ غم ہی انسانی زندگی کی معراج ہے۔

صد حیف وہ گل ہو کفِ گلچیں میں جو اب تک
آزردۂ آویزشِ شبنم نہ ہوا تھا

آویزش = کش مکش

دنیا کے حُسن و رنگینی کی ناپائداری پر افسوس کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ وہ پھول جنھیں صرف اپنی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے اور شبنم کی چھیڑ چھاڑ بھی جن کو آزردہ نہیں کر سکتی وہ بھی شاخ سے توڑ لیے جاتے ہیں اور گلچیں کے ہاتھوں بکھر جاتے ہیں۔

قاتل ہی مرا کیوں اسے کہتا ہے زمانہ
مانا وہ شریکِ صفِ ماتم نہ ہوا تھا

محبوب عاشق کی موت پر ماتم میں شریک نہ ہوا جس سے لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ ہی اس کا قاتل ہے لیکن عاشق کو محبوب کی یہ رسوائی منظور نہیں اس لیے وہ کہتا ہے کہ ماتم میں شریک نہ ہونا اس بات کا ثبوت تو نہیں کہ وہ قاتل ہے۔

فاش آج مرے دم سے ہوا رازِ محبت
کچھ راز نہ تھا جب کوئی محرم نہ ہوا تھا

اگرچہ محبت جو اس عالم کی اصل ہے ہمیشہ سے موجود تھی لیکن انسان کے وجود سے پہلے کوئی محبت کے راز سے واقف نہ تھا۔ ہم نے ہی اس راز سے پردہ اٹھایا ہے یعنی جب ہم نے اس کو راز کی حیثیت سے دیکھا اور اس کو سلجھانے کی کوشش کی تب اس کا راز ہونا ثابت ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ ایک حقیقت تھی۔ اس میں محبت کو کائنات کی اصل قرار دیا ہے اور منطقی انداز سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محرم راز (انسان) سے پہلے راز (محبت) کی اہمیت نہ تھی۔

پاتے ہی خجل رحم کا دریا امنڈ آیا
پردہ مری آنکھوں کا ابھی نم نہ ہوا تھا

خجل = شرمندہ

گناہوں پر ندامت گناہ گار کی بخشش کا سبب بن جاتی ہے۔ ابھی میری آنکھوں میں ندامت کے آنسوؤں کی نمی بھی نہ آپائی تھی کہ رحمت الٰہی جوش پر آ گئی اور میری خطائیں بخش دی گئیں۔

رسوا نہ کر اس سوز کو اے شمع لبِ گور
جو واقف دل سوزیٔ ہمدم نہ ہوا تھا

دل سوزی = ہمدردی

ہماری [illegible] پر جو شمع جل رہی ہے وہ ہمارے سوز دل کی علامت یا اس کی تصویر ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ وہ غم جسے ہم زندگی بھر سینہ میں چھپائے رہے اور جسے کسی غمگسار کی ہمدردی نہ حاصل ہو سکی اب مرنے پر شمع مزار کی بدولت سب پر ظاہر ہو۔

گھر خیر سے تقدیر نے ویرانہ بنایا
سامانِ جنوں مجھ سے فراہم نہ ہوا تھا

جنوں میں ہم سامانِ ویرانی فراہم نہ کر سکے تھے یا ویرانہ تک نہ پہنچ سکے تھے تو تقدیر کی مہربانی نے ہمارے گھر کو ہی ویرانہ میں تبدیل کر دیا۔ اپنی تقدیر کی برگشتگی کو طنزاً مہربانی کہا ہے۔

اک کفرِ سراپا نے کیا حشر کا قائل
میں معتقدِ حشرِ مجسّم نہ ہوا تھا

کفر سراپا = کافر ادا محبوب

میں فتنۂ محشر کا قائل نہ تھا لیکن ایک کافر ادا کو دیکھ کر اس کا یقین ہو گیا کہ فتنۂ محشر حقیقت رکھتا ہے اور یہ فتنۂ مجسّم ہو کر انسان کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ قامتِ محبوب کو قیامت سے تشبیہ دنیا غزل کا عام مضمون ہے۔ غالبؔ نے کہا ہے:

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم   میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

فانی کے شعر میں کفر کے ذریعہ حشر کے قائل ہونے نے لطف پیدا کر دیا ہے۔

ہر دل میں نئی شانِ تجلّی ہے کہ فانی
نشتر ہے وہ انداز جو مرہم نہ ہوا تھا

محبوب کے جلوے ہر دل پر جدا جدا رنگ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی ادائیں کسی دل کے لیے نشتر کا کام کرتی ہیں اور کسی کے لیے مرہم کا۔

(۶۹)

ستم گردشِ ایّام اٹھا   ہر سحر اُٹھ کے غمِ شام اٹھا

فانی کے نزدیک جس طرح زندگی میں دن اور رات کا سلسلہ ناگزیر ہے اور انسان کو خوش ناخوش اسے گذارنا ہی پڑتا ہے، اسی طرح غم بھی ناگزیر ہے اور ہر صبح انسان کے لیے آنے والی رات کا غمگیں تصور بھی ساتھ لاتی ہے۔ مراد یہ کہ زندگی پر انسان کا بس ہے نہ غموں پر۔

تم جسے در سے اٹھا دیتے تھے   آج دنیا سے وہ ناکام اٹھا

محبوب عاشق کے اپنے در پر بیٹھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ آج ناکامیٔ عشق کی بدولت وہ دنیا ہی سے رخصت ہوگیا۔ یہ مضمون فانی کا پسندیدہ مضمون ہے۔

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے   کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

عشق کا ایک قصور اور سہی   موت کے سر سے تو الزام اٹھا

عاشق کی موت کی ذمہ دار اجل نہیں بلکہ عشق ہے۔ اچھا ہوا کہ موت کے سر پر یہ الزام نہ آیا۔ عشق چونکہ تمام مصائب و آلام کا سرچشمہ ہے اس پر اگر عاشق کی موت کا الزام عائد ہو بھی گیا تو کیا ہے اس کی فہرست میں ایک خطا کا اضافہ اور سہی۔

ابر اٹھا سمتِ حرم سے زاہد   تو بھی سجادہ اُلٹ، جام اٹھا

سجادہ = مصلّٰی

اس شعر میں فانی کی غم پسند اور مایوس طبیعت کی جگہ شگفتگی و سرخوشی کا اظہار پایا جاتا ہے۔ وہ زاہد سے کہتا ہے کہ سمتِ قبلہ سے ابر جھوم کر آ رہا ہے۔ ایسے میں ترا مصلّے پر بیٹھنا بدمذاقی ہے اس کو تہہ کر دے اور ہاتھ میں جام اٹھا لے۔

ہل گئی پھر مرے دل کی دنیا   درد پھر لے کے ترا نام اٹھا

آج پھر درد نے میرے دل میں کروٹ لی ہے اور میرے ارمانوں کی دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ یہ خلش اس لیے اور بھی جان لیوا بن گئی ہے کہ درد محبوب کا نام لے کر اٹھا ہے۔

(۷۰)

دنیائے حسن و عشق میں کس کا ظہور تھا
ہر آنکھ برق پاش تھی، ہر ذرّہ طور تھا

برق پاش = تجلی گرانے والی۔

حسن و عشق کی دنیا محبوبِ حقیقی کی تجلی سے روشن ہے۔ اس کا جلوہ دیکھنے کے لیے طور اور برقِ تجلّی کی ضرورت نہیں بلکہ کائنات کا ہر ذرّہ اس کی جلوہ گاہ اور ہر آنکھ اس کی تجلّی سے روشن ہے۔

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا
اللہ! ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

محبوب کے حسن کو مادّی آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں گویا میری نگاہیں ہی اس کے نور کا پردہ بن گئیں۔ اس کے نور کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ نگاہیں جو خود شعاعِ نور کی طرح لطیف ہوتی ہیں اس کے نور کا پردہ بن گئی ہیں۔ مراد یہ کہ عاشق کی نگاہیں جلوہ گاہِ معشوق ہیں اور اس کی تجلی کی حامل ہیں مگر یہی اس کے اور محبوب کے درمیان حائل بھی ہیں۔ یعنی اپنی ہستی کا احساس ہی سب سے بڑی دوری ہے۔

تھی ہر تڑپ سکون کی دنیا لیے ہوئے
پہلو میں آپ تھے کہ دلِ ناصبور تھا

ناصبور = بے قرار و بے صبر

ہمارا دل جب محبت میں بے قرار ہو کر تڑپتا ہے تو اس کی تڑپ میں بھی ہمیں سکون و آرام ملتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سینے میں دل نہیں بلکہ خود محبوب ہے۔ مراد یہ کہ عاشق کو محبوب کا دیا ہوا درد بھی محبوب کی طرح عزیز اور باعثِ سکون ہوتا ہے۔

ہم کشتگانِ غم پہ یہ الزامِ زندگی
بے مہر کچھ تو پاسِ حقیقت ضرور تھا

کشتگانِ غم = غم کے مارے ہوئے

عاشق غمِ عشق کا شکار ہو چکا ہے اور اس کی زندگی موت کا نمونہ ہے لیکن محبوب اب بھی اسے زندہ سمجھتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ستم اور حقیقت سے دوری کیا ہوگی۔

بالیں پہ تم جب آئے تو آئی وہ موت بھی
جس موت کے لیے مجھے جینا ضرور تھا

بالیں = سرہانے

محبوب کا بالیں پر آنا اور عاشق کا جان دے دینا غزل کا عام موضوع ہے۔ لیکن فانی نے "وہ موت بھی" کہہ کر شعر میں ندرت پیدا کر دی ہے کہ میں اُس موت کی تمنا میں جی رہا تھا کہ تم آؤ تو میں جان نذر کر دوں۔ آج تمھارے آنے سے یہ خواہش پوری ہوگئی۔

تھی ان کے روبرو بھی وہی شانِ اضطراب
دل کو بھی اپنی وضع پہ کتنا غرور تھا

عاشق کا دل بے قرار محبوب کے آنے سے بھی پُرسکون نہیں ہوتا۔ گویا یہ اضطراب دل کی وضعداری میں شامل ہے جس پر وہ ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ مراد یہ کہ عشق میں وصل محبوب اتنا اہم نہیں جتنا کہ خود غمِ عشق۔

لطفِ حیات بے خلشِ مدعا کہاں
یعنی بقدرِ تلخئ صہبا سرور تھا

شراب میں جتنی تلخی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی اس میں سرور اور نشہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح زندگی کا اصلی لطف بھی تمنّاؤں کی خلش کے بغیر ممکن نہیں۔

اٹھ کر چلے تو حشر بھی اٹھنا تھا کیا ضرور
ان کی گلی سے مدفنِ فانی تو دور تھا

محبوب جب چلتا ہے تو اس کی رفتار سے قیامت کے فتنے بیدار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی گلی میں گرم رفتار ہے اور ساتھ ہی حشر بھی اٹھا رہا ہے۔ عاشق کو حسرت ہے کہ یہ حشر اٹھنا تھا تو میرے مزار پر اٹھتا۔ لیکن میرا مزار تو اس کی گلی سے بہت دور ہے۔ اب اس طرح حشر اٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شعر میں در پردہ یہ تمنّا ہے کہ کاش محبوب کی رفتار کے فتنے ہمارے مدفن پر اٹھیں۔

(۷۱)

دم کیا تنِ بسمل سے آسان نکل آیا
ارمان بھرے دل سے ارمان نکل آیا

عاشق کے زخمی جسم سے جان یوں آسانی سے نکلی گویا اس کے دل کا ارمان نکل گیا۔ مراد یہ کہ مدت کی ایک آرزو تھی جو آج پوری ہوئی۔

وحشت کی بدولت ہم جس گھر سے نکل آئے
اس گھر سے تباہی کا سامان نکل آیا

ہماری موجودگی ہمارے گھر کی تباہی کی ضامن تھی۔ یعنی اگر ہم گھر کو نہ چھوڑتے تو وہ یقیناً ویران ہو جاتا۔ اب جو وحشت میں ہم گھر سے نکل گئے ہیں تو گھر کی تباہی اور خرابی کا سامان بھی نکل گیا۔

تم شامِ شبِ فرقت بیساختہ آ نکلے
یا کفر کے پردہ سے ایمان نکل آیا

شاعر نے شبِ فرقت کی تیرگی کو کفر سے اور محبوب کے حسن کو ایمان سے تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ رات جب ہجر کی تاریکی اور مایوسی میں اچانک تم آ گئے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کفر کی تاریکیوں میں ایمان کا اجالا پھیل گیا۔ "بیساختہ آ نکلے" نے شعر میں بیساختگی پیدا کر دی۔

ہم عرصۂ ہستی سے گذرے بھی تو کیا گذرے
اک اور قیامت کا میدان نکل آیا

ہماری زندگی اضطراب و بے چینی کے ہاتھوں قیامت کا نمونہ تھی، ہم نے جیسے تیسے اس زندگی کو گذارا۔ لیکن مر کر معلوم ہوا کہ ابھی تو ایک مرحلہ اور طے کرنا ہے اور مرنے کے بعد میدانِ حشر کی امتحاں گاہ سے بھی گذرنا ہے۔

آنکھوں کی خطا فانی محشر میں عطا ٹھہری
طوفان اٹھایا تھا احسان نکل آیا

محبت کے غم سے گھبرا کر آنسو بہانا مذہبِ عشق میں جرم ہے لیکن ہم نے جو آنسو بہائے وہ محشر میں ہماری بخشش کا سبب بن گئے۔ گویا اشکباری جسے ہم خطا تصوّر کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی عطا کا سبب بن گئی۔ اور آنکھوں نے اشکوں کا جو طوفان برپا کیا تھا وہ ہمارے لیے احسان اور موجبِ رحمت بن گیا۔

(۷۲)

سنگِ در دیکھ کے سر یاد آیا
کوئی دیوانہ مگر یاد آیا

محبوب اپنے سنگِ در کو دیکھ کر رُک گیا ہے۔ شاید اسے کسی دیوانہ کا اس سے سر پھوڑنا یاد آگیا ہے۔

پھر وہ اندازِ نظر یاد آیا
چاکِ دل تا بہ جگر یاد آیا

پھر ہمیں محبوب کی وہ قاتل نگاہیں یاد آرہی ہیں جنھوں نے دل و جگر کو زخمی اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

ذوقِ اربابِ نظر یاد آیا
سجدہ بے منّتِ سر یاد آیا

بے منّتِ سر = سر کے احسان سے آزاد

اہلِ نظر سجدہ ریزی کے لیے ظاہری اسباب کے پابند نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ انھیں سجدہ کے لیے جبیں اور سر کی حاجت بھی نہیں ہوتی بلکہ ان کے لیے ہر در، درِ محبوب اور ان کی ہستی اس کی ہمہ تن پرستش بن جاتی ہے۔ ہمارے دل میں بھی ایسے ہی سجدہ کی آرزو ہے۔

ہر تبسّم پہ یہ کھاتا ہوں فریب   کہ انھیں دیدۂ تر یاد آیا

محبوب عاشق کی حالتِ زار پر مسکرا رہا ہے لیکن عاشق اپنی سادہ لوحی سے اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ شاید اُسے عاشق کی اشک آلود آنکھوں پر ترس آگیا ہے اور اس کی مسکراہٹ ازراہِ عنایت ہے۔

پھر ترا نقشِ قدم ہے درکار   سجدۂ راہ گزر یاد آیا

ہمیں وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب ہم تیری رہ گزر میں سجدے کیا کرتے تھے۔ کاش تیرے وہ نقشِ قدم ہمیں پھر سے میسّر آجائیں اور ہم ان پر سجدہ ریزی کرسکیں۔

جمع کرتا ہوں غبارِ رہِ دوست   سرِ شوریدہ مگر یاد آیا

شوریدہ = وحشت سے بھرا۔

دیوانگی میں عاشق سر پر خاک ڈالتا تھا۔ ایک عرصہ سے وہ خاموش بیٹھا تھا لیکن آج پھر وہ محبوب کی گلی کی خاک جمع کر رہا ہے۔ شاید پھر اس کی وحشت تازہ ہوئی ہے اور اسے سر پر خاک ڈالنے کا خیال آگیا ہے۔

ہائے وہ معرکۂ ناوکِ ناز   دل بچایا تو جگر یاد آیا

محبوب کے ناز و ادا کے تیر بھی کیا قیامت تھے کہ دل و جگر دونوں ان کا نشانہ تھے اگر میں دل بچانے کی کوشش کرتا تھا تو جگر زد میں آجاتا تھا۔

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا   میں بہ عنوانِ دگر یاد آیا

بہ عنوان دگر = نئے انداز سے

محبوب یوں تو عاشق کو یاد نہیں کرتا لیکن آئینہ دیکھ کر اسے عاشق کا دیدۂ حیراں یاد آجاتا ہے اور اسی لیے اس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے گویا آئینہ میری یاد کا عنوان یا سبب بن گیا ہے۔

درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش   خانہ برباد کو گھر یاد آیا

آج پھر دل میں درد کی کسک پیدا ہوئی ہے اور درد پھر میرے دل کو اپنا ٹھکانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس خانہ برباد (غم) کو مدت کے بعد اپنا گھر یاد آیا ہے۔ مراد یہ کہ دلِ عاشق درد کا اصلی گھر ہے اور اس کے سوا اور کوئی ٹھکانہ غم کا نہیں۔

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ   کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

محبوب کو فراموش کرنا عاشق کے بس کی بات نہیں۔ اگر وقتی طور پر اس کی یاد کو دل سے نکال بھی دیا پھر بھی اس کی یاد بار بار آئے گی اور عاشق اس کے سامنے بے بس ہوگا۔ شعر میں بڑی بیساختگی ہے۔

(۷۳)

اللہ رے فسوں گر تری آنکھوں کا اشارا
پھر دل نے لیا دردِ محبت کا سہارا

نہ جانے محبوب کی سحر کار نظروں نے کیا اشارہ کر دیا کہ میرا دل پھر سے دردِ محبت کا سہارا ڈھونڈھ رہا ہے۔ یعنی عاشق کے دل کا درد بے وجہ نہیں اس میں محبوب کی مرضی یا اس کا اشارہ بھی شامل ہوتا ہے۔

موجوں سے بھی گذرے تہِ دریا کو بھی دیکھا
ملتا ہے کہیں بحرِ محبت کا کنارا

محبت ایک ایسا دریا ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ ہم نے اس دریا کی موجوں کے تھپیڑے بھی کھائے اور تہ تک ڈوب کر بھی دیکھا لیکن اس کا ساحل کہیں نہ پا سکے۔ مراد یہ کہ محبت ایک لامتناہی جذبہ ہے اور مر کر بھی اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔

احساسِ محبت ہی مری موت ہے فانیؔ
اس زندگیٔ دل نے مجھے جان سے مارا

محبت کا احساس ایک طرف تو دل کی زندگی کا ضامن ہے مگر دوسری طرف اس کی

تکالیف جان لیوا بھی ہیں۔ گویا محبّت نے ہمیں زندگی دی مگر ہماری جان لے لی۔

(۷۴)

کیا چھپاتے کسی سے حال اپنا   جی ہی جب ہو گیا نڈھال اپنا

ہمارا دل غم اُٹھاتے اُٹھاتے ایسا نڈھال ہو گیا کہ اس میں برداشت کی طاقت ہی نہ رہی اور ہماری حالت سب پر ظاہر ہو گئی۔

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر   جس کی تصویر ہے خیال اپنا

افلاطون کے نظریہ کے مطابق اس کائنات کی ہر چیز اعیان ثابتہ (خدا کے تصورات) کا عکس ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ ہم اپنے محبوب کے تصورات یا خیالات کا عکس ہی نہیں ہیں بلکہ وہ بھی ہمارے خیالات سے مماثل اور مشابہ ہے یعنی خدا ہی اس کائنات کی اصل بھی ہے اور اس کا محبوب بھی۔

وہ بھی اب غم کو غم سمجھتے ہیں   دور پہنچا مگر ملال اپنا

محبوب بھی اب غم سے واقف ہو گیا ہے اور غم کو غم سمجھنے لگا ہے۔ شاید ہمارے حالِ زار کا ذکر اب اس تک پہنچ گیا ہے۔ اس میں اشارا یہ ہے کہ شاعر کو افسوس ہے کہ اس کا غم محبوب کے ملال کا سبب بنا اور اتنی دور تک پہنچا۔

تو نے رکھ لی گناہ گار کی شرم   کام آیا نہ انفعال اپنا

انفعال = شرمندگی

ہمیں یہ دعویٰ تھا کہ گناہوں پر ندامت ہماری بخشش کا سبب بن جائے گی۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ تیری رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ شرمندگی و انفعال ہمارے کسی کام نہ آ سکتے تھے۔ یعنی گناہ گار کی بخشش کا سبب صرف رحمت خداوندی ہے جو اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتی ہے۔

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے   یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا

شاعر یادِ محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میرے دل میں سنبھل کر قدم رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دل کی بے چینی اور تڑپ سے تیرے قدم بھی ڈگمگا جائیں۔ یعنی شاعر کو خوف ہے کہ بے چینی کے ہاتھوں کہیں دل محبوب کی یاد سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔

باخبر ہیں وہ سب کی حالت سے
لاؤ ہم پوچھ لیں نہ حال اپنا

ہم بے خودی میں اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں اور اپنے حال کی خبر ہمیں صرف محبوب (محبوبِ حقیقی) سے مل سکتی ہے جو ہر ایک کی حالت سے باخبر ہے۔

موت بھی تو نہ مل سکی فانی
کس سے پورا ہوا سوال اپنا

ہماری کوئی خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی، یہاں تک کہ ہم نے موت کی تمنا کی تھی مگر وہ بھی ہمیں نہ مل سکی۔ ع ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

(۷۵)

ہوشِ ہستی سے تو بے گانہ بنایا ہوتا
کاش تو نے مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

شاعر دیوانگی کو ہوش پر ترجیح دیتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ کاش وہ دیوانہ ہوتا تاکہ اپنے وجود کا احساس جو اسے محبوب سے دور رکھتا ہے اس سے نجات مل جاتی۔ مراد یہ کہ عاشق کی ہستی محبوب سے الگ نہیں۔ یہ صرف احساسِ ہستی ہے جو اسے محبوب سے دور کر دیتا ہے۔

دل میں اک شمع سی جلتی نظر آتی ہے مجھے
آ کے اس شمع کو پروانہ بنایا ہوتا

محبت کی معراج یہ ہے کہ دل میں خیالِ محبوب کے سوا کوئی احساس یا آرزو باقی نہ رہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ابھی ہماری محبت اس مقام تک نہیں پہنچ پائی ہے اور اسی لیے دل میں ایک شمع سی جلتی نظر آتی ہے (شمع سے مراد آرزو بھی ہو سکتی ہے اور اپنے وجود کا احساس بھی) تو ایک بار سامنے آجاتا کہ یہ احساس بھی مٹ جائے اور ہم تیری محبت کے سوا ہر چیز

سے بے نیاز ہو جائیں۔

تیرے سجدوں میں نہیں شانِ محبت زاہد
سر کو خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

زاہد بھی حسنِ یار کا پرستار ہے اور عاشق بھی۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ زاہد صرف ظاہری رسوم عبادت کو کافی سمجھتا ہے اور عاشق ان رسوم سے بے نیاز ہے اور اس کی محبت میں اپنی ہستی کو مٹا دینا محبت کی معراج سمجھتا ہے۔ وہ زاہد کو بھی یہی مشورہ دیتا ہے کہ ان بے روح سجدوں سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر تم محبوب تک پہنچنا چاہتے ہو تو اس کی محبت میں خاک ہو جاؤ۔

دل تری یاد سے آباد ہے اب تک ورنہ
غم نے کب کا اسے ویرانہ بنایا ہوتا

دنیا کے غم و آلام نے ہمارے دل کو کب کا ویران کر دیا ہوتا۔ مگر بھلا ہو تیری یاد کا کہ اس کی بدولت دل آج بھی آباد اور زندہ ہے۔ مراد یہ کہ جس دل میں محبوب کا تصوّر جاگزیں ہے اسی کو دنیا کے رنج و غم کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے (اصغر)

درد دے کر دلِ فانی کو مٹا دینا تھا
اس حقیقت کو بھی افسانہ بنایا ہوتا

تو نے ہمیں غمِ محبت عطا کر کے ہمارے دل کو حقیقتوں کا امین بنا دیا۔ اچھا تھا کہ تو اس کو محبت میں بالکل مٹا دیتا اور اس حقیقت (دل) کو ایک موہوم افسانہ میں تبدیل کر دیتا یعنی معدوم کر دیتا۔ شعر حقیقت و افسانہ کے الفاظ کے تضاد کی خاطر لکھا گیا ہے اور کوئی خاص تاثر نہیں ہے۔

(۷۶)

عشقِ رسوا بھی کسی کا نازِ معشوقانہ تھا ہر محبت کا فسانہ حُسن کا افسانہ تھا

نظریۂ ہمہ اوست کے مطابق ہر چیز کی اصل صرف ایک ہی ذات ہے اور کوئی شے اس سے جدا نہیں۔ جب یہ ہے تو پھر عاشق اور معشوق میں بھی کوئی فرق نہیں۔ عشق کی رسوائیاں بھی حسن ہی کی ایک ادا ہیں۔

قہر کی حد تک بھی تھا دشوار جن کا التفات   مہر کی اُن سے توقع! میں کوئی دیوانہ تھا

محبوب ہم سے اس حد تک بے زار ہے کہ ہم کو قہر و غضب کا مستحق بھی نہیں سمجھتا۔ ایسے تغافل پیشہ سے مہربانی کی اُمید رکھنا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ شعر کا خیال عام اور فرسودہ ہے مگر اندازِ بیان کی بے ساختگی نے حسن پیدا کر دیا ہے۔

ان کے آگے کھل گیا تھا شمع کا سارا فریب   رات بزمِ دوست میں پروانہ ہی پروانہ تھا

محبوب کے حسن کے آگے شمع کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ رات اس کی محفل میں پروانوں کا ہجوم دیکھنے کے قابل تھا۔ "پروانہ ہی پروانہ تھا" ٹکڑے سے دو باتوں کا اظہار مقصود ہو سکتا ہے۔ اول تو یہ کہ اس کی محفل میں پروانوں کی کثرت تھی اور پروانے شمع کی بجائے اس کی طرف مائل تھے۔ دوسرے یہ کہ شمع بھی اس کے حسن کا پروانہ (عاشق) بن گئی تھی۔

عشق اور مایوسیاں، مایوسیاں کہنے کو ہیں   عہدِ ترکِ آرزو خود آرزو مندانہ تھا

عشق صادق ہو تو مایوسی کا اس میں گزر نہیں ہوتا۔ ترکِ آرزو کی جس منزل کو عام لوگ مایوسی خیال کرتے ہیں وہ بھی دراصل مایوسی نہیں بلکہ آرزو کی بلندی اور انتہا ہے۔ عشقِ حقیقی کے راستہ پر چلنے والوں کے نزدیک جب عاشق اپنے دل سے تمام آرزوؤں کو نکال دیتا ہے اور بیرنگی کے مقام تک پہنچتا ہے تب اسے محبوب سے اتصال حاصل ہو جاتا ہے۔

آپ کے غم کی بدولت دونوں عالم جمع ہیں   ورنہ دل کچھ بھی نہ تھا، دیکھے اک ویرانہ تھا

محبت کے بغیر دل ایک ویران کھنڈر کی مانند تھا۔ اسے محبت کا جذبہ عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے دونوں جہان کی وسعت دے دی ہے بقول غالب: ؏

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے

جس نظر میں امتیازِ کعبہ و بتخانہ تھا
وہ بھی کتنی تھی مذاقِ دید کی منزل سے دور

صوفیاو کے نزدیک کعبہ اور بت خانہ میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں جگہ ایک ہی حسن کے جلوے ہیں۔ جو لوگ ظاہر بیں ہیں اور ان امتیازات اور اختلافات کو مانتے ہیں ان کی نگاہیں کبھی محبوب کے دیدار سے سرفراز نہیں ہو سکتیں۔

جس پہ آتی تھیں بلائیں وہ مرا غم خانہ تھا
آسماں سے ہو چکا ساری بلاؤں کا نزول

ہمارے گھر کی بربادی کے بعد لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اب آسمان سے کوئی بلا نازل نہیں ہوگی کیونکہ بلائیں صرف ہمارے گھر کے لیے اترتی تھیں۔ مراد اپنی بدنصیبی و محرومی کا اظہار۔

حشر تک آنکھوں میں شاید جلوۂ جانانہ تھا
ہم قیامت کو قیامت ہی نہ سمجھے صبحِ حشر

قیامت آئی بھی اور گزر بھی گئی مگر ہمیں اس کا پتہ بھی نہ چلا کیونکہ ہماری آنکھوں میں تیرے حسن کے جلوؤں کی محشر خیز یاں بسی ہوئی تھیں۔ مراد یہ کہ تمہارے جلوؤں نے ہم پر وہ قیامت توڑی جس کے آگے قیامت کے فتنے بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

بات تو کچھ بھی نہ تھی، اک نالہ بیمارانہ تھا
ہم نے پوچھا حالِ فانؔی اور یہ سمجھے کچھ کہا

فانؔی کا ضعف اور ناتوانی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ بات کرنا بھی محال ہے۔ کوئی حال دریافت کرے تو اس کے لبوں سے صرف ایک نالہ نکل کر رہ جاتا ہے۔ ناتوانی کی تصویر کشی ہے لیکن غیر مؤثر۔ "بیمارانہ" کی ترکیب بھی غیر مانوس ہے۔

(۷۷)

جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا
مزاجِ دہر میں ان کا اشارہ پائے جا

دنیا کے غم و آلام تیرے محبوب (اللہ تعالیٰ) کی دین ہیں۔ اس بات کو سمجھ لے اور غموں پر نالاں ہونے کی جگہ مسکرانے کی کوشش کر۔ یہ خیال اکثر صوفی شعراء کا پسندیدہ موضوع

ہے۔ اصغر گونڈوی کہتے ہیں:

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

بہارِ صد چمنستانِ آرزو بن کر
مرے خیال کی رنگینیوں میں آئے جا

شاعر تصورِ محبوب سے التجا کرتا ہے کہ تیرے ہی دم سے ہماری آرزوؤں کی دنیا رنگین اور آباد ہے۔ تو اسی طرح بہار بن کر ہمارے خیالوں کو رنگین بناتا رہ۔

خرد نواز نگاہوں کی آڑ میں رہ کر
فضائے عالمِ دیوانگی پہ چھائے جا

خرد نواز = عقل کو اہم اور عظیم سمجھنے والی۔

اہلِ عقل ہمیشہ سے حسنِ حقیقی کی تلاش میں سرگرداں ہیں مگر آج تک اس کو نہ سمجھ سکے اس لیے کہ عقل کے ذریعے اسے پانا ممکن ہی نہیں۔ مگر جو اس کے عاشق ہیں انھوں نے عقل کے بجائے دیوانگی (محبت) کو اپنا رہنما بنایا اور اسے پا لیا۔ شاعر محبوب سے آرزو کرتا ہے کہ تو اہلِ خرد کو اسی طرح اپنے جلووں سے محروم رہنے دے اور اپنے دیوانوں کو اپنے حسن سے سرشار کر دے۔

پلائے جا کہ ابھی ہوشِ بیخودی ہے مجھے
پلائے جا ابھی ساقی مجھے پلائے جا

شاعر کی خواہش ہے کہ ساقی اسے اس قدر شراب پلائے کہ اسے اپنا مطلق ہوش نہ رہے۔ یہاں تک کہ بے خودی کا احساس بھی جاتا رہے کیونکہ بے خودی کے ہوش کا بھی یہ مطلب ہے کہ ابھی اپنے وجود کا احساس باقی ہے۔

ل و جگر پہ گزر جائے گی جو گزرے گی
تری نظر سے جو فتنے اٹھیں اٹھائے جا

شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ تو عاشقوں کی حالت کی پروا نہ کر۔ تیرا کام بجلیاں گرانا ہے، گراتا رہ۔ یعنی عاشق کو یہ فکر نہیں کہ اس پر کیا گزرے گی۔ وہ ہر قیمت پر محبوب کا نظارہ کرنے کو آمادہ ہے۔

را ٹھہر کہ اب انجامِ سوزِ غم ہے قریب
چراغِ زیست بھڑکنے کو ہے بجھائے جا

محبوب کے اُٹھ کر چلنے سے عاشق کی جان بھی نکلی جا رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا دیر اور رک جاؤ کہ اب ہمارا انجام بھی نزدیک ہے اور ہماری زندگی کا چراغ بھڑک رہا ہے۔ اس کو بجھا دو پھر چلے جانا۔ یہ شعر عاشق کی بے بسی اور بے کلی کی بڑی پُراثر تصویر ہے۔

سکوتِ میّت فانی ہے اک فسانۂ شوق　　لبِ خموش سے ہر مُدّعا کو پائے جا

اگرچہ مر کر عاشق کے لب خاموش ہو چکے ہیں مگر اس کی خاموشی بھی اس کے غم کی داستان سُنا رہی ہے۔ اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو ان خاموش ہونٹوں سے بھی یہ روداد سُن سکتا ہے۔

(۷۸)

ناوکِ ناز ترا کوئی خطا کرتا ہے　　اُڑ گیا ایک اشارہ میں نشانہ دل کا

ناوک = تیر

محبوب کے ناز و ادا کے تیر کبھی خالی نہیں جاتے۔ اس نے ہمارے دل کی طرف تیر پھینکا اور ایک ہی بار میں دل کا پتہ نہ رہا۔

حسرتیں جن کے نکلنے کی نہیں کچھ اُمید　　ڈھونڈھتی پھرتی ہیں سینہ میں ٹھکانہ دل کا

ہم ان حسرتوں اور تمنّاؤں کو اپنے سینہ میں جگہ دیتے ہیں جن کے پورے ہونے کا امکان ہی نہیں۔ انداز بیان میں تکلّف ہے اور کوئی خاص بات نہیں۔

ہائے وہ دُھن تجھے مشقِ ستمِ بے جا کی　　ہائے وہ روز نئے ظلم اُٹھانا دل کا

محبوب کو نت نئے ظلم ڈھانے کا شوق ہے۔ اس کے لیے وہ ہمارے دل کو تختۂ مشق بناتا ہے چنانچہ ہمارا دل روز نئے ظلم سہتا ہے۔

ہائے وہ جوشِ جنوں ہائے وہ وحشت فانیؔ　　یاد آتا ہے ہمیں کوئی زمانہ دل کا

ہمیں ابتدائے عاشقی کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب دل پر وحشت کا غلبہ تھا اور جنون کی بدولت ہم کبھی نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ میرؔ نے اسی کیفیت کو بڑے لطف سے بیان کیا ہے:

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　اب جو ہیں خاک انتہا یہ ہے

(۷۹)

نام بدنام ہے ناحق شبِ تنہائی کا
وہ بھی اک رُخ ہے تری انجمن آرائی کا

اگر جذبۂ عشق صادق ہے تو محبوب سے جدائی بھی جدائی نہیں رہتی بلکہ اس عالم میں بھی عاشق محبوب کو اپنے سے قریب محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ جس کو عام لوگ شبِ تنہائی خیال کرتے ہیں وہ بھی ہم تیری یاد میں بسر کرتے ہیں گویا تو ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ ع

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

آچلا ہے مجھے کچھ وعدۂ فردا کا یقیں
دل پہ الزام نہ آجائے شکیبائی کا

شکیبائی = صبر

عاشق محبوب کے وعدہ پر اعتبار کر کے صبر و سکون سے بیٹھا ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ کہیں اس کی خاموشی سے محبوب یہ مطلب نہ نکال لے کہ اس کے دل کا اضطراب کم ہوگیا ہے اور محبّت کی بے چینیاں جاتی رہیں۔

اب کانٹوں ہی سے کچھ لاگ نہ پھولوں سے لگاؤ
ہم نے دیکھا ہے تماشا تری رعنائی کا

لاگ = دشمنی   لگاؤ = رغبت

محبوب کے حسن کے جلووں نے ہمیں ایسا سرشار کر دیا ہے کہ اب ہمیں کسی چیز سے تعلق ہی نہیں رہا۔ اب نہ کانٹوں کا غم ہے نہ پھولوں کی حسرت۔ اگر شعر کو حقیقی معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ عشق نے ہمارے اندر وہ نگاہ پیدا کر دی ہے کہ ہم ہر چیز کے پردہ میں چھپے ہوئے حسنِ حقیقی کے جلوہ کو دیکھ لیتے ہیں اسی لیے ہماری نظر میں کانٹوں اور پھولوں میں کوئی فرق اور امتیاز باقی نہیں رہا۔

دونوں عالم سے گزر کر بھی زمانہ گزرا
کچھ ٹھکانہ بھی ہے اس بادیہ پیمائی کا

بادیہ پیمائی = جنگلوں کی خاک چھاننا (جو کہ عاشقوں کا دستور ہے)۔

ہم کو دونوں جہان کی وسعتوں کو طے کیے ہوئے عرصہ گزر گیا اب اس منزل سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔

خود ہی بیتاب تجلّی ہے ازل سے کوئی دیکھنے کے لیے پردہ ہے تمنّائی کا

اللہ تعالیٰ کا حسن ہمیشہ سے موجود تھا مگر اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے انسان کو اور اس کائنات کو تخلیق کیا۔ گویا اس کے جلوے جو ازل سے خود نمائی کے لیے بے چین تھے انھوں نے انسان کے پردہ میں اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ گویا وہ وہی تماشا ہے اور خود ہی تماشائی۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں:

عشق ہے پرتوِ حُسنِ محبوب آپ ہی اپنی تمنّا! کیا خوب

لگ گئی بھیڑ یہ دیوانہ جدھر سے گزرا ایک عالم کو ہے سودا ترے سودائی کا

تیرا دیوانہ جدھر جاتا ہے ایک خلقت اس کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔ یہ تیری محبت کا فیض ہے کہ ساری دنیا تیرے دیوانے کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہے۔ دیوانہ کی بے وقعتی کو بڑے خوبصورت انداز سے اس کی عظمت پر محمول کیا ہے۔

پھر اسی کافرِ بے مہر کے در پر فانیؔ لے چلا شوق مجھے ناصیہ فرسائی کا

ناصیہ فرسائی = ماتھا جھکانا یا رگڑنا

یہ جانتے ہوئے بھی کہ محبوب بے مہر اور وفا کا منکر ہے ہم اپنے شوق سے مجبور ہو کر اس کے در پر سجدہ ریزی کرنے جا رہے ہیں۔

(۸۰)

شکوہ سمجھو نہ کم نگاہی کا حال دیکھو مری تباہی کا

کم نگاہی = بے توجہی۔

عاشق کی بدحالی و تباہی کا سبب محبوب کی کم نگاہی اور تغافل ہے۔ مگر وہ یہ بات سننا نہیں چاہتا بلکہ عاشق کی بے چینی کو بھی شکایت سمجھتا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ تم ہماری تباہی کو ایک بار آ کر دیکھ تو لو۔ تب تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم نے یہ حالت تمھیں دکھانے کو یا تمھارے تغافل کے شکوہ کے لیے نہیں بنائی ہے بلکہ واقعی ہم اس حال کو پہنچ گئے ہیں کہ

حالِ دل ہماری حالتِ زار سے ظاہر ہونے لگا ہے۔

دے غمِ عشق دل کو غم سے پناہ　　　واسطہ اپنی بے پناہی کا

عشق ایک ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں مگر یہ دوسرے تمام غموں سے نجات بھی دلا دیتا ہے گویا یہ ہر درد کی دوا ہے اور خود درد لا دوا۔ شاعر عشق کی اسی خصوصیت کی دہائی دے کر اس سے مدد مانگتا ہے کہ مجھے تمام غموں سے آزاد کرا دے۔

دوسرا نام ہے شبِ فرقت　　　میری تقدیر کی سیاہی کا

ہماری تقدیر کی سیاہی کی مثال اگر کسی چیز سے دی جا سکتی ہے تو وہ شبِ فرقت ہے۔ ایک اشارہ شعر میں یہ بھی ہے کہ ہماری بدنصیبی نے جدائی کی شکل اختیار کر لی ہے۔

بخش دے جبرِ کل کے صدقے میں　　　ہر گنہ میری بے گناہی کا

جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں کہ انسان اس دنیا میں مجبورِ محض اور تقدیر کا پابند ہے ان کے نزدیک اس کے گناہ بھی مجبوری کے ہیں اور وہ ان کے لیے جواب دہ نہیں۔ اس شعر میں فانی بھی اسی کے قائل نظر آتے ہیں اور خدا سے ملتجی ہیں کہ تو نے ہمیں مجبور بنایا ہے۔ اسی جبر کا صدقہ ہمارے گناہوں پر سزا نہ دے اور ان کو ہماری مجبوری سمجھ کر معاف کر دے۔ "بے گناہی کا گناہ" لطف سے خالی نہیں۔

آپ کا نام لینے والوں کو　　　فقر کا ہوش ہے نہ شاہی کا

جو لوگ اللہ تعالیٰ سے لَو لگا لیتے ہیں ان کے دل میں دنیاوی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی اور وہ بادشاہی و فقیری دونوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

فطرتِ اختیار حشر کے دن　　　آسرا ہے تری گواہی کا

فطرتِ اختیار = صاحبِ اختیارِ فطرت مراد خدا۔

روزِ حشر جب نیکی و بدی کا دفتر پیش ہوگا اس دن ہمیں بس ایک آسرا ہے۔ وہ یہ کہ

اللہ تعالیٰ خود اپنی شانِ اختیار کو کام میں لا کر اور ہماری مجبوری کا خیال کر کے ہمیں بخش دے گا کیونکہ بندۂ مجبور کے گناہ تعذیر کے مستحق نہیں ہوتے۔ یہ نظریہ بڑا گمراہ کن ہے کیونکہ اس کی رو سے انسان اپنے کسی گناہ کا ذمہ دار نہیں۔

مقتضاء رحمتِ الٰہی کا　　　کیا کہوں جی رہا ہوں کیوں فانیؔ

ہم نہیں جانتے کہ ہماری زندگی کا کیا مقصد ہے اور ہم کس لیے جیے جا رہے ہیں۔ اس کو خدا کی رحمت کے سوا اور کیا کہیں۔ شعر گستاخانہ ہے۔ اس میں رحمتِ خداوندی پر طنز ہے۔

(۸۱)

دل کو مٹا کر روح کو تن سے حکم نہ دے آزادی کا
کوئی تماشا دیکھنے والا چاہیے اس بربادی کا

محبوب عاشق کے دل کو مٹا کر اس کی جان بھی لینا چاہتا ہے۔ عاشق اسے یہ کہہ کر باز رکھنا چاہتا ہے کہ اگر جان بھی چلی گئی تو اس بربادی کا تماشا کون دیکھے گا۔ عاشق کی غم پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ مر کر وہ غم سے نجات پا لے بلکہ وہ اپنی تباہی کو تماشا بنانے کا خواہش مند ہے۔

یوں ترے غم نے دل میں جگہ کی، دیدی گویا غم سے نجات
دید کے قابل منظر ہے اس آمدِ غم کی شادی کا

جب سے غمِ عشق نے دل میں جگہ کی ہے، ہر غم سے دل کو نجات مل گئی ہے اور دل میں اس کی آمد کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔

ظلم سے توبہ تم نہ کرو گے آہ سے کیوں باز آئیں ہم
تم نہ سہی فریادی کے، اللہ تو ہے فریادی کا

محبوب ظلم کیے جاتا ہے اور ہم فریاد۔ یہ فریاد محبوب کے دل کو نرم نہ کر سکی تو خدا تو سنے گا۔ یہ سوچ کر ہم فریاد سے باز نہیں آتے۔

یاد ہے وہ نومیدی میں ہلکی سی جھلک امیدوں کی
ہائے وہ دل کے ویرانے پر دھوکا سا آبادی کا

ہمارے مایوس اور ویران دل میں کبھی جب کوئی ہلکی سی اُمید جاگتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ویرانہ آباد ہوگیا ہو۔

فانی جب دل پاس نہ ہو تو لطفِ تماشا کچھ بھی نہیں
حال کسی سے کیا کہیے، کشمیر کی دل کش وادی کا

غم کے ہاتھوں دل اس طرح مُردہ ہوا ہے، کہ کشمیر کی وادی کی سیر بھی ہمیں کوئی لطف نہیں دے سکی۔

(۸۲)

جذبِ محبت بھی کیا شے ہے ان کا چاہا ہو نہ سکا
وہ مرے دل سے کیا چھپتے آنکھوں سے بھی پردا ہو نہ سکا

محبوب لاکھ چاہے کہ ہم سے چھپ کر پردے میں رہے مگر اس کی یہ مرضی پوری نہیں ہوسکتی۔ ہمارا جذبۂ محبت سلامت ہے تو ہم اسے دل کی محفل میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی بسالیں گے۔ غالب نے اسی بات کو زیادہ منطقی انداز میں کہا ہے:

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں پر یہ تو بتلاؤ
کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

عزّتِ رسوائی بھی کہیں تدبیر سے حاصل ہوتی ہے
حیف ہے اس کی قسمت پر جو عشق میں رسوا ہو نہ سکا

حیف = افسوس

محبت میں بدنام و رسوا ہونے کو شاعر عاشقی کی معراج سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ سرفرازی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ نہ اس میں انسان کی اپنی تدبیر کو ہی کچھ دخل ہے بلکہ ع : ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست۔

یاس و اُمید سے کام نہ نکلا دل کی تمنّا دل میں رہی
ترکِ تمنّا کر نہ سکے، اظہارِ تمنّا ہو نہ سکا

اگر محبوب سے اپنی آرزو کا اظہار کرتے تو اس کے مہربان ہونے کی اُمید ہوتی لیکن اظہار کی ہم میں ہمت نہ تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ دل سے اس کی آرزو نکال دیتے اور بالکل ہی مایوس ہو جاتے مگر ایسا ہم کر نہ سکے۔ گویا امید اور یاس دونوں کے راستے ہمیں راس نہ آئے اور ہم دونوں کے درمیان بھٹکتے رہے۔

جس سے دل میں زخم پڑے تھے پھر وہ نظر مرہم نہ ہوئی
تم نے جسے اچھا نہ کیا پھر تم سے بھی اچھا ہو نہ سکا

محبوب کی نگاہوں نے عاشق کے دل کو زخمی کیا اور اس کی کوئی خبر نہ لی۔ اس کے دل کے زخم اب اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اگر وہ خود بھی انھیں اچھا کرنا چاہے تو کامیاب نہ ہوگا۔

جس کی چمک ذرّوں میں نہیں وہ مہرِ عالمتاب نہیں
جو نہ سمایا قطرہ میں وہ دریا دریا ہو نہ سکا

مہرِ عالمتاب = دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔

ایسا سورج جس کی چمک صرف بلندیوں کو چھوئے اور ذرّوں کو نہ چمکا سکے وہ مہرِ عالمتاب کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسی طرح جو دریا قطرہ کی پیاس نہ بجھائے وہ دریا نہیں۔ یعنی حقیقی بڑائی یہ ہے کہ بغیر کسی امتیاز اور تفریق کے ہر ایک کو فیض پہنچایا جائے اور سورج کی طرح کسی کو اپنی روشنی سے محروم نہ رکھے۔

جان دمِ رخصت ہی نہ دی تو فانیؔ تجھ سے کیا اُمید
ہجر کی پہلی فرصت میں بھی تجھ سے اتنا ہو نہ سکا

محبّت کا تقاضا تھا کہ جیسے ہی محبوب رخصت ہوا تھا عاشق کی جان بھی اس کے ساتھ چلی جاتی۔ مگر جب وہ اس وقت جان نہ دے سکا تو اب اس سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ محبّت میں کچھ

کر کے دکھائے گا۔

(۸۳)

دل کیا، غمِ دنیا کیا، اس دردِ محبّت نے
ایک ایک حقیقت کو افسانہ بنا ڈالا

دل کے وجود کا احساس، دنیا کے غم و آلام غمِ عشق کے آتے ہی اس طرح معدوم ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ گویا عشق نے زندگی کی تمام حقیقتوں کو ایک کہانی بنا دیا۔ اور عاشق کی دنیا میں غمِ عشق کے سوا کسی چیز کا وجود ہی نہ رہا۔

ہر پھول کی نکہت میں کیفیتِ مئے بھر کر
ساقی نے گلستاں کو میخانہ بنا ڈالا

اگر انسان میں حقیقت کی تلاش کا جذبہ ہو تو گلستاں کا ہر پھول شرابِ معرفت کا بھرا ہوا جام بن جاتا ہے یعنی اس آئینہ میں وہ محبوبِ حقیقی کے حسن کا جلوہ دیکھ سکتا ہے اور اپنی روح کو اس کے حسن سے سرشار کر سکتا ہے۔ اس شعر میں تصوف کے خیال کو تغزل میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔

وہ شمع ہے تو جس نے اس آئینہ خانہ میں
اپنی ہی تجلی کو پروانہ بنا ڈالا

صوفیا کے نزدیک یہ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے۔ اس میں حقیقی ذات صرف ایک ہے اور وہ ہے حسنِ ازل۔ باقی جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب اس ایک حقیقت کے مختلف عکس ہیں۔ انسان بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ انسان جو عشقِ الہٰی کا دعویدار ہے وہ گویا اپنے ہی عشق میں مبتلا ہے۔ یہ مضمون فانی کا پسندیدہ ہے اور اکثر شعروں میں بڑے لطف کے ساتھ پیش ہوا ہے۔

(۸۴)

عشق سے کام بھی لے عشق پہ ایمان بھی لا
دل ہی نذرِ نگہِ ناز نہ کر جان بھی لا

محبت میں صرف دل ہی محبوب کی نذر کرنا کافی نہیں بلکہ عقل کا تقاضا ہے کہ جان بھی

اسے نہ دی جائے۔ اس لیے عاشق اپنے آپ کو تنبیہ کرتا ہے کہ محبت کے یقین کے ساتھ عقل کی رہنمائی بھی ضروری ہے۔ اس شعر میں لطف یہ ہے کہ عقل کا مفہوم شاعر کے نزدیک اس مفہوم سے بالکل جداگانہ ہے جو عام لوگ مراد لیتے ہیں۔ یعنی عام نظروں میں تو جان کی حفاظت عقل کا تقاضا ہے۔ مگر فانیؔ جان دینے کو عقل مندی قرار دیتے ہیں کیونکہ دل کے بغیر زندگی ایک وبال ہے۔

فانیؔ زار جاں بری عشق میں مصلحت نہیں   جاں وداعِ دل کے بعد ہو کے وبال رہ نہ جائے

تیری آمد کے تصدق، ترے جلووں کے نثار
آ مری قبر پہ آ، حشر کا سامان بھی لا

عاشق کی تمنا ہے کہ محبوب اس کی قبر پر آئے، چاہے اس کے آنے سے عاشق پر قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے۔

تو نے دل دے کے بس اک شانِ ہوس پیدا کی
ان کا بندہ ہے تو نادان وہی شان بھی لا

انسان جس کی محبت کا دم بھرے اور اپنے کو جس کا نام لیوا کہے، چاہیے کہ اپنے اندر اس کی سی خصوصیات اور اوصاف بھی پیدا کرے۔ مگر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر اپنے محبوب سے ہمارا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ یہ محبت کرنے والوں کے انداز نہیں اہلِ ہوس اور فریب کاروں کا طریقہ ہے۔ محبوب کا اشارہ یہاں خدا کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور نبی اکرمؐ کی طرف بھی۔

غمِ شوریدگیٔ عشق کی تکمیل بھی کر
رنجِ ناکامیٔ دل کے لیے ارمان بھی لا

شوریدگی = جنون

شاعر کو عشق کا غم اور ناکامی اس قدر عزیز ہے کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا یا اسے ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ اس کے دل میں نئے نئے ارمان پیدا ہوتے رہیں تاکہ

ان کے نتیجہ میں اسے روز نئی ناکامیاں نصیب ہوں۔

جب سے اک تار بھی دامن میں سلامت نہ رہا
جوشِ وحشت کا تقاضا ہے گریبان بھی لا

دیوانہ جنون میں اپنے دامن کے تار بکھیر چکا ہے مگر ابھی اس کے جنون میں کمی نہیں آئی ہے اور اب وہ گریبان کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔

دادِ نظارہ تو دی اب جو حقیقت ہے وہ سُن
بزمِ عالم میں فقط آنکھ نہ لا، کان بھی لا

داد نظارہ دینا = اچھی طرح سے دیکھنا

انسان کو چاہیے کہ دنیا میں صرف آنکھیں ہی نہ کھلی رکھے بلکہ کانوں کو بھی کھولے۔ یعنی ان ظاہری شکلوں سے گزر کر ان کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو سمجھے اور اس سازِ ہستی سے نکلنے والے نغمات کو سننے کی کوشش کرے۔ خیال بلند ہے مگر الفاظ کا استعمال عامیانہ ہے۔

تجھ کو پھبتا نہیں اسلام کا دعویٰ فانی
ورنہ وہ غیرتِ اسلام بھی لا، آن بھی لا

فانی کو اعتراف ہے کہ ان کے اندر وہ آن بان اور غیرتِ دینی نہیں جو ایک مسلمان میں ہونا چاہیے۔ اسی لیے وہ اپنے دعوئ اسلام کو بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ ایک بڑے انسان کی پہچان ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور اپنی خوبیوں کا انکار کرتا ہے۔

(۸۵)

نہیں منظور تپِ ہجر کا رسوا ہونا   ترے بیمار کا اچھا نہیں اچھا ہونا

تپِ ہجر = جدائی کی آگ

محبت کے بیمار اس درد سے صحت نہ پائیں۔ یہی بہتر ہے۔ کیونکہ ان کا اچھا ہونا ان کی محبت کی رسوائی اور بدنامی کا سبب ہے۔

ناصحا! وسعت کاشانہ جنوں خیز نہیں   ورنہ کیا فرض ہے آوارۂ صحرا ہونا

جنوں خیز = دیوانگی کو بڑھانے والی۔

عاشق کے گھر پر بھی اب صحرا کی سی ویرانی برسنے لگی ہے مگر وہ اب بھی صحرا نوردی سے باز نہیں آتا۔ لوگوں کے یہ کہنے پر کہ اب صحرا کی خاک اڑانے کی کیا ضرورت ہے، وہ کہتا ہے کہ تمھارا یہ کہنا تو درست ہے کہ گھر بھی صحرا کی طرح ویران و وحشت انگیز ہے مگر گھر کی تنگی جنون میں وہ اضافہ نہیں کرتی جو کہ صحرا کی وسعت سے ممکن ہے۔ مراد گھر کی ویرانی کا مذکور ہے اور ساتھ ہی یہ بات کہ اہلِ جنون کو خاک اڑانے کے لیے صحرا کی وسعت ضروری ہے۔

بس اب اے ضبط زیادہ مجھے محجوب نہ کر   ہے مری آنکھ کی تقدیر میں دریا ہونا

محجوب = شرمندہ

عاشق کی آنکھوں میں دریا سے کم آنسو نہیں مگر ضبط اسے آنسو بہانے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اپنے ضبط کی طاقت سے مخاطب ہے کہ اب اپنی روک تھام ختم کر دے اور ہماری آنکھوں کو دریا بننے دے ورنہ ناحق ہمیں شرمندہ ہونا پڑے گا، یعنی ہمارے ضبط کو بے حسی سمجھ لیا جائے گا۔

کس سے کھلتے ہیں تری زلفِ گرہ گیر کے بل   کوئی آسان ہے یہ عقدۂ دل وا ہونا

زلف گرہ گیر = خم کھائی ہوئی زلفیں   عقدۂ دل وا ہونا = دل کی حسرت پوری ہونا

محبوب کی خمیدہ زلفیں ہمارے دل کی پریشانی کا سبب ہیں۔ اس کی زلفوں کا سلجھنا بھی ناممکن ہے اور ہمارے دل کی آرزو بر آنا بھی۔ عقدہ کے معنی بھی گرہ یا گانٹھ کے ہیں اس لحاظ سے بھی عقدۂ دل اور زلف کی گرہوں کو ایک دوسرے سے مناسبت ہے۔

نگہِ ناز کو آساں دمِ خنجر بننا   لبِ جاں بخش کو دشوار مسیحا ہونا

مسیحا = علاج کرنے والا۔ یہ حضرت عیسیٰ کا لقب بھی تھا۔

محبوب اگر چاہے تو اپنے لبوں کی ایک جنبش سے اپنی نگاہ کے مارے ہوؤں کو زندگی بخش دے مگر اسے جان لینا ہی آتی ہے۔ جاں بخشی کی ادا اس نے سیکھی ہی نہیں۔

ہائے باتوں میں تری لغزشِ مستانۂ ناز   ہائے آنکھوں میں تری نشۂ صہبا ہونا

محبوب بات کرتا ہے تو اس کی گفتگو حسن کے نشہ سے سرشار ہوتی ہے اور اس کی آنکھوں میں شراب کا نشہ ہے۔ پھر عاشق کیسے اپنے کو ہوش میں رکھے۔

ہمہ تن داغِ غمِ عشقِ بتاں ہوں فانی   دل سے بھاتا ہے مجھے نقشِ سویدا ہونا

نقشِ سویدا = سیاہ داغ

ہم کو سیاہ رنگ دل سے پسند ہے (سیاہ رنگ غم کی علامت ہے) اس لیے عشق میں ہم نے سر سے پیر تک خود کو جلا کر سیاہ کر لیا ہے۔

(۸۶)

پھر ذوقِ تماشا کو مرہونِ اثر فرما   فرصت ہو تو دل پہ بھی پھر قصدِ نظر فرما

ہماری آرزو ہے کہ محبوب پھر ایک بار ہماری طرف نگاہ کرے اور ہمارے ذوق تماشا کو اپنے جلووں سے کامیاب کر دے۔ پھر کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ پہلے عاشق محبوب کے جلووں سے سرفراز ہو چکا ہے۔ اس میں اشارہ روزِ ازل اللہ تعالیٰ کے دیدار کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور طور کے واقعہ کی طرف بھی۔

یہ تیری خموشی بھی گو عینِ تکلّم ہے   مشتاقِ تکلّم سے کچھ پھر بھی مگر فرما

تکلّم = گفتگو

محبوب اگرچہ خاموش ہے مگر اس کی خاموشی بھی عاشق سے گفتگو میں مصروف رہتی ہے لیکن عاشق اس پر قانع نہیں بلکہ اس کی آواز بھی سننا چاہتا ہے۔

تری آواز سازِ دل کے پردوں سے تو سنتا ہوں
مگر اب بے محابا گفتگو ہوتی تو اچھا تھا   (اختر کمالی)

فرمانِ سحر پیدا ہر شام پہ جاری ہے   یارب شبِ غم کو بھی تاکیدِ سحر فرما

کہتے ہیں کہ ہر شام کی صبح ضرور ہوتی ہے۔ فانی خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو ہماری

سبب ہم کو بھی زخ میں بدل دے۔ شعر کا لہجہ نہایت پردرد اور دل پر اثر کرنے والا ہے۔

فانی نے تجھے چاہا، تو بندہ نوازی کر
فانی نے خطا کی ہے تو قطعِ نظر فرما

ہم کو اقرار ہے کہ ہم نے بے شمار گناہوں کا ارتکاب کیا ہے لیکن تو اپنی بندہ نوازی سے کام لے اور ہمیں اپنا بندہ سمجھ کر ہمارے گناہ کو بخش دے۔ کیونکہ ہم تیرے ہی نام لیوا ہیں۔ شعر کے الفاظ سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا شاعر چاہت کو گناہ قرار دے رہا ہے۔

(۸۷)

بیخودی پہ تھا فانی کچھ نہ اختیار اپنا
عمر بھر کیا ناحق ہم نے انتظار اپنا

محبت نے ہمیں بے خودی کی اس منزل پر پہنچا دیا کہ خود اپنے کو بھول بیٹھے اور ساری عمر اپنا انتظار کرتے رہے۔

تابِ ضبطِ غم نے بھی دیدیا جواب آخر
اُن کے دل سے اُٹھتا ہے آج اعتبار اپنا

محبوب کو بھروسا تھا کہ چاہے وہ کتنا بھی ظلم کیوں نہ کرے، عاشق اُف بھی نہیں کرے گا لیکن عاشق کی قوتِ برداشت ظلم برداشت کرتے کرتے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کو اپنے حال کا کوئی غم نہیں۔ غم تو اس کا ہے کہ محبوب کو اس پر جو اعتماد تھا وہ ختم ہو جائے گا۔

عشق زندگی ٹھہرا لیکن اب یہ مشکل ہے
زندگی سے ہوتا ہے عہد استوار اپنا

استوار = مضبوط

ہم نے کبھی زندگی کی پروا نہ کی اور ہمیشہ اسے ٹھکرایا۔ لیکن جب سے عشق ہماری زندگی بن گیا ہے ہمیں زندگی کے ناز اُٹھانا پڑ رہے ہیں اور اس سے نباہ کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ زندگی جیسی ناگوار چیز عشق کے سبب سے گوارا اور حسین بن جاتی ہے۔

شکوہ برملا کرتے! خیر یہ تو کیا کرتے
ہاں مگر جو بن پڑتا شکوہ ایک بار اپنا

برملا = ظاہر، سب کے روبرو۔

رسمِ عاشقی کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ کے سلوک کا برملا شکوہ کیا جاتا۔ لیکن ہماری غیرت نے

اس کی اجازت نہ دی۔ کاش ہم ایک بار اپنا ہی شکوہ کر لیتے۔ اس سے آپ کی جفا کی تلافی تو کیا ہوتی البتہ ہمارے دل کی بھڑاس ضرور نکل جاتی۔

غم ہی جی کا دشمن تھا غم سے دور رہتے تھے
غم ہی رہ گیا آخر ایک غمگسار اپنا

انسان غم کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اس سے بھاگتا ہے لیکن آخر میں اسے پتہ چلتا ہے کہ خوشیاں تو عارضی طور پر ملتی ہیں۔ انجام میں غم ہی اس کا آخری ساتھی رہ جاتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ غم زندگی کی حقیقت اور اس کا انجام ہے اس لیے اس سے بھاگنا نادانی ہے۔

لے گیا چمن کو بھی موسم بہار آ کر
اب قفس کا گوشہ ہے حاصلِ بہار اپنا

ہم نے بہار سے لطف اندوز ہونا چاہا اس کے عوض ہم کو قسمت نے قفس میں گرفتار کرا دیا۔ گویا بہار نے ہم سے چمن چھڑا کر قفس کی قید دے دی۔ دنیا کی مسرتوں کی خواہش کرنے والوں کے حصہ میں ناکامیوں کے غم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

جھوٹ ہی سہی وعدہ کیوں یقیں نہ کر لیتے
بات دلفریب اُن کی دل اُمیدوار اپنا

ہم نے محبوب کے جھوٹے وعدوں پر یقین کر لیا۔ اس کی وجہ کچھ تو اس کے بات کرنے کا دلکش انداز تھا اور کچھ ہمارے دل کی شدتِ آرزو۔ اس میں نفسیات کا یہ پہلو پیش کیا گیا ہے کہ انسان جب کسی چیز کا بہت آرزومند ہوتا ہے تو اس کے نتائج اور اس کے کھرے کھوٹے پن کے بارے میں چھان بین نہیں کرتا۔

انقلابِ عالم میں ورنہ دیر ہی کیا تھی
اُن کے آستاں تک تھا خیر سے غبار اپنا

وہ تو کہیے خیر ہو گئی کہ ہماری خاک محبوب کی گلی تک پہنچ گئی۔ ورنہ اگر کہیں یہ خاک اُڑتی رہتی اور اس کی گلی کی راہ نہ پاتی تو دنیا میں انقلاب آ جاتا اور قیامت برپا ہو جاتی۔

دل ہے مضطرب فانیؔ آنکھ محوِ حیرت ہے
دل نے دیدیا شاید آنکھ کو قرار اپنا

جب تک محبوب سامنے نہ تھا آنکھیں بے قراری سے ہر سمت سے تلاش کرتی تھیں اور

دل بجھا سا تھا۔ اب اس کا جلوہ دیکھ کر آنکھیں تو حیرت سے ساکت ہو گئی ہیں مگر دل کی بے قراری بڑھ گئی ہے۔ شاید دل کا سکون آنکھوں کو مل گیا ہے۔ محبوب کو دیکھ کر عاشق کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کو بہت پُر لطف انداز میں پیش کیا ہے۔

(۸۸)

کیوں نہ سب پہ ہو جاتا حالِ دل عیاں اپنا
ہر سکوتِ بیجا کی تہ میں تھا بیاں اپنا

ہماری دن رات کی خاموشی دراصل ہمارے دل کے طوفان کو چھپائے ہوئے تھی۔ اگرچہ ہم نے کسی سے دل کی بات نہ کہی مگر ہماری بے سبب کی خاموشی نے یہ راز سب پر ظاہر کر دیا۔

دل سے کچھ اُمیدیں تھیں وہ بھی اب انہی کا ہے
کاش عشق میں ہوتا دل ہی رازداں اپنا

محبت میں ہر ایک نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور کوئی ہمدرد اور رازدار نہیں یہاں تک کہ خود ہمارا دل بھی اب ہمارا نہیں رہا بلکہ محبوب کا ہو گیا ہے۔ کاش دل ہی ہمارے پاس ہوتا۔

تیرے در سے اُٹھ کر ہم جائیں تو کدھر جائیں
اب زمیں اپنی ہے اور نہ آسماں اپنا

عاشقوں کا ٹھکانہ درِ محبوب کے سوا کہیں نہیں۔

فصلِ گُل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا
فصلِ گُل میں اُجڑا تھا شاید آشیاں اپنا

قفس میں قید غم نصیبوں کو بہار کی یاد بھی آتی ہے تو اس سے خوشی کے بجائے غم ہوتا ہے کیونکہ بہار میں اپنے آشیاں کے اجڑنے کا منظر بھی یاد آ جاتا ہے۔ لفظ "شاید" نے شعر کا اثر بڑھا دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چمن سے بچھڑے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں کہ کب بچھڑے تھے۔

تھا حریمِ ناز اُن کا دل کی آخری منزل
ہم نے اُن کو ڈھونڈھا تھا، مل گیا نشاں اپنا

نظریۂ "ہمہ اوست" کے ماننے والوں کے نزدیک طالب (انسان) اور مطلوب (خُدا) میں کوئی فرق نہیں ہے اور خدا تک پہنچنے کے لیے خود کو پہچاننا کافی ہے۔ اسی طرح جس نے خُدا کو

پالیا اس نے گویا خود کو پالیا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم محبوب کی تلاش میں نکلے تھے۔ اس کی جلوہ گاہ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہی دل کی بھی منزل تھی یعنی اس کی تلاش خود اپنی تلاش ثابت ہوئی اور اس کے ذریعہ ہم نے اپنی حقیقت کو پہچان لیا۔ میر نے اسی خیال کو اس طرح پیش کیا ہے:

نظریں لگی ہوئی تھیں کب سے درِ حرم سے   پردہ اٹھا تو لڑیں آنکھیں ہماری ہم سے

بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے   جل گیا مکاں یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

بجلیاں اوروں کے لیے مصیبت ہوں مگر انھوں نے پردیس میں ہماری بے گھری کی عزت رکھ لی۔ یعنی ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی مکان رکھتے تھے جو بجلیوں نے پھونک دیا۔ بڑا لطیف طنز ہے۔

زندگی کب اپنی ہے موت کس کے بس کی ہے   ہجر میں بنا لیتے کس کو مہرباں اپنا

ہجر کی رات ہم نے تنہا گزار دی اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ موت پر کسی کا قابو نہیں جو اسی کو بلا لیتے اور زندگی تو پہلے ہی ہم سے خفا ہے۔

نقشِ سجدہ گھبرا کر کیوں مٹائے دیتے ہو   اس میں کیا نظر آیا سنگِ آستاں اپنا

محبوب جہاں عاشق کے سجدوں کے نشان پاتا ہے جلدی سے انھیں مٹا دیتا ہے۔ عاشق اس سے پوچھتا ہے کہ آخر ایسا کرنے سے کیا مقصد ہے۔ کیا ان میں تمھیں اپنے سنگِ در کی تصویر نظر آ رہی ہے؟ یعنی صرف ان نشانوں سے تو کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ سجدے تمھارے ہیں۔ پھر ان سے گھبرانے کی وجہ۔ اس میں فانی نے غالب کے اس شعر سے فائدہ اٹھایا ہے۔

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا   ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

س نے دل کی حالت کا کیا اثر لیا ہوگا   دل نے کیا کہا ہوگا دل ہے بے زباں اپنا

عاشق کی اگر محبوب تک رسائی ہو بھی جائے تو اس کی زبان محبوب کے سامنے کھل نہیں سکتی اور اس لیے محبوب کا اس کے حال سے واقف ہونا یا اثر لینا بھی مشتبہ ہے۔

پھر بھی نارسا ٹھہرا اور کیا رسا ہوتا   عرش سے پرے پہنچا شورِ الاماں اپنا

ہم نے محبت کی تکلیفوں سے گھبرا کر جو نالے بلند کیے وہ آسمان سے بھی پرے پہنچ گئے پھر ان نالوں کو نارسا کیوں کہتے ہو۔ اس سے آگے اور کہاں جاتے۔ مراد یہ کہ ہمارے نالے نارسا نہیں مگر محبوب پر یہ اثر نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب ہی سنگدل ہے۔

ہاں کبھی وطن بھی تھا، اب وطن کہاں اپنا گھر ہے اب قفس فانی گھر کبھی چمن بھی تھا

ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم وطن میں تھے اور ہمارا گھر گلشن کا نمونہ تھا مگر آج اپنا کوئی وطن نہیں۔ اور گھر قید خانہ معلوم ہوتا ہے۔ اپنی بے وطنی کی بڑی درد انگیز تصویر پیش کی ہے۔

(۸۹)

حالِ دل کس اُمید پر کہیے جب تمہیں اعتبار ہی نہ رہا

محبوب کو جب ہماری بات کا اعتبار ہی نہیں تو پھر اسے حالِ دل سنانے سے کیا حاصل؟

بے قراری کہاں کہ دل ہی نہیں ہائے وہ بے قرار ہی نہ رہا

عاشق کی بے قراری و بے چینی دل کے دم تک تھی۔ اب دل خون ہو چکا ہے اور عاشق بھی ساکت و خموش ہے۔

دل کی اب روک تھام کون کرے ضبط پر اختیار ہی نہ رہا

جب تک ہمیں صبر کی طاقت رہی دل کو سمجھاتے رہے مگر اب ضبط کی طاقت جواب دے چکی ہے۔ اس لئے دل کو جو کرتا ہے کرنے دو۔ ہم اسے کہاں تک روکیں۔

اب کوئی آرزو نہیں فانیؔ دلِ اُمید وار ہی نہ رہا

محبت میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ نہ دل ہے نہ دل میں کوئی آرزو۔

(۹۰)

ضبط اپنا شعار تھا، نہ رہا دل پہ کچھ اختیار تھا، نہ رہا

محبت میں ہمارا دل قابو سے باہر ہو گیا ہے اور ضبط کا دامن جو اب تک تھامے تھے، ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غمگسار تھا، نہ رہا

محبت میں سب نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک دل دُکھ سُکھ کا ساتھی تھا سو وہ بھی ختم ہو گیا۔

آ کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالہ ناخوشگوار تھا نہ رہا

تمہیں ہمارے نالے ناگوار تھے۔ اب جب کہ موت کی خاموشی ہم پر طاری ہے اور نالے ختم ہو چکے ہیں، اب تو آ جاؤ۔

ان کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی اُمیدوار تھا، نہ رہا

عاشق نے محبوب کے ظلم و ستم کی وجہ سے جان دے دی مگر اسے خبر بھی نہیں۔

آہ کا اعتبار بھی کب تک
آہ کا اعتبار تھا نہ رہا

ہمیں اپنی آہوں کے اثر پر بڑا بھروسہ تھا مگر اب یہ بھروسہ ختم ہو گیا اور ہم نے آہوں کی بے اثری دیکھ لی۔

کچھ زمانہ کو ساز گار سہی
جو ہمیں ساز گار تھا نہ رہا

جو چیز ہمیں کبھی راس آئی تھی اب ہمیں میسر نہیں ہے جب ہم اپنی مراد نہ پا سکے تو ہمیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہے کہ دنیا والوں کو کیا راس آتا ہے۔ یہاں غالب کے اس شعر کی گونج سنائی دیتی ہے۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغلِ فصلِ بہار تھا نہ رہا

بہار رخصت ہو چکی ہے اور دیوانوں نے اپنا گریبان چاک کرنا بھی ترک کر دیا ہے گویا وہ بھی موسم بہار کا ایک مشغلہ تھا جو بہار کے ساتھ ختم ہوا۔

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا نہ رہا

محبوب کا انتظار کرتے کرتے عاشق مایوس ہو چکا ہے اور اب اس نے موت کی راہ دیکھنا شروع کر دی ہے۔ ناامیدی کی بڑی دلکش عکاسی کی ہے۔

مہرباں یہ مزارِ فانیؔ ہے   آپ کا جاں نثار تھا' نہ رہا

محبوب عاشق کے مزار سے بڑی بے تعلقی سے گزر رہا ہے۔ اسے مخاطب کر کے شاعر بتاتا ہے کہ یہ مزار آپ ہی کے عاشق نامراد کا ہے۔

(۹۱)

زمانِ رخصتِ طفلی ہے تو شباب آیا   سوا پہرِ رُخِ روشن کا آفتاب آیا

صبح کے بعد اور دوپہر سے پہلے سورج بلندی کی طرف جانے لگتا ہے اور اس کی چمک بڑھتی جاتی ہے۔ شاعر محبوب کے حسن کو سوا پہر کے سورج سے تشبیہ دے رہا ہے کیونکہ وہ بھی زندگی کی پہلی منزل (بچپن) گزار کر اب دوسری منزلِ یعنی جوانی میں داخل ہو رہا ہے اور اس کا حُسن عروج کی طرف مائل ہے۔

بہت دنوں یہی کہہ کہہ کے دم دیے دل کو   ذرا ٹھہر دلِ مضطر کہ اب جواب آیا

دم دینا = دھوکا دینا

بہت دنوں تک ہم دل کو جھوٹی تسلیوں سے بہلاتے رہے کہ محبوب کا خط اب آنے ہی والا ہے۔ مگر اب دل کو بہلانا ممکن نہیں۔

یہ چڑھا گیا میں بلانوش یادِ ساقی میں   جو بھر کے زہر سے بھی ساغرِ شراب آیا

ہم ساقی کے عشق میں ایسے گرفتار تھے کہ جب ہمیں شراب کی بجائے زہر کا جام دیا گیا تو وہ بھی ہم بخوشی پی گئے۔

وہ آئے گورِ غریباں میں، جی اُٹھے مردے   جلو میں فتنۂ محشر بھی ہم رکاب آیا

قیامت میں مردے زندہ ہو کر قبروں سے نکل آئیں گے۔ محبوب کے قبرستان آنے سے

سارے مردے جی اُٹھے۔ گویا وہ اپنے ساتھ قیامت لے کر آیا تھا۔

جگر میں درد نے اُٹھ اُٹھ کے چٹکیاں لے لیں   ذرا بھی گر شبِ غم میں خیالِ خواب آیا

ہجر کی شب اگر ذرا بھی نیند آنے کو ہوتی تھی تو دل کا درد نئے سرے سے بیدار ہو جاتا تھا اور ایسی ٹیسیں اٹھتی تھیں کہ نیند کا خیال بھی نہ رہ سکے۔

کوئی ہو شیخ ہو یا برہمن ہوائے فانی   گیا جو میکدۂ عشق میں خراب آیا

عشق کی دنیا میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں۔ جس نے بھی اس کوچہ میں قدم رکھا برباد ہی ہوا۔ چاہے مسلمان ہو یا ہندو۔

(۹۲)

جذبِ دل جب بروئے کار آیا   ہر نفس سے پیامِ یار آیا

اگر محبت سچی اور جذبِ دل صادق ہے تو ہر چیز میں محبوب کا عکس نظر آسکتا ہے اور ہر سانس اس کا پیغام دینے لگتی ہے۔

موت کا انتظار تھا، آئی   جائیے اب مجھے قرار آیا

عاشق کی بے قراری دیکھ کر محبوب جاتے جاتے رک گیا تھا۔ مگر عاشق کو محبوب کی خاطر اس قدر عزیز ہے کہ زبردستی اس کو روکنا نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ آپ اب جا سکتے ہیں کیونکہ موت جس کا مجھے انتظار تھا آ پہنچی ہے۔ اب آپ کے جانے کے بعد وہ مجھے تسکین دے دے گی۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی جدائی میں صرف موت ہی عاشق کو تسکین دے سکتی ہے۔ انداز بیان نے شعر کو زبردست تاثیر دے دی ہے۔

جب کسی نے لیا تمھارا نام   گریہ بے قصد و اختیار آیا

عشق کی شدت اور عاشق کی بے قراری کا اظہار ہے

بے قراری میں اب یہ ہوش نہیں   کس کے در پہ تجھے پکار آیا

عاشق کی بے خودی اور بے قراری کا یہ حال ہے کہ ہر در، محبوب کا ہی در معلوم ہوتا ہے اور وہ ہر جگہ اسے پکارتا پھرتا ہے۔ بے خودی کی اس سے بہتر تصویر کشی مشکل ہے۔

فرشِ گل پھر بچھا رہی ہے نسیم
آیئے موسمِ بہار آیا

عاشق محبوب کو گلشن میں آنے کی دعوت دے رہا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کے استقبال کے لیے بادصبا نے پھولوں کا فرش بچھا رکھا ہے۔

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو
ان کے آگے جو بار بار آیا

ویسے تو عاشق ضبطِ غم اور آنسو پینے کا عادی ہے مگر محبوب کے سامنے اس کو اپنے پر قابو نہیں رہتا اور کوشش کے باوجود آنکھوں سے اشک ٹپک ہی جاتے ہیں۔

خیر تو ہے کہ آپ کے در سے
آج فانیؔ امیدوار آیا

آج یہ کیسا انقلاب آیا ہے کہ فانیؔ محبوب کے در سے بہت پُر امید اور خوش واپس آ رہا ہے۔

(۹۳)

وعدہ کے یہ تیور ہیں کہہ دوں کہ یقیں آیا
اب ان سے کوئی کیوں کر کہہ دے کہ نہیں آیا

محبوب اس ادا سے وعدہ کرتا ہے کہ عاشق کو اس سے یہ کہنے کی ہمّت ہی نہیں ہوتی کہ ہمیں تمھارے وعدہ پر یقین نہیں۔ وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جیسے اسے یقین آگیا ہے۔ محبوب کے احترام کی کیا اچھی عکاسی ہے۔

کافر کی محبّت میں ایمان کے لالے تھے
چھپ چھپ کے دعاؤں میں وہ دشمنِ دیں آیا

محبوب کا تصوّر دل و دماغ پر اس قدر چھایا ہوا ہے کہ عبادت اور دعا کے وقت بھی

خدا کی بجائے اسی کا خیال آجاتا ہے۔ گویا وہ دل کا دشمن تو تھا ہی، اب ایمان کا بھی دشمن ہو گیا۔ کیوں نہ ہو کافر ہی جو ٹھہرا۔

یہ کوچۂ قاتل ہے آباد ہی رہتا ہے
اک خاک نشیں اٹھا اک خاک نشیں آیا

محبوب کا کوچہ کبھی عاشقوں سے خالی نہیں رہتا۔ اگر ایک اس پر جان وار دیتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

دنیا کے گِلے شکوے ہم حشر میں کیا کرتے
کہنا تو بہت چاہا، کچھ یاد نہیں آیا

کہا جاتا ہے کہ قیامت میں مظلوم کی فریاد سُنی جائے گی اور اس کا انصاف کیا جائے گا۔ مگر ہم کیا کریں کہ ہمیں محبوب کو سامنے دیکھ کر کچھ یاد ہی نہ رہا اور یہ بھی خیال ہوا کہ دنیا کی تکلیفیں تو گزر گئیں، اب ان کی شکایات کیا کریں۔

پھر گورِ غریباں کا ہر ذرّہ لرز اُٹھا
فانی کوئی دل شاید پھر زیرِ زمیں آیا

کوئی محبت کا مارا جب لحد میں دفن کیا جاتا ہے تو اس کی بے قراری سے گورِ غریباں کی زمین لرزنے لگتی ہے۔ یعنی عشق کی بے چینی مر کر بھی جاتی نہیں۔

(۹۴)

بہتے بہتے سارے آنسو بہہ گئے   روتے روتے آنسوؤں کو رو لیا

رو لینا = صبر کر لینا۔

ہم نے محبت میں اتنے آنسو بہائے کہ آنکھوں میں ایک آنسو بھی باقی نہ رہا۔ شعر میں اثر کی بجائے الفاظ کے استعمال پر زور ہے۔

تو تمہارے سر ہے میری منصفی   دل مرا تم نے لیا؟ بولو لیا؟

محبوب عاشق کا دل لے کر مکر رہا ہے۔ عاشق کہتا ہے ہم کچھ نہیں کہتے۔ تمھاری بات ہی مانیں گے۔ بس آخری مرتبہ انصاف سے کام لے کر بتا دو کہ تم نے دل لیا ہے؟

داغِ دل پہلو سے یوں مٹتا نہ تھا
آبِ خنجر سے یہ دھبّہ دھو لیا

دل پر محبت کے جو داغ پڑ گئے وہ پانی سے نہیں دھوئے جا سکتے۔ ان کو صرف آبِ خنجر سے مٹایا جا سکتا ہے۔ یعنی محبت کے داغ جان کے ساتھ ہیں۔ مر کر ہی یہ مٹ سکتے ہیں۔ آبِ خنجر کو دھونے کے لیے استعمال کرنا لفظی رعایت ہے۔

آئے دنیا میں تو ساتھ آئی اجل
ہائے دشمن پیچھے پیچھے ہو لیا

موت ہمیشہ زندگی کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ یہ ایسا دشمن ہے جس سے مفر نہیں۔

(۹۵)

وہ پوچھتے ہیں ہجر میں ہے اضطراب کیا
حیران ہوں کہ دوں اُنھیں اس کا جواب کیا

محبوب انجان بن کر عاشق سے دریافت کرتا ہے کہ آخر تمھاری بے چینی کا سبب کیا ہے۔ عاشق حیران ہے کہ اس کا کیا جواب دے۔ یعنی جس کی خاطر یہ حالت بنی وہ ہی بے خبر ہے۔

دل؛ اور وہ بھی صرف مرا دردمند دل
تیری نگاہ نے یہ کیا انتخاب کیا

محبوب نے اپنے جلووں کے لیے پسند بھی کیا تو ہمارے دردمند دل کو۔ نہ معلوم اسے اس میں کون سی خوبی دکھائی دی۔ اگرچہ شاعر بظاہر اس انتخاب پر حیرت کا اظہار کر رہا ہے لیکن درحقیقت یہ بتانا چاہتا ہے کہ درد بھرا دل ہی حُسن کی جلوہ گاہ بن سکتا ہے۔

جاتی نہیں خلش المِ روزگار کی
اے آسماں ہوا وہ ترا انقلاب کیا

آسمان روز نئے انقلاب لاتا ہے اور کسی چیز کو ایک جگہ پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ لیکن نہ معلوم کیوں ہمارے غم کے لیے اس کا رویّہ بدل گیا ہے کہ روزِ اوّل سے غم کی جو خلش تھی وہ آج تک قائم ہے

نظارۂ جمال کی یاں تاب ہی نہیں
اے برقِ حسن چاہیے تجھ کو نقاب کیا

محبوب ہمارے سامنے نقاب اوڑھ کر ناحق آتا ہے۔ ہم تو یوں بھی اس کے رُخِ روشن کے نظارہ کی تاب نہیں رکھتے۔ یہ شعر بھی غالب کے شعر کا چربہ ہے لیکن غالب کا انداز زیادہ شاعرانہ اور ساتھ میں منطقی ہے:

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

وعدہ بھی کر لو، وعدہ پہ یاں آ بھی جاؤ تم
یہ سب سہی "تمہاری نہیں" کا جواب کیا

مانا محبوب نے آنے کے وعدہ کو پورا کر دیا اور ہمارے گھر آ گیا مگر اس کے بعد وہ ہماری ہر بات مان لے گا اس کا کیا یقین ہے۔ اس کی "نہیں" کی عادت تو بدلنے سے رہی۔

بیش از گمانِ خواب نہیں فرصتِ حیات
فانی تم اس خیال کو سمجھے ہو خواب کیا

عام طور پر شاعر زندگی کے غیر حقیقی ہونے کے سبب اسے خواب سے مثال دیتے آئے ہیں مگر فانی اسے خواب سے بھی زیادہ بے حقیقت سمجھتے ہیں اور خواب کا گمان (دھوکا) کہتے ہیں کیونکہ خواب پھر بھی کچھ دیر تک باقی رہتا ہے اور تھوڑی ہی دیر کی سہی خوشیاں دے دیتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو سو نہ پائے، صرف سونے کے خیال میں رہے۔ اسے یہ دونوں باتیں میسر نہیں۔ فانی کے نزدیک زندگی کی بھی یہ ہی مثال ہے۔

(۹۶)

دیکھنا پھر حشر میں کیا حشر برپا ہو گیا
وہ سراپا حشر جب ہنگامہ آرا ہو گیا

محبوب مجسم قیامت ہے اور جدھر جاتا ہے ہنگامے برپا کرتا جاتا ہے۔ اگر کہیں میدانِ قیامت میں وہ ہنگامے جگاتا آ گیا تو دیکھنا کہ قیامت میں ایک نئی قیامت برپا ہو جائے گی۔ شعر میں کوئی خاص لطف نہیں۔ صرف لفظِ حشر کی تکرار ہے۔

زندۂ جاوید فانی نام اپنا ہو گیا
سحرِ الفت رشکِ اعجازِ مسیحا ہو گیا

اعجازِ مسیحا = حضرت عیسیٰ کا معجزہ کہ وہ مردوں کو جلا دیتے تھے۔

فانی کا کہنا ہے کہ محبّت کے سحر سے وہ معجزے رونما ہوئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کا اعجاز بھی اس پر رشک کرے۔ یعنی اس کے اثر سے ہماری ہستیٔ فانی زندۂ جاوید ہو گئی ہے۔ یہاں پر انھوں نے اپنے تخلص سے فائدہ اٹھایا ہے یعنی اسے "مٹنے والے" کے معنی میں لیا ہے جو زندۂ جاوید کا الٹ ہے۔ اور اس سے صنعت، ایہام تضاد پیدا کی ہے۔

نذر دینے لائے تھے ہم جلوۂ جاناں کو دل
وہ بھی صرفِ کشمکش ہائے تماشا ہو گیا

تماشا سے مراد یہاں دنیا کے ظاہری جلوے ہیں جو انسان کو محبوبِ حقیقی سے دُور کر دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمیں دل اس لیے ملا تھا کہ ہم اسے محبوب کی نذر کریں لیکن افسوس کہ وہ بھی دنیا کے جلووں میں الجھ کر رہ گیا۔

اپنی مشتِ خاک بھی پہنچی نہ کوئے یار تک
ہائے بختِ نارسا تیرا ہی چاہا ہو گیا

ہم نے چاہا تھا کہ مر کر ہماری خاک ہی محبوب کی گلی تک پہنچ جائے مگر ہماری بدنصیبی جو زندگی میں ہماری خواہشات کے پورا ہونے میں مانع رہی تھی، مر کر بھی آڑے آ گئی اور ہماری خاک کو اس کوچہ تک نہ پہنچنے دیا۔

شکوۂ طاقت ربائیہائے غم کیا کیجیے
حالِ دل کیا کہیے کیونکر آشکارا ہو گیا

طاقت ربائی = طاقت ختم کر دینا، گھلا دینا۔

ہم کیا بتائیں کہ ہمارا حالِ دل کس طرح سب پر ظاہر ہو گیا۔ ایسا کرنا غم کی شدّت کی شکایت کرنا ہوگا جو ہم سے ممکن نہیں۔ غموں کی شدّت نے عاشق کو نالہ و فریاد پر مجبور کر دیا۔ اسے اس پر افسوس ضرور ہے لیکن غم کی شکایت کا اظہار کرنا اس کے مسلک کے خلاف ہے۔ "طاقت ربائیہائے غم" کی ترکیب فانی کی ایجاد ہے اور عام مزاج سے ہٹی ہوئی۔

رو دیں کیا رودادِ عبرت خیزِ عشقِ قیس پر
وائے ناکامی وہ اپنا ہی فسانا ہو گیا

مجنوں کی ناکامیٔ عشق کا قصّہ عبرت خیز ہے مگر ہم اس پر کیا افسوس کریں خود ہمارے

ساتھ بھی یہی سب پیش آیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں مسلسل اضافتوں کا استعمال زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

زندگی اتنی ہی تھی، جینا مقدّر ہی نہ تھا
رازِ عشقِ یار فانؔی مفت رسوا ہو گیا

فانؔی کی بے وقت موت سے لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ اس نے عشق میں جان دی ہے۔ مگر فانؔی عشق کی رسوائی نہیں چاہتا اور اس پر زور دیتا ہے کہ اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔ اس کا وقت آ گیا تھا اس لیے مر گیا۔ وفا کا یہ عالم ہے کہ مر کر بھی عشق کی رسوائی منظور نہیں۔

ردیف (ب)

(۹۷)

پھر دلِ بیتاب ہے آرامِ جانِ اضطراب
پھر تمنّا ہے کسی کی میہمانِ اضطراب

پھر اضطراب و بے چینی نے میرے دل کو اپنا ٹھکانہ بنایا ہے اور اس بے چینی کی وجہ یہ ہے کہ محبوب کی آرزو پھر اضطراب کے گھر میں مہمان بن کر آ گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی آرزو نے پھر دل کو بے قرار کر دیا ہے۔

ہم ہوئے جاتے ہیں قائل آہ کی تاثیر کے
اس نے کیا کیا کہہ کر بڑھا دی آج شانِ اضطراب

اب تک ہم اپنی آہ کو بے اثر سمجھتے تھے لیکن آج ہمیں اپنی آہ کی تاثیر کا قائل ہونا پڑا۔ اس لیے کہ محبوب پر ہماری آہ کا اتنا اثر تو ہوا کہ اس نے اگرچہ ہمیں تسلّی نہیں دی لیکن ہمارے اضطراب کی شان کو بڑھا دیا۔

کب سے آغوشِ لحد میں ہم ہیں سرتاپا قرار
وہ ستم پرور ہے اب تک بدگمانِ اضطراب

ہم کب سے قبر کی آغوش میں سکون سے سو رہے ہیں مگر محبوب اب تک ہماری طرف سے

اس بدگمانی میں مبتلا ہے کہ ہم قبر میں بھی مضطرب و بے چین ہیں۔

مجھ کو مضطر دیکھ کر ان کو حجاب آنے لگا   ہو چلی ہیں وہ نگاہیں رازدانِ اضطراب

میری بے قراری و بے چینی سے محبوب نے میرے عشق کا اندازہ لگا لیا ہے۔ اسی لیے اسے میرے اضطراب کو دیکھ کر حیا آنے لگی ہے۔

اشک ایک ایک کر کے سب آوارۂ دامن ہوئے   رفتہ رفتہ مٹ گیا نام و نشانِ اضطراب

میری آنکھوں سے نکلنے والے آنسو میرے اضطراب و بے چینی کی علامت تھے۔ مگر وہ تمام اشک دامن میں جذب ہو کر معدوم ہو گئے اور اس طرح اضطراب عشق کے تمام ظاہری نشانات ختم ہو گئے۔

وقتِ عرضِ حالِ دل اس فکر نے مارا اب مجھے   کیجیے آغاز کیوں کر داستانِ اضطراب

ہم محبوب کے سامنے حالِ دل بیان کرنا چاہتے تھے مگر پریشانی یہ تھی کہ اس داستان کا آغاز کہاں سے کیا جائے کیونکہ میری داستان کا ہر باب بجائے خود اہم ہے۔ پہلے مصرع کے الفاظ میں جھول ہے اور فانی کی زبان کے معیار سے گرے ہوئے ہیں۔

اضطرابِ دل کے شکووں نے کیا اُلٹا اثر   بے نیازِ نطق ہے گویا زبانِ اضطراب

نطق = گفتگو کی طاقت

عاشق کی بے چینی و اضطراب محبوب کو ناگوار تھا اور اس نے عاشق سے اس کا شکوہ کیا۔ اس کے شکوے سے یہ تو ہوا کہ اب اضطراب کا اظہار تو نہیں ہوتا گویا اضطراب کی زبان نطق (بولنے کی قوت) سے بے نیاز ہو گئی مگر اضطراب میں کمی نہیں آئی بلکہ اور بڑھ گیا ہے یعنی محبوب کے شکووں نے اُلٹا اثر دکھایا۔ اگر شکووں کو عاشق سے منسوب کیا جائے تو معنی یہ نکلیں گے کہ میرے دل کی بے تابی نے محبوب کے ستم کا شکوہ کیا مگر اس کا اُلٹا اثر ہوا اور محبوب مہربان ہونے کے بجائے اور برہم ہو گیا اور یہ شکوے ایسے بے اثر ثابت ہوئے گویا اضطراب کی زبان قوتِ گویائی سے محروم تھی۔

رازِ ضبطِ غم الٰہی کس نے افشا کر دیا
ہے انھیں میری خموشی پر گمانِ اضطراب

اگرچہ میرے دل میں ایک ہنگامہ برپا تھا مگر میں ضبط سے کام لے کر محبوب کے روبرو خاموش رہا۔ میرے بظاہر خاموش رہنے پر اس کو سکون کا گمان ہونا چاہیے تھا مگر معلوم نہیں کس نے میرے دل کی حالت اس کو بتا دی ہے کہ وہ میری خاموشی کو بھی بے قراری کی ایک شکل سمجھتا ہے۔ شدید بے چینی کے عالم میں بھی انسان چپ ہو کر رہ جاتا ہے۔

سینۂ فانیؔ ہے یا جولاں گہِ برقِ فنا
دل ہے یارب یا بلائے آسمانِ اضطراب

جولان گہ = دوڑ کا میدان

فانیؔ کا سینہ نہیں ہے بلکہ ایک میدان ہے جس میں فنا کی بجلیاں کوندتی رہتی ہیں اور اس کا دل نہیں ہے بلکہ ایک بلا ہے جو اضطراب کے آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ یعنی ہمارا دل بلاؤں کا نشانہ ہے اور اضطراب و بے چینی کے سبب فنا کی منزل تک جا پہنچا ہے۔

(۹۸)

عشق ہے پرتوِ حسنِ محبوب
آپ ہی اپنی تمنّا کیا خوب

وحدت الوجود کے نظریہ کے ماننے والوں کے نزدیک وجود صرف ایک ہے جس کو وہ حسنِ مطلق سے تعبیر کرتے ہیں اور تمام اشیاء کی اصل قرار دیتے ہیں۔ "کُلّ شيٍ یرجع اِلیٰ اصلہٖ" (کائنات کی ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع ہے) کے قول کے بموجب ماسوا اسی کی طرف راغب اور اس کے عشق میں گرفتار ہے مگر چونکہ ماسوا کا خدا سے الگ کوئی وجود نہیں اس لیے کہنا چاہیے کہ عشق اور معشوق میں دوئی نہیں ہے بلکہ عاشق بھی محبوب ہی کا عکس ہے۔ گویا حسنِ محبوب عشق کے پردے میں آپ ہی اپنا تمنائی ہے۔

طلب محض ہے سارا عالم
کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

طلب محض = خالص طلب مراد عشق۔

عالم کے وجود کا سبب اور غایت اصلی عشق ہے۔ یہاں نہ کوئی طالب ہے نہ مطلوب۔

ایک ہی ہستی ہے جو خود طالب ہے اور خود ہی مطلوب۔ یہ شعر بھی پہلے کے شعر کی طرح وحدت الوجود کے نظریے کا ترجمان ہے۔ نیز اُس میں جذبۂ عشق کی اہمیت پر زور ہے۔

قلب، ادراک، دماغ اور حواس   مجھ سے منسوب ہیں تجھ سے مغلوب

منسوب = نسبت ہونا   مغلوب = اختیار میں ہونا

میرا دل، دماغ، عقل و حواس کہنے کو میرے ہیں لیکن یہ نسبت محض اعتباری و خیالی ہے۔ ورنہ حقیقت میں ان سب پر تیرا قبضہ اور اختیار ہے۔ انسان کی مجبوری کے مسئلہ کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

ردیف (پ)

(۹۹)

یہ عکسِ زلف سے ہے ساغرِ شراب میں سانپ
کہ آفتاب قمر میں ہے، آفتاب میں سانپ

آفتاب = شراب

شراب کے پیالے میں محبوب کی سیاہ زلفوں کا عکس اس طرح پڑ رہا ہے جیسے کہ سانپ ہو۔ شراب کا جام گولائی کے اعتبار سے قمر کی مانند ہے گویا آفتاب قمر کے اندر ہے اور آفتاب میں سانپ ہے۔ شعر میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ صرف آفتاب و قمر کی مناسبت سے شعر میں ایہام پیدا کیا گیا ہے۔

دکھا کے زلفِ سیہ فام آئینہ میں انھیں
یہ کہہ کے ہم نے اتارا کہ ہے نقاب میں سانپ

محبوب کے چہرہ سے نقاب اتار دینا ویسے تو ممکن نہ تھا۔ عاشق نے اس کو آئینہ میں اس کی

سیاہ لہراتی ہوئی زلفوں کا عکس دکھلا کر کہا کہ تمھارے نقاب میں سانپ ہے اور یہ کہہ کر اس کی نقاب اُتار کر پھینک دی۔ یہ شعر فانی کے مزاج سے بالکل ہٹا ہوا ہے اور زندہ دلی کی مجسم تصویر ہے۔

نہ کیوں تصوّرِ گیسوئے یار ہو دل میں
بنا ہی لیتے ہیں گھر خانۂ خراب میں سانپ

ہمارے ویران دل میں محبوب کے خمدار گیسوؤں کا عکس یوں پڑتا ہے جیسے کسی ویران گھر میں سانپوں کا مسکن ہو۔ خیال نیا ہے۔ لیکن دل کی ویرانی کا تاثر نہیں پیدا ہو سکا ہے کیونکہ محبوب کا تصوّر (خواہ یہ تصوّر گیسوؤں کا ہی ہو) ویرانی کی نہیں آبادی کی علامت ہے۔

ردیف (ت)

(۱۰۰)

پھر فریبِ سادگی ہے رہنمائے کوئے دوست
مٹنے والی آرزوئیں لے چلیں پھر سوئے دوست

میری سادگی پھر فریب دے کر امیدوں کے سبز باغ دکھا رہی ہے اور کوچۂ یار کی طرف میری رہنمائی کر رہی ہے اور میری آرزوئیں جو مٹنے اور برباد ہونے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہیں مجھے پھر دوست کی طرف لیے جا رہی ہیں۔ یعنی یہ جانتے ہوئے کہ وہاں میری آرزوؤں کا خون ہوگا میں پھر محبوب کے کوچہ کو چلا ہوں۔ لفظ "پھر" بتا رہا ہے کہ پہلے بھی دھوکہ کھا چکے ہیں۔

مانگتا ہوں آبِ خنجر سے سوا خنجر کی خیر
کچھ گراں جانی مری کچھ قوّتِ بازوئے دوست

آبِ خنجر = خنجر کی دھار گراں جانی = سخت جانی

معشوق میرے قتل کے واسطے آمادہ ہے۔ مگر ادھر میری سخت جانی ہے، اُدھر اُس کے

خنجر آزما بازوؤں کی قوت۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں دونوں کی کشمکش میں خنجر کی دھار بے کار ہونے کے علاوہ خنجر ہی نہ ٹوٹ جائے۔

اب مجھی کو طولِ شامِ ہجر کا شکوہ بھی ہے
خود ہی چھیڑی تھی حدیثِ طرّۂ گیسوئے دوست

حدیث = تذکرہ

میں نے شبِ ہجر میں دل کو بہلانے کے لیے محبوب کے گیسوؤں کا ذکر چھیڑا تھا مگر بجائے اس کے کہ شب جلدی گزرتی زلف کے ذکر سے شامِ فراق کا طول اور زیادہ ہوگیا۔ یعنی اس کی یاد نے جدائی کے غم کو اور بڑھا دیا۔ زلفِ دراز کی مناسبت شبِ دراز سے ظاہر ہے۔

آسماں کا شکر واجب ہے گلہ جائز نہیں
آسماں سے ملتی جلتی ہے جہاں تک خوئے دوست

آسمان کی اور محبوب کی عادت ایک حد تک یکساں ہے یعنی دونوں عاشق پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو آسمان کی شکایت کیسی بلکہ اس کا شکر لازم ہے۔ غالب کا شعر ہے:

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں   کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

رنگ و بوئے دہر کا مفہوم یوں کچھ بھی سہی
میرے مسلک میں ہے فانی رنگِ دل یا بوئے دوست

دنیا کی خوشبو اور رنگینی کا مطلب دوسروں کے نزدیک خواہ کچھ بھی ہو، محبت کرنے والوں کے لیے ہر رنگ میں محبوب کا رنگ ظاہر ہے اور ہر خوشبو دل کی خوشبو سے معطر۔

(۱۰۱)

جنسِ دل ہو مشتریٔ دل بہت   سر سلامت چاہیے قاتل بہت

مشتری = خریدار

فانی حسن کے مقابلہ میں عشق کو زیادہ اہم خیال کرتے ہیں کیونکہ اگر دل پاس ہے تو اس

کے لیے خریداروں کی کمی نہیں۔ جس کو یہ نذرانہ دیا جائے گا وہ بخوشی اس کا خریدار بن جائے گا۔

منحصر ہے آپ کی "ہاں" پر وصال   آپ کو آساں، مجھے مشکل بہت

محبوب کی ملاقات اور اس کا وصل ہمارے بس کی چیز نہیں۔ لیکن خود وہ چاہے تو اس کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ بس اس کے ہاں کہنے کی دیر ہے۔ شعر میں سادگی ضرور ہے لیکن اس سے کوئی لطف یا اثر نہیں پیدا ہوتا۔

فانیؔ جاں باز سا کوئی نہیں   گرچہ قاتل! ہیں ترے بسمل بہت

اگرچہ محبوب کے چاہنے والوں اور اس کی تیغِ ناز کے گھائلوں کی کوئی کمی نہیں لیکن فانیؔ جیسا چاہنے والا ان میں ایک بھی نہیں۔ دوسرے مصرع میں الفاظ کی نشست درست نہیں۔ "قاتل" کا لفظ بے موقع ہے۔

(۱۰۲)

ہو کاش وفا وعدۂ فردائے قیامت
آئے گی مگر دیکھیے کب آئے قیامت

محبوب نے کل آنے کا وعدہ کیا تھا مگر اس کی یہ کل قیامت کی کل بن گئی ہے کہ آ ہی نہیں چکتی۔ عاشق کی تمنا ہے کہ کاش وہ اپنا وعدہ جلد پورا کرلے اور وہ قیامت کی کل جلد رونما ہو۔

سنتا ہوں کہ ہنگامۂ دیدار بھی ہوگا
اک اور قیامت ہے یہ بالائے قیامت

کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن محبوب (اللہ تعالیٰ) اپنا دیدار دکھائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ قیامت کے دن ایک نئی قیامت اور برپا ہو جائے گی۔ آصغر نے اسی خیال کو بہت سنبھل کر یوں ادا کیا ہے۔

سنا ہے حشر میں ہر آنکھ انھیں بے پردہ دیکھے گی
مجھے ڈر ہے نہ توہینِ جمالِ یار ہو جائے

ہم دل کو ان الفاظ سے کرتے ہیں مخاطب
اے جلوہ گہہِ انجمن آرائے قیامت

ہمارے دل کی محفل میں وہ جلوے موجود ہیں جن کی رونمائی صرف میدانِ حشر میں ہوگی (مراد جلوۂ الٰہی) اسی لیے ہم اپنے دل کو انجمن آرائے قیامت کی جلوہ گاہ کہتے ہیں۔

اللہ بچائے غمِ فرقت وہ بلا ہے
منکر کی نگاہوں پہ بھی چھا جائے قیامت

جُدائی کے غم اس قدر جان لیوا ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اگر کوئی شخص قیامت اور روزِ حشر کی سختیوں کا منکر بھی ہو لیکن اسے یہ غم سہنا پڑے تو وہ قیامت کا قائل ہو جائے۔

فانؔی یہ مگر راہِ محبّت کی زمیں ہے
ہر ذرّہ میں ہے وسعتِ صحرائے قیامت

محبّت کے راستے اس قدر دشوار گذار اور طول طویل ہیں کہ اس راہ کے ایک ایک ذرّہ کو میدانِ قیامت کی سی وسعت حاصل ہے۔

ردیف (ٹ)

(۱۰۳)

آنکھ اُٹھائی ہی تھی کہ کھائی چوٹ بچ گئی آنکھ، دل پہ آئی چوٹ

محبوب سے نظر ملتے ہی اس کی نگاہوں کا ایسا وار ہوا کہ ہمارا دل زخمی ہوگیا۔

دردِ دل کی انھیں خبر کیا ہو جانتا کون ہے پرائی چوٹ

اگر محبوب ہمارے درد سے بے خبر ہے تو کوئی نئی بات تو نہیں۔ اس دنیا میں کون کسی دوسرے کے دکھ کو سمجھتا یا محسوس کرتا ہے۔

آئی تنہا نہ خانۂ دل میں درد کو اپنے ساتھ لائی چوٹ

محبّت کی چوٹ جب سے دل پر لگی، درد دل کا ساتھی بن گیا ہے۔ شعر میں تکلّف ہے چوٹ اور درد کو الگ الگ چیز سمجھنا محض لفّاظی ہے۔

تیغ تھی ہاتھ میں نہ خنجر تھا اس نے کیا جانیں کیا لگائی چوٹ

محبوب اگرچہ اپنے ہاتھ میں نہ تلوار رکھتا ہے نہ خنجر۔ پھر بھی نہ معلوم کس چیز کا وار کیا کہ عاشق تڑپ گیا۔ غالؔب نے اس بات کو اپنے اندازِ بیان سے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یوں نہ قاتل کو جب یقیں آیا ہم نے دل کھول کر دکھائی چوٹ

محبوب کو عاشق کے زخمِ دل کا اس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک وہ اپنا کلیجہ چیر کر دل کا زخم اسے دکھا نہ دے۔

کہیں چھپتی بھی ہے لگی دل کی لاکھ فاؔنی نے گو چھپائی چوٹ

ہم نے بہت کوشش کی محبت کا راز کسی پر افشا نہ ہو اور محبت کی ہر چوٹ کو چھپائے رہے مگر عشق اور مشک کہیں چھپ سکتے ہیں۔ آخر ہمارا افسانۂ محبت مشہور ہو کر ہی رہا۔

ردیف (د)

(۱۰۴)

فغاں کے پردہ میں سن میری داستاں صیّاد
کہ پھر رہے نہ رہے طاقت بیاں صیّاد

میں فغاں کے ذریعہ اپنی داستانِ غم بیان کر رہا ہوں۔ تو اس داستان کو توجہ سے سن لے۔ اگر تو نے توجہ نہ کی تو ممکن ہے کہ اتنی طاقت بھی باقی نہ رہے کہ اپنا حال بیان کر سکوں۔ شعر کا مخاطب محبوب ہے۔

ترا اشارہ ترا ساز برق سے نہ سہی
تجھے خبر ہے کہ جلتا ہے آشیاں صیّاد

ساز = ساز باز

مانا کہ صیّاد اور برق میں کوئی تعلق یا ساز باز نہیں لیکن چونکہ عاشق کی تباہی میں دونوں برابر کے شریک ہیں اس لیے اس کے دل میں صیّاد کی طرف سے شبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ صیّاد سے پوچھتا ہے کہ تجھے ضرور خبر ہونا چاہیے کہ ہمارے آشیانہ کا برق نے کیا حشر کیا۔

نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں
بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیّاد

ہم وہ سوختہ نصیب ہیں کہ ہم نے فنا کی آغوش میں پرورش پائی ہے اور ہمارا آشیاں ہمیشہ برق کی زد میں رہتا ہے گویا اس کی تعمیر تنکوں سے نہیں بجلیوں سے ہوئی ہے اس لیے صیّاد کو ہمارے آشیاں سے دور ہی رہنا چاہیے کہ کہیں وہ بھی ہمارے ساتھ بجلیوں کا نشانہ نہ بن جائے۔

بس ایک آہِ جہاں سوز کے اثر تک ہیں
یہ خار، برق، قفس، دام، آسماں، صیّاد

آہِ جہاں سوز = دنیا کو جلا کر راکھ کر دینے والی آہ۔

یہ تمام چیزیں (برق، آسماں، صیّاد وغیرہ) جو مجھے برباد کرنے پر تُلی ہوئی ہیں ان کا وجود اسی وقت تک ہے جب تک میں آہ نہیں بھرتا۔ میری آہ میں وہ اثر ہے کہ جس روز میں نے آہ کی یہ سب جل کر خاک ہو جائیں گے۔

نکل ہی جائیں گے نالے دہن سے خوں ہو کر
زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زبان صیّاد

اگر صیّاد کے ڈر سے ہم نے زبان بند بھی کر لی اور نالوں کو باہر نہ آنے دیا تب بھی ہماری حالت ظاہر ہو کر رہے گی۔ اس کے ظلم سے رگِ زبان پھٹ کر اس سے لہو جاری ہو جائے گا اور یہ خون وہی کام کرے گا جو نالے کرتے۔

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاں ہوں میں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں صیّاد

آوازہ = شہرت

میری خوش بیانی کی شہرت نے مجھے مصیبت میں ڈالا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو میں کیوں قفس میں گرفتار ہوتا۔

گل و گلچیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوا اپنی صدا کے باعث

چمن میں دل ہے تو میری نگاہ میں ہے چمن
چمن سے تو مجھے لے جائے گا کہاں صیّاد

میرا تمام وجود چمن سے وابستہ ہے۔ چمن میں میرا دل رہتا ہے تو میری نگاہوں نے اس کے حُسن کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اگر صیّاد نے مجھے بہ ظاہر چمن سے جدا کر بھی دیا تو اس تعلق کو کیوں کر ختم کر سکے گا۔

یہ جذبِ شوقِ اسیری ہے ورنہ اے فانیؔ
کہاں میں سوختہ دل مشتِ پر، کہاں صیّاد

سوختہ دل = دل جلا، غمگین   مشتِ پر = مٹھی بھر پر، مراد حقیر

میرے اندر گرفتار ہونے کا شوق تھا جو مجھے قفس میں کھینچ لایا ہے ورنہ مجھ جیسے دل جلے اور حقیر طائر کو گرفتار کرنا صیاد بھی اپنے لیے توہین خیال کرتا۔

(۱۰۵)

کیا کہیے کہ بیداد ہے تری بیداد
طوفانِ محبت کی ہے زد میں فریاد

میں نے جب محبوب کی بیداد پر فریاد کرنا چاہی تو محبت نے مجھے اس سے باز رکھا کہ محبوب کے ظلم کو ظلم کہنا آدابِ محبت کے خلاف ہے گویا جوشِ عشق فریاد پر غالب آگیا۔

پابندیٔ رسم برطرف، کیوں اے موت
ان کے بھی کیے ہیں تونے قیدی آزاد

عشق کی قید سے گھبرا کر عاشق موت سے دریافت کرتا ہے کہ کیا اسیرانِ محبت کی رہائی پر بھی تجھے اختیار ہے۔ اگر یہ ممکن ہو تو رسمی تکلفات کو نظر انداز کر کے ہمیں بھی آزاد کرا دے۔ ایک طرف تو عشق کی تکالیف کی شدّت کا اظہار ہے، دوسری جانب یہ کہ موت کو عاشق پر رحم آسکتا ہے محبوب کو نہیں۔

دل محشرِ بے خودی ہے اللہ اللہ
یاد اور کسی بھولنے والے کی یاد

محبوب کی عادت بھول جانا ہے۔ عاشق بھی اس کی اس عادت کی مناسبت سے ہر چیز کو بھلا بیٹھا ہے اور اس کی یاد میں اس کا دل بے خودی کا محشرستان بن گیا ہے۔

اللہ یہ بجلیاں نہ کام آئیں گی
آندھی ہی سے کیوں ہو آشیانہ برباد

ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے آشیانہ کے تنکے آندھیوں میں منتشر ہوں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ برق ایک مرتبہ ہی اس کو پھونک دے۔ آشیانہ کی بربادی گویا ناگزیر امر ہے۔

دنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانیؔ
ہے اک طلسمِ اجتماعِ اضداد

اجتماعِ اضداد = متضاد چیزوں کا اکٹھا ہونا۔

دنیا کچھ متضاد چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ خوشی و غم، نفرت و محبّت، زندگی و موت۔ خود عناصر جن کی ترتیب سے دنیا بنی ہے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایسے اجتماع کی حقیقت ہی کیا۔ یہ تو محض ایک نیرنگ نظر یا طلسم ہے۔

(۱۰۶)

آخر کوئی اُمیدِ اثر بھی دعا کے بعد　　کچھ آپ بھی کہیں گے مری التجا کے بعد

ہم نے جو دعائیں کی ہیں ان کے اثر اور قبولیت کی اُمید اسی وقت ہو سکتی ہے جب محبوب ان دعاؤں پر اپنے لبوں کو جنبش دے اور کچھ بولے۔ ظاہر ہے کہ دعائیں اسی سے متعلق ہیں۔

کیا جانے کیا بلا ہے وہ اندازِ التفات　　دنیا بدل گئی نگہِ آشنا کے بعد

محبوب کے التفات میں کس بلا کا اثر تھا کہ جوں ہی اس نے ہماری طرف محبت سے دیکھا دنیا نے ہم سے بیگانگی اختیار کر لی۔ گویا: جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

دوسرے مطلب یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ محبوب کی نگہ آشنا کے بعد عاشق کا زاویۂ نظر ہی بدل گیا اور ساری دنیا اسے خوبصورت دکھائی دینے لگی لیکن اس صورت میں "کیا بلا تھی" کا انداز بے محل ہو جائے گا۔

فکرِ وفائے عہد تمھاری بلا کرے　　جیتا ہے کون وعدۂ صبر آزما کے بعد

محبوب نے عاشق سے وعدہ تو کیا ہے مگر اسے یہ فکر نہیں کہ وعدہ کیونکر وفا ہو گا کیونکہ اس کے صبر آزما وعدہ تک عاشق کا زندہ رہنا ہی ممکن نہیں۔

لنگر کا آسرا ہے نہ تائیدِ ناخدا　　میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد

اس شعر میں شاعر کے یقینِ کامل اور عزمِ راسخ کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہتا ہے کہ میرے پاس نہ ظاہری سہارے ہیں نہ ان کی حاجت۔ میری کشتی کا محافظ خدا ہے اور اس کے بعد میری قوتِ بازو ہے جس پر مجھے بھروسہ ہے "اسعی منّی والاتمام من اللہ" کی سچّی تشریح ہے۔ ایک اور شعر میں اسی یقین کا اظہار یوں کرتے ہیں :

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ   اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

اللہ رے اعتمادِ نوازش کہ ہے مجھے   امیدِ لطف، ہر ستمِ ناروا کے بعد

محبوب کی نوازشوں پر مجھے اس قدر بھروسہ ہے کہ اس کے ہر بے جا ستم کے بعد بھی اس سے لُطف کی اُمید ختم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے کہ شاید اب وہ پشیمان ہو کر کرم کرے۔

اب بھی اُمیدِ مہر ہے ان سے   اپنی معصومیٔ وفا کی قسم (ظفر احمد صدیقی)

شکوہ ہے اپنے کشتۂ بیداد سے انہیں   دیکھا نہ انتظارِ تلافی جفا کے بعد

کشتۂ بیداد ۔ ظلم کا مارا ہوا

محبوب کی جفاؤں کی تاب نہ لاکر عاشق نے جان دے دی۔ اور اب ستم ظریفی دیکھو کہ اُلٹا اس بات کا شکوہ ہے کہ اس نے اتنا انتظار کیوں نہ کیا کہ جفاؤں کی تلافی کی جاتی۔

فانی اسی خلش سے عبارت ہے یادِ دوست   جو انتہا کی زد میں نہ ہو ابتدا کے بعد

محبوب کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ دل میں ایسی خلش پیدا ہو جائے جو ایک بار شروع ہو کر کبھی ختم نہ ہو۔ گویا یادِ دوست عاشق کی زندگی کے ساتھ ہے اور اس سے پیدا ہونے والے درد کی خلش بھی لازوال ہے۔

ردیف (ر)

(۱۰۷)

حیراں ہوں رنگِ عالمِ تصویر دیکھ کر   کیا یاد آ گیا مجھے زنجیر دیکھ کر

عالمِ تصویر ۔ دنیا جس کی حیثیت افلاطونی فلسفیوں کے نزدیک اصلیت کے عکس یا تصویر کی سی ہے جو

اپنے اصل کی محتاج ہوتی ہے۔ زنجیر سے بھی اشارہ زندگی کی اسی مجبوری کی طرف ہے ۔

شاعر جب اس دُنیا کی رنگینی و دلکشی کو دیکھتا ہے اور اس کی حقیقت پر غور کرتا ہے تو وہ حیران ہوتا ہے اور معاً اس کا ذہن اُس اصلی زندگی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو روح کی زندگی ہے اور جہاں یہ مجبوریاں نہیں۔ پھر وہ خود ہی کہتا ہے کہ دیکھو اس قید نے بھی مجھے کیا یاد دلا دیا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے ۔

قسمت کے حرف سجدہ در سے مٹا تو دوں
دل کانپتا ہے شوخیٔ تدبیر دیکھ کر

محبوب کے در پر سجدے کر کے میں اپنے نوشتۂ تقدیر کو پیشانی سے مٹا سکتا ہوں مگر اپنی تدبیر کے انجام سے دل ڈرتا ہے کہ میری تدبیر کی یہ جسارت کامیاب بھی ہو سکے گی۔ یہ حروف چونکہ قسمت کے لکھے ہوئے ہیں اس لیے ان کو مٹانے کی تدبیر شوخی یا جسارت پر محمول نہ کی جائے گی۔

ہے ہے وہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں
سر پیٹتا ہوں خانۂ زنجیر دیکھ کر

جب ہم زنجیر کے خالی خانوں کو دیکھتے ہیں تو یاد آتا ہے کہ محبت کے دیوانے زنداں میں بھی کس ذوق و شوق سے گذر کرتے تھے اور ان کی یاد ہمیں تڑپا دیتی ہے۔

وہ بے وفا جفا سے بھی اب آشنا نہیں
کیا منفعل ہوں آہ کی تاثیر دیکھ کر

محبوب کی جفاؤں پر میں نے جو آہیں کیں اُن کا اثر یہ تو نہ ہوا کہ محبوب مجھ پر مہربان ہوتا اور وہ جفا بھی چھوڑ بیٹھا۔ میں اپنی آہ کی اس تاثیر پر شرمندہ ہوں کہ اس طرح رہا سہا تعلق بھی ختم ہو گیا۔

فانی وداعِ ہوش ہی کرنا پڑا مجھے
تن سے وداعِ روح میں تاخیر دیکھ کر

وداع = رخصت

غم سے نجات کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو موت آجاتی یا ہم ایسے بے خود ہو جاتے کہ احساسِ غم ہی باقی نہ رہتا۔ پہلی صورت اپنے بس میں نہ تھی۔ موت کے آنے میں تاخیر ہوئی

توہم نے ہوش ہی کو رخصت کر دیا۔

(۱۰۸)

خدا کی رحمتیں نازل ہوں عشقِ فتنہ ساماں پر
یہ دردِ بے دوا احسان ہے تقدیرِ درماں پر

درماں = علاج

خدا دردِ عشق کو سلامت رکھے اس لاعلاج درد نے ہمیں فکرِ درماں سے بے نیاز کر دیا گیا اس طرح درماں کی تقدیر (شفا بخشنا) پر اس درد کا احسان رہا۔ مراد یہ کہ درماں کا کام ہے درد کو دور کرنا۔ مگر عشق کی فتنہ سامانیوں نے عاشق کی ہستی کو ختم کر کے درد کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح اس کا احسان درماں پر بھی ہو گیا۔

ستم ہائے نمایاں سے نوازش ہائے پنہاں تک
شباب آتے ہی ہر آفت گزر جاتی ہے انساں پر

اپنی حالت پر قیاس کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ جوانی انسان کی مصیبتوں اور آزمائشوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اسی دور میں وہ مبتلائے عشق ہو کر محبوب کی ظاہری جفاؤں اور درپردہ لطف جیسی آفتوں کا سامنا کرتا ہے۔

غمِ اُمید کے صدقے وہ اضمحلالِ رنگیں ہوں
بہار آنے سے کچھ پہلے جو چھا جائے گلستاں پر

اضمحلال = افسردگی

ہماری حالت امیدوں کے غم یا فکر کے سبب اس باغ کی سی ہو گئی ہے جو خزاں کے گزرنے کے بعد بہار کا منتظر ہو اور بہ یک وقت اُمید و بیم کا نمونہ ہو۔ غموں کے بعد اُمیدوں میں مبتلا ہونے کی کیفیت کو "اضمحلال رنگیں" کہنا فانی کی اختراع ہے۔

ٹھہر اے نشترِ حرماں ٹھہر، یہ ماجرا کیا ہے
مجھے کچھ جان کا دھوکا سا ہوتا ہے رگِ جاں پر

نشترِ حرماں = غم کے نشتر۔
غم نے شاعر کے جسم و جان کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ اس میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی۔ اسے بے جان سمجھ کر نشترِ غم نے اپنی کارروائیوں کو منقطع کر دیا ہے مگر شاعر اسے روکتا ہے اور کہتا ہے کہ ابھی تیرا کام پورا نہیں ہوا کیونکہ ابھی ہماری رگِ جاں میں زندگی کی ایک رمق سی محسوس ہوتی ہے۔ اسے بھی ختم کر دے پھر رخصت ہونا۔

یہ محشر ہے، یہاں جو چاک ہے رحمت بداماں ہے
وہ دنیا تھی جو ہنستی ہی رہی ہر چاکِ داماں پر

چاک دامانی کنایہ ہے دیوانگی یا شکستہ حالی سے۔ دنیا میری چاک دامانی پر ہنسا کرتی تھی اور مضحکہ اڑاتی تھی مگر قیامت میں اس چاک دامانی کی داد ملی کہ یہاں جو چاک دامن آتا ہے رحمت الٰہی کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

متاعِ یک جہانِ آرزو جو چند گھڑیاں تھیں
سو وہ اک اک گھڑی بھاری ہے اب بیمارِ ہجراں پر

متاعِ یک جہانِ آرزو = تمنّاؤں کی دنیا کی پونجی۔ "یک جہاں" کثرت کے اظہار کے لیے ہے۔
زندگی کی وہ آخری ساعتیں جو عاشق کی ساری آرزوؤں کا حاصل تھیں اور اس کے لیے بڑی گراں مایہ تھیں (کیونکہ اسے محبوب کا انتظار تھا) وہ اب بیمارِ ہجر پر بھاری ہو رہی ہیں اور ایک ایک پل گزارنا دوبھر ہو رہا ہے۔

مری دیوانگی کی شرح میرا ہوش ہے فانیؔ
گریباں ہے مگر وحشت برستی ہے گریباں پر

ہماری ہوش کی حالت بھی دیوانگی کی ہی تفسیر ہے یعنی عالمِ ہوش میں بھی ہماری ہر ادا سے وحشت نمایاں ہے۔ ہمارا گریبان اگرچہ سلامت ہے مگر اس پر بھی وحشت برستی ہے۔

(۱۰۹)

عشق عشق ہو شاید حسن میں فنا ہو کر
انتہا ہوئی غم کی دل کی ابتدا ہو کر

غموں کی انتہا کا نام دل ہے۔ مراد یہ کہ دل کی زندگی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب غم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح شاعر یہ توقع ظاہر کرتا ہے کہ عشق اگر خود کو حسن میں فنا کر دے تو وہ اپنا اصلی مقام حاصل کر لیتا ہے یعنی عشق حسن کا ایک دوسرا روپ ہے اور دل غم کی ایک شکل۔

دل ہمیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر
عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر

دوسرے لوگ انتہائے غم کو عشق کا کمال قرار دیتے ہیں مگر فانی کے نزدیک یہ ابتدائے عشق کا مقام ہے اور انسان جب تک اپنے کو درد میں نہ مٹا دے اُس وقت تک وہ اہلِ دل نہیں کہلا سکتا۔

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں
سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر

جب تک غم ہے اسی وقت تک زندگی بھی ہے اور نالے بھی نامرادوں کے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی کہ سانس کی آمد و رفت۔ گویا ہمارے نالے جو تاثیر سے محروم رہے اپنی نارسائی کی بدولت ہماری زندگی کے ضامن بن گئے ہیں۔

اب ہوئی زمانہ میں شیوۂ وفا کی قدر
عالم آشنا ہے وہ دشمن آشنا ہو کر

محبوب کی وفادشمنی نے اسے زمانہ بھر میں مشہور کر دیا ہے اور اس کی بے وفائی کی شہرت نے لوگوں کو ہماری وفا کا بھی قدر دان بنا دیا ہے۔

اور بندے ہیں جن کو دعویٰ خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

ایک وہ لوگ تھے جو بندہ ہو کر نادانی سے خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے۔ ایک ہمیں دیکھو کہ اگرچہ خدا سے جدا نہیں ہیں پھر بھی ہمیں اپنی بندگی و بے چارگی کا اقرار ہے۔ مطلب یہ کہ "لاعین" و "لاغیر" کی حدود کے اندر رہنا ماسوا کی تقدیر ہے۔

بندۂ خدائی ہے مدعی خدائی کا
بندے نے خدائی کی بندۂ خدا ہو کر

اوپر کے شعر کے خیال کو دوسرے پیرایے میں پیش کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں سچ پوچھو تو وہ قدم قدم پر دوسروں کے محتاج ہیں۔ اس کے برخلاف جو خدا کے سچے بندے ہیں وہ زمانہ کے دلوں پر خدائی (حکمرانی) کرتے ہیں۔ یعنی انسان کی عظمت اعتراف بندگی میں مضمر ہے، دعویٰ خدائی میں نہیں۔

عمر خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں
زندگی نئی پائی آپ سے جدا ہو کر

آپ سے مراد خود شاعر کی اپنی ذات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب سے میں نے محبت میں خود کو فنا کر دیا ہے اس وقت سے مجھے ایک نئی زندگی مل گئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میری ہر سانس عمرِ خضر کی طرح ایک حیاتِ جاوداں ہے۔

بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

درد دل میں اس طرح جاری وساری ہے کہ اس میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی اور ہمارا شمار نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ "درد پر خدا کی مار" کے فقرے نے لطف پیدا کر دیا ہے۔

کارگاہِ حسرت کا حشر کیا ہوا یارب
داغِ دل پہ کیا گزری نقشِ مدّعا ہو کر

کارگاہ = کارخانہ

ہمارا دل حسرتوں کا ایک کارخانہ بن گیا تھا جس میں نئی نئی تمنّائیں اور ان کے داغ بنتے تھے اور یہ داغِ حسرت ہی ہماری زندگی کا مقدر و مدّعا بن گئے تھے۔ اس کے بعد دل کا کیا حشر ہوا اور داغِ دل پر کیا گزری ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ان کا انجام معلوم ہوگا تو خدا کو ہوگا۔ مراد یہ کہ جس دل کے پلّہ پر داغوں کے اور حسرتوں کے سوا کچھ نہ ہو اس کے انجام کا خدا ہی حافظ ہے۔

عشق سے ہوئے آگاہ صبر کی بھی حد دیکھی
خاک میں ملادوگے دیر آشنا ہو کر

دیر آشنا = دیر میں دوستی کرنے والا۔

ہم عشق کے تمام مراحل سے گزر چکے اور جس حد تک صبر کر سکتے تھے کیا مگر محبوب اس قدر دیر آشنا ہے کہ پھر بھی وفا کا صلہ نہیں دیتا۔ اس کی یہ تاخیر ہمیں مٹا کر ہی چھوڑے گی۔

کی قضائے مبرم نے زندگی کی غم خواری
درد کی دوا پہنچی دردِ بے دوا ہو کر

جب ہمارا درد حد سے گزر کر لادوا ہوگیا تو اس کی لاعلاجی نے ہی دوا کا کام کر دیا۔ یعنی موت نے آکر ہمیں اس درد سے نجات دے دی اور اس طرح ہماری غمگساری کا فرض ادا کر دیا۔ ع : درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

زندگی سے ہو بیزار فانیؔ اس سے کیا حاصل
موت کو منالو گے جان سے خفا ہو کر

تم لاکھ زندگی سے بیزار سہی مگر تمھاری آرزوئے موت سے موت سچ مچ تو نہیں

آجائے گی۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ راضی برضا رہو اور تقدیر جو دکھائے دیکھو۔

(۱۱۰)

کر نہ فریاد خموشی میں اثر پیدا کر
دردبنکر دلِ بے درد میں گھر پیدا کر

عشق میں نالہ و فریاد کرنا مناسب نہیں بلکہ اپنی خموشی میں وہ تاثیر پیدا کر کہ بے درد محبوب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور تیرے غم سے تڑپنے لگے۔

میں دعا موت کی مانگوں تو اثر پیدا کر
ورنہ یارب شبِ فرقت کی سحر پیدا کر

شاعر شب غم کی تکلیفوں سے تنگ آکر خدا سے التجا کرتا ہے کہ یا تو میری دعائے مرگ کو قبولیت بخش دے ورنہ شب ہجر کا خاتمہ کر دے تاکہ میں اس اذیت سے نجات پا جاؤں۔

تہہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر کے دیکھ
قطرے قطرے میں سمندر ہے نظر پیدا کر

یہاں ہر قطرہ بحر در آغوش ہے اور ہر جزء میں کل موجود ہے لیکن اس کی حقیقت کو جاننے کے لیے سطح سے گزر کر ہر چیز کی تہہ تک پہنچنے والی نظر درکار ہے۔ یہاں قطرہ سے مراد عالم کی اشیا ہیں اور سمندر سے ذات الہٰی۔

جتنے غم چاہے دیے جا مجھے یارب لیکن
ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر

انسانی زندگی کو غم سے کتنا ہی اُنس کیوں نہ ہو مگر قوتِ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ میں وفورِ غم سے نہیں گھبراتا ہاں اس قدر ضرور چاہتا ہوں کہ ہر تازہ غم کو برداشت کرنے کے لیے ایک نیا دل بھی عطا ہو جائے۔

یا اسے کر کسی بجلی کے حوالے یارب
یا مرے نخلِ تمنّا میں ثمر پیدا کر

نخلِ تمنا = آرزوؤں کا درخت

میرا نخلِ تمنّا ہمیشہ بے ثمر ہی رہا ہے یعنی میری کوئی آرزو کبھی پوری نہیں ہوئی۔ اے خدا تو میرا نخلِ آرزو بارور کر دے اور اگر یہ تیری مشیت نہیں تو پھر اسے بجلیوں کے حوالے

کردے کہ وہ اسے جلا کر خاک کر دیں۔

(۱۱۱)

دلِ مایوس کو اے عہدِ کرم شاد نہ کر
نازپروردۂ غم ہے اسے برباد نہ کر

عاشق کا دل محرومیوں اور غم کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ اب وہ خوشی کے تصوّر کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ محبوب کے وعدوں پر خوش ہونے کے بجائے اس سے کہتا ہے کہ میں غم کا عادی ہوں مجھے کرم کا وعدہ کر کے خوشی کی اُمید دلانے کی کوشش نہ کر۔

اے تقاضائے خرد مجھ پہ یہ بیداد نہ کر
میں ہوں دنیائے محبّت مجھے برباد نہ کر

عشق اور عقل کا ہمیشہ سے بَیر ہے۔ جس طرح محبّت کے غلبہ سے عقل جاتی رہتی ہے اسی طرح عقل کے تسلّط سے محبّت رخصت ہو جائے گی۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ میں سراپا محبّت ہوں۔ کہیں خرد کے تقاضے اپنی جانب بُلا کر مجھے تباہ نہ کر دیں۔

روحِ اربابِ محبّت کی لرز جاتی ہے
تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

محبوب اپنی جفاؤں پر شرمندہ ہے اور عاشق کی موت پر تاسّف کر رہا ہے۔ عاشق کو اس کی شرمندگی گوارا نہیں اور وہ یہ کہہ کر اسے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ تمھارا یہ غم عاشق کی روح کے لیے صدمہ کا باعث ہوگا۔

غمِ ہستی ہی سہی، تیرے سوا کوئی ہو
دل کہ بستی ہے تری، غیر سے آباد نہ کر

دل مقامِ محبوب ہے، اس میں محبوب کے سوا کسی کا گزر نہ ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ غمِ ہستی یا غمِ حیات کو بھی دل میں جگہ دینا مناسب نہیں۔

خامشی عینِ فغاں ہونے نہ پائے اے دل
اور جو فریاد ہی کرنا ہے تو فریاد نہ کر

مجبور کی خاموشی بھی گویا فریاد ہی کی ایک شکل ہے، اس لیے شاعر اپنے دل کو تاکید کرتا ہے کہ اگر تجھے محبوب کے سامنے فریاد کرنا ہی منظور ہے تب تو خاموشی اختیار کر ورنہ

کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری خاموشی کو وہ شکایت تصوّر کرے اور تجھ سے بدگمان ہو جائے۔

صبر شایانِ محبت تو نہیں ہے لیکن   شکر گر بن نہ پڑے شکوۂ بیداد نہ کر

صبر ناگوار چیز کی برداشت کو کہتے ہیں۔ جفائے یار پر صبر کرنا عشق کے شایان نہیں کیونکہ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جفا ناگوار ہے۔ عاشق کو تو ظلم پر شکر ادا کرنا چاہیے اور اگر اس کی توفیق نہیں تو شکایت زبان پر لانے سے بہتر ہے کہ خاموش ہی ہو جائے۔

دل کی حد سے اثرِ زیست نہ گزرے فانیؔ   ہوش لازم ہے مگر ہوش کو آزاد نہ کر

زندگی کے مراحل سے گزرنے میں شاعر ہوش کی ضرورت کا منکر نہیں۔ البتہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہوش اپنی حدود میں رہے اور دل کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ غمِ زیست کو اتنی آزادی نہ ملنا چاہیے کہ وہ ساری زندگی پر حاوی ہو جائے۔

(۱۱۲)

گزرے گی اب نہ غم کا مداوا کیے بغیر   بنتی نہیں اجل سے تقاضا کیے بغیر

مداوا = علاج، تدارک

غم اب حد سے گزر گیا ہے اس لیے اب اس کا علاج کیے بغیر کام نہیں چلے گا اور ہمیں موت سے جلد آنے کا تقاضا کرنا ہی پڑے گا۔ اشارہ یہ کہ غم کا علاج صرف موت سے ہی ممکن ہے۔ شعر کا انداز نیا اور مؤثر ہے۔

دل کامیابِ شوق ہے بے منّتِ نگاہ   جلوے ہیں دلفریب تماشا کیے بغیر

محبوب (محبوبِ حقیقی) کے جلووں کی دلکشی و دلفریبی سعیٔ تماشا کی محتاج نہیں اور ہمارے شوقِ دیدار کی یہ کامیابی نظروں کی مرہونِ منت نہیں۔ یعنی اس کے جلووں کو ظاہری نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ دیدۂ دل سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج تک   ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کیے بغیر

عاشق کو محبوب پر اس قدر اعتماد ہے کہ اگرچہ اس نے کبھی اس کو (محبوب کو) آزمایا نہیں پھر بھی یہ اعتمادِ محبت ہے کہ اپنے ہر غم والم کا مداوا اسی کو سمجھتا ہے۔

دل ہی نہیں ہے اس کی تمنّا کیے بغیر   وہ جان ہی نہیں جو نہ ہو جائے نذرِ دوست

اُس زندگی کی کوئی حقیقت نہیں جو دوست کے قدموں پر نثار نہ کر دی جائے اور وہ دل دل نہیں جو اس کی آرزو سے معمور نہ ہو۔

ممکن نہیں ہے راحتِ دُنیا کی آرزو   غم پر گمانِ راحتِ دنیا کیے بغیر

دنیا میں مسرت و راحت کی آرزو ممکن نہیں کیونکہ شاعر کے نزدیک دنیا میں راحت کا وجود ہی کب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی غم کو ہی راحت دنیا سمجھ کر اس کی تمنّا کر بیٹھے۔ یعنی راحت کی خواہش کرنا بھی غم کی خواہش کے مترادف ہے کیونکہ غم انجام راحت ہے۔

اس ضبط و احتیاط پہ رسوا ہے رازِ عشق   پردہ میں حسنِ دوست ہے پردا کیے بغیر

مشہور ہے کہ عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ چنانچہ عاشق نے اپنے عشق کو راز رکھنا چاہا مگر ساری دنیا کو خبر ہو گئی۔ اس کے برخلاف محبوب (حقیقی) کا حسن عالم آشکار ہونے پر بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے گویا

بے حجابی یہ کہ ہر ذرے سے جلوہ آشکار   اس پہ یہ پردہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

لازم سی ہے حیات کہ فانیؔ مفر نہیں   جینے کی تلخیوں کو گوارا کیے بغیر

زندگی اپنی اختیاری چیز نہیں۔ جب جینا ہی ہے تو کیوں نہ زندگی کی تلخیوں کو گوارا اور قابلِ قبول بنایا جائے۔ ع : ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

(۱۱۳)

ہر تبسّم کو چمن میں گریاں ساماں دیکھ کر
جی لرز جاتا ہے ان غنچوں کو خنداں دیکھ کر

شاعر کا تجربہ ہے کہ دنیا میں ہر خوشی غم کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور ہر مسکراہٹ آنسوؤں کا۔ اسی لیے جب وہ کسی کلی کو مسکراتے دیکھتا ہے تو اس کے انجام کے خیال سے اس کا دل کانپ جاتا ہے۔ یہ خیال اکثر شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ محشر بدایونی کہتے ہیں :

پژمردگیٔ گل پہ ہنسی جب کوئی کلی   آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

میر کا بے پناہ شعر ہے :

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات   کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

فانی نے دوسری جگہ اس خیال کو ادا کیا ہے :

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حال انھیں معلوم نہیں   کلیوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہیے

آخر آخر ہوش ہی وحشت بھی تھا حیرت بھی تھا
دل کو عالم آفریں صحرا بداماں دیکھ کر

محبت نے دل کو وہ وسعت بخشی ہے کہ اس کے دامن میں کتنے ہی صحرا سما گئے ہیں جنھوں نے دنیا کی وسعت کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ دل کی اس وسعت کے مشاہدے نے میرے ہوش کو وحشت میں تبدیل کر دیا۔ مراد یہ کہ میری وحشت بے خبری کا ذریعہ نہیں بلکہ حقیقت کے ادراک پر تحیر کا نتیجہ ہے اور ہوش نے ہی مجھے اسباب وحشت فراہم کیے ہیں۔

شیوہ اپنا غم پرستی قبلہ اپنا خاکِ دل
روحِ غم کو پیکرِ خاکی میں انساں دیکھ کر

روح غم انسان کے پیکرِ خاکی میں متشکل ہو گئی ہے۔ ہم چونکہ غم کی پرستش کو اپنا سلک سمجھتے ہیں اور دل غموں کا مسکن ہے۔ اس لیے ہم نے دل کو اپنا قبلہ اور سجدہ گاہ نا لیا ہے۔

بر تسلّی سے سوا ہوتی گئی دل کی تڑپ
درد کچھ سے کچھ ہوا سامانِ درماں دیکھ کر

قاعدہ ہے کہ کسی کو ہمدرد دیکھ کر انسان کو غم کا احساس بڑھ جاتا ہے اور اظہارِ غم

یں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عاشق کی تڑپ دوستوں کی ہمدردی سے اور بڑھ گئی اور درد کہیں سے کہیں جا پہنچا۔

معنیٔ صورت میں ہم نے تیری صورت دیکھ لی
تیری قدرت دیکھ لی انساں کو انساں دیکھ کر

جب مظاہر سے گزر کر ہم اشیا کے باطن یا اس کے معنی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ہر چیز میں حسن حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے چنانچہ جب ہم نے انسان کی ہستی پر غور کیا تو اس میں بھی ہمیں تیری ہی قدرت و صورت نظر آئی۔

قبرِ فانی پر ہیں وہ برچیدہ دامن اے نسیم
منتشر کر خاک لیکن ان کا داماں دیکھ کر

برچیدہ دامن = دامن سمیٹے ہوئے۔

محبوب عاشق کے مزار پر آیا ہے مگر دامن سمیٹے ہوئے کہ کہیں عاشق کی قبر کا غبار اس کے دامن تک نہ آ جائے۔ اس کی مرضی کا عاشق کو اس قدر خیال ہے کہ وہ نسیم (ہوا) کو تاکید کر رہا ہے کہ میری خاک کو اس طرح اڑانا کہ ان کا دامن آلودہ نہ ہو۔ مر کر بھی محبوب کا احترام میر کے اس شعر میں بھی پایا جاتا ہے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(۱۱۴)

جی ڈھونڈھتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

دنیا کے آلام و مصائب اور آسمان کے ظلم سے شاعر اس درجہ تنگ آ چکا ہے کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہنے کا خواہش مند ہے جو زمین و آسمان سے الگ اور ان کی حدود سے باہر ہو۔

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں
بجلی چمک رہی ہے مرے آشیاں سے دور

درخور = لائق، مستحق   نگہ گرم - نگاہِ غضب

کرم کی تو مجھے امید نہیں تھی مگر شاید قسمت نے مجھے نگاہِ غضب کے قابل بھی نہ سمجھا جو بجلیاں بھی میرے آشیانہ سے دُور رہتی ہیں اور اس پر گرنا گوارا نہیں کرتیں۔

وہ پوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
"کس کی وفا ہے دسترسِ امتحاں سے دور؟"

عاشق کو اپنے عشق کے کمال کا دعویٰ تھا اور وہ اسے امتحان و آزمائش کی حدود سے بالاتر خیال کرتا تھا لیکن جب محبوب نے دریافت کیا کہ کون ایسا عاشق ہے جسے اپنے عشق کے مکمل اور امتحان کی دسترس سے بالاتر ہونے کا دعویٰ ہو تو سب خاموش ہیں اور کسی کو جواب دینے کی جرأت نہیں ہو رہی۔ عشق کے کامل نہ ہونے کا تصور فانی کے یہاں اکثر اشعار میں ملتا ہے۔ دوسرا مصرع محبوب کا سوال ہے جو وہ عاشقوں سے کر رہا ہے۔

آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دور

محبت کی داستان اگرچہ ہماری زبان پر یا اس کے قریب رہی مگر ہم نے رسوائی کے خیال سے اسے کبھی کسی سے بیان نہیں کیا۔ آج محبوب نے اس ادا سے ہم سے آنکھیں چرائیں کہ یہ ستان سب پر ظاہر یعنی عام ہوگئی۔ ایک اور شعر میں فانی نے کہا ہے:

ں چرائیں اس نے نظارِ سادگی تو دیکھنا   بزم میں گویا مری جانب اشارا کر دیا

ہے منعِ راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

عشق کی منزلِ مقصود دیر و حرم دونوں سے بہت آگے ہے۔ کعبہ و بت خانہ دونوں

اسی تک پہنچنے کے راستے ہیں البتہ ایک راستہ سے راہرو جلدی پہنچتا ہے دوسری سے دیر میں لیکن عشق کی راہ میں چلنے والا ان دونوں راستوں سے بچ کر نکلتا ہے اور قرب و دوری کے احساس سے بالاتر ہوتا ہے۔

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

لاگ = تعلق

شاعر کی یہ تمنائے پرستش کتنی انوکھی ہے کہ وہ محبوب کے حضور ایسا سجدہ کرنا چاہتا ہے جو رسمِ عبادت کی ہر پابندی سے بے نیاز ہو یہاں تک کہ اس کے لیے آستانِ محبوب کی قید بھی نہ ہو اور وہ سجدہ پابندِ در نہ ہونے پائے۔ لاگ یہاں لگاؤ یا تعلق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

فانیؔ دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

دکن کے رہنے والے شمالی ہند کو ہندوستان کہتے ہیں اور دکن کو الگ تصوّر کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ دکن (حیدرآباد) آکر یہ نئی بات معلوم ہوئی کہ ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اس سے دور ہیں۔

(۱۱۵)

نہ چاہا حسن کی فطرت نے کوئی داغ دامن پر
رہا محشر میں اپنا خونِ ناحق اپنی گردن پر

ہم نے محشر میں محبوب پر اپنے خون کا دعویٰ کیا مگر وہ الزام ثابت نہ ہو سکا اور وہ اس سے بری قرار پایا۔ اُلٹا ہم خود اپنے خونِ ناحق کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔ مراد یہ کہ اگرچہ محبوب عاشق کی موت کا ذمہ دار ہوتا ہے مگر اس کو کوئی قانون مجرم قرار نہیں دے سکتا اور خود عاشق ہی مجرم بنتا ہے۔

قیامت کی کشش رکھتے ہیں دانے میرے خرمن کے
کہیں کی بجلیاں ہوں آ کے چھا جاتی ہیں خرمن پر

خرمن = کھلیان

میرے خرمن کے دانوں میں وہ کشش ہے کہ ہر جگہ سے بجلیاں اکٹھی ہو کر اسی پر ٹوٹتی ہیں۔ مراد یہ کہ میری بدنصیبی کا یہ حال ہے کہ جو مصیبت نازل ہو مجھی کو نشانہ بناتی ہے۔

ہر بلائے کز آسماں آید خانۂ انوری تلاش کند

محبت میں ہمیں جی کھول کر رونا نہیں آتا
جو چار آنسو ہیں آنکھوں میں تو دو آنسو ہیں دامن پر

ابھی ابتدائے عشق ہے اور ہم کو جی بھر کر رونے کا سلیقہ نہیں آتا۔ چند آنسو پلکوں پر مچلتے ہیں تو چند دامن میں جذب ہو جاتے ہیں۔

بنایا تھا نشیمن شاخِ گل پر کس گھڑی یارب
بچھی جاتی ہے ہر برقِ بلا شاخِ نشیمن پر

نہ معلوم وہ کون سی منحوس ساعت تھی جب ہم نے آشیاں کی بنیاد ڈالی تھی کہ اس روز سے آج تک وہ شاخ جس پر ہمارا آشیانہ ہے بجلیوں کا مسکن بن گئی ہے۔

مجھے کھینچے لیے جاتا ہے کیا جانے کہاں کوئی
نہ کچھ احسانِ رہبر ہے نہ کچھ الزام رہزن پر

محبت کرنے والوں کو راہِ وفا میں نہ راہبر کی پروا ہوتی ہے نہ راہزن کا ڈر۔ ایک نادیدہ کشش ہے جو کشاں کشاں نامعلوم راستوں پر لیے جاتی ہے۔

نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں دوستوں کو اور نہیں پاتیں
نظر اٹھتی ہے اب جس دوست پر پڑتی ہے دشمن پر

دنیا میں دوستوں اور ہمدردوں کا اس قدر قحط ہے کہ ڈھونڈے سے بھی دوست دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ دوست کے بھیس میں ہر طرف دشمن ہی دکھائی دیتے ہیں۔

ہنسی آتی ہے تیری سادگیِ شوق پر فانی
وہ میّت ہی پہ کب آئے جو اب آئیں گے مدفن پر

عاشق مرنے کے بعد اس فریبِ شوق میں مبتلا ہے کہ شاید محبوب قبر پر آجائے مگر پھر خود ہی خیال آتا ہے کہ جب وہ لاش پر ہی نہیں آیا تو قبر پر کیا آوے گا۔ یہ تو محض تیری سادگی ہے جو تو ایسا سمجھتا ہے۔

(۱۱۶)

رُلایا عمر بھر خونِ جگر اک اک مصیبت پر
مٹا کر دم لیا پتھر پڑیں دردِ محبت پر

دردِ محبت کا بُرا ہو کہ اس نے ہم پر وہ مصیبتیں توڑیں کہ ہم تمام عمر خون کے آنسو روتے رہے اور اس غم نے آخر ہمیں مٹا کر ہی دم لیا۔ خون رونا تو محاورہ ہے۔ فانی نے خونِ جگر رلایا کہہ کر اس میں تحریف کی ہے جو بے لطف ہے۔

کہیں عبرت برستی ہے کہیں حسرت برستی ہے
خدا کی رحمتیں نازل ہیں کیا کیا دشت وحشت پر

جس دشت میں دیوانے خاک اڑاتے ہیں، اس میں ہر طرف حسرت اور عبرت کا دور دورہ ہے۔ گویا اس ویرانے پر خدا کی رحمتوں کا خاص نزول ہے۔ رحمت کا لفظ طنزاً استعمال ہوا ہے۔

حقیقت اور فتنوں کی ہی کیا تیرے مقابل میں
قیامت کو ہوا اپنا سا دھوکا تیرے قامت پر

دنیا کا فتنہ تیرے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہاں فتنۂ قیامت ضرور اس کے مشابہ ہے کہ وہ تیرے قد سے ملتا جلتا ہے۔

مرے بےچین دل کو صبر آجائے تو میں جانوں
کہ اے ناصح نہیں رہتا زمانہ ایک حالت پر

ناصح کہتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور زمانہ ایک حالت پر قائم

نہیں رہتا۔ ہم اس کی اس بات کے قائل کس طرح ہوں جبکہ ہمارے دل کی بے چینی میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ قاعدہ ہے کہ آدمی اپنے تجربہ کی بنا پر ہی کوئی رائے قائم کرتا ہے۔

جنازے پر ترے کشتے کے ظالم کتنا مجمع تھا
کہ شوقِ دید میں حسرت گری پڑتی تھی حسرت پر

کشتہ = مارا ہوا، شہید۔

محبوب نے جب اپنے طالبِ دیدار کو قتل کیا تو اس کے جنازے پر اس کی حسرتوں اور ارمانوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی جو محبوب کے دیدار کی تمنا میں وہاں جمع تھیں۔ مراد یہ کہ عاشق کے جنازے پر رونے والا بھی اس کی حسرتوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

(۱۱۷)

وہ خواب فریبِ جمال ہے جو نظر تھی جلوۂ یار پر
مجھے اب بہار سے کیا غرض کہ مری خزاں ہے بہار پر

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہمیں جلوۂ محبوب (محبوبِ حقیقی) کی دید میسر تھی اور اس کا حُسن ہر لمحہ ہمارے پیشِ نظر تھا مگر اب وہ جلوے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور ہم نے فریبِ جمال (دنیا کے مظاہر) کو ہی اصل جلوہ سمجھ لیا ہے۔ گویا ہماری حالت اس خزاں نصیب شخص کی سی ہے جو خزاں کو بہار سمجھ بیٹھا ہو اور جس کا تعلق بہار سے منقطع ہو چکا ہو۔

مرے ذوقِ دید کو بجلیاں ہی نصیب ہیں تو یہی سہی
یہ گناہ ہے تو اُٹھا نہ رکھ یہ گناہ روزِ شمار پر

محبوب کے جلووں کی دید کی تمنا ایک گناہ ہے جس کے لیے عاشق سزا کا مستحق قرار پاتا ہے اور محبوب کا حُسن اس کی نگاہوں کو بجلی کی مانند جلا دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر خواہشِ دید گناہ ہے اور اس کا خمیازہ بجلیاں ہیں تو اس کے لیے ہم روزِ قیامت کا انتظار کیوں کریں (خیال رہے کہ قیامت میں خدا نے اپنا جلوہ دکھانے کا وعدہ کیا ہے) اور کیوں نہ اس دنیا ہی میں اس سے دید کا تقاضا کر کے اس گناہ کی سزا پا لیں۔ اس شعر میں ایک لطیف اشارہ حضرتِ موسیٰ کے واقعہ کی طرف بھی پایا جاتا ہے۔ نیز عاشق کی بے چینی

اورشوقِ دید کا بھی بہت پُر اثر اور سچا اظہار ہے۔

یہ نویدِ گردشِ جام کیا یہ صلائے عیشِ مدام کیا
کہ ہزار لطف کی صحبتیں ہیں نثار اک غمِ یار پر

نوید = خوش خبری   صلا = دعوت دینا

فانی کے نزدیک غمِ محبت دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کے سامنے ہر خوشی اور عیش بے حقیقت ہے۔

مرے آشیاں پہ عجب نہیں کبھی برق قصدِ کرم کرے
مگر آہ درخورِ پیشکش نہ وہ مشتِ خس نہ یہ چار پَر

درخورِ پیش کش = پیش کرنے کے لائق

فانی کو تباہیاں اور بربادیاں اس قدر عزیز ہیں کہ انھیں اپنے آشیاں کے جلنے کا غم ہونے کے بجائے اس بات کا افسوس ہے کہ ان کے پاس بجلیوں کی نذر کرنے کو کچھ اور آشیاں کیوں نہ ہوئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے بجلیاں کبھی ہمارے آشیانہ کی طرف نظرِ عنایت کریں لیکن ہم ان بجلیوں کی ضیافت کس طرح کریں گے۔ ہمارے پاس تو آشیانہ کے چند تنکوں اور مٹھی بھر پروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو اُن کو پیش کرنے کے لائق ہو۔ شعر میں اشارہ یہ بھی ہے کہ جو دنیا کے ساز و سامان سے بے نیاز ہوتا ہے اسے کوئی خوف یا فکر نہیں ہوتی۔

وہ مزارِ فانیٔ مبتلا کا نشاں مٹانے کو آئیں گے
یہ وعید وعدہ سے کم نہیں کہ وہ آئیں گے تو مزار پر

وعید = ڈراوا۔

محبوب عاشق کی قبر کا نشان مٹانے کو آرہا ہے۔ یہ خبر عاشق کو خوفزدہ کرنے کے بجائے اس کی خوشی کا سبب بن گئی ہے کہ چلو اسی بہانے سہی وہ اس کے مزار پر آتو رہا ہے۔

اور شوقِ دید کا بھی بہت پُر اثر اور سچا اظہار ہے۔

یہ نویدِ گردشِ جام کیا یہ صلائے عیشِ مدام کیا
کہ ہزار لطف کی صحبتیں ہیں نثار اک غمِ یار پر

نوید = خوش خبری　　صلا = دعوت دینا

فانی کے نزدیک غمِ محبت دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کے سامنے ہر خوشی اور عیش بے حقیقت ہے۔

مرے آشیاں پہ عجب نہیں کبھی برق قصد کرم کرے
مگر آہ درخورِ پیشکش نہ وہ مشتِ خس نہ یہ چار پَر

درخورِ پیش کش = پیش کرنے کے لائق

فانی کو تباہیاں اور بربادیاں اس قدر عزیز ہیں کہ انھیں اپنے آشیاں کے جلنے کا غم ہونے کے بجائے اس بات کا افسوس ہے کہ ان کے پاس بجلیوں کی نذر کرنے کو کچھ اور آشیاں کیوں نہ ہوئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے بجلیاں کبھی ہمارے آشیانہ کی طرف نظرِ عنایت کریں لیکن ہم ان بجلیوں کی ضیافت کس طرح کریں گے۔ ہمارے پاس تو آشیانہ کے چند تنکوں اور مٹھی بھر پروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو اُن کو پیش کرنے کے لائق ہو۔ شعر میں اشارہ یہ بھی ہے کہ جو دنیا کے ساز و سامان سے بے نیاز ہوتا ہے اسے کوئی خوف یا فکر نہیں ہوتی۔

وہ مزارِ فانیٔ مبتلا کا نشاں مٹانے کو آئیں گے
یہ وعید وعدہ سے کم نہیں کہ وہ آئیں گے تو مزار پر

وعید = ڈراوا۔

محبوب عاشق کی قبر کا نشان مٹانے کو آ رہا ہے۔ یہ خبر عاشق کو خوفزدہ کرنے کے بجائے اس کی خوشی کا سبب بن گئی ہے کہ چلو اسی بہانے سہی وہ اس کے مزار پر آ تو رہا ہے۔

(۱۱۸)

مورِدِ کفر بنا مظہرِ ایماں ہو کر
دل مرا لوٹ ہے کافر پہ مسلماں ہو کر

دل جو خدا کا گھر کہلاتا ہے اور جو ایمان کی علامت تھا ایک کافر کی محبت میں بتلا ہو کر کفر کا مرتکب ہو گیا۔

صبر و ہوش و خرد و تاب کا شکوہ کیا ہے
تم ہی جب چھوڑ گئے مجھ کو مری جان ہو کر

محبت میں ہمیں اپنے ہوش وحواس اور تاب وتواں کے رخصت ہونے کا غم نہیں۔ غم تو اس کا ہے کہ محبوب جس کو ہم جان سے عزیز جانتے تھے اور جس کی خاطر ان تمام چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے وہ بھی ہمیں چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔

کچھ بھی تاثیر ہے اُلفت میں تو انشاء اللہ
منہ سے ظالم ترے نکلے گی "نہیں" "ہاں" ہو کر

فانی کو اپنے جذبۂ محبت پر اس قدر بھروسہ ہے کہ انھیں یقین ہے کہ ایک دن محبوب کا انکار اقرار میں تبدیل ہو کر رہے گا۔

(۱۱۹)

ہجر میں مسکرائے جا دل میں اُسے تلاش کر
نازِ ستم اُٹھائے جا رازِ ستم نہ فاش کر

جب محبوب دل میں بسا ہو تو اس کی دوری بھی دوری نہیں رہتی بلکہ عاشق ہجر میں بھی وصل کے لطف لیتا ہے۔ شاعر اپنے سے کہتا ہے کہ محبوب کی دوری میں بھی مسکراتے رہو اور اپنے دل کے آئینہ میں اس کے جلووں کو دیکھو۔ اس کے دیے ہوئے ظلم وستم کو سینہ سے لگا کر رکھو اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے راز کو غیروں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھو۔ یعنی محبوب کے ظلم وستم کے پس پردہ محبت کا جذبہ ہے

شیوۂ عاشقی ہے یہ، حاصلِ زندگی ہے یہ
آہِ جگر گداز کھینچ، نالۂ دل خراش کر

فانی کے نزدیک انسان کی زندگی کا مقصد کسی کی محبت میں آہیں بھرنا اور نالے کرنا ہے۔ اور یہی عاشقوں کا طریقہ ہے۔

درد دیا، کرم کیا۔ اب اسے لا دوا بنا
شیشۂ دل عطا کیا، اب اسے پاش پاش کر

فانی کے نزدیک ٹوٹا ہوا اور دردمند دل خدا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ وہ شکر ادا کرتا ہے کہ تو نے ہمیں ایسا دل دیا جو غم آشنا ہے۔ اتنا کرم اور کر کہ اس غم کو ابدیت عطا کر دے اور ہمارے درد کو دردِ بے دوا بنا دے۔

سہل نہیں ہے مسئلہ قربِ حریمِ ناز کا
دل کو غم آشنا بنا، خوگرِ دور باش کر

دور باش = دور رہو

جس طرح قطرہ کی، تی اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ سمندر سے جدا رہتا ہے۔ اسی طرح عاشق بھی محبوب کے قرب کی تاب نہیں لا سکتا۔ اسی لیے فانی کا کہنا ہے کہ محبوب کی جلوہ گاہ کے قریب جانا آسان نہیں۔ بہتر ہے کہ خود کو اس کی جدائی کا عادی بناؤ اور اس کے غم کو اپنا ساتھی سمجھو۔ فلسفی شعراء کے نزدیک حصولِ آرزو، آرزو کے خاتمہ کا سبب بنتا ہے۔ بقولِ اقبال : وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

فانی اب انتہا ہوئی نزع میں ضبطِ عشق کیوں
اب تو کسی کا نام لے، اب تو یہ راز فاش کر

فانی! زندگی بھر تو تو نے محبوب کا نام زبان پر نہ آنے دیا اور غم کو چھپاتا رہا۔ اب تو آخر وقت ہے۔ آخر کب تک تو ضبط کرے گا اور اس راز کو سینہ میں لیے ہی دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

ردیف (ز)

(۱۲۰)

کون اُٹھائے میری وفا کے ناز
دل ستم دوست وہ رقیب نواز

ستم دوست = ستم کو عزیز رکھنے والا

میری وفا کی داد یا تو محبوب دے سکتا تھا یا میرا دل۔ کیونکہ وفا کا تعلق انھی دو سے ہے لیکن دونوں کو مجھ سے ہمدردی نہیں ہے۔ دل محبوب کی جفاؤں کو پسند کرنے لگا ہے اور محبوب کو رقیب کی خاطر عزیز ہے۔

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز
میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز

میرے لیے زندگی کے ساز سے ہمیشہ دکھ بھرے نغمے ہی نکلتے رہے گویا میری ہستی ہی ایک نغمۂ درد تھی۔ اب میرے بعد اس ساز کو نئے انداز سے چھیڑا جانا چاہیے یعنی زندگی کے غم میرے لیے تھے لہٰذا میرے بعد لوگوں کو خوشیاں ملنا چاہئیں۔

کُھل گیا میری زندگی کا راز
اے شب ہجر تیری عمر دراز

اے شب ہجر خدا تیرا بھلا کرے کہ تیری وجہ سے میری زندگی کا عقدہ حل ہو گیا یعنی میری زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ شب ہجر کے صدمے برداشت کروں۔ مراد یہ ہے کہ میری زندگی کا مقصد غم ہے جو شب ہجر کی بدولت مجھے حاصل ہوا ہے۔

دیکھیے کیا ہو عشق کا انجام
دل کی ہستی ہے موت کا آغاز

عشق دل کی ہستی کا ضامن ہے لیکن یہ ہستی انسان کو فنا ہو کر ملتی ہے گویا دل کی زندگی موت کی تمہید ہے۔ عشق جس کی ابتدا یہ ہے اس کی انتہا خدا جانے کیا ہو گی۔ فانی کے فلسفہ کے مطابق موت انسان کے غموں (غم عشق) کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کی راہ کا ایک ابتدائی مقام ہے اس کے آگے بھی بہت سے امتحانات سے اسے گزرنا ہوتا ہے۔

رہ گئی تھی جو بازوؤں میں سکت   ہو گئی صرفِ ہمتِ پرواز

ہماری بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اوّل تو بازوؤں میں طاقت نہیں رہی تھی اور تھوڑی بہت جو طاقت تھی وہ اُڑنے کی کوشش میں صرف ہو گئی۔ پرواز کی نوبت ہی نہیں آئی۔

آج روزِ وصالِ فانؔی ہے   موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

وصال = ملاقات۔ موت۔

فانؔی کو موت محبوب کی طرح عزیز ہے اس لیے موت کی آمد کو "وصال" کہا ہے اور وصال کی رعایت سے راز و نیاز لائے ہیں۔

(۱۲۱)

دور لے جا ہٹا کے سرحدِ ناز   دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز

میرا دل نیاز کی حدود سے بہت آگے جا چکا ہے۔ یعنی اب ہم عشق میں بے خودی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں محبوب کے ساتھ نیاز کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ اب ہم تیرے ناز سے بھی بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے تجھے بھی چاہیے کہ ناز کی حدوں کو ختم کر دے۔

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم   میری ہستی ہے غیب کی آواز

جس طرح غیب کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں ہوتا اسی طرح میری حقیقت سے بھی کوئی (یہاں تک کہ خود میں بھی) واقف نہیں۔ میرا وجود غیب کی آواز کی طرح ہے۔

صور و منصور و طور ارے توبہ   ایک ہے تیری بات کا انداز

صور = وہ آواز جو قیامت کے روز سنائی جائے گی اور جس کو سن کر تمام انسان اور جاندار مر جائیں گے۔ منصور = منصور حلاج جو عشقِ الٰہی میں دیوانہ ہو کر "انا الحق" کہنے لگے تھے اور آخر میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ طور = وہ پہاڑ جہاں موسیٰ نے خدا کا جلوہ

دیکھا تھا اور بے ہوش ہو گئے تھے۔

حسن عاشق کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا محبوب بھی جب اور جہاں عاشق پر توجہ کرتا ہے، انھیں ایک سا ہی تجربہ ہوتا ہے چاہے وہ موسیٰ ہوں یا منصور۔ یہ بھی مفہوم ہے کہ صور، منصور اور طور ذات الٰہی سے کوئی الگ شے نہیں ہیں۔

ہوں اسیرِ فریبِ آزادی   پر ہیں اور مشق حیلۂ پرواز

شاعر جبر کا قائل ہے اور اختیار کو فریب محض خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی مثال ایک ایسے پرند کی سی ہے جس کو بازو تو بخشے گئے مگر طاقتِ پرواز نہ ملی۔ وہ ان سے پرواز تو کیا کرتا صرف پرواز کا بہانہ کرتا ہے یا اس کی نقل اُتارتا ہے۔

آج اچھے نہیں الٰہی خیر   درد کے تیور، آہ کے انداز

آج ہمارے درد کی شدت اور آہوں کا انداز کچھ بدلا ہوا ہے اور آثار اچھے نہیں ہیں۔ خدا خیر کرے۔

کیوں فلک انتہا ہوئی کہ نہیں   ایک دم رہ گیا ہے اب دمساز

شاعر آسمان سے شکوہ گزار ہے کہ تو نے ہمارے تمام ساتھی و ہمدرد ہم سے جدا کر دیے صرف ایک دم (سانس) ہے جو ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ اب بھی تجھے چین آیا کہ نہیں اور تیرے ظلم و ستم کی انتہا ہوئی کہ ابھی کچھ اور باقی ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ہے کوئی شے تو یار و جلوۂ یار   یہ حقیقت ہے اور یہ اصل مجاز

محبوب (حقیقی) تو اس کائنات کی اصل ہے اور اس کا حقیقت ہونا مسلّم۔ مگر فانیؔ کے نزدیک یہ مظاہر کائنات (مجاز) جو اس کی تجلّی سے وجود میں آئے ہیں وہ بھی حقیقت ہی ہیں۔ مراد یہ کہ یار کا وجود تجلّی کی اصل ہے اور اس کی تجلّی کائنات کی اصل ہے اس لیے اس کو بھی عدم محض قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرقِ مجاز دحقیقت کیا
یہ عرضِ حقیقت ہے وہ حقیقت ہستیٔ باطل کوئی نہیں

ہاں یہاں کوئی شے نہیں باطل   عشق ہے راز، عقل پردۂ راز

اس شعر کا مضمون بھی اوپر کے شعر سے ملتا ہوا ہے۔ عشق کو جو اصل کائنات ہے راز کہا ہے اور عقل کو جو عشق کے چہرہ کا حجاب بن گئی ہے پردۂ راز قرار دیا ہے۔ پردہ لاکھ بے حقیقت سہی مگر یہ حقیقت کو چھپائے ہے اس لیے اس کو بھی باطل نہیں کہہ سکتے۔ ربّنا ما خلقت ھٰذا باطلا

اپنی صبر آزما نظر کو سنبھال   ہم ہیں مجبورِ آہِ صبر گداز

آہِ صبر گداز = آہ جو صبر کو فنا کردے

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ اپنی صبر آزمانے والی نگاہوں سے ہماری طرف نہ دیکھو۔ اس صورت میں ہم صبر سے کنارہ کش ہو کر آہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ پھر ہمیں الزام نہ دینا۔

جانِ فانی ترے کرم پہ نثار   تو نے بخشی حیاتِ مرگ نواز

حیاتِ مرگ نواز = ایسی زندگی جو موت کو نوازنے والی یا اس کی پذیرائی کرنے والی ہو۔

شاعر خدا کے کرم بے حد کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے مجھے ایسی زندگی عطا کی ہے جو موت کی محتاج یا احسان مند نہیں بلکہ خود موت کو نوازنے والی ہے۔ یعنی اس کی زندگی غم و آلام سے اس قدر بھری ہوئی ہے کہ خود موت سے مماثل ہے۔ یہ شعر بھی فانی کی الم پسند طبیعت کا عکاس ہے۔ تخلص کے استعمال سے شعر میں دوہری معنویت آگئی ہے۔ جانِ فانی میں فانی کی جان اور فنا ہونے والی زندگی دونوں پہلو موجود ہیں۔

(۱۲۲)

اللہ اللہ یہ شانِ کشتۂ ناز   ہے مری خاک سجدہ گاہِ نماز

تیرے ناز کے مارے ہوؤں کا یہ مرتبہ ہے کہ جس جگہ وہ دفن ہیں وہ زمین خلائق کی عبادت گاہ بنی ہوئی ہے۔ عشق کی برکت سے عاشق کی عظمت اس شعر میں بھی نمایاں ہے۔

وہاں سجدہ سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اُٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

ہاں شبِ ہجر آج صبح نہ ہو
ہاں چلی جائے یادِ زلفِ دراز

ہجر کی رات میں عاشق محبوب کی زلفوں کی یاد میں گم ہے اور اس میں اس قدر لطف محسوس کر رہا ہے کہ ہجر کی تکلیف کا احساس بھی باقی نہیں رہا۔ وہ چاہتا ہے کہ شبِ ہجر کی سحر نہ ہو تاکہ محبوب کی زلفِ دراز کی یاد کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ شبِ ہجر زلفِ دراز سے مشابہ ہے اس لیے وہ بھی عاشق کو عزیز ہے اور ہجر کی رات میں زلفِ یار کا یاد آنا فطری ہے۔

دھیان تیرا بہشتِ شوق سہی
دلِ عاشق ہے ایک دوزخِ راز

مانا کہ دوست کا تصور اہلِ شوق کے لیے فردوس بداماں ہے لیکن عاشق کا دل رازِ عشق کو چھپانے کی کوشش میں دوزخ کا نمونہ بن گیا ہے اس لیے کہ آتشِ محبت کی گرمی نے سینے میں دوزخ کا سا سماں پیدا کر دیا ہے۔

چشمِ حاسد مجھے نہ دیکھ سکی
ہوں دلیلِ بلندیِ پرواز

حاسدوں کی حسد بھری نگاہیں مجھ تک نہ پہنچ سکیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ میری بلند پروازی نے وہ مقام حاصل کرلیا ہے جہاں تک اُن کی نظروں کو رسائی حاصل نہیں۔

آج پہلو میں کیوں ہے سناٹا
کیا ہوئی "آہ آہ" کی آواز

نہ معلوم دل پر کیا گذری اور اس کا کیا حشر ہوا کہ آج ہمارے سینے میں سناٹا ہے اور کراہنے کی جو آواز آیا کرتی تھی اب بند ہو گئی ہے۔ مراد یہ کہ غم دل کی ہستی کا ضامن ہے۔ غم جس روز نہ رہا دل بھی نہ رہے گا۔

راس آئے ہیں اشک و آہ کسے
کر نہ آب و ہوائے غم سے ساز

شاعر نے اشک کو آب اور آہ کو ہوا کہا ہے۔ اور یہ آب و ہوائے غم آج تک کسی کو راس نہیں آئی ہے اس لیے اس سے زیادہ دوستی نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے   تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

اس شعر میں "ہمہ اوست" کا نظریہ پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق مجاز اور حقیقت صرف مختلف نام ہیں ورنہ اصل یہ ہے کہ جس کو مجاز سمجھا جاتا ہے حقیقت سے الگ اس کا وجود ہی نہیں ہے. محبوب خود ہی حقیقت ہے خود ہی مجاز- گویا وہ خود ہی اپنے جمال کا پردہ بھی ہے-

ہم ہیں اور عزمِ آشیاں یعنی   رہ گئی دور طاقتِ پرواز

جب تک ہم میں اُڑنے کی طاقت رہی ہم نے آشیانہ کی پابندیوں سے خود کو آزاد رکھا. اب آشیانہ بنانے یا چھوڑے ہوئے آشیانہ کی طرف بازگشت کا ارادہ اس بات کا ثبوت ہے کہ طاقتِ پرواز رخصت ہو چکی ہے-

ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہیے   راز ہے بے نیاز محرمِ راز

فانی کی زندگی ایک ایسا راز ہے جس کا شناسا اور محرم کوئی نہیں- اس لیے یہ کہنا بھی ممکن نہیں فانی کا وجود ہے بھی یا نہیں-

ردیف (ش)

(۱۲۳)

دل چرا کے نگاہ ہے خاموش   ہوش اور مست ہو کے اتنا ہوش

محبوب کی آنکھ کو شاعر مدہوش یا مست باندھتے ہیں لیکن یہ آنکھیں مستی میں بھی ہوشیار ہیں کہ عاشق کا دل چرا کر اس طرح خاموش ہیں کہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہی عاشق کے دل کی چور ہیں-

مست کو چاہیے بلا کا ہوش   خم دیئے اور دیا نہ اذنِ خروش

خُم = مٹکا۔ شراب کا بڑا برتن   اذنِ خروش = ہنگامہ کرنے کی اجازت

ہم وہ رند ہیں جسے بے اندازہ شراب پلا کر بہکنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں بہت زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہے۔

ہر مسافر سے پوچھ لیتا ہوں   خانہ برباد ہوں کہ خانہ بدوش

ہم بیخودی کی اس منزل پر ہیں کہ جہاں اپنے متعلق بھی دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے اور آوارگی کے عالم میں ہمیں یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمارا گھر اور ساز و سامان لُٹ چکا ہے یا ہم اسے اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔

ہوسِ جلوہ اور نظر غافل   کہ نظر ہے صلائے جلوہ فروش

صلاء = بلاوا یا اجازت   جلوہ فروش = جلوہ دکھانے والا (محبوب)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نظر دی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنے جلیے دیکھنے کی اجازت عام دے رکھی ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ خواہشِ دید رکھتے ہوئے بھی اس کے دیدار سے محروم ہیں۔ اس کی وجہ ہماری اپنی نظر کی غفلت اور کوتاہی ہے۔ اگر نظر واقعی نظر ہوتی تو وہ خود ہی محبوب کی جلوہ فروشی کا اعلان کر دیتی۔

شاید اب منزلِ عدم ہے قریب   یادِ خاکِ وطن ہے طوفاں جوش

کہا جاتا ہے کہ جس زمین کی مٹی سے انسان کا خمیر تیار ہوتا ہے مرتے وقت وہ کھنچ کر اسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج خاکِ وطن کی یاد ہمارے دل میں طوفان برپا کر رہی ہے۔ شاید ہماری موت کا وقت قریب آن پہنچا ہے اسی لیے ہماری خاک خاکِ وطن سے مل جانے کے لیے بے چین ہو رہی ہے۔

فضل تیرا شفیعِ طاعت و زہد   عدل عاصی نواز و عصیاں پوش

شفیع = شفاعت کرنے والا، بخشنے والا   عدل = انصاف   عصیاں = گناہ   عاصی = گنہگار

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اطاعت و پرہیزگاری کا انعام اس کی شانِ عدل کا تقاضا ہے

اور گناہوں کی مغفرت اس کے فضل کی مرہونِ منّت ہے۔ انیسؔ کہتے ہیں :

جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
یہ رحم ترا ہے وہ عدالت تیری

فانیؔ نے اس کے برعکس فضل کو شفیعِ طاعت و زہد اور عدل کو عاصی نواز کہہ کر ایک قولِ محال (PARADOX) کا انداز اختیار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم کسی استحقاق کی بنا پر مغفرت کی توقع نہیں کر سکتے۔ صرف اس کا فضل و کرم ہی مغفرت کا ضامن ہے۔ اس طرح گو ہمارے گناہ نجات کی راہ میں حائل ہیں مگر اس کی شانِ عدل پر ایمان اور اپنی خطاؤں پر ندامت کے سبب گناہ گار بھی اس کے کرم سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں اور ان کے جرموں کی پردہ پوشی ہو سکتی ہے۔

ہجر نے کی مفارقت فانیؔ
لے مبارک ہو موت کا آغوش

فانیؔ مبارک ہو کہ موت کے سبب تجھے ہجر کی تکلیفوں سے نجات مل گئی اور تجھے موت کا وصال میسّر آ گیا۔

(۱۲۴)

میں ہوں اک مرکزِ ہنگامۂ ہوش و رمِ ہوش
دل اگر عالمِ مستی ہے تو سر عالمِ ہوش

رمِ ہوش = ہوش رخصت ہونا

میرے اندر ہوش اور جنوں (رمِ ہوش) دونوں کی آویزش سے ایک ہنگامہ برپا ہے۔ دل اگر مستی و جذب کا گہوارہ ہے تو دماغ عقل و ہوش کے تسلّط میں ہے اور میری ہستی ان دونوں متضاد کیفیتوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

عدمِ ہوش پہ ہے فطرتِ ہستی مائل
کس توقع پہ اُٹھائے کوئی نازِ غمِ ہوش

زندگی کی فطرت مائل بہ جنون ہے یعنی ہوش کی نفی کرتی ہے۔ اور جب زندگی کا مزاج ہی ہوش کے لیے سازگار نہیں تو کوئی کس امید پہ ہوش کی جستجو کرے اور اس کے غم کے ناز اٹھائے۔

بے خودی مایۂ عرفانِ خودی ہے یعنی
محرمِ جلوۂ اسرار ہے نامحرمِ ہوش

جو لوگ اسرارِ حقیقت سے آگاہ ہو جاتے ہیں وہ پھر ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور حقیقت سے آگاہی یا اس کا عرفان خود اپنی ذات کا عرفان ہے تو گویا اپنی ہستی فراموش کر دینا یا اس کے احساس کو فنا کر دینا ہی اپنی حقیقت اور اسرارِ زندگی سے واقفیت کا ذریعہ ہے۔

یہ عرفانِ خودی دیتی ہے احساسِ خودی لیکر   محبت زندگی دیتی ہے لیکن زندگی لے کر

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالمِ مستی، وہ ترا عالمِ ہوش

اس شعر میں وحدت الوجود کے عقیدہ کی تائید میں شاعر کہتا ہے کہ وجودِ حقیقی صرف ایک ہی ہے یعنی ذاتِ الٰہی جس کی مختلف "شیون" عالمِ وحدت و کثرت اور حقیقت و مجاز میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اس کی بے خودی یا مستی کا عالم عالمِ وحدت ہے اور اس کے ہوش کا عالم عالمِ کثرت یا عالمِ مجاز کا خلاق ہے۔ اس شعر میں ہیگل کے فلسفہ کی بازگشت ہے جس کا کہنا ہے اولین وجود ایک ذاتِ واحد یا ABSOLUTE حقیقت تھی جس میں نہ شعورِ ذات تھا نہ غیرِ ذات کا وجود۔ رفتہ رفتہ اس حقیقت میں شعورِ ذات (EGO) پیدا ہوا جس سے کائنات (غیرِ ذات) وجود میں آئی۔ عالمِ مستی سے مراد عالمِ ذات ہے اور عالمِ ہوش سے شعورِ ذات۔

مظہرِ ہستی و خلاقِ عدم ہے مری ذات
کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہمِ ہوش

کائنات میں جب تک میرا وجود نہیں تھا اس وقت تک سارا عالم شعور یا ہوش کا ایک غیر مرتب سلسلہ تھا جس میں کوئی ربط یا تسلسل نہ تھا۔ نہ زندگی کا وجود تھا نہ موت کی اہمیت۔ جب میں کائنات میں آیا تو زندگی نے کروٹ لی اور زندگی کی وساطت سے موت وجود میں آئی۔ گویا میری ذات ہستی و عدم کی خلاق ٹھہری کیوں کہ اسی کی بدولت کائنات کے برہم سلسلہ میں ربط پیدا ہوا۔

عجب اک سانحۂ ہوش رُبا تھی وہ نگاہ
میں ہوں اک عمر سے فانی ہمہ تن ماتمِ ہوش

سانحۂ ہوش رُبا = ہوش اُڑانے والا حادثہ

محبوب کی نگاہوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ اس کی ایک نگاہ نے میری متاعِ ہوش کو لوٹ لیا اور میں آج تک اس کا ماتم کر رہا ہوں۔

(۱۲۵)

برہم ہے میری ذات سے سارا نظامِ عیش
ٹوٹا ہے میرے عہد میں نیرنگِ نامِ عیش

فانی کے معنی فنا ہو جانے والے ہیں اس لیے ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ میرے وجود میں آنے کے بعد عیش وعشرت کا سارا نظام درہم وبرہم ہو گیا ہے گویا میری غموں سے بھرپور زندگی نے عیش وعشرت کے فریب کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ عیش کو فریب یا جادو اس لیے کہا ہے کہ اس کو ثبات وقرار نہیں۔

اب احتیاجِ شکوۂ اختر نہیں مجھے
مینائے خونِ عیش سے بھرتا ہوں جامِ عیش

شاعر عرفانِ غم کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے کہ اپنی محرومی اور بدنصیبی کا شکوہ آسمان یا ستاروں کی گردش سے کرنے کی بجائے وہ غم ہی میں راحت محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ شرابِ غم (خونِ عیش کی شراب) کی صراحی سے اپنا جام بھرتا ہے اور اسی میں اسے عیش کی شراب کا سرور حاصل ہو جاتا ہے۔

گلشن صلائے عام اسیری ہے سربسر
پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دامِ عیش

ظاہر بیں نگاہوں کے لیے گلشن عیش ونشاط کی جگہ ہے مگر جو لوگ دنیا کی حقیقت کو

جانتے ہیں ان کے نزدیک گلشن اور اس کی رعنائیاں انسان کو گرفتار کرنے کی دعوت ہیں۔ وہ ایک زنداں ہے جہاں پھولوں کی رنگینیوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ بہار کی رنگینیاں انسان کے دل کو اپنے جال میں گرفتار کر لیتی ہیں اور وہ ظاہری عیش کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

ردیف (غ)

(۱۲۶)

اب منزلِ فغاں ہے نہ پہلو مکانِ داغ
دل رہ گیا ہے نام کو باقی نشانِ داغ

نہ اب ہمارے ہونٹوں پر پہلے کی طرح نالے و آہیں ہیں نہ سینہ پر زخموں کے داغ۔ اب صرف دل باقی ہے جو ہمارے داغِ حسرت کی آخری نشانی ہے۔

اے عشق خاکِ دل پہ ذرا مشقِ فتنہ کر
پیدا کر اس زمیں سے کوئی آسمانِ داغ

شاعر کی آرزو ہے کہ عشق اس کے دل کو اپنی جولاں گاہ بنالے اور داغ عشق اس کے دل کی خاک کو منور کر کے آسمان کی رفعت بخش دے۔ گویا دل جو ایک مشتِ خاک ہے داغِ عشق کی بدولت آسمان کی بلندی اور وسعت کا حامل بن جائے گا۔

دل کچھ نہ تھا تمھاری نظر نے بنا دیا
دنیائے درد، عالمِ حسرت، جہانِ داغ

یہ شعر بھی مضمونِ بالا ہی سے متعلق ہے۔ شاعر کہتا ہے میرے دل کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر جب سے محبوب کی نظرِ عنایت اس پر ہوئی ہے دل میں درد، حسرت اور داغوں کی ایک دنیا آباد ہو گئی۔

پہلے اجل کو رخصتِ تلقینِ صبر دے
پھر آخری نگاہ سے سن داستانِ داغ

بیمارِ غم کے پاس محبوب اُس وقت آیا ہے جب موت کا تقاضا بھی آچکا ہے اور اس کی قوتِ گویائی ختم ہو چکی ہے اور ایک نگاہ کی فرصت بھی باقی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم میری داستانِ غم سننا چاہتے ہو تو ذرا موت کو تھوڑی دیر صبر کرنے کو کہو تاکہ ہم آخری نگاہ سے تمھیں اپنے دل کے داغوں کی کہانی سُنا سکیں۔ بے بسی و حسرت کی پوری تصویر اس شعر میں موجود ہے۔

وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چُپ کی داد
یہ حشر ہے یہاں تو کھُلے گی زبانِ داغ

شاعر اس توقع پر دن گزار رہا ہے کہ اگر محبوب کی محفل میں کسی نے اس کے حالِ زار پر [illegible] کھایا اور اسے فریاد کی اجازت نہ ملی تو کیا قیامت میں اسے اپنا حالِ زار دکھانے اور [illegible] کی داد پانے کا موقع ملے گا۔

ہم سادہ دل ہیں خوش کہ ہوئی نذرِ دل قبول
اس بدگماں کو مدِّ نظر امتحانِ داغ

محبوب نے ہم سے دل طلب کیا تو ہم یہ سوچ کر خوش ہوئے کہ شاید اس نے ہمارا نذرانۂ دل قبول کر لیا۔ یہ خبر نہ تھی کہ وہ صرف یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ واقعی ہمارے دل پر اس کی محبت کا داغ ہے بھی یا نہیں۔

سارا ملال پیار کی نظروں سے مٹ گیا
ان رہزنوں نے لوٹ لیا کاروانِ داغ

ہمارے دل پر محبوب کی بے رُخی نے داغ ڈال دیئے تھے اور ہم ان داغوں ہی کو اپنی متاعِ جاں سمجھے ہوئے تھے لیکن اس کی محبت بھری نظروں نے ہمارا سارا غم مٹا دیا اور اس طرح غم کی دولت کو لوٹ لیا۔

فاَنی زمینِ گورِ غریباں ہے لالہ زار
پھر فصلِ گل میں خاک ہوئی ترجمانِ داغ

بہار آئی ہے اور اس کے ساتھ گورِ غریباں کی زمین بھی پھولوں سے بھر گئی ہے لیکن دراصل یہ بہار کے پھول نہیں بلکہ خاکِ مرقد اُن داغوں کی نمائش کر رہی ہے جو کہ عشاق اپنے دلوں پر لیے دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ پھولوں کو داغوں سے تشبیہ دینا شاعری میں عام ہے۔

ردیف (ک)

(۱۲۷)

منزلِ عشق ہے نمودِ وجود
ہم بھی ہیں تیری بدگمانی تک

بدگمانی یہاں سوءِ ظن کے معنوں میں نہیں بلکہ غلط گمانی کے معنوں میں آیا ہے۔ صوفیہ کے ایک گروہ اور ہندو ویدانت کے فلسفیوں کا کہنا ہے کہ اس عالم کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ یہ صرف ہستیٔ مطلق کے خیالات ہیں جنھوں نے مجاز کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ فاَنی کہتے ہیں کہ اگرچہ ہماری ہستی صرف تیری بدگمانی پر منحصر ہے (اس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں) مگر یہ ہستیٔ موہوم ہی عشق کی منزل بھی ہے۔

موت ہے ایک وقفۂ موہوم
زندگانی سے زندگانی تک

شاعر کے نزدیک انسان کی دو زندگیاں ہیں۔ ایک تو یہ عارضی زندگی اور دوسرے وہ زندگی جو مرنے کے بعد ملے گی۔ اور موت کی حیثیت ایک موہوم وقفہ کی ہے جو ان دونوں زندگیوں کے درمیان ہے۔ اس سے زندگی کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں۔ بقولِ میر:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مہربانی کی آس رہنے دے
کون جیتا ہے مہربانی تک

محبوب سے مہربانی کی امید کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر بالفرض وہ مہربان ہوا بھی تو اس وقت تک عاشق اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوگا۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا   بات پہنچی تری جوانی تک

محبوب کی جوانی اور قیامت میں بہت مشابہت ہے چنانچہ جب بھی قیامت کا ذکر چھڑتا ہے تو اس کی انتہا یا خاتمہ محبوب کی جوانی کے ذکر پر ہوتا ہے۔ گویا محبوب کی جوانی کے سامنے قیامت بھی ہیچ ہے۔ بڑے سادہ انداز میں بڑی پُرمعنی بات پیش کی ہے۔

نیند تھی چشمِ ناز میں فانیؔ   ایک بے خواب کی کہانی تک

عاشق نے اپنی بیقراری و بیخوابی کی داستان محبوب کو سنانا چاہی تو اس پر نیند طاری ہونے لگی مجبوراً اسے اس داستانِ غم کو ناتمام چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد محبوب کی آنکھوں سے نیند بھی رخصت ہو گئی۔ گویا اس کی نیند ایک بہانہ تھی۔ محبوب کے تغافل اور عاشق کی عاجزی کی مکمل تصویر ہے۔

(۱۲۸)

گزر گیا انتظار حد سے، یہ وعدۂ ناتمام کب تک
نہ مرنے دے گی مجھے ستمگر، تری تمنائے خام کب تک

تمنائے خام = وہ محبت جو ابھی تکمیل کی منزل تک نہیں پہنچی۔

محبوب نے وعدہ کر کے اسے پورا نہیں کیا ہے۔ عاشق اس کے ایفائے عہد کے انتظار میں جی رہا ہے اب انتظار کی طاقت باقی نہیں لیکن اپنی محبت کے خام ہونے کے سبب وہ مرتا بھی نہیں۔ وہ محبوب سے مخاطب ہے کہ کب تک تو مجھے اپنے انتظار میں تڑپائے گا اور میں تیری محبت میں مر مر کے جیتا رہوں گا۔ شعر کے الفاظ خیال کا پوری طرح ساتھ نہیں دے رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غزل ابتدائے مشق کے زمانہ کی ہے۔

اجل مرا اتنا کام کر دے کہ کام میرا تمام کر دے
رہے کوئی زندگی کے ہاتھوں جہاں میں رسوائے عام کب تک

زندگی کے آلام و مصائب سے تنگ آ کر شاعر موت سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ اسے زندگی کی رسوائیوں سے نجات دلا دے۔ انداز میں تکلف ہے اور کوئی خاص حسن نہیں۔

وہ آئے یا وعدہ پر نہ آئے، بلا سے قسمت جو کچھ دکھائے
مگر ہمیں دیکھنا تو یہ ہے کہ آج ہوتی ہے شام کب تک

محبوب نے شام ہونے پر آنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا یا اس کی وعدہ خلافی عاشق کو ختم کر دے گی۔ یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ عاشق کے سامنے پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ کسی طرح دن ختم ہو اور شام آ چکے۔ انتظار کے لمحات کتنے طویل ہوتے ہیں اس کی طرف دلچسپ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ بحث و تکرار چھوڑ دے آ، یہ زہد کا عہد توڑ دے آ
رہے گی اے مدعیٔ حرمت شرابِ دنیا حرام کب تک

مدعی حرمت = شراب کو حرام کہنے والے

زاہد جو شراب کو حرام سمجھتا ہے اور اس کی برائیاں کرتا رہتا ہے۔ شاعر اسے شراب نوشی کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اب تو بھی اپنا عہد توڑ کر رندوں میں شامل ہو جا۔

(۱۲۹)

اے دل یہ تیری حوصلہ مندی کب تک
اس بزم میں یہ خدمت سپندی کب تک

سپند = ایک طرح کا سیاہ دانہ، جسے نظر اتارنے کے لیے آگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ آگ میں ڈالنے پر اس میں سے ہلکی سی "چٹ" کی آواز نکلتی ہے۔

عاشق اپنے دل کی بے حوصلگی اور کم ہمتی پر طنزیہ انداز میں اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو کب تک اس کم ہمتی کا مظاہرہ کرے گا کہ تیری آواز سپند کی طرح محبوب کے کانوں تک نہ پہنچ پائے گی اور تو جل کر خاک ہو جائے گا۔ مراد یہ کہ ہمت سے کام لے اور اپنی فریاد سے اس کی "محفل تہ و بالا" کر دے۔

منزل سے غرض، راہ بلا سے کچھ ہو
اندازۂ پستی و بلندی کب تک

عشق کی راہ پر چلنے والوں کو راستہ کے پیچ وخم اور مشکلات کی پروا نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں تو اپنی منزلِ مقصود کی لگن میں اس درجہ منہمک ہونا چاہیے کہ ان چیزوں کا خیال بھی نہ آنے پائے۔

لاکام میں جذبۂ خودی کو بھی کبھی   یہ شیوۂ عجز و مستمندی کب تک

مستمندی = حاجت مندی۔ غمگینی

فانی عاجزی اور التجا کے طریقہ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طریقہ کو چھوڑ کر خودداری اور استغنار کا اصول اپناؤ تو تمھاری ضرورتیں خود پوری ہو جائیں گی۔ اس غزل کا خیال اور بہت سے الفاظ میں ہمیں اقبال کی نظموں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

کب تک مری سمت بے نیازانہ نگاہ   اے حسن یہ وضعِ خود پسندی کب تک

فانی کی خودداری یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ محبوب اسے نظرانداز کر کے اپنی اداؤں میں محو رہے۔ وہ اس سے شکایت کرتے ہیں کہ کب تک تو یہ انداز اختیار کیے رہے گا۔

آخر یہ جناب عشق کی خدمت میں   فانی شرفِ نیازمندی کب تک

فانی محبوب ہی کی خدمت میں نیازمندی کو پسند نہیں کرتے بلکہ عشق کی بارگاہ میں بھی اپنی خودداری قائم رکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کب تک تو عشق کی چوکھٹ پر سر جھکائے گا۔

ردیف (گ)

(۱۳۰)

سیکھے دل کے چھیننے کے ڈھنگ   نہ گئی دل کے ساتھ دل کی امنگ

محبوب نے ہمارا دل تو چھین لیا مگر اس کے ساتھ دل کی امنگوں اور آرزوؤں کو نہ لے سکا اور وہ اپنی جگہ پر برقرار ہیں۔ ابھی وہ دل لینے کے طریقہ سے ناواقف ہے اور اسے مزید مشاقی کی ضرورت ہے۔

دل ہے اور سحر سازئ ادراک   آنکھ ہے اور فریب گردش رنگ

دل اپنے ادراک و شعور کے بنائے ہوئے سحر میں گرفتار ہے اور آنکھیں دنیا کے بدلتے ہوئے رنگوں کے فریب میں مبتلا۔ مراد یہ ہے کہ دنیا میں انسان جن چیزوں کو اپنے شعور کی مدد سے سمجھتا اور جو بدلتے ہوئے رنگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے وہ درحقیقت اس کے اپنے ذہن کے قائم کیے ہوئے فریب اور سحر ہیں اور کچھ نہیں۔

تیغِ قاتل تری دہائی ہے   میری موت اور یہ دستبرد درنگ

درنگ = تاخیر

دست برد = زبردستی

شاعر محبوب کی تیغ کی دہائی دیتا ہے اور فریاد کرتا ہے کہ اس کی موت میں یہ تاخیر کیوں ہے۔ اگر موت کو آنے میں تامل ہے تو تیغِ قاتل اس کا یہ کام انجام دے سکتی ہے۔

دین و دنیائے دیدہ و دل ہیں   بزمِ صدرنگ و جلوۂ بے رنگ

بزمِ صدرنگ = دنیا کے رنگارنگ مناظر۔   جلوۂ بے رنگ = جلوۂ الٰہی جو کسی رنگ کا پابند نہیں۔

شاعر کے عقیدہ میں اس دنیا کے جلوے بھی اہل نظر کے لیے دین دنیا سب کچھ ہیں اور وہ اس دنیا کی کثرت میں بھی محبوب کے جلوۂ بے رنگ کو مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

شمع ہوں بے نیازِ ظلمت و نور   آئینہ ہوں بغیرِ صیقل و زنگ

میں ایسی شمع ہوں جس کے لیے اندھیرے اُجالے کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا اور ایسا آئینہ ہوں جو صیقل (قلعی) اور زنگ دونوں سے بے نیاز ہے۔ یعنی دنیا کے غم اور خوشی دونوں کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں۔

میں ہوں عالم کو بے دلی کا پیام   خیر و شر مدعا، نہ صلح نہ جنگ

شاعر دنیا سے بے تعلقی اور بے زاری کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے۔ اس کی نظر میں خیر و شر صلح اور جنگ سب بے معنی چیزیں ہیں اور وہ دوسروں کو بھی اسی بے دلی و لاتعلقی کی تلقین کرتا ہے۔

ع : حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

رازِ نیرنگیٔ حقیقت ہوں   میں ہوں فانیٔ حقیقت نیرنگ

نیرنگیٔ حقیقت = وجودِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی ناقابلِ فہمی   نیرنگ = شعبدہ بازی مراد دنیا

دنیا ایک سراب یا سحر ہے اور اس کی دلکشی و رنگینی محض نظر کا فریب ہے لیکن اس دنیا میں میری ہستی ایک ٹھوس حقیقت کی مانند ہے کیونکہ میں اُس حقیقت کا اظہار ہوں جو اس نیرنگی کے پیچھے کارفرما ہے۔

(۱۳۱)

مایۂ ناز راز ہیں ہم لوگ   محرمِ راز ناز ہیں ہم لوگ

یہ عالم یا کائنات ایک راز ہے اور ہماری ذات اس عالم کا مایۂ ناز سرمایہ ہے کیونکہ ہم حسنِ ازل کے جلووں کے محرم اور رازِ کائنات سے آگاہ ہیں۔ مراد یہ کہ انسان کی ذات حاصلِ کائنات ہے اور اس کی یہ اہمیت جذبۂ عشق کے سبب ہے جس سے کائنات کی دوسری چیزیں محروم ہیں۔

بزمِ دل میں دیا نہ عیش کو بار   صاحبِ امتیاز ہیں ہم لوگ

شاعر اس بات کو اپنے لیے فخر و امتیاز کا باعث سمجھتا ہے کہ دنیا کی خوشیاں جن کے پیچھے لوگ دیوانہ بنے ہوئے ہیں، اِس نے ان کو اپنے دل میں کبھی جگہ نہ دی۔

ہم سے ملتی ہے برقِ طور کو داد   وہ تبسم نواز ہیں ہم لوگ

حضرت موسیٰ محبوب کی برقِ تجلّی کی تاب نہ لا سکے تھے اور بے ہوش ہو گئے تھے۔ لیکن شاعر کا دعویٰ ہے کہ ہم حسنِ دوست کے ادا شناس ہیں اور ہمارا ذوقِ نظر اتنا بلند ہے کہ برقِ طور (تجلّیِ الٰہی) ہم سے داد طلب کرتی ہے۔

عقل عاجز ہے بیخبر ہے ہوش   چشم بد دور راز ہیں ہم لوگ

ہماری ہستی ایک ایسا راز ہے جس کی حقیقت کے ادراک میں عقل و خرد عاجز رہے اور آج تک کوئی اس راز کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔

حشرِ امید سے مراد ہیں ہم
گلہ ہائے دراز ہیں ہم لوگ

حشرِ امید = امیدوں و آرزوؤں کا محشرستان۔
ہماری ذات امیدوں اور آرزوؤں کا ایک محشرستان ہے اور ہماری زندگی ان آرزوؤں کی شکست کا ایک طویل شکوہ۔ مراد یہ کہ ناکامیوں کے باوجود امیدیں قائم کرنا اور ان امیدوں کے خاتمہ پر گلہ کرنا یہی انسان کی زندگی ہے۔

تیری ناز آفرینیاں ہیں گواہ
کہ سراپا نیاز ہیں ہم لوگ

محبوب کا ناز اور غرور اس بات کا گواہ (یا ثبوت) ہے کہ ہم نے ہمیشہ نیازمندی کا رویہ اپنایا ہے۔ گویا ہماری نیازمندی ہی اس کی ناز آفرینی کا سبب ہے۔ ع:
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ تو بے نیاز ہوتا

حسنِ بے جلوہ کچھ سہی فانؔی
جلوۂ جلوہ ساز ہیں ہم لوگ

میرے محبوب (محبوبِ حقیقی) کے جلوؤں کو آج تک نہ کوئی دیکھ سکا ہے نہ سمجھ سکا ہے وہ کیسا ہے یہ تو میں نہیں جانتا ہاں مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی اسی کا ایک جلوہ ہوں۔ یعنی ذاتِ انسانی میں اس کے بنانے والے کی جلوہ گری بدرجہ اولیٰ ہے اس لیے اسی کے ذریعہ خدا کے جلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ردیف (ل)

(۱۳۲)

ٹھکرا کے اڑا دے پھر ہر ذرۂ خاکِ دل
ہر سجدہ سے پیدا کر اک سجدۂ مستقبل

محبوب نے عاشق کے دل کو مٹا دیا مگر دل کی خاک اس کے آستاں پر سجدہ ریز ہے۔

عاشق محبوب کو دعوت دیتا ہے کہ دل کی خاک کے ان ذرّوں کو ٹھکرا کر پھر سے منتشر کر دے مگر اس خاک کا ہر ذرّہ منتشر ہو کر پھر سے اسی جگہ آ کر سجدہ کرے گا۔ یعنی عشق کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔

مشکل ہو تو آساں ہو مشکل ہی نہیں شاید
آساں ہی نہیں ہوتی اللہ رے مری مشکل

مشکل کاموں کا آسان ہونا ممکن ہے مگر شاعر کہتا ہے کہ میری پریشانیاں اور مشکلات آسان ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ شاید یہ دشواری اس لیے ہے کہ میری مشکل مشکل ہی نہیں۔ اگر مشکل ہوتی تب اس کے آسان ہونے کی توقع بھی ہوتی۔ شعر میں الفاظ کے اُلٹ پھیر کے علاوہ کوئی خوبی یا لطف نہیں۔ بقول غالب:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اک حق کے سوا کوئی ہستی ہی نہ تھی یا رب
یوں میرے سر آنکھوں پہ تمیزِ حق و باطل

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ "لاموجود الا اللہ" یعنی خدا کے سوا اور کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ فانی بھی اسی مسلک کے پیرو ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تو نے حق و باطل اور نیکی و بدی میں فرق کرنے کا جو حکم دیا ہے تو چونکہ تیرا حکم ہے اس لیے میں اسے مانے لیتا ہوں ورنہ میری نظر میں تو دنیا میں حق ہی ہے باطل کا وجود ہی نہیں۔ خواجہ میر درد کا شعر ہے:

تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہے تفرقہ میں
اے امتیاز ناداں ٹک امتیاز کرنا

اس کشتیٔ ہستی کو طوفاں ہی مبارک تھا
گردابِ حوادث کے آغوش میں تھا ساحل

کشتیٔ حیات کے لیے ناکامیوں کے طوفان اور حوادث کے بھنور سکون سے زیادہ مبارک اور سازگار ہیں اور ان میں پھنس کر ہی اسے ساحل مراد مل سکتا ہے۔ مراد یہ کہ غموں میں فنا ہو کر ہی عاشق کو کامیابی ملتی ہے۔

ہر دل میں ترا جلوہ ہر لب پہ مرا چرچا
غم زینتِ صد خلوت، غم رونقِ صد محفل

محبوب کا حسن عاشقوں کے دل میں جاگزیں اور میرے عشق کا شہرہ ہر محفل میں ہے۔ حسن کا جادہ چونکہ دلوں میں پوشیدہ ہے اس لیے اس کو "زینتِ خلوت" کہا ہے اور عشق کا چرچا عام ہے اس لیے وہ "رونقِ محفل" ہے۔ مراد یہ کہ دنیا میں جو بھی رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق کی بدولت ہے۔

(۱۳۳)

مجھے عزیز ہے فرمانِ موت میں تعجیل
کہ موت کی یہ تمنّا ہے زندگی کی دلیل

تعجیل = عجلت، جلدی

عام طور پر شاعر زندگی کی کم فرصتی کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ فانی بھی زندگی کی بے ثباتی کے قائل ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں موت کی عجلت پسندی کا کوئی شکوہ نہیں بلکہ ہم تو اسے نہایت عزیز سمجھتے ہیں اور موت کے خواہش مند ہیں کیونکہ موت کی یہ تمنا ہی ہمارے نزدیک زندگی کی علامت ہے۔ شعر میں اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ ہماری زندگی اتنی تکلیف دہ اور پُر مصائب ہے کہ اس کو زندگی کہنا مشکل ہے۔ ہمارے زندہ ہونے کا ثبوت صرف موت کی وہ تمنا ہے جو ہمیشہ ہمارے دل میں رہتی ہے ورنہ یہ زندگی بھی موت سے کم نہیں۔ نفی سے اثبات کو اور موت سے زندگی کو ثابت کرنا فانؔی کا پسندیدہ انداز ہے۔

ع : نیست نہ ہو تو ہست نہیں، ہستی کی کیا ہستی ہے

نوید لطف ہے دل کی ہر آرزو کے لیے
تری نگاہ ہوئی خونِ آرزو کی کفیل

کفیل = ذمّہ دار

عاشق کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ محبوب اس کی طرف نگاہ کرے۔ خواہ یہ نگاہِ غضب ہی کیوں نہ ہو۔ محبوب نے عاشق کی طرف اس طرح غصّہ سے دیکھا ہے کہ اس کی ساری آرزوؤں کا خون ہوگیا ہے لیکن وہ خوش ہے اور اس کی اس نگاہ کو لطف و عنایت کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ فانی نفسیات کے اس نکتہ سے واقف ہیں کہ نفرت کا شدید اظہار

محبت اور تعلق خاطر کا پردہ ہوتا ہے۔

ابھی سے شورِ قیامت جگا رہا ہے مجھے
ابھی ہوئی تھی کچھ آرام یک نفس کی سبیل

زندگی بھر مصیبتیں جھیلنے کے بعد موت کی نیند آئی تھی اور ایک دم آرام ملا تھا کہ قیامت کے شور نے پھر سے ہمیں جگا دیا ہے۔ سودا کے ایک شعر میں بھی یہی خیال ان الفاظ میں ادا ہوا ہے :

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت   خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

مگر سودا کے الفاظ کی بلند آہنگی اور "خدامِ ادب" کا ذکر شعر میں وہ تاثر نہیں پیدا کر سکا جو فانی کے یہاں ملتا ہے۔

ترے خیال کو واجب کیا محبت نے
ترے خیال کی ممکن نہ تھی کوئی تشکیل

محبوب (اللہ تعالیٰ) کی ہستی کا تصور ایک ایسا خیال تھا جس کو سمجھنا یا اس کا احاطہ کسی کے بس میں نہ تھا۔ عقل اس میدان میں کتنا ہی دوڑے مگر اس تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ لیکن عشق کی مدد سے انسان نے اس عقدہ کو حل کر لیا ہے اور اس کی معرفت حاصل کر لی۔ فانی محبت کی اسی عظمت کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ محبت کا فیضان تھا کہ ہم نے تیرے خیال کو اپنی زندگی کا جز بنا لیا ورنہ اس کو سمجھنا یا اس تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس شعر میں "واجب" اور "ممکن" اگرچہ بظاہر رعایتِ لفظی کی خاطر استعمال کیے گئے ہیں مگر ان میں اشارا ان الفاظ کے اصطلاحی معنوں کی طرف بھی ملتا ہے۔ واجب فلسفہ کی اصطلاح میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کا وجود برحق ہو اور کسی ثبوت کا محتاج نہ ہو۔ فلسفیوں کے قول کے مطابق صرف خدا کی ذات واجب کا درجہ رکھتی ہے۔

فانی کے شعر میں ایک لطیف اشارا یہ بھی ہے کہ تجھے واجب کی حیثیت میرے عشق نے دی ہے کیونکہ بقول فانی :

ع : عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے

سراغِ منزل و تائیدِ راہبر تو کجا
ملا نہ راہِ وفا میں نشانِ فرسخ و میل

ہم محبت کی راہ پر تنہا چلتے رہے۔ اس راہ میں ہمیں نہ کوئی راہبر ملا نہ منزل کا کوئی نشان۔ یہاں تک کہ راستے میں پتھر بھی نہ تھے جو فاصلہ کی نشان دہی کرتے۔

عجب نہیں تری رحمت کی حد نہ ہو کوئی
گناہگارِ ازل ہوں مری سزا میں یہ ڈھیل

فانی خدا کی رحمت کے بے حد و حساب ہونے کا ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ انسان بتدائے آفرینش سے ہی گناہ کا مرتکب ہوا تھا (حضرت آدم کے گیہوں کھانے کی طرف اشارا ہے) مگر خدا نے اسے سزا دینے کی بجائے دنیا میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔

نگاہِ آخرِ فانی سے مختصر سُن لو
زبانِ خلق پہ ہوگی یہ داستان طویل

عاشق کی تمنا ہے کہ دمِ آخر کوئی لمحہ کو محبوب اس کے پاس آجائے تاکہ وہ اپنی نگاہِ یاس سے اسے دل کی داستان سُنا دے۔ محبوب اس کی یہ خواہش یوں تو پوری کرنے سے رہا۔ اس لیے وہ بجہ شاعرانہ سے کام لے کر کہتا ہے کہ تم ذرا سی دیر کو آجاؤ تو ہم آخری نگاہ سے تمھیں اپنی ہانی سُنا دیں۔ ورنہ ہمارے بعد یہ داستان تمھیں اوروں کی زبانی سُننا پڑے گی۔ اس میں مھیں زیادہ تکلیف ہوگی کیونکہ الفاظ میں یہ داستان طویل ہو جائے گی۔

ردیف (م)

(۱۳۴)

ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ شعر اس مقامِ حیرت (لاادریت) کی ترجمانی کرتا ہے جہاں انسان کسی چیز یہاں تک کہ خود اپنے بارے میں بھی یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہماری ہستی بھی ایک واہمہ ہے تو پھر اس کی ابتدا یا انجام کے بارے میں کچھ کہنا کس طرح ممکن ہے۔ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے:

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

دعا تو خیر، دعا سے امیدِ خیر بھی ہے
یہ مدّعا ہے تو انجامِ مدّعا معلوم

ہم نے گھبرا کر کامیابی کی دعا کی۔ یہاں تک تو خیر غنیمت تھا مگر ستم یہ ہے کہ ہم کو یہ بھی توقع ہے کہ دعا میں اثر پیدا ہوگا‘ یہ ہماری نادانی ہے۔ اس لیے کہ دعا سے خیر اور بھلائی‘ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ع : آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ہوا نہ رازِ رضا فاش وہ تو یہ کہیے
مرے نصیب میں تھی ورنہ سعئ نامعلوم

مشیت ایزدی کا راز انسانوں کی نظر سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی کوششوں کا بھرم قائم رہے۔ اگر یہ راز فاش ہو جاتا تو انسان کی تمام سعی و کوشش اور اس کے مقاصد کی بے بضاعتی ظاہر ہو جاتی۔

مری وفا کے سوا غایتِ جفا کیوں ہو
تری جفا کے سوا حاصلِ وفا معلوم

تیری جفاؤں کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہماری وفا کو آزمائے اور ہمیں اپنی وفاؤں کے صلہ میں تجھ سے سوائے جفا کے کچھ اور بدلہ ملنے کی توقع بھی نہیں ہے۔

کچھ ان کے رحم پہ تھی یونہی زندگی موقوف
کہ ان کو رازِ محبّت بھی ہو گیا معلوم

ہماری زندگی پہلے ہی محبوب کے رحم و کرم پر منحصر تھی۔ اب ستم یہ ہوا کہ اس کو ہماری محبت کا علم بھی ہو گیا۔ دیکھیے اب اس کا ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو۔

ترے خیال کے اسرار بیخودی میں کھلے
ہمیں چھپا نہ سکے ورنہ دل کو کیا معلوم

ہم نے محبوب کے خیال کو خود اپنے دل سے بھی چھپا کر رکھا تھا مگر جب محبت کی بیخودی زیادہ بڑھی تو ہم اس راز کو راز نہ رکھ سکے اور دل کو بھی اس کا علم ہوگیا۔ یہ ہمارا ہی قصور تھا کہ ہم اس راز کی پردہ داری نہ کر سکے۔

فریبِ امن میں کچھ مصلحت تو ہے ورنہ   سکونِ کشتی و توفیقِ ناخدا معلوم

مسلسل ناکامیوں نے شاعر کو اس قدر بدگمان بنا دیا ہے کہ اب اسے کامیابی پر بھروسہ ہی نہیں رہا اور خوشی سے اعتبار ختم ہوگیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کشتی کا یہ سکون فطرت کی کوئی مصلحت ہے اور سکون کا صرف دھوکہ ہے ورنہ ہم جانتے ہیں کہ کشتی کی قسمت میں سکون کہاں اور نہ ناخدا میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کشتی کو پار لگا سکے۔

وہ التفات کہ تھا اسکی انتہا بھی ہے   خدا کی مار کہ دل کو یہی نہ تھا معلوم

آغازِ محبت میں دل کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ محبوب کا التفات اور مہربانیاں کبھی ختم بھی ہوسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس سے محروم ہونے پر اس غم کی شدت بہت زیادہ ہے۔ مراد یہ کہ اگر انسان پہلے سے انجام سوچ لے تو ناکامیاں اسے اتنا متاثر نہ کریں۔

یہ زندگی کی ہے رودادِ مختصر فانیؔ   وجودِ درد مسلم، علاج نامعلوم

زندگی کی داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں غم ناگزیر ہیں اور اٹل حقیقت ہیں مگر ان غموں سے بچنے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا ہے۔

(۱۳۵)

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم
بے خودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار ہیں ہم

وارفتۂ رفتار = بے خودی میں چلتے رہنا۔

وادیٔ شوق میں ہماری رہ نوردی اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ ہم کسی کی محبت میں گرفتار ہیں لیکن بے خودی کا یہ عالم ہے کہ ہمیں یہ بھی نہیں یاد کہ ہمیں کس کی طلب ہے۔ عاشق

بے خودی میں خود کو بھول جاتے ہیں مگر فانی اس سے بھی آگے ہیں کہ محبوب کو ہی فراموش کر بیٹھتے ہیں۔

ہاں ابھی بے خبرِ لذتِ آزار ہیں ہم
مژدہ اے مشقِ ستم تازہ گرفتار ہیں ہم

شاعر کہتا ہے کہ ابھی ہم بساطِ عشق پر تازہ وارد ہوئے ہیں اور ہمیں عشق کے آزار اور تکلیفوں کا مزہ ابھی نہیں پتہ چلا ہے۔ پھر وہ محبوب کی مشق ستم کی عادت کو یہ خوش خبری سنا کر دعوت دیتا ہے کہ مبارک ہو۔ تیری مشق کے لیے ایک تازہ گرفتار مل گیا۔

ہو غمِ ہستیٔ جاوید گوارا کیوں کر
جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

عشقِ محبوب میں جان دے کر ہستیٔ جاوید ملتی ہے۔ ہم عشق میں اسی لیے جان دینے سے گریز کرتے ہیں کہ اس طرح ہمیں زندگیٔ جاوید مل جائے گی اور ہم زندگی سے اس قدر بیزار ہیں کہ یہ عارضی زندگی بھی دوبھر ہو گئی ہے تو پھر بھلا زندگیٔ جاوید کا بوجھ کس طرح اٹھایا جائے گا۔ شعر میں الفاظ کا کھیل ہے۔

میں نے گویا صلۂ مہر و وفا بھر پایا
کاش اتنا ہی وہ کہہ دیں کہ جفا کار ہیں ہم

مجھے محبوب سے مہر و وفا کا بدلہ التفات کی صورت میں تو ملنے سے رہا۔ اگر وہ اپنی جفا کا اقرار کرے تو میں اسی کو اپنی وفا کا صلہ سمجھ لوں گا۔ اپنی جفا کا اقرار گویا بالواسطہ عاشق کی وفا کا اقرار ہے۔

حسنِ حیرت تو میسر ہے تماشا نہ سہی
تیری محفل میں ہیں گو نقش بدیوار ہیں ہم

نقش بدیوار = دیوار پر بنی ہوئی تصویریں۔ حیرت زدہ انسان کی حالت تصویر سے مشابہ مانی جاتی ہے۔ محبوب کی محفل میں عاشق کی مثال بھی دیوار کی تصویر کی سی ہے کہ حیرت زدہ ہو کر ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

گو اس کی رنگینیوں میں شامل نہیں۔ مگر وہ اسی پر خوش ہے کہ اس کی محفل میں بار تو ملا۔ یہ بھی کیا کم ہے۔

یوں تو کچھ غم سے سروکار نہ راحت کی تلاش
غم کوئی دل کے عوض دے تو خریدار ہیں ہم

فانی کے عقیدے میں خوشی غم سے بھی زیادہ بے حقیقت و ناپائدار ہے۔ یوں تو اس کی نظر میں غم اور خوشی دونوں یکساں ہیں اور اسے کسی سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی اگر غم کوئی دے تو اسے دل کے بدلے میں لینے کو تیار ہے۔

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانیؔ
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

عام شعرائے تصوف کی طرح فانی کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے اور مختار ذات اللہ کی ہے۔ جب انسان مجبور ہے تو پھر اعمال کی سزا یا جزا بھی کوئی معنی نہیں رکھتی چنانچہ فانی کہتے ہیں کہ ہمارا گناہ تو صرف اس قدر ہے کہ اس دنیا میں دو گھڑی کے لیے آنکھ کھولی۔ ہم گناہ بھی کرتے ہیں تو مجبوری کے تحت۔ اس پر بھی خدا سزا دے تو اس کو اختیار ہے۔

(۱۳۶)

رازِ ناکامی وفا کی قسم   دل جفا دوست ہے خدا کی قسم

شاعر محبت کی ناکامیوں کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ ہماری ناکامی کا راز یہ ہے کہ ہمارا دل خود ہی محبوب کی جفاؤں کا متمنی ہے اور ناکامیوں کو عزیز رکھتا ہے۔

جانتا ہوں حقیقتِ باطل   ماسوا تو ہے ماسوا کی قسم

شاعر وحدت الوجود کا قائل ہے۔ وہ باطل کی حقیقت سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ اس کے پیچھے بھی حقیقت ہی کارفرما ہے یعنی جب ہستی حقیقی ایک ہی ہے تو پھر ماسوا کا وجود ہی کہاں۔ ہر چیز خدا ہے۔

حُسنِ مطلق بھی ہے حجاب ان کا
اعتباراتِ برملا کی قسم

اعتباراتِ برملا = کائنات کی تمام ظاہری اشیا جن کا کوئی حقیقی وجود نہیں بلکہ صرف اعتباری حیثیت رکھتی ہیں۔

محبوب نے اپنے حُسن پر اعتبارات کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ ان پردوں ہی کی قسم اگر وہ اپنے حُسن کو بے نقاب کر دے تب بھی کوئی اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا حُسن ہی سب سے بڑا پردہ ہے۔

دل ہے اب التفات کے قابل
بے کسی ہائے مدّعا کی قسم

محبت کی ناکامی نے مجھے ترکِ مدعا پر مجبور کر دیا ہے اور اب میری خواہشیں دم توڑ رہی ہیں۔ اب تو اس کو مجھ پر رحم آ جانا چاہیے۔

غمِ فرقت ہے ابتدا دل کی
مالکِ علمِ ابتدا کی قسم

مالکِ علمِ ابتدا = اللہ تعالیٰ جو ہر چیز کے آغاز سے باخبر ہے۔

خدائے تعالیٰ جو ہر چیز کے آغاز سے واقف ہے شاعر اس کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ زندگی دل کا آغاز غمِ فرقت سے ہوا ہے یعنی دل کو دل بنانا غمِ فراق کا کام ہے۔ خدا کو گواہ بنانے میں لطیف اشارا یہ بھی ہے کہ غم کی ہستی اتنی قدیم ہے کہ اس کی ابتدا سے خدا کے سوا کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔

نور و ظلمت جدا نہیں ہوتے
آپ کی چشمِ سرمہ سا کی قسم

شاعر کہتا ہے کہ اندھیرے اور اُجالے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ثبوت میں وہ محبوب کی سرمہ لگی آنکھوں کو پیش کرتا ہے جن میں نور و ظلمت یکجا ہیں۔ پہلے مصرعہ میں دعویٰ ہے دوسرے میں دلیل۔

عیشِ کشتی ہے رازِ ہر گرداب
زورِ بازوئے ناخدا کی قسم

شاعر ناخدا کے زورِ بازو کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ کشتی کے سکون یا خوش انجامی کا

گرداب سے گہرا تعلق ہے کیونکہ اس کی آزمائش بھنور میں پھنس کر ہی ہوتی ہے۔ مراد یہ کہ زندگی کے طوفان انسان کے دشمن نہیں بلکہ اس کے زورِ بازو اور اس کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

عشق رسوا مجھی کو تھا منظور   سعیٔ اظہارِ ماجرا کی قسم

ہم نے محبوب سے اظہارِ حال کی جو کوشش کی اس کا سبب یہ تھا کہ ہم خود ہی عشق میں رسوائی اور بدنامی کے خواہاں تھے۔

میں ہوں فانیٔ صحیفۂ باقی   حرفِ بے معنی فنا کی قسم

میرے نزدیک "فنا" ایک بے معنی لفظ ہے۔ میں اس لفظ کی بے حقیقتی کی قسم کھاتا ہوں کہ میری زندگی بقا کی ایک دستاویز ہے (یعنی ابدی ہے)۔

(۱۳۷)

کیا کہیں کیوں خاموش ہوئے ہیں سُن کے تری فرقت کی خبر ہم
نالۂ دل کے جتنے تھے اجزا ہو گئے سارے درہم برہم

جب سے ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ تجھ سے وصال ممکن نہیں اس وقت سے ہمارا یہ حال ہے کہ نالہ و فریاد بھی نہیں کر سکتے اور خاموش ہو کر رہ گئے ہیں۔ فرقت کا یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ اس نے نالۂ دل کے تمام اجزا کو منتشر کر دیا ہے۔

گو بیٹھے بھی اُٹھے بھی ہم محفلِ دشمن میں تری خاطر
بیٹھ گئے دلِ زار کی صورت، اٹھے صورتِ دردِ جگر ہم

تیری خاطر گو کہ ہم نے دشمن کی محفل میں بھی شرکت کی۔ مگر یہ نہ سمجھ کہ ہم نے خوشی سے شرکت کی بلکہ جب ہم بیٹھے تو اس طرح جیسے کسی مجبور کا دل صدمہ سے بیٹھ جاتا ہے اور جب وہاں سے اُٹھے تو یوں جیسے کسی کے دل میں درد اُٹھتا ہے۔ یہ تشبیہیں رعایتِ لفظی کی خاطر استعمال کی گئی ہیں۔

شکوۂ جورِ بتاں ہم کرتے، ظاہر دردِ نہاں ہم کرتے
مانا آہ و فغاں ہم کرتے، لاتے کہاں سے تجھ کو اثر ہم

محبوب کے ظلم و ستم پر نالہ و فریاد یا اپنے درد کا اظہار ہم کرتے بھی تو کیا حاصل ہوتا کیوں کہ اثر پر تو ہمارا اختیار نہ تھا۔ اسے کہاں سے لاتے۔

کوئی گھڑی اے بیخودئ غم دم لینے دے سنبھل لینے دے
آ کوئی دم اے ہوش کہ تجھ سے پوچھیں گے کچھ اپنی خبر ہم

ہماری بے خودی کا یہ حال ہے کہ خود اپنی حالت کی بھی خبر نہیں۔ کاش چند لمحات کے لیے ہوش آجائے تاکہ ہمیں اپنے حال کی کچھ خبر مل سکے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

دوست تسلّی دینے آئے لے کے دوائیں چارہ گر آیا
لیجیے آئی زخمِ جگر پر اور اک تازہ آفتِ مرہم

شاعر کی ایذا پسندی کا یہ حال ہے کہ دوستوں کی تسلّی اور معالجوں کی چارہ سازی سے اس کو تکلیف ہوتی ہے اور اس نے زخموں پر جو مرہم لگایا جا رہا ہے وہ اسے مصیبت سمجھتا ہے۔

ڈوب ہی جائے کشتئ ہستی کچھ تو ہو آخر ورنہ کہاں تک
بحرِ تلاطم خیز جہاں میں یونہی رہیں گے زیر و زبر ہم

بحرِ تلاطم خیز = طوفانی سمندر

ہم زندگی کے طوفانی سمندر میں مدت سے غوطے کھا رہے ہیں اور ہماری کشتی نہ ڈوبتی ہے نہ پار لگتی ہے۔ اب تو یہ کشتی ڈوب ہی جائے تو بہتر ہے ورنہ ہم کب تک اس بحرِ طوفاں خیز کے تھپیڑے کھاتے رہیں گے۔

گھڑیاں اپنی عمر کی ہم نے غنچوں میں چل پھر کے گزاریں
آئے تھے فانی باغِ جہاں میں گویا مثلِ نسیمِ سحر ہم

ہم نے دنیا کی رنگینیوں کو دیکھا ضرور مگر بہت مختصر عرصہ کے لیے۔ جیسے نسیم سحر باغ میں کہیں رُکے بغیر کلیوں کے درمیان سے گزرتی چلی جاتی ہے یونہی ہم بھی دنیا کی رنگینیوں سے گزرتے چلے گئے۔

(۱۳۸)

زندگی کا ہے امتحاں انجام　　　حذر اے آہ! الاماں انجام

حذر، الاماں = خدا بچائے۔ خدا کی پناہ

آہوں کا مقصد زندگی کے غموں میں چھٹکارا پانا یا دوسرے الفاظ میں زندگی سے نجات حاصل کرنا تھا مگر جب معلوم ہوا کہ زندگی کا انجام بھی سکون نہیں بلکہ اس کے بعد بھی ایک امتحان درپیش ہے تو شاعر اس سے پناہ مانگتا ہے اور آہوں کو محتاط رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔

تیرے گھر کی زمیں ارے توبہ　　　ذرّہ ذرّہ ہے آسماں انجام

محبوب کے گھر کی زمین بھی عاشق کے لیے اتنی ہی فتنہ خیز اور ہنگامہ خیز ہے جیسا کہ آسمان ہے۔

حُسن ہے جاودانِ بے آغاز　　　عشق آغازِ جاوداں انجام

فلاسفہ کا قول ہے کہ حُسنِ حقیقی یعنی خدا کی ذات قدیم ہے جس کی نہ کوئی ابتدا تھی نہ انتہا بلکہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن شاعر کے نزدیک عشق کی ہستی بھی اگرچہ حسن کی طرح "قدیم" تو نہیں لیکن پھر بھی اس کو یہ عظمت حاصل ہے کہ اس کا آغاز تو ہے مگر انجام کوئی نہیں اور یہ بھی حسن کی طرح لافانی اور جاوداں ہے۔ حسن کی طرح عشق بھی لامحدود ہے اور اس کو فنا نہیں۔

طبعِ نازک پہ بار اک اک حرف　　　حالِ دل حرفِ داستاں انجام

محبوب کی نازک مزاجی کا یہ عالم کہ میری داستانِ غم کا ایک ایک حرف اس پر بار ہے اور میرا حال دل اس قدر طویل ہے کہ اس کا ایک ایک حرف ایک پوری داستان پر منتہی۔ پھر یہ داستان محبوب کو کیسے سنائی جا سکے گی۔

اور جو مل جائے دل سے دل یارب　　　ایک دل کا ہے دو جہاں انجام

شاعر خدا سے التجا کرتا ہے کہ اگر ہماری محبت کامیاب ہو جائے اور ہمارا دل محبوب کے دل سے مل جائے تو یہ کامیابی دونوں جہاں کی نعمتوں پر بھاری ہوگی اور ہم یہ سمجھیں گے کہ گویا دونوں جہاں ہمیں مل گئے۔ "اور" کا لفظ زاید ہے۔

کم نہ تھی عمر اک نظر کے لیے   عشق تھا مرگِ ناگہاں انجام

ہم سمجھتے تھے کہ محبوب کو ایک نظر دیکھنے کے لیے یہ زندگی کافی ہوگی مگر اس بدنصیبی کا کیا کیجیے کہ عشق کا انجام ناگہانی موت تھی جس نے محبوب کو ایک نظر دیکھنے کی مہلت بھی نہ دی۔

پوچھتے ہو نشانِ فانؔی کیا   وہ ہے اک قبرِ بے نشاں انجام

فانؔی کا نشان اور انجام کیا پوچھتے ہو۔ ایک شکستہ قبر جو اب جلد ہی بے نشان ہونے والی ہے اس کی یادگار باقی ہے۔

(۱۳۹)

خاک بہ سر تجھ سے صبا اور ہم   خوں شدہ دل تجھ سے حنا اور ہم

صرف ہم ہی تیری محبت میں گرفتار اور تیرے عشق میں دل خون کیے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ بادِ صبا کی آوارگی اور خاک اُڑانا نیز مہندی کی سُرخی بھی اس بات کی علامت ہے کہ وہ بھی ہماری طرح تیرے دیوانے ہیں۔ صوفی شعراء کا عقیدہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز میں جذبۂ عشق کا اظہار ہے اور ہر شے حسنِ مطلق کی شیدائی ہے چنانچہ میرؔ کہتے ہیں:

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا   کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

وادیٔ مجنوں میں گزر کر کے دیکھ   خاک اُڑاتے ہیں صبا اور ہم

مجنوں نے جس دشت میں آوارہ گردی کی تھی وہاں آج بھی اس کے اثرات باقی ہیں وہاں جا کر دیکھو اب بھی تمھیں فانؔی خاک اُڑاتا اور بادِ صبا بیتابی سے گھومتی نظر آئے گی۔ مراد یہ کہ عشق مر کر بھی فنا نہیں ہوتا۔

درخورِ انعامِ جفا اور رقیب   قابلِ تعزیرِ وفا اور ہم

تعزیر = سزا

ہم وفا کر کے بھی محبوب کے نزدیک سزا کے مستحق ہیں اور رقیب کو وہ اپنی جفاؤں سے نوازتا ہے۔ عاشق کے نزدیک محبوب کی جفائیں اور ستم بھی انعام ہوتے ہیں کیونکہ ان کی تہ میں ایک تعلّق چھپا رہتا ہے۔

گم شدگانِ رہِ غم کی مثال
قیس ہے اک آبلہ پا اور ہم

جن لوگوں نے محبّت کی راہ میں اپنے کو گُم کر دیا ہے اور اپنی ہستی کو محبّت کی خاطر مٹا دیا ہے ان میں یا تو قیس کا نام آتا ہے یا پھر ہمارا۔

عقدۂ دل گو نہ کھُلے یا کھُلے
آج ہے وہ بندِ قبا اور ہم

آج ہم تہیہ کر کے چلے ہیں کہ محبوب سے دست درازی کر کے رہیں گے اور ہر اس پردے کو ہٹا دیں گے جو ہمارے اور اس کے بیچ میں حائل ہے خواہ ہمارے دل کی آرزو پوری ہو یا نہ ہو۔ مگر آج ہم ہر فاصلے کو ختم کر کے رہیں گے۔

یہ ہمت و عزم اور بندِ قبا سے اُلجھ پڑنے کا جذبہ فانیؔ کی شاعری اور ان کے مزاج دونوں کے لیے نیا ہے اور ایک فلسفی شاعر کے ذہن سے زیادہ ایک عملی اور تشدّد پسند مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔

(۱۴۰)

دل اور دل میں یاد کسی خوش خرام کی
سینے میں حشر لے کے چلے ہیں جہاں سے ہم

مرنے کے بعد بھی محبوب کے خرام کی یاد دل میں موجود تھی۔ گویا ہم اپنے سینے میں قیامت لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ محبوب کی چال کو قیامت کہنا شاعری کی عام تشبیہ ہے۔

اب چارہ سازیِ دلِ بیمار کیا کریں
اے مرگِ ناگہاں تجھے لائیں کہاں سے ہم

ہمارے دل کی تکلیفوں اور دکھوں کا ایک ہی علاج ہے کہ موت آجائے۔ لیکن کیا کریں موت ہمارے اختیار میں نہیں۔

اللہ رکھے ہم کو سہارا ہے ضعف کا
بیٹھے تو پھر اُٹھیں گے نہ اس آستاں سے ہم

ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ عاشق جہاں بیٹھ جاتا ہے وہاں سے اُٹھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی اس حالت سے خوش ہے کہ چلو اسی بہانے سے محبوب کے در پر بیٹھنے کا موقع مل جائے گا اور وہاں جا کر بیٹھیں گے تو پھر کوئی اُٹھا نہ سکے گا۔

کیا کیا دیئے فریبِ غمِ عشقِ یار نے
دل ہم سے بدگمان ہے اور رازداں سے ہم

محبت نے ہمیں سب سے بدگمان کر دیا ہے اور ہم اپنے رازداں کو بھی اپنا رقیب اور دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے دل کو خود ہم پر بھروسہ نہیں رہا۔

(۱۴۱)

مجھ پہ رکھتے ہیں حشر میں الزام   آ نہ جائے زباں پہ تیرا نام

قیامت میں ہمارا دفترِ عمل پیش ہو رہا ہے اور ہمیں گناہگار قرار دیا جا رہا ہے۔ کہیں اپنی صفائی دینے میں ہماری زبان سے محبوب (اللہ تعالیٰ) کا نام نہ نکل جائے۔ مراد یہ کہ ہم نے کوئی عمل اپنے ارادہ یا اختیار سے نہیں کیا بلکہ جو کیا اسی کی مرضی اور حکم سے کیا۔ پھر یہ حساب کتاب کیوں۔ بڑے شاعرانہ اور محتاط طریقہ سے بات کہی ہے۔

ضبط کی کوششیں بھی جاری ہیں   درد بھی کر رہا ہے اپنا کام

ہمارے دل میں درد اور ضبط کی وجہ سے ایک کشمکش برپا ہے۔ درد کی کوشش ہے کہ ہماری قوتِ برداشت کو ختم کر دے اور ہمیں آہیں بھرنے پر مجبور کر دے مگر دوسری طرف ضبط کا تقاضا ہے کہ اُف بھی نہ کریں۔

وقفۂ موت بھی غنیمت ہے   کچھ تو فی الجملہ مل گیا آرام

فی الجملہ = الغرض

زندگی کے دشوار گزار مرحلوں کے بعد موت ایک پُرسکون وقفہ ہے جس کے بعد پھر سے عقبیٰ کا سفر شروع ہوتا ہے۔ بقول میر:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اس نے دیکھا ہے شام کا منظر
جس نے دیکھی ہے بے کسوں کی شام

شام کے منظر کی اداسی اور سناٹے کو جس نے پوری طرح نہ محسوس کیا ہو وہ کسی بدنصیب عاشق کی شام کو دیکھ لے۔

کس سے اب درد کی دوا چاہوں
درد اٹھتا ہے لے کے تیرا نام

عاشق دردِ محبت سے شفا حاصل کرنا نہیں چاہتا نہ اس کا علاج منظور ہے کیونکہ اس درد کے ساتھ محبوب کی یاد بھی شامل ہے۔

اب قیامت قریب ہے فانیؔ
فتنۂ عشق ہو چلا ہے تمام

عشق کی فتنہ سامانیوں اور شدتوں میں کمی آنے لگی ہے۔ اس سے فانیؔ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شاید قیامت بہت جلد آنے کو ہے۔ اس خیال میں دو اشارے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ عشق کے فتنوں کا ختم ہونا ویسے تو ممکن نہ تھا۔ قیامت ہی انھیں ختم کر سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فتنے عاشق کی قسمت ہیں۔ عشق کے فتنوں میں کمی آئی ہے تو اس سے بڑھ کر فتنہ نازل ہونا چاہیے اور وہ صرف قیامت ہی ہو سکتی ہے۔

ردیف (ن)

(۱۴۲)

یہ دُھن ہے تری یاد دھیان ہے تیرا جانے اسے کیا کہتے ہیں
اب ہوش و حواس بھی آٹھ پہر کچھ کھوئے ہوئے سے رہتے ہیں

اب ہمارا یہ حال ہے کہ ہر وقت ایک بے خودی و بے خبری طاری رہتی ہے۔ خدا جانے یہ محبت کی کون سی منزل ہے۔ یا تو تیری آرزو نے ہمیں دیوانہ بنا دیا ہے یا تیرے خیالوں نے ہم پر یہ

محویت طاری کر دی ہے کہ کسی چیز کا ہوش نہیں۔ دھن اور دھیان میں درجہ کا فرق ہے۔ دھن کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ دھیان اس بات کی طرف اشارا ہے کہ اسے حاصل کر لیا ہے۔

تو اور کہیں ہم اور کہیں ممکن جو نہ تھا وہ ممکن ہے
جب سنتے تھے تو ڈرتے تھے اب پڑتی ہے تو سہتے ہیں

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب تک مصیبت آتی نہیں صرف اس کا خوف ہوتا ہے تب تک وہ لرزتا اور ڈرتا رہتا ہے لیکن مصیبت پڑنے پر وہ اس کو جھیل جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر بھی کہتا ہے کہ محبوب سے جدائی کا تصور بھی ہمارے لیے سوہانِ روح تھا مگر اب جب وہ ہم سے جدا ہو گیا ہے تو اس سختی کو بھی جھیل رہے ہیں جسے برداشت کرنے کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔

اچھا ہے اگر دو آگ کے دریا آنسو بن کر بہتے ہیں
آنکھوں میں تو رہ کر یہ فتنے طوفان اٹھائے رہتے ہیں

ہماری آنکھوں سے گریۂ آتشیں کے جو دھارے بہتے رہتے ہیں یہ اچھا ہی ہے۔ اس طرح سوزشِ دل تو کم ہو جاتی ہے ورنہ جب تک یہ آنسو آنکھوں میں رہتے ہیں اس وقت ان کی طغیانی ہمارے لیے قیامت بن جاتی ہے۔

(۱۴۳)

مری آنکھوں سے بہنا چاہیے دل کا لہو برسوں
رہی ہے اُن کو خونِ آرزو کی آرزو برسوں

محبوب کو عاشق کی آرزوؤں کا خون دیکھنے کی خواہش تھی۔ اس کی اس خواہش کے احترام میں میری آنکھوں سے دل کا خون آنسوؤں کی شکل میں مسلسل بہتے رہنا چاہیے تاکہ محبوب اس کو دیکھ کر لطف اندوز ہو۔

جیے جانے کی تہمت کس سے اُٹھتی کس طرح اُٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

ہماری زندگی ہمارے اوپر زندگی کے الزام کی طرح تھی۔ ہم اس کو کسی طرح نہ اُٹھا سکتے تھے، اگر اس میں تیرا غم نہ شامل ہوتا۔ مطلب یہ کہ غمِ عشق نے ہماری زندگی کی لاج رکھ لی اور اسے اس قابل بنا دیا کہ اسے زندگی کہا جا سکے ورنہ یہ صرف ہمارے اوپر ایک الزام تھا جسے اُٹھانا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔

نگاہوں نے دلوں میں دل نے آنکھوں میں تجھے ڈھونڈا
تری دُھن میں رہے سودائیانِ جستجو برسوں

سودائیان جستجو = "تلاش کے سودائی"

تلاش محبوب کا تعلق دو چیزوں سے ہوتا ہے دل اور نگاہ۔ عاشق کا دل اور نگاہ دونوں محبوب کی تلاش میں برسوں سے سرگرداں ہیں۔ نگاہوں کا خیال ہے کہ محبوب دل میں تو نہیں چھپا بیٹھا اور دل کو شبہ ہے کہ آنکھوں نے تو اسے اپنے اندر نہیں چھپا لیا۔ دیدہ و دل کی رقابت کا مضمون غزل میں بہت عام ہے۔

نقابِ جلوہ کی کایا پلٹ دی شوقِ بے حد نے
مری وحشت نے توڑا ہے طلسمِ رنگ و بو برسوں

محبوب (خدا تعالیٰ) نے اپنے حسن کو رنگ و بو کے سیکڑوں پردوں میں چھپا رکھا تھا مگر میری وحشت یا جذبۂ شوق کی شدّت نے عالمِ رنگ و بو کا یہ طلسم توڑ دیا جو جلوۂ محبوب کا حجاب بنا ہوا تھا۔ مراد یہ کہ انسان میں جذبِ کامل ہو تو یہ ظاہری پردے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

تری ایذا پسندی کی ادا بھی کیا قیامت ہے
مجھے مرنے نہ دے گی آرزوئے مرگ تو برسوں

موت کا مطلب ہے غموں اور پریشانیوں کا خاتمہ۔ لیکن شاعر کی آرزوے مرگ میں چونکہ ایذا پسندی بھی شامل ہے۔ اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ مر کر اپنے غموں کا خاتمہ کرے اور یہ ایذا پسندی اسے زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

ہماری بے کسی کی موت تھی بدلا اسیری کا
رہا طوقِ اسیری بھی گرفتارِ گلو برسوں

ہماری بے کسی کا یہ حال ہے کہ مرنے کے بعد کوئی ایسا بھی نہ تھا جو اُس طوق کو ہماری گردن سے نکالتا جو اسیر کرنے کو صیاد نے ہمیں پہنایا تھا۔ چنانچہ وہ برسوں ہماری لاش کے گلے میں پڑا رہا گویا اس طرح ہماری بے کسی کی موت نے طوق کو گرفتار رکھ کے اسیری کا بدلہ طوق سے لے لیا۔

کیے جائیں گے دل کے خاتمے پر شکر کے سجدے
وفاؤں نے کیا ہے خونِ حسرت سے وضو برسوں

وفا کا تقاضا ہے کہ حسرت و ارمان بلکہ دل کے خون ہونے پر بھی گلہ کی جگہ شکر کیا جائے۔ ہماری وفائیں ہمیشہ اپنی آرزوؤں کے خون سے وضو کرتی رہی ہیں اب دل کے مٹنے پر سجدۂ شکر ادا کریں گی۔ سجدے کی رعایت سے خونِ دل میں ڈوبنے کی جگہ خون سے وضو کرنا استعمال کیا ہے۔

نہ چھیڑ اے نامرادی خستۂ امیدِ باطل ہوں
رہا ہے چاکِ دل آزردۂ مشقِ رفو برسوں

اے نامرادی مجھے جھوٹی امیدوں کا سہارا لینے پر مجبور کر کے میری تکلیف میں اضافہ نہ کر۔ اس لیے کہ میں پہلے ہی سے امیدِ باطل (جھوٹی امید) کا مارا ہوا ہوں۔ مدتوں میں نے اپنے دل کے چاک کو رفو کرنے کی ناکام کوشش کر کے دل کی خلش میں اضافہ کیا ہے۔ اب تو اور امیدیں باندھ کر میرے زخموں میں خلش نہ بڑھا۔

تجھے اور حالِ دل سے یہ تجاہل، تو بہ کر تو بہ کر
کہ تجھ سے میری خاموشی نے کی ہے گفتگو برسوں

محبوب کا میرے حال سے تجاہل برتنا محض اس کا بہانہ ہے۔ مانا کبھی میں نے اس سے حالِ دل نہیں کہا مگر میری خاموشی نے بار بار اس کو میری حالت جتائی ہے۔ اب بھی اس کا تغافل کرنا قابلِ افسوس امر ہے۔

مری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

محبت نے میری رگوں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہے اور غمِ محبت کے سبب میری زندگی ایک مسلسل جانکنی کا عذاب بنی رہی ہے۔

(۱۴۴)

لطف و کرم کے پتلے ہو اب قہر و ستم کا نام نہیں
دل پہ خدا کی مار کہ پھر بھی چین نہیں آرام نہیں

محبوب ظلم و ستم چھوڑ کر اب سراپا لطف و نوازش ہے مگر دل کی بے قراری میں اب بھی کوئی لی نہیں۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ تڑپنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ مومن کا شعر ہے:

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

جتنے منہ ہیں اتنی باتیں دل کا پتہ کیا خاک چلے
جس نے دل کی چوری کی ہے ایک اسی کا نام نہیں

میرے دل کے چوری جانے پر ہر شخص اپنی سی قیاس آرائیاں کر رہا ہے مگر کسی کا دھیان اصلی ر یعنی محبوب کی طرف نہیں جاتا۔ محبت کی مجبوری ملاحظہ ہو کہ عاشق خود واقف ہوتے ہوئے بھی ں کا نام نہیں لے سکتا۔

جلوہ و دل میں فرق نہیں اب جلوہ ہی کو دل کہتے ہیں
یعنی عشق کی ہستی کا آغاز تو ہے انجام نہیں

عشق کی معراج یہ ہے کہ محبوب اور عاشق میں دوئی باقی نہ رہے۔ عشق کا آغاز خواہ کسی ت سے ہوا ہو اس کی انتہا یہ ہے کہ وہ حسن بن جائے۔ اسی وقت اس کو بھی ابدیت حاصل ہوتی ہے۔

رک کے جو سانسیں آ گئیں مانا کہ وہ آہیں تھیں لیکن
آپ نے تیور کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں

شدتِ غم کے سبب عاشق کی سانسیں رک رک کر آ رہی ہیں۔ محبوب ان کو آہیں خیال کرتا اور غصہ سے اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ شاعر معذرت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میری آہیں

بھر رہا ہوں تو کسی کا نام تو نہیں لے رہا۔ آپ بے وجہ کیوں خفا ہوتے ہیں۔

عشق کے آزاری بھی کہیں مرجانے سے جی جاتے ہیں
لے یہ تسلّی رہنے دے اے موت یہ تیرا کام نہیں

آزاری = بیمار

موت عاشق کو زندگی کی تکلیفوں سے نجات دلانے کا دعویٰ کرتی ہے مگر شاعر اس کی ان طفل تسلیوں پر یقین نہیں کرتا۔ اس کا کہنا ہے کہ مریضانِ محبت کو زندگی دینا (غموں سے نجات دلانا) موت کے بس سے باہر ہے۔ مراد یہ کہ غم عشق کی خلش مرکر بھی نہیں مٹتی۔

کب سے پڑی ہیں دل میں تیرے ذکر کی ساری راہیں بند
مدّت گزری اس بستی میں رسم سلام و پیام نہیں

مدّت گزری کہ دل کی بستی اُجڑی پڑی ہے اور اب یہاں ذکر محبوب کا چرچا بھی نہیں۔ اب دید و شنید تو کیا اس اجڑی بستی میں محبوب کا کوئی پیام بھی نہیں پہنچتا۔

حد تھی یہ بے تابئ دل کی جانئے اب کیا ہونا ہے
صبر کی حد بھی ہونے آئی صبح نہیں یا شام نہیں

جب بے تابی کے اظہار یعنی تڑپنے کی طاقت نہ رہی تو ہم نے صبر اختیار کیا مگر صبر کرتے ہوئے بھی ایک مدّت گزر گئی اور اب صبر کی طاقت بھی جواب دینے والی ہے۔ دیکھیں اس کے بعد کیا حشر ہو۔

دل ہی پہ اپنا بس نہیں چلتا ان کی شکایت کیا کیجے
آپ ہم اپنے دشمن ٹھہرے دوست پہ کچھ الزام نہیں

ہماری بربادی کا ذمہ دار ہمارا اپنا دل ہے جو ہمارے قابو سے باہر ہے۔ جب دل ہی ہمارے بس میں نہیں اور روکنے کے باوجود محبت کر بیٹھا تو محبوب سے شکوہ کرنا عبث ہے۔

دل سے کسی کی آنکھوں تک کچھ راز کی باتیں پہنچی ہیں
آنکھ سے دل تک آیا ہو ایسا تو کوئی پیغام نہیں

ابھی ہماری محبت یکطرفہ ہے۔ ہمارے دل نے اپنے سارے راز محبوب کی نگاہوں سے کہہ دیئے ہیں اور وہ ہمارے حالِ دل سے واقف ہو گیا ہے مگر ابھی اس کی طرف سے کسی التفات یا تعلق کا اظہار نہیں ہوا ہے اور ان کی نظروں کا کوئی پیغام ہمارے دل تک نہیں پہنچا ہے۔

نزع میں فانؔی تو نے یہ کس کا چپکے چپکے نام لیا
کیوں اے کافر تیری زباں پر اب بھی خدا کا نام نہیں

مرتے وقت ہر انسان خدا کا نام لیتا ہے مگر شاعر نزع میں بھی محبوب کے نام کا ورد کر رہا ہے اور لطف یہ کہ لوگوں کے طعن یا رشک کے خیال سے وہ چپکے چپکے اس نام کو لے رہا ہے۔ اس کی اس رازداری سے تیمار دار سمجھ جاتے ہیں کہ وہ اس وقت بھی محبوب کو یاد کر رہا ہے ورنہ خدا کا نام لیتا تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اسے تنبیہ کرتے ہیں کہ او کافر اب تو خدا کو یاد کر اور محبوب کا ذکر چھوڑ دے۔ صورتِ حال کی مکمل تصویر کشی نے شعر کو خوبصورت بنا دیا ہے۔

(۱۴۵)

آ! ورنہ جانتا ہوں فریبِ نظر کو میں
دیکھوں اُلٹ کے پردۂ داغِ جگر کو میں

محبوب (حقیقی) نے ہماری نگاہوں کو جو فریب دے رکھا ہے ہم اس کی حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ خود ہمارے دل میں درد کی شکل میں موجود ہے۔ اگر وہ ہمارے سامنے نہ آیا تو پھر ہم اس ظاہری پردے کو ہٹا دیں گے اور داغِ دل کا پردہ ہٹا کر اسے بے نقاب کر کے دیکھ لیں گے۔ مراد یہ کہ عشق ہی جلوۂ محبوب کا امین ہے اور عاشق جب چاہے خود اپنے اندر اس کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔

ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دُھنتا ہوں سر کو میں
پہچانتا نہیں ہوں تری رہگذر کو میں

میری وارفتگیٔ شوق کا یہ حال ہے کہ ہر نقشِ پا کو دیکھ کر اس خیال سے کہ شاید یہ تیرے ہی قدموں کے نشان ہوں بے چین ہو جاتا ہوں۔ یہ بےخودی اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی میں تیری راہ گزر اور تیرے نقشِ پا سے ناواقف ہوں۔ یہ شعر غالب کے شعر کا چربہ ہے۔

عہدِ خزاں میں رفتۂ آشوبِ ہوش ہوں   بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں

رفتۂ آشوبِ ہوش = ہوش کی فتنہ انگیزیوں سے آزاد۔

موسمِ دیوانہ گر = بہار کا موسم جو عاشقوں کے جنوں میں اضافہ کرتا ہے۔

ہماری وحشت فصلِ بہار کی پابند نہیں بلکہ ہم خزاں میں بھی بیگانۂ ہوش ہو جاتے ہیں۔ بہار جو کہ موسمِ دیوانہ گر سمجھا جاتا ہے اس کے آنے اور گزرنے کی تو ہمیں خبر بھی نہیں۔ ہم خزاں میں ہی ہوش کے پھندوں سے آزاد ہو گئے۔

گم گردہ راہ ہوں قدمِ اوّلیں کے بعد   پھر راہ بر مجھے نہ ملا راہ بر کو میں

میں زندگی کی راہوں میں بھٹک گیا۔ میرا ایک قدم تو منزل کی طرف بڑھا تھا مگر اس کے بعد میں راہ بر سے بچھڑ گیا۔ قدمِ اولیں کے بعد ہی راہ بر سے چھوٹ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ شاید اب اسے پہچان بھی نہ سکیں گے اور راہ بر کی حاجت اس بات کی طرف اشارا ہے منزل کی راہ سے ناواقف ہیں۔

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو   پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

جہت آشنا = سمتوں کو جاننے والا۔

شاعر راہِ عشق پر چلنے کے لیے ایسے قدموں کا طالب ہے جو سمتوں کی پابندیوں سے آزاد ہوں۔ اور اس کی خودداری خضر کی راہ نمائی کو بھی قبول نہیں کرنا چاہتی۔ مراد یہ کہ راہِ عشق میں نہ رہ بر کی ضرورت ہوتی ہے نہ راہ اور سمتوں کے تعین کی۔ منزلِ عشق تک پہنچنا عاشق کے اپنے ذوقِ سفر اور ہمت پر منحصر ہے۔

مایوسِ انتظار ہوں ممنونِ اضطراب   ہنستا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

عالمِ جنوں کی کیفیت کی بڑی سچی عکاسی کی ہے۔ شاعر کو مایوسیوں نے گھیر لیا ہے مگر اس کے باوجود اس کے اضطراب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس پر جنون کا غلبہ ہے اور وہ دیوار و در کو دیکھ کر قہقہے لگا رہا ہے۔ یہی کیفیت اس شعر میں بھی دکھائی ہے۔

انتہائے یاس ہے یا عالمِ دیوانگی
ہنس رہے ہیں غم کے ماروں کو نہ جانے کیا ہوا

بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

شامِ غم شاعر نے اپنے دل کو بہلانے کا یہ سامان کیا کہ خود گھر میں آگ لگا دی۔ اسے خیال تھا کہ شاید آگ کی روشنی ہجر کی تاریکی کو کم کر دے مگر نہ تو شامِ غم کے اندھیروں میں کوئی کمی آئی نہ دل کو سکون ہی مل سکا۔ اس پر وہ افسوس کرتا ہے کہ اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو میں گھر کو آگ ہی نہ لگاتا۔ غالبؔ نے کہا ہے:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

دو تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا
شرحِ دراز زندگیِ مختصر کو میں

موت کی چند ہچکیوں نے زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ہمارا عالمِ نزع زندگیِ مختصر کی روداد کی شرح یا تصویر تھا اور اسی شرح کے خاتمہ کے لیے صرف دو تین ہچکیاں کافی ہو گئیں۔ عالمِ نزع کو اپنی زندگی کی شرح کہنے سے یہ اظہار مقصود ہے کہ ہماری ساری زندگی جس عالم میں گزری نزع کی تکلفیں اسی کی ترجمانی یا تشریح کر رہی تھیں۔

فانیؔ دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈھ رہا ہوں اثر کو میں

ایسی دعا سے کیا فائدہ جو محرومِ اثر ہو۔ اسی لیے میں موت کی دعا کرنے سے پہلے اثر کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ جب اثر حاصل ہو جائے گا تو دعائے مرگ بھی مانگ لوں گا۔

(۱۴۶)

دل وقفِ تپش ہے ہائے مگر وجہِ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

ہم ایک زخمی انسان کی مانند ہر وقت تڑپتے اور جلتے رہتے ہیں مگر افسوس کہ ہم اپنے جلنے کی وجہ اور اپنے قاتل کے نام سے بھی واقف نہیں۔ مراد یہ کہ تڑپنا اور جلنا ہماری فطرت میں داخل ہے۔

کس زعم میں ہے اے رہروِ غم دھوکہ میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں

شاعر غم کی راہ پر چلنے والوں سے مخاطب ہے کہ اس فریب میں نہ رہنا کہ تمھیں کبھی منزل مل سکے گی۔ ہم مدتوں اس راہ کی خاک چھان کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس راہ میں کوئی منزل نہیں آتی۔

یہ واہمہ تھا یا مشکل تھی کیوں میں نے کہا کیا نادم ہوں
وہ پوچھتے ہیں کیا مشکل ہے کیا کہیے کہ مشکل کوئی نہیں

عاشق محبوب کے سامنے اپنی پریشانیوں کا بیان کرنے گیا۔ مگر جب اس نے مہربان ہو کر پوچھا کہ تمھیں کیا پریشانی درپیش ہے تو اب لگتا ہے کوئی پریشانی ہی نہیں اور عاشق حیران و نادم ہے کہ کیا جواب دے۔ مراد یہ کہ محبوب کی توجہ ہوتے ہی ساری مشکلات ایک واہمہ کی طرح مفقود ہو گئیں۔

بس ان پہ نہ ان کی یاد پہ ہے تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں
تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں تقدیر سے غافل کوئی نہیں

ہم جانتے ہیں کہ محبوب پر ہمارا کوئی قابو نہیں نہ ہی اس کو بھول جانا ہمارے اختیار میں ہے اور یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی ہم اسے پانے یا بھلانے کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں یہ بھی تقدیر کا ہی ایک کرشمہ ہے۔

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کو ساحل کوئی نہیں

محبت ایک ایسا دریا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں لیکن یہ دریا بجائے خود ایک ساحل سے کم نہیں۔ اس دریا کی جو موج ڈبو دے وہ ہی ساحل بن جاتی ہے ورنہ اس دریا کا ساحل معدوم ہے مراد یہ کہ عشق میں کامیابی یا تکمیل حاصل کرنے کے لیے فنا ہونا لازمی ہے۔ عاشق کے لیے عشق میں فنا ہونا ہی ساحلِ مقصود ہوگا۔

کرشیشہ و ساغر بادہ و ساقی گل اور شمع سے قطع نظر
محفل میں یہ رونق کس کی ہے جب صاحبِ محفل کوئی نہیں

دنیا کی محفل میں بے شمار رنگینیاں موجود ہیں جو تجھے اپنی جانب بلائیں گی مگر تجھے ان رنگینیوں سے قطع نظر کرکے اُس ہستی کی تلاش کرنا چاہیے جو ان سب سے بالا و برتر ہے اور ان کی رنگینی و حسن کا سبب اور سرچشمہ ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ان جلوہ ہائے مجاز کی جان کوئی اور ہی ذات ہے۔

خود حسن کمالِ حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق مآلِ عشق ہے یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

فانی نے اس شعر میں ایک گہری حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن ایک صفت کمال ہے جو بجائے خود مکمل ہے اور اپنی تکمیل کے لیے کسی وسیلہ کا محتاج نہیں۔ اس کے برعکس عشق مسلسل طلب و جستجو کا نام ہے جس کی کہیں انتہا نہیں ہوتی۔ یا دوسرے لفظوں میں حسن کا شمار اعیانِ ثابتہ[1] میں ہے جو اپنی جگہ مکمل و کامل ہے۔ لیکن عشق ایک مسلسل جدوجہد یا طلب ہے جو ہمیشہ جاری رہتی ہے لیکن تکمیل کی منزل کو کبھی نہیں پہنچتی۔ اور حسن نام ہے تکمیل کا جب کہ عشق میں کامل ہونا ممکن نہیں۔

گو جلوۂ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

---

[1] یہاں فانی کی شاعری از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

"اعیانِ ثابتہ ESSENCES EXISTING IN THE MIND OF GOD۔ یہاں ایک صوفیانہ نکتہ بیان کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو حکم دیتا ہے کہ کُن (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکم کس کو دیا گیا۔ اگر شے موجود ہے تو معاذ اللہ تحصیل حاصل اور فعلِ عبث ٹھہرتا ہے اور اگر غیر موجود کو دیا گیا ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک چیز موجود بھی نہ ہو اور مامور بھی ہو۔ صوفیہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس حکم کا اطلاق "اعیان ثابتہ" پر ہے یعنی حق تعالیٰ ان معلومات اور تصورات کو ایک اعتباری وجود قبول کرنے کا امر فرماتا ہے جس کو وہ بہ امتثال قبول کر لیتے ہیں اور عالم وجود میں آجاتا ہے۔ یہی ان کے نزدیک تخلیق کا راز ہے۔"

غیب کے معنی ہیں پوشیدہ اور شہود کے معنی ظاہری عالم۔ یہ دونوں تصوف کی اصطلاحیں ہیں صوفیہ غیب سے ذاتِ الٰہی یا حقیقت مطلق مراد لیتے ہیں اور شہود سے تجلیٔ الٰہی۔ سالک کو تمام کائنات میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اور اس کی آخری منزل وہ ہے جہاں غیب و شہود کا فرق مٹ جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ ہم عالم شہود کو جلوۂ غیب مانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غیب کے جلوے ابھی غیب ہی میں ہیں۔ وہ تجلیات (مظاہر) جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں ہماری نظر میں شامل ہیں یا اس کا کرشمہ ہیں ورنہ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم نے ان تجلیات کو حقیقت میں دیکھا ہے۔ اسی خیال کی غالبؔ کے اس شعر میں وضاحت کی گئی ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرقِ مجاز و حقیقت کیا
یہ عرضِ حقیقت ہے وہ حقیقت، ہستی باطل کوئی نہیں

جب ہم نے یہ مان لیا کہ کائنات کی ہر شے میں خدا ہی کا جلوہ ہے اور وہی ہر چیز کی حقیقت ہے تو پھر دنیا کی کوئی شے باطل نہیں رہتی بلکہ ہر چیز حق ہو جاتی ہے۔ گویا مجاز و حقیقت اور حق و باطل کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ مجاز کو بھی اظہارِ حقیقت (عرضِ حقیقت) ہی سمجھنا چاہیے۔ جوہر اور عرض فلسفہ کی اصطلاحیں ہیں جو ذاتِ الٰہی اور کائنات کی دوسری اشیاء کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

فانیؔ ہی وہ اک دیوانہ تھا جو مدت سے پہلے مر جائے
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

زندہ رہ کر زندگی سے بے پروا و بے تعلق ہو جانا اور اس کی دلچسپیوں سے کنارہ کشی کر لینا ان لوگوں کا کام نہیں جو ہوش اور فرزانگی کے مدعی ہیں۔ فانیؔ کی دیوانگی نے موت سے پہلے ہی موت کو گلے لگا لیا ورنہ اہل ہوش کی دنیا میں کسی میں ایسی موت کو پانے کی اہلیت و ہمت نہیں۔

(۱۴۷)

خرابِ لذتِ دیدارِ یار، ہم بھی ہیں
ترے شریکِ دلِ بے قرار ہم بھی ہیں

شاعر اپنے دل کو اپنی ذات سے جدا فرض کر کے اس سے کہہ رہا ہے کہ تیری ہی طرح ہم بھی

محبوب کے دیدار کے مارے ہوئے اور ناکام دید ہیں۔ مراد یہ کہ دل پر جو کچھ گزری ہے وہ صرف دل تک محدود نہیں بلکہ دل کا غم ساری شخصیت پر حاوی ہو چکا ہے۔

نہ دن کو چپ ہیں نہ راتوں کو تری طرح اداس   جلے ہوئے تو چراغِ مزار ہم بھی ہیں

ہم بھی چراغِ مزار کی طرح جل جل کر عمر گزارتے ہیں مگر ہمارے اور اس کے جلنے میں فرق ہے۔ ہم اپنے غم کو سینہ میں چھپائے رہتے ہیں اور نہ تو اس کی طرح دن کو بجھے رہتے ہیں اور نہ راتوں کو اس کی طرح اداس۔ مراد یہ کہ غم تو اوروں کو بھی ملتا ہے مگر کوئی ہماری طرح اسے سینہ میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔

امیدِ مرگ ہے باقی تو ناامید نہیں   کہ اپنی وضع کے امیدوار ہم بھی ہیں

اگر زندگی میں کوئی امید باقی نہ رہے تو ہم مایوس نہیں ہوتے اور امیدِ مرگ کے سہارے جی سکتے ہیں۔ ہماری امیدواری کا یہ منفرد انداز ہے جسے ہم نے بڑی وضعداری کے ساتھ نبھایا ہے۔

کسی کی بزمِ طرب میں کچھ ایک شمع نہیں   حریفِ گریۂ بے اختیار ہم بھی ہیں

حریف = مقابل، مدعی

محبوب کی بزمِ طرب میں صرف شمع ہی آنسو نہیں بہاتی بلکہ ہم بھی بے اختیار آنسو بہانے پر مجبور ہیں۔ یعنی رونے میں ہم شمع سے کم نہیں۔ بزمِ طرب میں آنسو بہانے کے خیال نے شعر میں دوہرا اثر پیدا کر دیا ہے۔

ادھر بھی دیدۂ عبرت نگاہ ایک نظر   کہ عہدِ شوق کی اک یادگار ہم بھی ہیں

عشق کے حادثات نے ہم کو نمونۂ عبرت بنا دیا ہے اور ہماری تباہ حالی ہمارے گزرے ہوئے عہدِ شوق کی عبرتناک یادگار ہے۔ اگر کوئی چاہے تو اس سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔

یہاں بھی ہے دلِ آگاہ وقفِ لذتِ درد   خرابِ مستیِ عیشِ خمار ہم بھی ہیں

خمار = نشہ ٹوٹنے کی کیفیت جو تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔

شاعر غم کی عظمت و اہمیت سے آگاہ اور درد و غم کا اس قدر خواہش مند ہے کہ میخانہ میں بھی وہ سرور حاصل کرنے کے لیے نہیں جاتا بلکہ اپنی اسی خواہش کی تسکین کے لیے جاتا ہے اور خمار کی حالت

میں جو اذیت اور سرگرانی ہوتی ہے اسے وہ عیش سمجھتا ہے اور اس کی مستی کا دلدادہ ہے۔

زمینِ گورِ غریباں پہ اک جگہ نہ ٹھہر
یہیں کہیں نگہِ شرمسار ہم بھی ہیں

محبوب گورِ غریباں کی طرف آیا ہے اور اپنے کشتوں کی قبروں پر شرمندگی سے نظریں گاڑے کھڑا ہے۔ عاشق اس کی شرمسار نگاہوں سے کہتا ہے کہ اس طرح ایک جگہ نہ ٹھہر۔ ہم بھی اس خاک میں دفن ہیں۔ اشارہ یہ کہ تیری شرمسار نگاہیں ہمیں قبر میں بھی بے قرار کر دیں گی۔

حجابِ ہوش اٹھا اب کوئی حجاب نہیں
خیالِ یار سے اب ہمکنار ہم بھی ہیں

ہوش یا احساس جو ہمارے اور محبوب کے درمیان پردہ بنا ہوا تھا درمیان سے ہٹ گیا ہے اور بے خودی کی بدولت ہم اس کے خیالوں سے ہم آغوش ہیں۔

جنوں نے دی ہمیں راحت وگرنہ اے فانیؔ
نشانۂ المِ روزگار ہم بھی ہیں

جنون کی بدولت ہمیں دنیا کے آلام و مصائب سے نجات مل گئی ہے اور دل کو کوئی غم نہیں رہا۔ ورنہ زمانے کے مصائب ہمیں بھی اپنا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ بقولِ حسرتؔ:

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

(۱۴۸)

چھائی ہوئی ہیں دل پر اسرار کی گھٹائیں
رحمت کی بجلیوں سے معمور ہیں فضائیں

عشق نے ہمیں وہ عارفانہ نظر بخشی ہے کہ اسرارِ حقیقت گھٹاؤں کی طرح ہمارے دل پر چھائے ہیں یعنی دل پر حقیقت کے راز کھل رہے ہیں اور فضا میں چاروں طرف برقِ تجلی کوندتی محسوس ہو رہی ہے۔

رہ جائے کیوں فنا کا ہنگامہ نامکمّل
کچھ میری زندگی سے لے لیجیے بلائیں

موت کے ہنگاموں میں وہ آفات اور آلام نہیں جو میری زندگی میں ہیں۔ اگر محبوب موت کے ہنگامے کی تکمیل چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ میری زندگی سے کچھ مصائب لے کر اس میں شامل کر دے۔

ہاں اے یقینِ وعدہ دامن ترا نہ چھوٹے   یہ آسرا نہ ٹوٹے وہ آئیں یا نہ آئیں

محبوب خواہ اپنے وعدہ پر آئے یا نہ آئے، اس کے وعدہ پر یقین رہنا چاہیے کہ یہ آسرا ابھی عاشق کے لیے بہت ہے۔

دیکھوں سُنا کرو گے بیگانہ وار کب تک   تم میری حسرتوں کی خاموش التجائیں

میری خاموشی جو محبوب سے فریاد کر رہی ہے۔ محبوب اس کی طرف سے تغافل برت رہا ہے لیکن میری یہ التجائیں کب تک بے اثر رہیں گی۔ کبھی تو تم پر ان کا اثر ہوگا۔ اپنی آہوں کے اثر پر بھروسہ قابلِ لحاظ ہے۔

انصاف چاہتا ہوں انصاف ہو رہے گا   بیداد گر یہ آہیں خالی کہیں نہ جائیں

اے ظالم ہماری آہوں سے ڈر۔ اگر تو نے ہمارے ساتھ انصاف نہ کیا تو خدا تو انصاف کرے گا اور ہماری یہ مظلومی رنگ لا کر رہے گی۔

کہتے جو دردِ دل کو تم دردِ دل سمجھتے   افسانہ کیا سُنو گے افسانہ کیا سُنائیں

محبوب عاشق کے دردِ دل کو دل لگی سمجھتا ہے اور تفریح کی خاطر اس سے دردِ دل کی روداد سُننا چاہتا ہے۔ شاعر بڑی بے بسی سے کہتا ہے کہ اگر تم ہمارے درد کو درد سمجھتے تب تو تمھیں اپنی روداد سُنانے سے کچھ حاصل بھی ہوتا۔ تم تو اسے افسانہ سمجھتے ہو تو ہم تمھیں یہ داستان کس امید پر سنائیں۔

وہ منفعل نگاہیں کیا کہہ گئی ہیں فانیؔ   شرمندۂ اثر ہیں روٹھی ہوئی دعائیں

شرمندۂ اثر = اثر کی احسان مند۔

محبوب نے ایسی پشیمان نظروں سے عاشق کی طرف دیکھا ہے کہ اسے اپنی بے اثر دعائیں مقبول ہوتی نظر آ رہی ہیں۔

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخمِ دل پیدا کریں یا زخمِ دل اچھا کریں

ایک طرف محبوب عاشقوں کا قاتل ہے اور دوسری طرف اس میں مسیحائی کا اعجاز بھی اور اسے خود ہی اپنے مارے ہوؤں کو اچھا بھی کرنا پڑتا ہے لہٰذا وہ بڑی مشکل میں پڑ گیا ہے کہ اپنی ایک صلاحیت کو کام میں لائے یا دوسری کو۔

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج اے اشکِ ندامت آ تجھے دریا کریں

ہمارا دامن دل گناہوں سے آلودہ ہو گیا ہے۔ ہمیں دل کی یہ آلودگی گوارا نہیں۔ اس لیے ہم اپنے ندامت کے اشکوں کے ہر قطرے کو دریا کی سی وسعت دینا چاہتے ہیں تاکہ دل کی یہ آلودگی دور ہو جائے۔ مراد یہ کہ ہمارے گناہوں کا دھونا اس صورت میں ممکن ہے کہ آنکھوں سے اشکِ ندامت کے دریا بہا دیئے جائیں۔

جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

اس شعر میں فانی نے جبر و اختیار کے مسئلہ پر بڑے دلنشیں انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ شاعر خداوند تعالیٰ سے عرض کرتا ہے کہ تو نے بہ ظاہر ہمیں اختیار اور آزادی عطا فرمائی ہے لیکن یہ آزادی صرف ظاہری جسم کی مانند ہے جس میں مجبوری کی روح پھونکی گئی ہے۔ آزادی کا احساس خود فریبی ہے ورنہ ہمارا ہر عمل تیری مرضی کا تابع ہے۔ ہم تجھ سے شکایت نہیں کرتے۔ تو نے جو چاہا کیا مگر ہمیں یہ تو بتا دے کہ ہم اس تضاد کو کیوں کر نباہیں کہ بہ ظاہر آزاد ہیں اور بہ باطن مجبور۔ شعر کا حسن اس کے عاجزانہ لہجہ میں پوشیدہ ہے۔

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسمِ گل آ گیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں

عاشقِ دیوانہ جو موسمِ بہار میں گلستاں سے دور زنداں میں مقید ہے خود سے کہتا ہے کہ بہار آگئی ہے۔ ہم زنداں میں بیٹھے بیٹھے ہی بہار کا کچھ لطف اٹھائیں اور اپنے خون کے چھینٹوں سے زنداں کی دیواروں پر پھولوں کے خاکے بنا کر زنداں کو لالہ زار بنالیں۔ محض خون کے چھینٹوں سے لطف اندوز ہونے کی تمنا مایوسی اور غم کا دوسرا پہلو ہے۔

جا بجا تغیرِ حالِ دل کے چرچے ہیں تو ہوں
ہم ہوئے رسوا مگر اب ہم کسے رسوا کریں

ہماری محبت کا چرچا اگر لوگوں کی زبانوں پر آگیا ہے اور ہماری داستانِ محبت رسوا ہو چکی ہے تو ہوا کرے۔ اب اس کا ازالہ تو ممکن نہیں لیکن ہمیں یہ گوارا نہیں کہ اپنے ساتھ محبوب کو بھی بدنام کریں۔

ہاں نہیں شرطِ مروت حسرتِ تاثیرِ درد
رحم آ ہی جائے گا ان سے تقاضا کیا کریں

ہمارے درد و غم کا محبوب پر کوئی اثر نہیں پھر بھی ہم ان سے رحم کا تقاضا نہیں کرتے کہ یہ آداب مروت سے دور ہے۔ بس اس سہارے پر وقت گزار رہے ہیں کہ اسے کبھی نہ کبھی تو ہماری حالت پر رحم آئے گا۔

شوقِ نظّارہ سلامت ہے تو دیکھا جائے گا
ان کو پردہ ہی اگر منظور ہے پردا کریں

محبوب کا حسن پردے میں ہے تو ہونے دو۔ اگر ہماری خواہشِ دید میں اثر ہے تو ہم اس کو ہزاروں پردوں میں بھی دیکھ لیں گے۔ اپنی شدتِ شوق پر اعتماد قابلِ داد ہے۔

ظرفِ ویرانہ بقدرِ ہمتِ وحشت نہیں
لاؤ ہر ذرّہ میں پیدا وسعتِ صحرا کریں

ہماری وحشت کے لیے ویرانہ کا دامن بھی تنگ ہے۔ ضروری ہے کہ صحرا کے ہر ذرّہ میں صحرا کی سی وسعت پیدا ہو تاکہ ہماری وحشت کا اظہار کھل کر ہو سکے۔

مرگِ بے ہنگام فانیؔ وجہِ تسکیں ہو چکی
زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں

فانیؔ تم زندگی سے گھبرا کر موت کے طلبگار ہو حالانکہ تمھاری تسکینِ قلب کے واسطے مرگِ ناگہاں بھی ناکافی ہے۔ ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(۱۵۰)

دل کی ہر لرزش مضطر پہ نظر رکھتے ہیں   وہ مری بے خبری کی بھی خبر رکھتے ہیں

محبوب کی عنایت اور مہربانی کا یہ حال ہے کہ اسے ہمارے دل کی ایک ایک لرزش کا علم ہے اور عالمِ بے خودی میں جب ہمیں خود اپنی خبر نہیں رہتی وہ اس وقت بھی ہماری حالت سے باخبر ہوتا ہے۔

درد میں لطفِ خلش کیفِ کشش پاتا ہوں   کیا وہ پھر عزم تماشائے جگر رکھتے ہیں

شاید محبوب پھر ہمارے درد جگر کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے تب ہی تو درد کی خلش میں ایک لذت اور کشش سی محسوس ہو رہی ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ درد جگر اس کی نظروں کی پذیرائی کے لیے تیار ہے۔

جس طرف دیکھ لیا پھونک دیا طور مجاز   یہ ترے دیکھنے والے وہ نظر رکھتے ہیں

کوہِ طور تجلیٔ الہی کی تاب نہ لا کر جل گیا تھا لیکن یہاں طالبانِ دید کی نظر ہی عالم مجاز کو طور کی طرح پھونک دینے کو کافی ہے یعنی عاشقانِ کامل کی نظر محبوب کے جلوؤں کی حامل ہوتی ہے اس لیے عالم مجاز کا ان کی نظروں سے جل کر خاک ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

خود تغافل نے دیا مژدۂ بیداد مجھے   اللہ اللہ مرے نالے بھی اثر رکھتے ہیں

میرے نالوں سے اتنا تو اثر ہوا کہ محبوب کے تغافل نے مجھے جور و ستم کی نوید دی ہے یعنی اس نے تغافل ترک کر کے ستم شروع کر دیا ہے۔

بے بسی دیکھ یہ سو بار کیا عہد کہ اب   تجھ سے امید نہ رکھیں گے مگر رکھتے ہیں

محبت میں دل اس قدر مجبور و بے بس ہے کہ سیکڑوں بار یہ عہد کر کے کہ اب تجھ سے کوئی امید نہ رکھیں گے۔ مگر پھر ہم تیرے وعدہ کی آس باندھ لیتے ہیں۔

ہے ترے در کے سوا کوئی ٹھکانہ اپنا   کیا کہیں تیرے اُجاڑے ہوئے گھر رکھتے ہیں

ہماری خانہ ویرانی تیری ہی نوازش کا نتیجہ ہے۔ اب تیرے آستانہ کے علاوہ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تیرے در کو چھوڑ کر ہم جا بھی کہاں سکتے ہیں۔

کوئی اس جبرِ تمنا کی بھی حد ہے فانیؔ   ہم شبِ ہجر میں اُمیدِ سحر رکھتے ہیں

انسان امیدیں قائم کرنے پر مجبور ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی اُمید کبھی پوری نہیں ہوگی وہ امید باندھتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم شبِ ہجر میں بھی صبح کی اُمید کر رہے ہیں جس کا ہونا ممکن ہی نہیں۔

(۱۵۱)

مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں   ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

زندگی میں محبوب کی یاد سے دامن چھڑانا ممکن نہ تھا اور نہ دل کی بیقراری ہی کم ہوتی تھی۔ اس بیقراری کو دور کرنے کی ہم نے یہ تدبیر کی ہے کہ زندگی کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح تیرے خیال کو بھی دل سے نکال دیا اور دل کو بھی سنبھال لیا۔

بے زار ہو نہ جائے کہیں زندگی سے دل   تاثیر سے خفا مرے نالے ہوئے تو ہیں

میرے نالے اثر سے خفا ہو گئے ہیں یعنی اب ان میں اثر نہیں رہا۔ ڈر ہے کہ میرا دل بھی زندگی سے بے زار ہو کر موت کے دامن میں پناہ نہ ڈھونڈ لے۔ مراد یہ کہ مایوسی میں موت ہی آخری سہارا ہوتی ہے۔

ہاں دردِ عشق ان پہ کرم کی نظر رہے   صبر و قرار تیرے حوالے ہوئے تو ہیں

اے دردِ عشق آج ہم اپنے صبر و قرار کو تیرے حوالے کر رہے ہیں (یعنی اب ہمیں صبر و قرار پر اختیار

نہیں رہا) مگر ذرا ان پہ مہربانی کرنا اور انھیں بالکل برباد نہ کر دینا۔ شعر میں محض تکلف ہے، اور کوئی خاص بات نہیں۔

یہ صحبتیں بھی دیکھیے لاتی ہیں رنگ کیا   مہمانِ خار پاؤں کے چھالے ہوئے تو ہیں

ہمارے پیروں کے چھالوں نے کانٹوں سے دوستی کی ہے اور ان کے مہمان بن گئے ہیں دیکھیے اب آبلہ پائی اور کانٹوں کے اس رابطے کا نتیجہ کیا ہو۔ کانٹوں کی چبھن تکلیف کی زیادتی کا باعث بھی ہو سکتی ہے اور آبلوں کی سوزش سے نجات بھی دلا سکتی ہے۔ راہ کے کانٹوں کو دیکھ کر مسرت کا اظہار شاعری میں عام ہے۔ غالب کہتے ہیں:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں   جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر
اقبال کا شعر ہے: ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا   کم کر گلۂ برہنہ پائی
خود فانی کا شعر ہے: بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے   کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

کیا جانیے کہ حشر ہو کیا صبحِ حشر کا   بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

صبحِ محشر دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ تیرے طالبانِ دید بھی خوابِ عدم سے جگا دیئے گئے ہیں اب دیکھیے قیامت میں کون سی نئی قیامت بپا کریں اور صبحِ محشر کا کیا انجام ہو۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی   سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

ہمارے عمل جبرِ دوست کا نتیجہ ہیں مگر بہ ظاہر ان کو اختیار کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے یعنی مانا کہ ہم مجبورِ محض اور بے اختیار ہیں مگر یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ہم کو بہ ظاہر اپنے اعمال کا مختار اور ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ شعر میں ایک چھپا ہوا طنز بھی ہے کہ ہم مجبورِ محض ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مختار ہیں اس سے زیادہ ستم ظریفی کیا ہو گی۔

(۱۵۲)

پہلوئے زوال ہوں معنیٔ کمال میں   میں ہوں حدِ امتیاز جلوہ و جمال میں

اس شعر میں تصوف کا یہ عقیدہ کام کر رہا ہے کہ کائنات اور ہستیٔ انسان عینِ ذات نہ ہوتے ہوئے بھی مظہرِ ذات ہے۔ میری ہستی حسنِ حقیقی اور اس کے جلوؤں کے درمیان ایک

حد فاصل ہے یعنی اس کا حسن جو کامل اور لازوال ہے وہ پنہاں ہے مگر اس کا اظہار میرے ذریعہ سے ہوا ہے۔ تو اگرچہ میری ہستی فانی اور زوال کی علامت ہے پھر بھی میں اسی کا عکس یا حصہ ہوں۔

بے خودی کدھر گیا وہ حجابِ اضطراب   کیا ہوا جو فرق تھا ہجر اور وصال میں

جب تک عاشق کو احساس تھا اسی وقت تک اسے محبوب سے دوری کا خیال بھی بےچین کیے ہوئے تھا، مگر بے خودی کے آتے ہی تصورِ دوست ہستیٔ دوست میں بدل گیا ہے اور ہجر و وصال میں کوئی امتیاز نہیں باقی رہا۔ شعر میں لطف یہ ہے کہ شاعر اپنی بے خودی سے اُس اضطراب کا حال پوچھ رہا ہے جو اس کے اور محبوب کے درمیان پردہ بنا ہوا تھا اور ہجر و وصال کے درمیان امتیاز کا باعث تھا۔

آدمی میں کچھ نہیں، آپ نے سمو دیا   عالمِ غبار کو عالمِ خیال میں

انسان کی ہستی کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ ایک پیکرِ خاکی ہے اور ساتھ ہی محشرِ خیال بھی۔ کفِ خاک اور عالمِ خیال دو متضاد چیزیں تھیں مگر یہ خالقِ کائنات کا کمال ہے کہ اس نے ان دونوں کو باہم دگر مربوط کر دیا۔

ابتدائے زندگی انتہائے زندگی   آپ کے خیال سے، آپ کے خیال میں

فلسفیوں کے نزدیک زندگی کی اصل ذاتِ الٰہی ہے۔ یہ اسی کے خیالات (اعیان) تھے جنھوں نے مجاز کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس شعر میں فانیؔ نے اسی خیال کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا خیال میری زندگی کی ابتدا کا سبب بنا تھا اس لیے اس کی انتہا بھی یہ ہونی چاہیے کہ آپ ہی کی یاد میں زندگی کا خاتمہ بھی ہو۔

عرضِ ناز راز ہے کثرتِ مجاز کا   آئینے سے اُگ گئے پرتوِ جمال میں

اکثر صوفیہ نے اس مسئلہ کو اٹھایا ہے کہ جب کائنات میں حقیقت صرف ایک ہے تو مجاز کی ان کثرت آرائیوں کا کیا سبب۔ بقولِ غالبؔ:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

فانی اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس کثرت کا وجود اس لیے ہے کہ حسن اپنے ناز کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور اس نے اپنے جمال کا پرتو یا عکس ان متعدد اور مختلف آئینوں میں رکھ دیا ہے جسے ہم عالم کثرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

میرے ہر سوال پر وہ خموش ہی رہے   کیا مرا جواب تھا خود مرے سوال میں

میں محبوب سے عرضِ شوق کرتا رہا مگر ع واں ایک خامشی میری سو کے جواب میں شاید میری عرضِ شوق ہی میں اس کا جواب پوشیدہ تھا جو اس نے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

فانیِ شکستہ دل تو نے کر دیئے جدا   ورنہ ممکنات شوق جذب تھے محال میں

ممکناتِ شوق = محبت کے امکانات۔

محبت کا وجود تو ازل سے ہی تھا مگر اس کا اظہار ہماری ذات سے ہوا۔ ہم نے عشق کے ان امکانات سے سب کو واقف کرا دیا جو ہم سے پہلے ذہنِ انسانی کی رسائی سے پرے تھے۔ گویا ہم نے محال کو ممکن بنا دیا۔

(۱۵۳)

فصلِ خبر بڑھا گئی عمر کے بابِ راز میں   یادِ وصال مختصر مل کے شبِ دراز میں

زندگی ایک پُر اسرار باب تھی۔ محبوب کے مختصر وصل کی یاد نے اس باب میں ایک نئے جزو کا اضافہ کیا اور اسے قابلِ فہم بنا دیا۔ یعنی محبوب کا وصل اگرچہ مختصر تھا مگر اس کی یاد اور ہجر کی طویل رات کے ربط سے ہمیں زندگی کے رازوں کا ایک نیا شعور حاصل ہوا ہے۔

جلوۂ اختیار سے نسبتِ جبر ہے مجھے   شعلۂ آرمیدہ ہوں وادیِ برقِ ناز میں

شعلۂ آرمیدہ = شعلۂ خاموش

یہاں فانی نے جبر و اختیار کے تضاد کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنی مجبوری کی بدولت ہمیں محبوبِ حقیقی کے جلوۂ اختیار سے ایک خاص نسبت اور تعلق ہے۔

مجھے اس سے وہی نسبت ہے جو شعلۂ خاموش اور برق تپاں میں ہے۔ شعلہ اپنے وجود کے لیے دوسری اشیاء کا محتاج ہے اور بجلی آزاد ہے اس کی تابانی بے منت غیر ہے۔

بے اثری مجھے قبول ایسے اثر کو کیا کروں
اب تو خدا اثر نہ دے آہِ اثر گداز میں

آہِ اثر گداز = ایسی آہ جس سے اثر بھی پگھل جائے۔

میری آہوں میں اثر پیدا ہوا تو ایسا کہ آہ کے شعلوں نے اثر کو ہی پگھلا دیا (فنا کر دیا) اس سے تو آہوں کا بے اثر رہنا ہی بہتر تھا۔

ہم نہ ازل سے آج تک سجدہ سے سر اُٹھا سکے
چھپ رہے جلوہ ہائے دوست کب کے حریمِ ناز میں

روزِ ازل ہم نے محبوب (حقیقی) کی ایک جھلک دیکھی تھی اور بے اختیار سجدہ میں گر پڑے تھے۔ اس کے جلووں نے ہمیں ایسا سرشار کیا تھا کہ آج تک ہمارا سر سجدہ سے نہیں اُٹھ سکا ہے حالانکہ اُس کے جلوے مدت ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو کر خلوت میں چھپ چکے ہیں۔

حشر میں حشر چاہیے حشر پہ حشر چاہیے
دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیہ نیاز میں

ناصیہ نیاز = عاشق کی عقیدت سے معمور پیشانی۔

خدائے تعالیٰ نے قیامت کے دن اپنا دیدار دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ میری پیشانی میں اتنے سجدے بیتاب ہیں کہ ان کے لیے ایک حشر کا دن کافی نہیں ہوگا بلکہ پے در پے کئی حشر درکار ہوں گے۔

چشم براہِ یار ہوں منتظرِ فشار ہوں
سبزۂ رہ گزار ہوں عالمِ عرضِ ناز میں

فشار = خرابی، تباہی

محبوب کا جلوہ عاشق کے لیے پیامِ زندگی بھی ہے اور فنا کا پیغام بھی۔ ہم محبوب کے خرامِ ناز کے منتظر ہیں۔ ہم اس کا انتظار نہیں کر رہے بلکہ اپنی بربادی اور پامالی کے منتظر ہیں کہ کب وہ اس راہ پر چلتا ہوا آئے اور ہمیں سبزۂ راہ کی طرح اپنے ناز و ادا سے پامال کر دے۔

چارہ تپ فراق کا شکر نہیں تو کچھ نہیں
بوئے مزاج یار ہے نبضِ بہانہ باز میں

فراقِ یار کی تپش سے ہمارا بدن جل رہا ہے اور نبض تیزی سے چل رہی ہے۔ اس تیزی میں ہمیں محبوب کے مزاج کی تیزی کا پرتو نظر آ رہا ہے اس لیے اب تپ ہجر کا علاج کرنے کی بجائے اس کا شکر کرنا چاہیے۔ غالب اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں

عالمِ درد کا نظام آکے ذرا الٹ نہ دو
عشق سے فرق آگیا حُسن کے امتیاز میں

عشق کے وجود میں آنے سے پہلے صرف حُسن ہی حُسن تھا لیکن جب عشق وجود میں آیا تو حُسن کی شانِ امتیاز جاتی رہی۔ یعنی اس کے سوا دوسری اشیاء بھی وجود میں آئیں۔ اس لیے شاعر محبوب سے التجا کرتا ہے کہ تم ذرا ایک بار اپنا جلوہ بے نقاب کر دو تو حُسن و عشق کا فرق مٹ جائے۔ عشق (درد) فنا ہو کر حُسن ہی حُسن باقی رہ جائے۔

بنیادی تصوّر۔ کائنات میں حقیقی وجود صرف خدا کا ہے۔ اگر اس حقیقت کا علم ہو جائے تو پھر امتیاز من تو بھی ختم ہو جاتا ہے۔

زہر ہے یا دوائے دل وہ یہ کہ موت ہے قریب
رعشہ مری نظر میں ہے یا کفِ چارہ ساز میں

چارہ گر بیمارِ عشق کو دوا دے رہا ہے، اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اس لرزش کو دیکھ کر بیمار کے دل میں کئی خیال آتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ چارہ گر اس کی دگرگوں حالت سے متاثر ہو کر دوا کی بجائے زہر دے رہا ہے اس لیے اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ یا پھر عالمِ نزع ہے اور موت قریب ہے جس کی وجہ سے اس کی نظروں میں رعشہ ہے۔ یا پھر محبوب اس کی عیادت کو آ رہا ہے اور اس کے قرب کے احساس سے نظریں بے قابو ہو رہی ہیں۔

فانیٔ زار کا ہوا خیر سے خاتمہ بخیر
عمر تمام ہو گئی عشق کے سوز و ساز میں

فانی جو تمام عمر عشق کے آلام و مصائب سہتا رہا، آج انہی مصائب نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ شکر ہے کہ اس کا خاتمہ بخیر ہوا یعنی اس نے ثابت قدمی سے مصائب کو برداشت کیا اور ان سے منحرف نہ ہوا۔

شکرِ فریاد سے فارغ لبِ فریاد نہیں
اس تکلف سے ہے بیداد کہ بیداد نہیں

محبوب کی بیداد میں بھی وہ حسن اور لطف ہے کہ اسے بیداد نہیں کہا جا سکتا۔ اور عاشق کے لبوں پر جو فریاد ہے وہ دراصل فریاد یا شکایت نہیں بلکہ اس بات کا شکر ہے کہ محبوب نے عاشق ہی کو اس کا مستحق قرار دیا۔ اس کے لب ہر وقت اس بات کا شکر ادا کرتے ہیں۔

جی چمن ہی میں لگا اور نہ قفس میں بہلا
نالہ بے قید نہیں زمزمہ آزاد نہیں

چمن میں رہ کر نالے کرنا رسمِ گلستاں کے خلاف ہے۔ اسی طرح قفس میں بھی نغمہ سرائی کی اجازت نہیں۔ شاعر ہر طرح کی رسم پرستی سے بیزار ہے اس لیے اس کا دل نہ چمن میں لگتا ہے نہ قفس میں۔ کیونکہ چمن میں اسے نالے کرنے کی آزادی نہیں اور قفس میں نغمہ سرائی پر پابندی ہے۔ ع : ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔ اس میں اشارہ یہ بھی ہے کہ فانی کے غم اور خوشی کے نظریات عام انسانوں سے مختلف ہیں۔

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تو
میں بہ عنوانِ تجلّی بھی تجھے یاد نہیں

اگرچہ ہم تیرے جلووں سے محروم ہیں لیکن نظارے کی وساطت کے بغیر بھی تیرے جلوے ہر دم ہماری آنکھوں میں سمائے رہتے ہیں اور ہم نے تجھے فراموش نہیں کیا لیکن افسوس تو نے ہمیں بھلا دیا اور اُن پچھلی نوازشوں کے حوالے سے بھی تو نے ہمیں یاد نہ رکھا جو تجلّی کے ذریعہ تو نے ہم پر کی تھیں۔ مراد یہ کہ دلِ عاشق وہی ہے مگر محبوب کی نظر بدل گئی ہے۔

دلِ مشتاق ہے اور بے حسیٔ شدتِ شوق
اب یہ گھر تیرے تصوّر سے بھی آباد نہیں

شدت شوق نے ہمارے دل کو اس طرح پامال کیا ہے کہ اب اس میں محبوب کا تصور

بھی باقی نہیں رہا۔ بقولِ غالب :

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں   آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غم باندازۂ غلط، عیش باندازہ حرام
دے مجھے وہ دلِ آگاہ کہ ناشاد نہیں

شاعر ایسی خوشی اور ایسے غم کو اپنے لیے حرام سمجھتا ہے جس کا کوئی اندازہ مقرر ہو۔ وہ ایسے دلِ آگاہ کا خواہش مند ہے جو غم اور خوشی سے بے نیاز اور ہر حال میں یکساں طور پر مطمئن رہے۔

تیرے ناکام کا ہوتا ہے کہیں کام تمام
نیشِ غم ہے یہ کوئی تیشۂ فرہاد نہیں

فرہاد نے ناکامیٔ محبت کے باعث تیشہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا تھا اور تمام غموں سے نجات پا گیا۔ لیکن تیرے ناکام محبت کے غموں کا خاتمہ موت بھی نہیں کر سکتی۔ نیشِ غم ان کی زندگی کو اذیتوں سے گرانبار تو کر دیتا ہے مگر تیشۂ فرہاد کی طرح انھیں غموں سے آزادی نہیں دلاتا۔ فرہاد کے مقابلہ میں اپنی برتری کا اظہار ہے۔

کون سمجھے اثرِ جلوۂ مستور کا راز
جو سُنی جائے محبت کی وہ روداد نہیں

جلوۂ مستور = چھپا ہوا جلوہ۔ جلوۂ الٰہی۔

محبوب کے حُسنِ پنہاں نے ہمارا کیا حال کیا ہے اس کی حقیقت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ محبت کی روداد ایسی نہیں جو الفاظ میں بیان ہو سکے۔

آشیاں پر کرمِ برق کی باری آئی
مژدہ اے ذوقِ بلا باغ میں صیّاد نہیں

ہماری غم نصیبی کا تقاضا ہے کہ کوئی نہ کوئی بلا ہمارے آشیاں کو گھیرے رہے۔ صیّاد جو آشیاں کو اُجاڑنے کی فکر میں تھا چلا گیا تو کیا ہے اب بجلیاں آکر آشیانہ کو جلائیں گی۔ اس کا جانا ہماری

اذیت کوشی کے لیے مبارک ہے۔

صرفِ عبرت ہے ہر افسانۂ ہستی فانؔی
حرفِ حسرت کے سوا عالمِ ایجاد نہیں

انسان کی وہ تمنائیں جو پوری نہیں ہوتیں حسرت بن جاتی ہیں۔ فانؔی کے نزدیک زندگی غموں اور ناکامیوں کا نام ہے۔ یہ عالم حسرتوں سے عبارت ہے اور یہاں ہر زندگی پر حسرتوں کی حکمرانی ہے۔

(۱۵۵)

فرقت میں تارِ اشک ہے ہر تارِ آستیں
ہر داغ خوں ہے دیدۂ خونبار آستیں

محبوب کی جدائی میں ہم نے اتنے اشک بہائے ہیں کہ آستین کا ہر تار بھیگ کر تارِ اشک کی مانند ہوگیا ہے (جب کوئی دوسرا آنسو پونچھنے والا نہ ہو تو آنسو آستین سے پونچھ لیے جاتے ہیں) اور خون کے آنسو رونے میں جو داغ آستین پر پڑے ہیں ان سے بھی اس طرح خون ٹپک رہا ہے گویا یہ داغ نہیں آستین کی خونبار آنکھیں ہیں۔ شعر میں مبالغہ ہے۔

رکھ پنجۂ جنوں سے سروکار آستیں
کب تک رہیں گے ہاتھ گرانبارِ آستیں

وحشت کا تقاضا ہے کہ آستین کی دھجیاں اُڑا دی جائیں اور ہاتھوں کو آستین کے بوجھ سے نجات دلا دی جائے۔

کل تک جو ہاتھ چشم و چراغِ جنوں رہا
ہے آج فرطِ ضعف سے آزارِ آستیں

کل تک میرا ہاتھ جنون کا چشم و چراغ یا مددگار بنا ہوا تھا یعنی دامن و آستین کو چاک کر دیا کرتا تھا مگر آج ضعف سے یہ حال ہے کہ وہی ہاتھ آستین کے لیے مصیبت بن گیا ہے۔

انبار آنسوؤں کے ہیں خونِ جگر کے ڈھیر
معمور ہے خزانۂ سرکار آستیں

میری آستینیں یسی حکومت کے مانند ہیں جس کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ آنسوؤں اور خونِ جگر کو آستینوں کا خزانہ کہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مجھے کبھی رونے سے فرصت نہیں ملتی اور اپنے آنسوؤں کو آستین سے پونچھتا رہتا ہوں جس کی وجہ سے دامن آنسوؤں سے (جس میں خونِ جگر شامل ہے) بھرا رہتا ہے۔ اپنی اشک باری کی شدت اور بے بسی کو مصنوعی انداز میں بیان کیا ہے۔

(۱۵٦)

میری آشفتہ حالیاں نہ گئیں   دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں

ہمارا دل اس قدر نازک مزاج ہے کہ اس کی نظر میں غم کے سوا کوئی چیز سماتی ہی نہیں۔ نہ ہمارے دل کی یہ عادت کم ہوئی اور نہ ہماری پریشانی اور آشفتہ حالی ہی گئی۔ مراد یہ کہ ہمارے غموں کا اصلی سبب خود ہمارا دل ہے۔

دل حریفِ زوالِ غم نہ ہوا   عشق کی بے کمالیاں نہ گئیں

بے کمالی و بے ہنری عشق کا شیوہ ہے۔ دلِ عاشق اسی بے کمالی کی بدولت کبھی زوالِ غم سے مقابل نہ ہوا بلکہ غم کو قبول کیے رہا۔ مراد یہ کہ عشق کی بے کمالی ہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔

موت بھی زندگی کی حد نہ رہی   غم کی بے اعتدالیاں نہ گئیں

موت کو عموماً زندگی کی انتہا یا انجام مانا جاتا ہے مگر غمِ عشق اس کو آخری حد نہیں مانتا اور اس سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر بے اعتدالی اور کیا ہوگی۔ مراد یہ کہ موت خواہ زندگی کا انجام ہو عشق کا انجام ہرگز نہیں ہے۔

میری شیوا نگاہیاں جائیں   تیری رسوا جمالیاں نہ گئیں

شیوا نگاہی = وہ نظر جو حُسن کو دیکھ سکتی ہو۔

محبوب نے اپنے جلووں کو ہر طرف عام اور ارزاں کر رکھا ہے۔ جب اس کی یہ عادت نہیں جاتی تو ہماری وارفتہ نگاہی کیونکر ختم ہو سکتی ہے۔ شیوا نگاہی اور رسوا جمالی کی ترکیب میں نیا پن ہے۔

عشق بے گانۂ مجاز رہا
حُسن کی بے مثالیاں نہ گئیں

حسنِ محبوب بے مثال تھا اور بے مثال ہے۔ مجاز چاہے کتنے ہی فریب کیوں نہ دے عشق اس کے دھوکے میں نہیں آ سکتا۔ یعنی عالمِ مجاز کی دلفریبیاں عارفوں کو گمراہ نہیں کر سکتیں۔

ہوش میں لاکھ انقلاب آئے
عقل کی خستہ حالیاں نہ گئیں

ہوش و خرد کی دنیا میں بے شمار انقلابات آئے اور عقل کو زندگی پر تسلّط و غلبہ بھی حاصل ہوا مگر اسرارِ حقیقت کا سراغ لگانے میں اس کی بے بسی و واماندگی آج بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔

موت بھی آ ہی جائے گی فانیؔ
تیری محزوں خیالیاں نہ گئیں

فانیؔ تو موت کی آرزو میں بے کار غمگین رہتا ہے۔ موت کو جب آنا ہے اسی وقت آئے گی۔ محزوں خیالی کی ترکیب نئی ہے۔

(۱۵۷)

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

زندگی جبر ہے مگر عجیب بات ہے کہ اس جبر کے آثار نظر نہیں آتے جو ثبوت میں پیش کیے جا سکیں۔ شاعر زندگی کو ایک ایسی قید سے تشبیہ دیتا ہے جس کے لیے زنجیر کی بھی ضرورت نہیں یعنی جو بظاہر آزادی سے مشابہ ہے۔ انسان مجبور و بے بس ہے مگر اسے اختیار و آزادی کے دھوکے میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔

بے ادب گریۂ محرومیٔ دیدار نہیں
ورنہ کچھ در کے سوا حاصلِ دیوار نہیں

اگر ہم دیدارِ محبوب سے محرومی پر آنسو بہانے پر آئیں تو ان آنسوؤں کے سیلاب کے آگے دیوار کی کوئی حیثیت نہیں اور اس میں در پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں مگر کیا کریں کہ محبوب کا ادب و احترام حائل ہو جاتا ہے۔

آسماں بھی ترے کوچہ کی زمیں ہے لیکن
وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

اس مشابہت کی بنا پر کہ آسمان بھی فتنے نازل کرتا ہے اور کوچۂ محبوب کی زمین بھی فتنہ خیز ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ویسے تو دونوں بہت ملتے جلتے ہیں لیکن ایک فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ آسمان کے پاس تیری دیوار کا سایہ نہیں ہے جس میں عاشق کو ہر مصیبت راحت معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ ہمیشہ ادنیٰ کو اعلیٰ سے دی جاتی ہے۔ یہاں بھی شاعر آسمان کو کوچۂ محبوب سے مثال دے کر یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ آسمان کے پاس وہ فتنے نہیں جو اس میں ہیں۔

ہائے دنیا! وہ تری سرمہ تقاضا آنکھیں
کیا مری خاک کا ذرّہ کوئی بے کار نہیں

دنیا نے زندگی بھر ہمیں چین نہ لینے دیا اور مرنے کے بعد بھی اسے یہ منظور نہیں کہ ہماری خاک آرام سے رہ سکے۔ بلکہ وہ اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہتی ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ہماری خاک کو لوگ آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔ شعر کے الفاظ خیال سے ہم آہنگ نہیں اور یہ پتہ نہیں کہ شاعر کو اس بات پر فخر ہے یا خوشی۔ 'سرمہ تقاضا آنکھیں' کی ترکیب قابلِ غور ہے۔

(۱۵۸)

نم ہے ہر ذرۂ خورشید اثر کا دامن
کم ہے آج آنکھ میں اک قطرۂ دریا دامن

ذرۂ خورشید اثر = وہ ذرّہ جس میں خورشید کی خصوصیت ہو۔ قطرۂ دریا دامن = دریا کی سی وسعت رکھنے والا قطرہ۔

ہمارے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ دریا کی سی وسعت رکھتا ہے۔ آج ایک قطرہ کم ہے اور

شاید آنکھوں سے ٹپک پڑا ہے جو کائنات کے تمام تپتے ہوئے ذرّے نم اور بھیگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذرۂ خورشید اثر اور قطرۂ دریا دامن فانی کی اپنی وضع کی ہوئی ترکیبیں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ عاشق کے آنسو ساری خدائی کو غرق کر سکتے ہیں۔

یہ میرے دستِ تظلّم کی رسائی یہ نصیب
ہجر میں دامن دل، حشر میں ان کا دامن

دستِ تظلّم = فریاد کا ہاتھ۔

ہمارے دستِ فریاد کی رسائی اور مقدّر تو دیکھو کہ جو ہاتھ ہجرِ محبوب میں اپنے دل کے سوا اور کسی پر دسترس حاصل نہ کر سکا تھا حشر میں محبوب کے دامن تک پہنچ گیا۔ یعنی اپنی مظلومی و صبر کی وجہ سے ہمیں یہ رسائی نصیب ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ قیامت میں ہر ایک کو مظلومی کی داد ملے گی اور مظلوم کے ہاتھ میں ظالم کا دامن ہوگا۔

پست کر حوصلۂ ذوقِ تماشا کہ ہنوز
دور ہے وہمِ نظر سے وہ اچھوتا دامن

اپنے ذوقِ دیدار کی جرأت کو کم کر اور محبوب کی دید کا خیال چھوڑ دے کیونکہ نظر کا تو ذکر کیا نظر کا خیال بھی اس کے اچھوتے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔

(۱۵۹)

جو تابِ دلنوازیٔ درماں نہ لا سکے
میں ہوں وہ درد غم کدۂ روزگار میں

درماں سے درد کم ہو جاتا ہے مگر ہمارا درد ایسا نرالا ہے کہ درماں کی کوششوں سے کم ہونے کی بجائے اور بڑھتا ہے۔

ہے عکسِ روئے دوست پر اک پرتوِ مجاز
میری نظر بھی کھنچ گئی تصویرِ یار میں

محبوب کا جلوہ اس قدر لطیف ہے کہ اس کو دیکھنا یا تصویر میں مقید کرنا ممکن نہ تھا

لیکن جب میری نگاہیں اس کے حسن میں شامل ہوگئیں تو اس کے چہرہ پر میری نگاہوں کا عکس بھی پڑ گیا اور جلوۂ حقیقت میں رنگ مجاز بھی شامل ہوگیا۔ مراد یہ کہ محبوب (حقیقی) کا حسن لطیف اظہار سے بالاتر تھا۔ اس کے حسن کو نمایاں کرنے میں میری نظروں کی کارفرمائی بھی شامل ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ دوریٔ معشوق ہے محال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں

عاشق محبوب کے روبرو یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ میں تمھارا قرب چاہتا ہوں جس پر میرا کوئی اختیار نہیں چنانچہ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہے کہ اب تم سے دور رہنا مشکل ہے۔ حسنِ طلب کا یہ انداز بھی خوب ہے۔

قربان اک ادائے تغافل پہ لاکھ بار
وہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں

عاشق کی تمام عمر محبوب کے انتظار میں گزر گئی مگر وہ ابھی تغافل کی منزل سے ہی آگے نہیں بڑھا ہے۔ اس کی یہ ادا بھی عاشق کو اس قدر عزیز ہے کہ ایسی لاکھوں زندگیاں اس پر سے قربان کرنے کو تیار ہے۔

(۱۶۰)

زباں مدعا آشنا چاہتا ہوں
دل اب زندگی سے خفا چاہتا ہوں

آج ہم نے سوچا ہے کہ اپنا حالِ دل زبان پر لے ہی آئیں گو ہمیں معلوم ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہمیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

ادا کو ادا آشنا چاہتا ہوں
تجھی پر تجھے مبتلا چاہتا ہوں

اداؤں کو کوئی اداشناس ہی سمجھ سکتا ہے اور تجھ سے بڑھ کر کون تیری اداؤں سے واقف ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری آرزو ہے کہ کاش تو خود اپنی محبت میں گرفتار ہو جائے اور تجھ کو معلوم ہو کہ تیری ادائیں کیسی قاتل ہیں۔

وفا چاہتے ہیں وفا چاہتا ہوں
وہ کیا چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں

محبوب اپنی جفاؤں کے باوجود عاشق سے وفا کا طالب ہے اور عاشق کی خواہش ہے کہ وہ جفا چھوڑ کر وفا اختیار کرے۔ دونوں کے سوچنے کا انداز کتنا مختلف ہے۔

محبت کو رسوا کیا چاہتا ہوں
نظر محرمِ التجا چاہتا ہوں

ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ آج محبوب تک نگاہوں سے اپنا حال پہنچا کر ہی رہیں گے اور اس سے رحم کی التجا کریں گے۔ اگرچہ جانتے ہیں کہ التجا کرنا محبت کو رسوا اور ذلیل کرنے کے مترادف ہے مگر اب دل پر ہمارا قابو نہیں رہا۔

تعین غمِ عشق کا چاہتا ہوں
انھیں چاہتا ہوں یہ کیا چاہتا ہوں

غمِ عشق ایک غیر متعین اور لامحدود جذبہ ہے جس کا حاصل غم ہونا چاہیے نہ کہ محبوب کی ذات۔ ہم نے محبوب کو اپنے عشق کا مقصد بنا لیا۔ یہ ہماری نادانی ہے کہ ہم نے ایک لامحدود چیز کو محدود کر دیا۔

ترے دل کو درد آشنا چاہتا ہوں
بھلا چاہتا ہوں بُرا چاہتا ہوں

میری تمنا ہے کہ محبوب کا دل بھی درد سے واقف ہو جائے تاکہ دوسروں کے درد کا احساس کر سکے۔ یہ تیرے لیے بھلائی بھی ہے اور بُرائی بھی۔ بھلائی اس لیے کہ تو دوسروں کے درد کو سمجھ سکے گا اور بُرائی اس لیے کہ تو خود درد میں مبتلا ہو جائے گا۔

بہت تنگ ہے وہمِ ہستی کی دنیا
میں عالم ہی اب دوسرا چاہتا ہوں

ہماری ہستی ایک وہم ہی سہی مگر اس وہمِ ہستی نے ہمیں محدود و مقید کر دیا ہے۔ ہماری طبیعت کی جولانی کے لیے وہمِ ہستی کی یہ قید ناقابلِ برداشت ہے۔ اب ہم اس قید سے خود کو آزاد کر کے کسی اور عالم (لامحدودیت) میں پہنچنا چاہتے ہیں۔ فلسفیوں کے نزدیک انسان لامحدود حقیقت کا ایک حصہ ہے مگر اس کا احساسِ وجود (جو فانی کے نزدیک وہم ہے) اسے محدود و مقید کر دیتا ہے۔

شبِ ہجر تیرا تصور ہی تو ہے
تجھے آج تجھ سے جدا چاہتا ہوں

ہم شبِ ہجر میں بھی تنہا نہیں بلکہ تیرا تصور ہمارے ساتھ ہے جو تیری عدم موجودگی میں تیرا

قائم مقام بنا ہوا ہے۔ گویا آج ہم نے تجھے تیری ذات سے جدا کر کے پالیا ہے۔

مری موت ماتم کا حسنِ طلب ہے
سکوں ایک ہنگامہ زا چاہتا ہوں

ہنگامہ زا = ہنگامہ پیدا کرنے والا۔

ہماری بے بسی کی موت دیکھنے والوں سے ماتم کا تقاضا کر رہی ہے (لوگ ماتم پر مجبور ہیں) گویا ہماری خاموشی ہنگامہ کا سبب بن گئی ہے۔

خطا ڈھونڈھتا ہوں عطاؤں کے قابل
عطا چاہتے ہیں خطا چاہتا ہوں

اللہ تعالیٰ کی رحمت گنہگار کی متلاشی رہتی ہے تاکہ اس کو اپنے دامنِ عفو میں چھپالے۔ اسی لیے میں بھی نہ صرف گناہ کرتا ہوں بلکہ کسی ایسے گناہ کی جستجو میں رہتا ہوں جو اس کی رحمت کے شایاں ہو اور جس کی بنا پر میں اس کی عطا کا حقدار بن سکوں۔

پھر اس بزم کو ڈھونڈھتی ہیں نگاہیں
پھر اک شکوۂ برملا چاہتا ہوں

برملا = کھلا ہوا، ظاہر۔

آج پھر دوست کی محفل میں جا کر اس کے روبرو شکوہ و شکایت کرنے کو طبیعت بے چین ہے۔ عشق کی مجبوری ملاحظہ ہو کہ اس یقین کے باوجود کہ محبوب کی عنایت حاصل نہ ہو سکے گی عاشق اس کی محفل میں جانے کو بے چین ہے۔

وہ فریاد کا عہد پھر یاد آیا
پھر اک نالۂ نارسا چاہتا ہوں

ہمیں وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب ہم آج کی طرح بے بس و خاموش نہ تھے بلکہ ہمارا وقت فریاد و فغاں میں گزرا کرتا تھا۔ آج ہم پھر ایک نالہ کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ پہلے کی طرح بے اثر ہی کیوں نہ ہو۔

پھر آدابِ فرقت ہیں ملحوظ یعنی
ہجومِ بلا در بلا چاہتا ہوں

محبوب کی جدائی کے لمحات گذارنے کے بھی کچھ طریقے اور آداب ہیں۔ ان میں خاموش

اور سکون سے بیٹھنا آدابِ فرقت کے خلاف ہے۔ اس لیے شاعر چاہتا ہے کہ اس پر یوں ہی مسلسل بلاؤں کا نزول ہوتا رہے۔ شبِ غم میں بلاؤں کا نازل ہونا شاعری کا مسئلہ ہے۔ غالب کہتے ہیں:

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا ہجوم
کیا اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

پھر اک سجدۂ توبہ کی آرزو ہے
تجھے آپ سے پھر خفا چاہتا ہوں

میری خواہش ہے کہ محبوب بار بار مجھ سے خفا ہو تاکہ میں اس کے سامنے پشیمانی کے اظہار کے لیے سجدہ کر سکوں۔

پھر اُمیدوارِ کرم ہوں کہ فانی
ستم ہائے شوق آزما چاہتا ہوں

ستم ہائے شوق آزما = محبت کو آزمانے والے ستم۔

محبوب کے ظلم و ستم حقیقت میں عاشق کے شوق کو آزمانے کے لیے ہوتے ہیں۔ گویا اس کا ستم بھی کرم سے کم نہیں۔ آج ہم اپنے محبوب سے پھر اُسی کرم اور عنایتِ خاص کے اُمیدوار ہیں۔ "ستم ہائے شوق آزما" کی ترکیب قابلِ غور ہے۔

کوئی وجہ تسکیں نہیں، غم نہ راحت
خدا جانے فانی میں کیا چاہتا ہوں

میں نے غم اور راحت دونوں کو آزما کر دیکھ لیا مگر میرے دل کو کسی صورت سے سکون میسر نہ ہوا۔ خدا جانے میرا دل کس چیز کا طالب ہے۔

(۱۶۱)

لاؤ کچھ تکملۂ شوق کا ساماں کر لیں
دلِ بیتاب کو بھی دیدۂ حیراں کر لیں

تکملہ = مکمل کرنا۔

عشق میں تڑپنا اور بے چینی کا اظہار فانی کے نزدیک عشق کی خامی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا شوق ابھی ناپختہ کار ہے۔ لاؤ اسے اس طرح تکمیل کر لیں کہ دل کی بیتابی کو ختم کر کے اس کو چشمِ حیراں کا سا سکون و محویت دے دیں۔

ہر نفس وقفِ خیالِ رُخِ جاناں کر لیں
زندگی ہجر میں دشوار ہے آساں کر لیں

فرقت کی دشوار گزار گھڑیوں کو سہل بنانے کے لیے لازم ہے کہ محبوب کے رخِ روشن کا تصوّر اس طرح دل و دماغ پر چھا جائے کہ زندگی کا ہر لمحہ اور ہر سانس اس کے لیے وقف ہو جائے۔

ٹھہر اے موت کہ قاتل کو پشیماں کرلیں
دادِ مظلوم نگاہی بھی تو لے لینے دے

عاشق موت سے صرف اتنی مہلت مانگتا ہے کہ وہ ایک مجبور نگاہ کے ذریعہ اپنی غم انگیز حالت کی داستان قاتل کو سنا سکے اور اس کو اس کی زیادتیوں پر شرمندہ کر دے۔

(۱۶۲)

نہیں کہ دل کی روش میں کچھ انقلاب نہیں
اب اضطراب کی صورت میں اضطراب نہیں

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ دل کی روش میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اگرچہ دل کا اضطراب اور بے چینی اب بھی ہے مگر اضطراب کی وہ شکل نہیں رہی جو پہلے تھی۔ یعنی دل اب بظاہر پرسکون ہو گیا ہے۔

نظر وہی ہے جو محرومِ صد تماشا ہو
وہ دل ہے جانِ تمنّا جو کامیاب نہیں

فانیؔ کا نظریۂ عشق اور نظریۂ حیات ہی یہ ہے کہ وہ ناکامیوں کو کامیابی کی دلیل خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت میں وہی نظر کامیاب ہے جو جلووں سے محروم ہو اور دل کی کامیابی کا راز اس کی ناکامی اور محرومی میں پوشیدہ ہے۔ وصل کو عشق کی موت ہمارے اکثر فلسفی شعرا نے کہا ہے۔

غمِ حبیب پیامِ سکونِ موت سہی
مرے نصیب میں تسکینِ اضطراب نہیں

شاعر کی ایذا پسند طبیعت بے چینی و اضطراب میں سکون تلاش کرنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے غمِ دوست کو اپنایا کہ اس کے ذریعہ وہ مضطرب ہو کر سکون حاصل کرے۔ مگر قسمت کو اس کی خوشی منظور نہ تھی اس لیے غمِ حبیب اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا اور جو تسکین وہ

اضطراب دل سے حاصل کرنا چاہتا تھا اس کو اب بھی نہ حاصل ہوگی۔ مراد یہ کہ عاشق ایسا غم چاہتا ہے جو موت کے اثر سے آزاد اور جاوداں ہو۔

نگاہِ شوق کی رعنائیوں کا کیا کہنا
مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہیں

عاشق کی نگاہِ شوق کی رعنائی، دلکشی اپنی جگہ پر مگر وہ حسن و دلکشی جو محبوب کی اداؤں میں ہے اس کی ہمسری عاشق کی نگاہ بھی نہیں کر سکتی۔

مجھے یہ دعوتِ روزِ حساب کیوں یارب
مرے گناہ تو شرمندۂ حساب نہیں

حساب ان چیزوں کا لیا جاتا ہے جن کا شمار ہو سکے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے گناہ تو اتنے ہیں کہ جن کا حساب ممکن ہی نہیں۔۔ مجھ سے روزِ حشر میں حساب پیش کرنے کے واسطے کیوں کہا جا رہا ہے۔

بقدرِ حوصلہ ہے فرقِ انتظار و فراق
امیدِ خواب نہ تھی آرزوئے خواب نہیں

انتظار اور جدائی کے درمیان فرق کرنا حوصلہ اور قوتِ برداشت پر منحصر ہے۔ انتظار کے زمانہ کے ختم ہونے کی اُمید رہتی ہے لیکن جدائی میں دوری کا احساس ایک الم ناک احساس کا باعث بنا رہتا ہے۔ مگر فانی کے لیے یہ فرق بے معنی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم کو تیری جدائی میں بھی وہی لذت ملتی ہے جو انتظار میں تھی۔ تیرے انتظار میں بھی جاگ کر راتیں گزارتے تھے اور اب جدائی میں بھی نیند آنے کا سوال نہیں۔

بجانِ فانیٔ مرحوم اب وہ بات کہاں
تری گلی میں جو وہ خانماں خراب نہیں

فانیٔ مرحوم کی جان کی قسم جب سے وہ خانماں برباد تیری گلی سے گیا ہے اس کی رونق ہی ختم ہو گئی ہے۔

جز وہمِ یقین و عینِ یقین اس منزلِ آب و گِل میں نہیں
یہ عالمِ دل ہے یعنی وہ آنکھوں میں نہیں جو دل میں نہیں

وہم یقین = وہ یقین جس کی بنیاد واہمہ پر ہو۔ عین الیقین = یقین جس کی بنیاد مشاہدہ پر ہو

یہ عالمِ آب و گل جو ہمارے سامنے ہے اس کی تمام اشیاء وہم یقین یا عین یقین سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یعنی کچھ موہوم یا خیالی چیزیں ہیں جن پر ہم نے یقین کر لیا ہے یا وہ مظاہر ہیں جنھیں ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اس خارجی دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ عالمِ آب و گل کے مشاہدات بھی ہمارے خیالات و احساسات کا عکس ہیں جو جلوے ہمارے دل میں موجود ہیں۔ انہی کو ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور جو جلوے دل میں نہیں وہ آنکھوں میں بھی نہیں۔ اسی سے ملتا جلتا خیال اس شعر میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
منھ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

غم خانۂ دل کا کیا کہنا وہ کچھ بھی سہی یہ بات کہاں
خلوت میں یہاں جو جلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں

میرے غم خانۂ دل کی رنگینی تو یہ ہے کہ بزمِ دوست کی رونقیں بھی اس کے آگے کچھ نہیں میرے دل کی تنہائیوں میں جو رونق اور جشن ہے محبوب کی محفل اس سے محروم ہے۔

سنتے تھے محبت آساں ہے، واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں

سنتے تھے کہ محبت کرنا آسان ہے۔ مگر یہ ایسی آسانی ہے کہ بڑی سے بڑی دشواری اس کے سامنے کچھ نہیں۔ مشکل ایک تو وہ ہوتی ہے جس کو حل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی کام اتنا آسان ہو کہ اس کو کرنا مشکل ہو جائے۔ غالب کہتے ہیں:

ملنا اگر ترا نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

گو راحت و رنج میں فرق نہیں یہ فرقِ مراتب کیا کم ہے
جو سعیٔ حصولِ عیش میں ہے وہ عیش غمِ حاصل میں نہیں

سعیٔ حصولِ عیش = خوشی کو حاصل کرنے کی کوشش
غمِ حاصل = نتیجہ یا انجام کی فکر

اہلِ بینش کے نزدیک غم اور خوشی میں کوئی فرق نہیں۔ فانی بھی ویسے اسی نظریہ کے قائل ہیں لیکن اس شعر میں وہ ذرا مختلف انداز سے اس بات کو پیش کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ غم اور خوشی میں کوئی حقیقی فرق نہیں صرف مدارج کا فرق ہے۔ انسان کو مقصد حاصل کرنے کی کوششوں میں جو خوشی اور لذت نصیب ہوتی ہے وہ کوشش کے نتیجہ یا انجام میں نہیں ملتی (خیال رہے کہ فانی کے نزدیک کوشش کا نتیجہ ناکامی ہے)۔ مراد یہ کہ کوشش کی ابتدا میں خوشی ملتی ہے انجام میں غم۔

دل خاک ہوا ہر چند مگر پستی کی طرف جو مائل ہو
ایسا کوئی ذرہ اے دنیا اس خاک فلک منزل میں نہیں

خاک فلک منزل = وہ خاک جس کا مقام آسمان کی رفعتوں پر ہو۔

محبت میں ہمارا دل خاک ہو گیا ہے مگر دل کی فطرت اور اس کے خمیر میں جو بلندی تھی وہ خاک ہو کر بھی باقی رہی چنانچہ اس کی خاک کے ذرے بھی زمین کی پستیوں پر رہنے کی بجائے آسمان کی بلندیوں کی طرف مائلِ پرواز رہیں گے۔

جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل و دریا ایک ہوئے
پھر لطفِ امید و بیم کہاں، دریا میں نہیں ساحل میں نہیں

شاعر کے نزدیک زندگی نام ہے امید و بیم کی کشمکش کا اور اسی میں زندگی کا لطف ہے۔ کنارے تک پہنچنے کی امید اور لہروں کا خوف اسی وقت تک ہے جب تک کوئی باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈوبنے کے بعد ساحل و دریا اس کے لیے برابر ہو جاتے ہیں اور نہ کوئی اُمید رہتی ہے نہ خوف۔

اب کس سے جفا کا حال کہیں اب کس سے وفا کی داد ملے
بیداد نہیں غماز نہ ہو آوازِ شکستِ دل میں نہیں

دل کے ٹوٹنے کی آواز نہیں ہوتی یعنی کسی کو اس کے ٹوٹنے کا اندازہ نہیں ہوا کرتا مگر جب تک محبوب کے ظلم وستم کا سلسلہ جاری تھا کم سے کم لوگوں کو ہماری وفا کا اندازہ ہو جاتا تھا اور ہمیں وفاؤں کی داد بھی مل جاتی تھی۔ مگر اب اس نے بیداد بھی ترک کر دی ہے۔ اب کس طرح اور کس سے ہم اس کی جفاؤں کا حال کہیں اور وفا کی داد پائیں۔

جینے کی حدیں ملتی ہیں کہیں ایمائے اجل ہے آگے بڑھ
منزل کا نشاں ہے ہر منزل آرام کسی منزل میں نہیں

عام طور پر موت کو زندگی کی منزل خیال کیا جاتا ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ زندگی ایک لامتناہی سفر ہے جس کی منزل کوئی نہیں۔ موت بھی منزل نہیں بلکہ صرف منزل کا نشان ہے جس کا اشارہ یہ ہے کہ ابھی چلنے کے لیے اور راہ باقی ہے۔ گویا مر کر بھی آرام ممکن نہیں۔ میر کا شعر ہے:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہم بھی ہوں خیالِ یار بھی ہو اس فکرِ محال سے کیا حاصل
بس اب اے فانی ہم ہی نہیں یا کوئی ہمارے دل میں نہیں

عشق میں زندہ رہنا ایک خیال محال ہے۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ یا تو محبوب کے خیال کو دل سے نکال دیں گے ورنہ پھر اس خیال کو لیے ہوئے دُنیا سے گزر جائیں گے۔ مراد یہ کہ "عشق میں مرنا سہل بھی جینا سہل نہیں"۔

(۱۶۴)

امید کرم کی ہے ادا میری خطائیں
اک بات نکلتی ہے مری لغزشِ پا میں

میری گم راہی اور لغزشِ پا بے وجہ نہیں۔ میری خطاؤں کی وجہ اور سبب رحمتِ الٰہی پر بھروسہ ہے۔ اس طرح میرے گناہ بھی ایک نیا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ فانی نے دوسری جگہ لکھا ہے:

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے رازِ بلندی پستی ہے

سمجھو تو غنیمت ہے مرا گریۂ خونیں
یہ بات نہ پھولوں میں نہ یہ بات حنا میں

محبوب کو میرے خونیں آنسوؤں کی قدر کرنی چاہیے کہ ان میں جو سرخی اور رنگینی ہے وہ نہ کسی پھول میں ہے نہ ہندی میں۔ (حسن کو پھولوں سے اور حنا سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے۔)

جھک جاتے ہیں سجدہ میں سر اور پھر نہیں اُٹھتے
کیا سحر ہے کافر ترے نقشِ کفِ پا میں

محبوب کے نقشِ پا میں نہ معلوم کیا جادو ہے کہ جس طرف سے وہ گزر جاتا ہے عشاق ان پر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور پھر ان کے سر اوپر نہیں اُٹھتے۔

وہ جانِ محبت ہیں وہ ایمانِ محبت
جو اُن کے اشارے ہیں محبت کی ادائیں

محبوب اگرچہ برملا کبھی اظہارِ محبت نہیں کرتا مگر اس کی اداؤں میں جو لطیف اشارے پائے جاتے ہیں وہ ہی عاشق کی محبت کا سرمایہ اور ایمان ہیں۔ "وہ" کی ضمیر محبوب کے اشاروں کے لیے ہے۔

پاتا ہوں کچھ آثارِ تمنا ابھی فانی
کھوئی ہوئی دنیا ہے مری دل کی فضا میں

میرا دل محبت میں مٹ چکا ہے اور ہر تمنا دل سے رخصت ہو چکی ہے لیکن دل کی فضا میں محبت کی گمشدہ دنیا کے کچھ آثار (کچھ تمنائیں) اب بھی پائے جاتے ہیں۔ مراد یہ کہ دل کی زندگی کا انحصار آرزوؤں اور تمناؤں پر ہے۔

(۱۶۵)

اُن کے آگے جب یہ آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں
وہ حیا پرور نگاہیں مسکرا کر رہ گئیں

جب محبوب کے روبرو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو اس کی شرمگیں نگاہوں نے مسکرا کر میرے گریہ کی داد دی۔ "حیاپرور" کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محبوب محبت کا راز فاش ہونے سے بچنے کے لیے مسکرایا ہے۔

گر جفاؤں کی تلافی کچھ وفاؤں کا صلہ
وہ ادائیں صبر ہی صبر آزما کر رہ گئیں

محبوب کی صبر آزما ادائیں ہمارے ضبط کا امتحان لیتی رہیں اور ہم خوش تھے کہ آزمائش کی اس منزل کے بعد وہ جفاؤں کی تلافی کرے گا اور ہماری وفاؤں کا صلہ دے گا مگر ایسا نہ ہوا اور اس نے آزمائش پر یہ سلسلہ ختم کر دیا۔

آسماں سر پر اُٹھا لینے کی ہمّت اب کہاں
لب تک آئیں بھی اگر آہیں تو آ کر رہ گئیں

کل تک ہمارے نالے آسمان سر پر اُٹھا لیتے تھے لیکن آج یہ حال ہے کہ آہیں لبوں سے باہر نہیں نکل پاتیں اور وہیں گھُٹ کر رہ جاتی ہیں۔

ثبت تھی اوراقِ "کُن" پر صرف میری سرگذشت
ہستیاں میرا ہی افسانہ سُنا کر رہ گئیں

اوراقِ کُن = مراد دنیا۔ دُنیا کو وجود میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "کن" (ہو جا) اور کائنات وجود میں آ گئی۔

کائنات کی تخلیق کا سبب انسان کی ذات ہے۔ گویا یہ دنیا ایک کتاب ہے جس کے اوراق پر صرف ہماری ہی کہانی لکھی ہوئی ہے اور اس کہانی میں جتنے بھی دوسرے کردار آتے ہیں وہ ہماری ہی داستان سنانے کو آتے ہیں۔

اب میری بربادیوں کو حشر کا ہے انتظار
جس قدر فتنے میسر تھے اُٹھا کر رہ گئیں

دنیا میں جتنی بلائیں اور مصیبتیں تھیں وہ مجھ پر نازل ہو چکی ہیں۔ میری بدنصیبی کو ابھی ایک آخری فتنہ کا اور انتظار ہے یعنی فتنۂ محشر کہ وہ بھی آ کر جو کمی رہ گئی ہے اُسے پورا کر دے۔ بقولِ غالبؔ: ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۱۶۶)

وہ ہی وہ ہیں مگر ظہور نہیں اس طرح دُور ہیں کہ دُور نہیں

اللہ تعالیٰ کے حُسن کا پرتو ہر شے میں موجود ہے مگر اس کے حُسن کو بے نقاب دیکھنا ممکن نہیں گویا وہ دور بھی ہے اور قریب بھی۔ آسیؔ نے کیا خوب کہا ہے:

بے حجابی یہ کہ ہر ذرّہ سے جلوہ آشکار اس پہ پردہ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

ترکِ دُنیا نہ ہو سکے تو نہ کر غمِ دُنیا مگر ضرور نہیں

محبّت کرنے والوں کے لیے دنیا سے بے تعلق ہو جانا لازمی نہیں۔ لیکن دنیا کی محبت دل سے دُور ہو جانا چاہیے۔

کچھ ہمیں کو یہ زندگی ہے عزیز ان کی بیداد کا قصور نہیں

محبوب کی بیداد کا تقاضا یہ تھا کہ ہم جان سے ہاتھ دھو لیتے۔ اب جب کہ ہم زندہ ہیں اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس کی بیداد میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ بلکہ یہ ہماری سخت جانی یا زندگی سے اُلفت تھی کہ ہم بیداد سہ کر بھی زندہ رہے۔

گھر جلاتے تو ہو مگر کس کا دل ہے بندہ نواز، طور نہیں

قلبِ عاشق محبوب کا مسکن ہے۔ اس کو جلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنے گھر کو آگ لگا رہا ہے۔ عاشق کہتا ہے یہ کچھ طور نہیں ہے جس کو تم جلا رہے ہو بلکہ یہ دل ہے جو تمہارا ہی مسکن اور مقام ہے۔ دل کو طور پر ترجیح دینا مقصود ہے۔ اندازِ تخاطب دلچسپ ہے۔

تم پہ مرنا جنھیں نہیں آتا زندگی کا انھیں شعور نہیں

جو شخص محبّت کی لذت سے محروم ہے اور محبت میں فنا ہونا نہیں جانتا اس کو زندگی کا سلیقہ نہیں آتا۔ مراد یہ کہ زندگی کی معراج محبوب پر قربان ہو جانا ہے۔ لفظ "مرنا" میں دو پہلو پوشیدہ ہیں۔

ہم بھی اپنی وفا پہ ہیں مغرور　　بات کی بات ہے غرور نہیں

محبوب کو اگر اپنے حسن پر غرور ہے تو ہم کو بھی اپنی وفاؤں پر ناز ہے۔ یہ تعلی نہیں اظہارِ حقیقت ہے۔ روزمرہ کے استعمال نے شعر کو پر لطف بنا دیا ہے۔

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانؔی　　ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

ہماری ہستی فانی اور عارضی ہے۔ نہ تو ماضی میں ہمارا کوئی وجود تھا اور نہ مستقبل ہی میں ہمارا کوئی نشان باقی رہے گا۔ انسان کے حادث ہونے کو کس سادگی اور لطف سے بیان کیا ہے۔

(۱۶۷)

دل میں آتے ہوئے شرماتے ہیں　　اپنے جلووں میں چھپے جاتے ہیں

صوفی شعراء کے نزدیک کائنات کی تمام اشیا، محبوب حقیقی کے جلووں کی امین بھی ہیں اور اس کے حسن کی نقاب بھی کیونکہ اس کا جلوہ ہر چیز میں موجود ہے مگر وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ فانؔی محبوب کی اس ادا کو شرم سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی شرم کا یہ عالم ہے کہ وہ دل میں آتے ہوئے بھی شرماتا ہے اور اپنے جلووں کے حجاب میں چھپ گ[illegible] شعر میں خوبی یہ ہے کہ ایک عارفانہ خیال کو تغزل کے انداز میں پیش کیا ہے۔

ہر نصیحت ہے نرالی ناصح　　ورنہ سمجھے ہوئے سمجھاتے ہیں

نصیحت کا حق اسی کو حاصل ہے جو اس صورت حال سے واقف ہو اور معاملہ کو پوری طرح سمجھ چکا ہو۔ حضرت ناصح کی نصیحتیں اس لحاظ سے نرالی ہیں کہ وہ ایسے معاملہ میں نصیحت کر رہے ہیں جس سے ان کو کبھی واسطہ نہیں رہا۔

وہ میرے قتل کا فرمان سہی　　کچھ وہ ارشاد تو فرماتے ہیں

عاشق کی تمنا ہے کہ محبوب اپنے شیریں لبوں سے کوئی بات اس سے کہے۔ خواہ وہ اس کے قتل کا فرمان ہی کیوں نہ ہو۔ بقولِ غالبؔ :

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

جور کو جور بھی اب کیا کہیے
خود وہ تڑپا کے تڑپ جاتے ہیں

محبوب کو اب ہم سے اس قدر تعلق خاطر ہوگیا ہے کہ ہمیں تڑپا کر وہ خود بھی بے چین ہوجاتا ہے۔ اسی لیے اس کے جور وستم ہمارے لیے ظلم نہیں رہے بلکہ کرم بن گئے ہیں۔

دل سے فانیؔ یہ اُلجھ پڑنا کیا
آپ دیوانہ کے منہ آتے ہیں

دل جو محبت میں بے خود اور دیوانہ ہوگیا ہے اس پر اُلجھنا یا اسے سمجھانا بھی نادانی ہے کیونکہ ؏ بڑی دیوانگی ہے ایک دیوانہ کو سمجھانا۔

(۱۶۸)

عقل کہتے ہیں جسے مقبولِ اہلِ دل نہیں
اس جنوں کو امتیازِ عاشقی حاصل نہیں

عقل کو کبھی اہلِ دل کی محفل میں بار نہیں مل سکا ہے اس لیے کہ گو عقل بھی ایک طرح کا جنون ہے لیکن اس جنون میں اور جنونِ عشق میں فرق یہ ہے کہ عقل کو وہ عظمت اور شانِ امتیاز حاصل نہیں جو عشق کا حصّہ ہے۔ عشق کو عقل پر ترجیح دینا شعراء کا عام مسلک ہے۔ عقل کو جنون کہنا فانیؔ کی جدّت ہے۔

ماورائے حد ہر منزل ہے شاید کوئے دوست
ہم نے جو چھانی نہ ہو ایسی کوئی منزل نہیں

ہم نے سلوک و معرفت کی ہر منزل کو چھان مارا مگر محبوب کا پتہ کہیں نہ پاسکے شاید اس کا مقام ان تمام منزلوں کی حد سے پرے اور ذہن کی رسائی سے ماوراء ہے۔

گرم رو ہوں نقشِ پا بنتے گئے مٹتے گئے
مسلک اپنا امتیازِ جادہ و منزل نہیں

گرم رو = چلنے میں منہمک   جادہ = راستہ   مسلک = طریقہ

ہم اپنے مقصود کی تلاش میں اس قدر سرگرداں اور محو رہے کہ راہ میں بنے ہوئے قدموں کے نشانوں کی بھی پروا نہ کی اور اپنی گرم رفتاری کے باعث وہ نشان بن بن کر مٹتے گئے کیونکہ محبت کی راہ میں جادہ و منزل میں امتیاز کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ مراد یہ کہ محبت کی کوئی منزل نہیں بلکہ تلاشِ دوست میں سرگرداں رہنا ہی عاشق کی تلاش کا حاصل ہے۔ بقول فانی :

ہے منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش   یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

ہر لطافت کا تصور ماسوا آلود ہے
آئینہ دل کا تری تصویر کے قابل نہیں

ماسوا = غیر از اللہ

ہمارے دل کا آئینہ ماسوا کی کثافتوں سے اس قدر آلودہ ہے کہ ہم کسی لطافت کا تصور ماسوا سے بے تعلق ہو کر کر ہی نہیں سکتے۔ حسنِ حقیقی (جو ایک لطیف شے ہے) کے جلوے ہمارے دل میں سمائیں تو کیوں کر۔ مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کا تصور یا احاطہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں کیونکہ اس کا حسن لامحدود و لطیف ہے اور ہمارے حسن کے معیار محدود اور مادی ہیں۔ تاباں بدایونی کا شعر ہے :

عاجز ہے عقل معرفتِ ذوالجلال میں   تاباں خدا وہ ہے جو نہ آئے خیال میں

بزمِ اربابِ نظر ہے کب سے تیری منتظر
آ کہ دل کا نام باقی رہ گیا ہے دل نہیں

عشاق کب سے تیری آمد کے منتظر ہیں۔ تیرے انتظار نے ان کے دلوں کا یہ حال کیا ہے کہ اب صرف دل کا نام باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی آنا ہے تو آجا۔

وہ مسافر ہوں جو ہو ختمِ سفر سے بے نیاز
میری ہر منزل نشانِ راہ ہے منزل نہیں

اسی پرانے خیال کا اعادہ اس شعر میں بھی ہے کہ : مسلک اپنا امتیازِ جادہ و منزل نہیں

بن نہیں پڑتی ہے تیری یاد سے تیری سی بات
ہاں مگر اتنا کہ گویا تو ہی تو ہے دل نہیں

اگرچہ تیری یاد بھی ہمارے لیے کچھ کم نہیں کہ اس میں ہم اس قدر محو اور بے خود ہو جاتے ہیں سوائے تیرے کسی چیز یہاں تک کہ خود اپنے وجود کا بھی ہوش باقی نہیں رہتا۔ تاہم یاد میں وہ بات کہاں جو تیری موجودگی میں ہوتی ہے۔

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جیے جانے سے کچھ حاصل نہیں

یہ شعر فانی کے چند بہترین مقطعوں میں سے ایک ہے۔ زندگی کے آلام و مصائب میں جو چیز شاعر کو موت کو اپنانے سے باز رکھتی ہے اور ان مصائب کو برداشت کرنے کی ہمت دیتی ہے وہ یہ خیال ہے کہ زندگی دوست کی امانت ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا محبت کی توہین ہے۔

(۱۶۹)

رہبر ہو خضر کا جو رہِ ذوق و خبر میں
وہ نقشِ کفِ پا ہوں تری راہ گزر میں

محبت کی راہ میں ہم نقش پا کی طرح عاجز اور راہ میں پڑے ہیں اور اس عاجزی کی بدولت ہم میں وہ عظمت اور بلندی پیدا ہو گئی ہے کہ خضر کو بھی سلوک اور معرفت کی راہ بتانے لگے ہیں۔

کانٹوں میں بھی پھولوں کی ادا تھی ترے آگے
اب باغ میں جو پھول ہے کانٹا ہے جگر میں

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب آدمی خوش ہوتا ہے تو ناگوار چیزیں بھی حسین لگنے لگتی ہیں اور جب خود پریشان ہو تو ہر حسین چیز کا حُسن بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اسی خیال کو شاعر یوں پیش کرتا ہے کہ محبوب کے سامنے کانٹوں میں بھی پھولوں کی سی دلکشی تھی اور اس کی جدائی میں پھولوں کا حُسن دل میں

کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ میر کا شعر ہے :

سحر گہِ عید میں دورِ سبو تھا   پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

ادراک ہے مظہر مری شوریدہ سری کا
سودا ہے بعنوانِ محبّت مرے سر میں

ادراک = عقل   شوریدہ سری = جنون

اپنے جنون پر فخر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ میری شوریدہ سری یا جنون جو محبت کا نتیجہ ہے اس کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ جنون بھی عقل و ہوش سے کم نہیں بلکہ عقل بھی اسی کی ایک ادا یا اس کا اظہار ہے۔

اس عالمِ تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا
میری ہی نظر محو ہے میری ہی نظر میں

ہمہ اوست کے تصور کے مطابق کوئی شے خدا سے الگ نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب ہم نے اس عالمِ تصویر (دُنیا) کی حقیقت پر نظر کی تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس کائنات کی ہر چیز یہاں تک کہ خود میرا وجود بھی ہستیٔ مطلق سے الگ کوئی شے نہیں بلکہ اسی کا ایک حصّہ ہے۔ گویا میں خود ہی تماشا ہوں اور خود ہی تماشائی۔ میر کہتے ہیں :

نظریں لگی ہوئی تھیں کب سے درِ حرم سے   پردہ اُٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

تم تھے تو مری شام میں تھا صبح کا عالم
تم جب سے گئے شام جھلکتی ہے سحر میں

اس شعر میں بھی اوپر کے شعر والے خیال کا اعادہ ہے۔ محبوب سامنے تھا تو شام میں بھی صبح کی سی دلکشی تھی اور اس کے جانے سے صبح بھی تاریک ہو گئی ہے۔

ہر اشک تری یاد کے جلووں سے ہے معمور
دنیا سمٹ آئی ہے مرے دیدۂ تر میں

تیری یادوں نے اشکوں کو جلووں سے اس طرح معمور کر دیا ہے گویا ساری دنیا کے

جلوے میری اشکبار آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں۔

فانی ہے میری آہ و فغاں میں اثر الٹا
شاید مری تقدیر کی گردش ہے اثر میں

میری تقدیر کی گردش کا اثر آہ و فغاں پر یہ پڑا ہے کہ اب جو نالہ کرتا ہوں اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ یعنی قسمت کی محرومی سے نالے بھی بے اثر ہو گئے ہیں۔

(۱۷۰)

اُن کی کسی ادا پہ جفا کا گماں نہیں
شوخی ہے جو بسلسلۂ امتحاں نہیں

عاشق کی وفا پرستی کا یہ حال ہے کہ وہ محبوب کی قاتل اداؤں کو جفا کار ماننے پر تیار نہیں۔ اس کے نزدیک محبوب کا ظلم و ستم یا تو اس کی شوخی کے اظہار کے لیے ہے یا عاشق کی آزمائش کے لیے۔ فراق نے کہا ہے:

جو بھی کر جور و ستم، جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

دیکھا نہیں وہ جلوہ جو دیکھا ہوا سا ہے
اس طرح وہ عیاں ہیں کہ گویا عیاں نہیں

محبوب (اللہ تعالیٰ) نے اپنے حُسن پر اس طرح رنگ و بو کے نقاب ڈال لیے ہیں کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے حُسن سے واقف ہوتے ہوئے بھی ہم اسے پہچان نہیں سکتے۔ اصغر کا شعر ہے:

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

نامہربانیوں کا گلہ تم سے کیا کریں
ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں

محبوب سے اس کی بے التفاتی کی شکایت اور اپنی بربادی کا گلہ کیا کریں۔ ہم نے اس سے محبّت کر کے خود اپنے ساتھ دشمنی کی ہے۔

اب تک لگاوٹیں ہی سہی لاگ تو نہ تھی
یہ کیا ہوا کہ مجھ سے وہ اب بدگماں نہیں

محبوب اب تک ہماری محبت کی طرف سے بدگمانی اور شبہ میں مبتلا تھا۔ اس کی یہ بدگمانی بھی لگاوٹ اور تعلقِ خاطر کا نتیجہ تھی۔ اس لیے ہم اس پر بھی خوش تھے لیکن اب جو اس نے بے تعلقی کا انداز اختیار کیا ہے وہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ شعر میں کوئی خاص ندرت نہیں۔ غالب کے شعر سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔

شاید زمینِ کوئے بتاں آسماں ہوئی
کہتے ہیں اب زمیں پہ کوئی آسماں نہیں

جدید نظریات کی رو سے آسمان کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ صرف ہماری حدِ نظر ہے۔
فانی کہتے ہیں کہ اب جب زمین کے اوپر آسمان نہیں رہا تو پھر آسمان کا کام (یعنی تباہی و فتنہ پردازی) شاید محبوب کے کوچے کی زمین کرے گی۔ مراد یہ کہ پہلے جو فتنے آسمان برپا کرتا تھا اب کوئے محبوب سے اُٹھتے ہیں۔

بربادِ صد بہار ہوں میری نگاہ میں
جو آشنائے برق نہ ہو آشیاں نہیں

ہم نے دنیا کی بہاروں کو آزما کر دیکھا ہے اور ان کے ہاتھوں برباد ہوئے ہیں۔ اب ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس چمن میں کوئی آشیاں ایسا نہیں جو برق کی زد سے محفوظ رہا ہو۔

ساری ہے دردِ دل مری رگ رگ میں چارہ ساز
کیا پوچھتا ہے درد کہاں ہے کہاں نہیں

ساری = سرایت کیے ہوئے۔
ہم چارہ ساز کو کیا بتائیں کہ ہمارے کہاں درد ہے کیونکہ درد تو ہماری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔

کل تک زبانِ خلق پہ ہوگی وہ داستاں
اب تک مری زبان پہ جو داستاں نہیں

زندگی بھر ہم نے غم کو اس طرح ضبط کیا کہ کسی کو ہماری داستانِ محبت کا علم نہ ہو سکا۔ مگر ہماری موت سب پر یہ راز فاش کر دے گی اور داستانِ محبت کا چرچا سب کی زبان پر ہوگا۔ لفظ "اب تک" سے اشارہ یہ ہے کہ عاشق موت کے کنارے آ لگا ہے پھر بھی اپنا حال کسی سے بیان نہیں کرتا۔

تیرا کرم کہ تو نے وہ دل کو عطا کیا   جو غم بقدرِ حوصلۂ آسماں نہیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے اپنی امانت آسمان و زمین، پہاڑ اور دریا، جن و ملک سب کو سونپنا چاہی مگر کوئی اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ آخر انسان بڑھا اور اس نے اسے سینے سے لگایا۔ شاعر کا عقیدہ ہے کہ یہ امانت "غم" تھی جس کو اٹھانے کی ہمت آسمان بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ تیری عنایت تھی کہ تو نے اس کا مستحق ہمارے دل کو قرار دیا۔ اس موضوع پر اکثر شعرا نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں:

سب پہ جس بار نے گرانی کی   اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

بجلی کہیں گری ہو مگر ہم قفس مجھے   ڈر ہے کہ اب کسی نے کہا "آشیاں نہیں"

انسانی نفسیات کا خاصہ ہے کہ اس کے دماغ میں خدشات بہت جلدی پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر یقینی طور پر معلوم نہ ہو تو وہ ہر حادثہ کو اپنے سے متعلق فرض کر لیتا ہے۔ چنانچہ شاعر بھی قفس میں سے جب کہیں بجلی گرتے دیکھتا ہے تو یقین کر لیتا ہے کہ میرے ہی آشیانہ پر بجلی گری ہے۔ اس میں غالبؔ کے اس شعر کی گونج سنائی دیتی ہے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

فانیؔ کوئی غم اور ابھی اٹھ رہا ہے کیا   دل پر ہنوز بارِ محبت گراں نہیں

"اٹھ رہا ہے" یہاں بمعنی باقی رہ گیا ہے، استعمال ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ابھی محبت کے غم ہماری برداشت سے باہر نہیں ہوئے ہیں۔ کیا ابھی اور بھی کوئی غم نازل ہونے کو باقی رہ گیا ہے۔

(۱۷۱)

تسکین عجیب چاہتا ہوں   دشمن کا نصیب چاہتا ہوں

ہماری بے کسی و محرومی کا یہ عالم ہے کہ اپنے لیے تسکین کا یہ عجیب طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہم یہ دعا کر رہے ہیں کہ خدا ہماری قسمت دشمن کی سی کر دے۔

تم دل میں بھی رہ کے دور سے ہو   کچھ اور قریب چاہتا ہوں

اگرچہ تم ہر وقت ہمارے دل میں رہتے ہو مگر ہم اس سے بھی زیادہ قرب کے خواہش مند ہیں یعنی ہم چاہتے ہیں کہ ہم میں اور محبوب میں دوئی باقی نہ رہے اور ہماری ہستی اس میں گم ہو جائے۔

ہوں محو جمالِ عالم افروز　　عالم کو رقیب چاہتا ہوں

میرا عشق نرالا ہے اور میرا محبوب صرف میری نگاہوں کو روشنی نہیں بخشتا بلکہ اس کے جلوے ہر ایک آنکھ کو منور کیے ہوئے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ ساری دنیا اس کے عشق میں میری طرح گرفتار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ عشقِ حقیقی میں رقابت کا سوال نہیں۔

انجام بخیر ہو نظر کا　　دیدارِ حبیب چاہتا ہوں

میں محبوب کے جلوے دیکھنے کا آرزو مند ہوں۔ اب میری نگاہوں کا خدا ہی حافظ ہے یعنی محبوب کے جلوے دیکھنے کی کسی نظر کو تاب ممکن نہیں۔

غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے　　فانیؔ وہ نصیب چاہتا ہوں

فانیؔ کی غم پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ غموں سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ دعا کرتے ہیں کہ انھیں غموں میں راحت ملنے لگے۔

(۱۷۲)

جب کی ہے فکرِ تجزیہ ہر مثال میں　　گم ہو گئی ہے ان کی تجلّی جمال میں

اس شعر میں افلاطون کے اس نظریہ کا عکس پایا جاتا ہے کہ اصل حقیقت عالمِ مثال (WORLD OF IDEAS) ہے اور یہ عالمِ آب و گِل صرف اس کا ایک عکس یا نقل ہے۔ اس عالمِ مثال کی مختلف سطحیں ہیں۔ سب سے بلند حقیقت حسنِ کامل یا خیرِ کامل ہے۔ اس مسئلہ کو فانیؔ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جب ہم نے عالمِ مثال کے تجزیہ کی کوشش کی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام تجلّیاں ایک حسنِ کامل یا جمالِ کامل میں جا کر گم ہو جاتی ہیں۔ مراد یہ کہ کائنات کی اصل خدا تعالیٰ کی ذات ہے جو حسنِ مکمل ہے۔

امکانِ معرفت کو سمو کر محال میں　　وہ دل میں یوں رہے کہ نہ آئے خیال میں

ذاتِ الٰہی کا عرفان مشکل ہی نہیں محال ہے۔ ایک طرف تو وہ شہ رگ سے بھی قریب تر ہے اور دوسری طرف انسان کا تخیل بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا اور عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

ٹوٹا نہ ہم سے رشتۂ رسمِ حجابِ عشق　　چھوٹا نہ ہم سے ہجر کا دامن وصال میں

ہم وہ ہجر نصیب ہیں کہ وصل میں بھی محبوب کے قرب کو ترستے رہے اور عشق کے آداب اور رسمِ حجاب ہمارے اور محبوب کے درمیان حائل رہی۔ محبوب کا یہ احترام فانی نے میر سے لیا ہے۔

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

قدموں پہ گر کے کوئی خطاوار مر نہ جائے　　ذوق آفرینیاں ہیں تمھارے ملال میں

محبوب کا ملال اور ناراضی عاشق کے ذوق جاں سپاری کو اور بڑھا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھیں آزردہ دیکھ کر تمھارا گنہگار تمھارے قدموں پر گر کر جان دیدے۔

ملتی نہیں تصورِ ہستی سے اب نجات　　گھر سا گیا ہوں حلقۂ دامِ خیال میں

"حلقۂ دامِ خیال" غالب کی ترکیب ہے۔ دنیا اور اس کی رنگینیاں ایک واہمہ کا جال ہیں۔ فانی بھی اسے دامِ خیال ہی تصور کرتے ہیں مگر اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود بھی اس جال سے نکلنا ان کے نزدیک آسان نہیں۔

آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا　　لانا پڑا تمھیں کو تمھاری مثال میں

محبوب کا حسن لاثانی ہے۔ جب زمانہ نے اس کی مثال لانے کی کوشش کی تو ناکامی ہوئی چنانچہ اس کی مثال کے لیے آئینہ کو سامنے لانا پڑا۔ ایک دوسرے شعر میں اس کے بالکل برعکس خیال کو پیش کیا ہے:

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانی　　آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

اپنی طرف بھی جھک کے نگاہیں ہیں بلند　　دیکھا کیے کمال کا پہلو زوال میں

اگرچہ انسان بظاہر ایک حقیر اور پست مخلوق ہے جو زوال کی زد میں ہے لیکن اس

کی پستی بلندیوں کی حامل بھی ہے۔ اس میں حسنِ حقیقی کا جلوہ موجود ہے اور انسان اگر اپنی حقیقت پر غور کرے تو اس پستی میں بلندیوں کو جلوہ گر دیکھ سکتا ہے۔ بقولِ میرؔ:

ع : پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں

گھٹتا ہے جی کہ ہم نہیں مختارِ انفعال   اک موجِ خوں بھی ہے عرقِ انفعال میں

مختارِ انفعال = شرمندہ ہونے پر قادر۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اپنے گناہوں پر شرمندگی کے احساس سے ہمیں پسینہ آگیا مگر چونکہ نہ گناہ کرنا اپنے اختیار میں تھا اور نہ شرمندگی یا عرق انفعال پر اپنا بس تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جبر کے احساس نے دل خون کر دیا اور پسینہ میں خون کی موجیں بھی شامل ہو گئیں۔ شعر کا بنیادی خیال نظریۂ جبر ہے۔

فانیؔ ہے ان سے طالب صد مرگ عاشقی   اے ہمّتِ سوال اثر دے سوال میں

فانیؔ نے ہمّت کر کے محبوب سے یہ التجا تو کر لی ہے کہ وہ اسے عشق میں ایک بار نہیں سیکڑوں بار موت دے لیکن اس کی التجا میں اثر بھی ہوگا اس کا یقین نہیں۔ اس لیے وہ اپنی ہمّت ہی سے اثر کا بھی طالب ہے۔

(۱۷۳)

نالے وہ اب ہیں لب پہ جو کھوئے ہوئے سے ہیں
آغوشِ اضطراب میں سوئے ہوئے سے ہیں

اب ہمارے نالوں میں پہلے کی سی شورش و شدّت نہیں۔ غالباً ہماری بے خودی کے اثر سے نالے بھی کھوئے سے ہیں۔ گویا اضطرابِ دل جو نالوں کا خالق ہے اس نے نالوں کو اپنی گود میں سُلا دیا ہے۔ مراد یہ کہ محبّت کی وہ منزل آگئی ہے جب بے چینی ختم ہو کر بے خودی طاری ہے۔

کرتے ہیں بزمِ ناز سے ہم اکتسابِ رنگ
دامانِ دل لہو میں ڈبوئے ہوئے سے ہیں

اکتسابِ رنگ = رنگ حاصل کرنا۔

ہم نے اپنے دل کو محبوب کی محفل کی رنگینی کا انداز دینے کے لیے اسے خون کے چھینٹوں سے لالہ زار بنا دیا ہے۔ مراد یہ کہ اس کی رنگینیوں کی یاد سے ہمارا دل خون ہو گیا ہے۔ دونوں کے تضاد کو بڑے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

گذرا فریب ہر غم و شادی کا مرحلہ
ہنستے ہوئے سے اب ہیں نہ روئے ہوئے سے ہیں

جب تک ہم دنیا کے غم و خوشی کو حقیقت سمجھتے رہے تو کبھی مسکرائے اور کبھی آنسوؤں سے دوچار رہے مگر اب ہم دونوں کی اصلیت کو سمجھ چکے ہیں اس لیے نہ ہنستے ہیں نہ روتے ہیں یعنی دنیا کے غم اور خوشیاں دونوں دھوکہ ہیں اور جو اہل نظر ہیں وہ ان سے متاثر نہیں ہوتے۔

غم ہائے روزگار سے ممکن نہیں گریز
یہ بھی ترے ستم میں سموئے ہوئے سے ہیں

دنیا کے غم والم سے نجات پانا ممکن نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کیونکہ غم روزگار بھی محبوب (اللہ تعالیٰ) ہی کا عطا کیا ہوا ہے۔

بالیں پہ آکے نزع کے پردہ میں چھیڑ دو
نغمے جو ساز مرگ میں سوئے ہوئے سے ہیں

اگر دم نزع محبوب عاشق کے سرہانے آجائے تو اس کی موت بھی حسین ہو جائے اور موت کی خاموشی نغمہ ریز ہو جائے۔

کچھ پاسِ جوشِ گریہ ہے کچھ پاسِ ضبطِ درد
اشکوں سے آستیں کو بھگوئے ہوئے سے ہیں

آنسوؤں کا طوفان آنکھوں سے بہہ نکلنے کے لیے بے قرار ہے۔ دوسری طرف ضبط کا تقاضا ہے کہ اشک بہنے نہ پائیں۔ ہم نے دونوں کے درمیان اس طرح سمجھوتہ کیا ہے کہ آنسو جو آنکھوں سے نکلنے

ہیں انھیں فوراً آستین سے پونچھ لیتے ہیں کہ یہ آنسو رسوا نہ ہوں۔

دامانِ تیغِ یار سے فانیؔ لہو کے داغ
دھوئے گئے ہیں اور نہ دھوئے ہوئے سے ہیں

محبوب نے عاشق کو قتل کر کے اپنی تلوار دھوئی ہے مگر اس کے باوجود لہو کے داغ اس سے دھل نہیں سکے ہیں۔ مراد یہ کہ مظلوم کا خون رنگ لا کر رہتا ہے۔

(۱۷۴)

آپ سے شرحِ آرزو تو کریں
آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں

ہم تو کب سے تیار بیٹھے ہیں کہ آپ سے فسانۂ غم کہہ سنائیں مگر آپ کی طرف سے ابتدا تو ہو۔

وہ یہیں ہیں جو کہیں بھی نہیں
آئیے دل میں جستجو تو کریں

ہم نے محبوب کو ہر جگہ تلاش کیا اور کہیں اس کا نشان نہ پا سکے۔ لاؤ اب ذرا اپنے دل میں تلاش کر کے دیکھیں۔ جب وہ اور کہیں نہیں تو ضرور دل میں ملے گا۔

خدا کو ڈھونڈھنا ہے تو اپنے دل میں ڈھونڈھ

اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں

دوسروں کا دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جو خود دکھ جھیل چکا ہو۔ دنیا والے مجھے اس وقت تک نہیں سمجھ سکیں گے جب تک وہ میری طرح اپنے دلوں کو غم سے مٹا نہ دیں۔

رنگ و بو کیا ہے یہ تو سمجھا دو
سیرِ دنیائے رنگ و بو تو کریں

ہم اس دنیائے رنگ و بو کی سیر کرنے کو تیار ہیں مگر کوئی یہ تو بتا دو کہ یہاں کے رنگین نظاروں کی اصلیت کیا ہے۔ شعر میں اگرچہ صرف سوال ہے مگر اس سوال ہی میں یہ اشارہ پنہاں ہے کہ اس دنیائے رنگ و بو کے جلوے کوئی اصلیت نہیں رکھتے بلکہ محض فریب ہیں۔

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

عاشق کو محبوب کی مرضی کا اس قدر احترام ملحوظ ہے کہ بغیر اس کی مرضی کے وہ اس کی خواہشِ وصل کو بھی دل میں نہیں آنے دیتا اور اس سے رضا طلب کر رہا ہے۔

وہ اُدھر، رُخ اِدھر ہے میّت کا　　لوگ فانی کو قبلہ رو تو کریں

قاعدہ ہے کہ میّت کو قبر میں اُتارنے کے بعد اس کا رخ قبلہ کی طرف کر دیا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا رخ دوسری طرف ہے حالانکہ میرا قبلہ (محبوب) دوسری طرف ہے۔ ذرا لوگوں سے کہو کہ وہ میرا چہرہ محبوب کی طرف پھیر دیں۔

(۱۷۵)

گردش میں تھا وہ ایک ہی جلوا کہاں کہاں
تھی فرشِ راہ چشمِ تماشا کہاں کہاں

کائنات کی ہر چیز کے پردہ میں محبوب کا جلوہ تھا اور جہاں جہاں اس کا جلوہ تھا وہاں عاشقوں کی نگاہیں اس کی راہ میں فرش بنی ہوئی تھیں۔ مراد یہ کہ یہ کائنات محبوبِ حقیقی کے جلووں اور عشق کی نگاہوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

ذرّے میں دشت، قطرے میں طوفاں چھپے رہے
ڈالا مری نگاہ نے پردا کہاں کہاں

شاعر اپنی ظاہر بیں نگاہ کے فریب کا شاکی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کے ہر ذرّے میں صحرا کی سی وسعت اور ہر قطرے میں طوفان کی شان تھی لیکن میری نگاہِ نارسا ظاہر سے گزر کر چھپی ہوئی حقیقتوں تک نہ پہنچ سکی اور اس نے ہر چیز کی حقیقت پر ایک پردہ ڈال دیا۔ مراد یہ کہ اگر دنیا کے حسن میں ہم حسنِ ازل کا مشاہدہ نہیں کر سکتے تو یہ ہماری نگاہوں کا قصور ہے۔

بزمِ الست، دارِ فنا، جلوہ گاہِ حشر
پہنچی ہے لے کے ان کی تمنا کہاں کہاں

بزمِ الست = محفلِ ازل جب خدا تخلیقِ کائنات کر رہا تھا۔ دارِ فنا = دنیا۔ جلوہ گاہِ حشر = قیامت۔

کا دن جہاں خدا کا جلوہ بے نقاب نظر آئے گا۔

شاعر کہتا ہے کہ ہم نے تلاشِ محبوب میں کائنات کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ اور بزمِ الست سے لے کر بزمِ محشر تک اس کو ڈھونڈتے رہے۔ مراد یہ کہ کائنات کی تخلیق عشق کے جذبہ کی مرہونِ منت ہے۔

قلب و جگر کے درد کا پھر کس کو ہوش تھا
جب اس نے مسکرا کے یہ پوچھا "کہاں کہاں"

محبوب نے جب مسکرا کر عاشق سے دریافت کیا کہ درد کس جگہ ہے تو اس پرسشِ حال نے اسے اتنا بے خود کیا کہ عاشق کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ درد کس جگہ تھا۔

آخر نگاہِ دوست میں فانی نے پا لیا
یوں مرگِ ناگہاں تجھے ڈھونڈھا کہاں کہاں

ہم موت کی تلاش میں سرگرداں تھے اور وہ ہمیں کسی طرح نہیں مل رہی تھی۔ آخر محبوب کی نگاہوں میں ہم نے اس کو پا لیا۔ یعنی اس کی قاتل نگاہیں ہماری موت کا بہانہ بن گئیں اور ہمیں اپنا مقصد حاصل ہو گیا۔

(۱۷۶)

آئینہ جلوۂ معشوقِ ازل کا میں ہوں
عکسِ محبوب ہے دل، محوِ تماشا میں ہوں

صوفیاء کے نظریۂ ہمہ اوست کے مطابق اس کائنات کی اصل صرف خدا کی ذات ہے۔ عالم کی ہر شے میں اس کا جلوہ ہے۔ ان جلوؤں کو دیکھنے کے لیے اس نے انسان کو تخلیق کیا ہے لیکن انسان کی شکل میں بھی وہ خود ہی جلوہ فگن ہوا ہے گویا بقول غالب: ؎ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔

فانی کے اس شعر میں بھی اسی عقیدہ کا اظہار ہے۔

نگہِ ناز کو ہے فخر کہ میں ہوں قاتل
لبِ جاں بخش کو دعویٰ کہ مسیحا میں ہوں

محبوب کا حسن بہ یک وقت عاشق کے لیے قاتل بھی ہے اور جاں بخش بھی۔ اس کی شوخ نگاہیں عاشق کی موت کا سامان فراہم کرتی ہیں تو اس کے حسین لب اسے دوبارہ زندگی دیتے

دلربا، دلبر و دلدار و دل آرا تم ہو   عاشق و والہ دلدادہ و شیدا میں ہوں

ایک معشوق میں جو صفات ہوتی ہیں وہ سب میرے محبوب میں جمع ہیں اور میں عاشق کے تمام اوصاف کا مجموعہ ہوں۔ شعر میں کوئی خاص حسن نہیں۔ صرف صنعتِ تنسیق الصفات کا استعمال ہے۔ یعنی کسی شخص کی مختلف صفتوں کو اکٹھا کر دینا۔

سخت مضطر ہوں شبِ ہجر میں تنہائی سے   اے اجل تو ہی خبر لے کہ اکیلا میں ہوں

شبِ ہجر کی تنہائی سے گھبرا کر شاعر موت کو یاد کرتا ہے کہ ایسے میں تو ہی ہماری خبر لے۔

یاس کی شکل میں اُمید نظر آئے جسے   سچ تو یہ ہے کہ وہ ناکامِ تمنّا میں ہوں

محبت کی ناکامیوں نے ہمارا یہ حال کر دیا ہے کہ اب کوئی امید دل میں نہیں بلکہ اگر کسی سے امید اور بھروسہ ہے تو مایوسیوں سے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

شمع و پروانۂ بزمِ احدی ہوں فانیؔ   عاشق و جلوۂ معشوق سراپا میں ہوں

بزمِ احدی = وہ محفل جہاں صرف ایک ہستیٔ واحد (اللہ تعالیٰ) کے سوا کوئی نہ تھا۔

اس شعر میں بھی نظریۂ ہمہ اوست کا اظہار ہے۔ فانیؔ کا کہنا ہے کہ اگرچہ میں بظاہر حسنِ ازل کا عاشق ہوں لیکن حقیقت میں مَیں ہی حسن ہوں۔ میری ذات اس وقت بھی موجود تھی جب اس کائنات میں سوائے ذاتِ واحد کے اور کسی شے کا وجود نہ تھا۔ اس محفل میں بھی میری ہی ذات کی روشنی تھی۔

(۱۷۷)

چراغِ کشتۂ آرام گاہِ بے نشانی ہوں
میں رویائے پریشانِ فنا ہوں، یعنی فانی ہوں

چراغِ کشتہ = بجھا ہوا دیا   رویائے پریشاں = پریشان خواب

میری زندگی کسی مٹی ہوئی آرام گاہ (مراد قبر) کے بجھے ہوئے چراغ سے مشابہ ہے۔ میری ہستی کا کوئی وجود نہیں بلکہ موت کے خواب پریشاں نے مجسّم ہوکر میری شکل اختیار کرلی ہے۔ زندگی کی بے حقیقتی اور آلام و مصائب کے اظہار کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی تشبیہ ممکن نہیں کہ اس کو فنا کا خواب پریشاں کہا جائے۔

خلوصِ ربطِ مرگ و عشق میں کچھ شک نہیں لیکن
عزیزِ خاطرِ نامہربانِ سخت جانی ہوں

موت اور عشق میں جو قریبی تعلق ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ہم جو عشق میں اب تک جی رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سخت جانی نے ہم کو اپنا خاص منظورِ نظر بنایا ہوا ہے۔

دیارِ نامرادی میں مری اک عمر گزری ہے
ابھی ناواقفِ رسمِ جہانِ کامرانی ہوں

ہماری تمام زندگی مایوسیوں اور ناکامیوں میں گزری ہے اور خوشیوں سے ہماری کوئی شناسائی نہیں ہے۔ شعر میں "ابھی" کا لفظ اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ فانؔی کو جہانِ کامرانی سے واقفیت حاصل کرنے کی توقع ہے مگر میر ناکامیوں سے کام لینے کو محبت کا سلیقہ بتاتے ہیں:

بڑے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں   تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

گئے وہ دن کہ میں اُمّیدوارِ مرگ فانؔی تھا
اب اک مدّت سے ماتم دارِ مرگِ ناگہانی ہوں

وہی لوگ جو فانؔی کی موت کے خواہش مند تھے اب اس کی ناگہانی اور بے وقت کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔

(۱۷۸)

آ کے تماشا گاہِ جہاں میں دادِ تماشا کیا چاہوں
یاں ہر ذرّہ کہتا ہے میں ذرّہ نہیں اک دنیا ہوں

اس عالم میں ہم جس ذرہ پر نظر ڈالتے ہیں وہ ہمیں ساری دنیا کے جلووں کا حامل نظر آتا ہے۔ جلووں کی اس کثرت نے ہمیں اس قدر متحیر کر دیا ہے کہ ہم ان جلووں کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ ع : حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

محو تماشا ہوں میں یارب یا مدہوش تماشا ہوں
اس نے کب کا پھیر لیا منھ، اب کس کا منھ تکتا ہوں

ہم نے بزم ازل میں محبوب کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کو دیکھ کر یہ عالم ہوا کہ اب اگرچہ اس کا حسن ہماری نگاہوں سے کب کا روپوش ہو چکا ہے مگر ہم ایسے محو ہیں گویا اب بھی وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس عالم کو محویت کہا جائے کہ مدہوشی۔ فانی کی شاعری میں تصوف اور تغزل کی حدیں اس طرح مل گئی ہیں کہ ایک ہی شعر کو حقیقی معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے اور مجازی میں بھی۔

شب اشکوں کے طوفاں کا وہ جوش و خروش ارے توبہ
ہر اشک امنڈ کر کہتا تھا میں دل کے لہو کا دریا ہوں

رات جدائی کی تکلیفوں سے یہ حال تھا کہ آنکھوں سے اشکوں کا طوفان رواں تھا اور لگتا تھا کہ خونِ دل آنسوؤں کے ذریعہ بہا جا رہا ہے۔

(۱۷۹)

ہر سانس کے ساتھ جا رہا ہوں   میں تیرے قریب آ رہا ہوں

فانی کے نزدیک موت اس لیے عزیز ہے کہ اس کے بعد ہی انھیں محبوب کا وصل نصیب ہو سکتا ہے۔ ان کو ہر ہر سانس گزرنے سے یہ خوشی ہے کہ اب ان کا راستہ کم ہو رہا ہے اور وہ محبوب سے نزدیک تر ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ دل میں کراہنے لگا کون   رو رو کے کسے رلا رہا ہوں

محبت کا مطلب ہے کہ محبوب اور عاشق میں دوئی باقی نہ رہے۔ جب یہ مرتبہ حاصل ہو گیا اور عاشق کی آواز محبوب کی آواز بن گئی تو پھر رونا یا آہیں بھرنا کیا معنی۔ فانی تو جو محبوب

رہا ہے یہ تو نہیں رو رہا ہے محبوب کو رُلا رہا ہے۔ فانی کے نزدیک محبت ہی سب سے بڑی چیز ہے۔

اب عشق کو بے نقاب کر کے
میں حسن کو آزما رہا ہوں

فانی کے نزدیک جذبۂ عشق میں وہ دلکشی اور حُسن ہے کہ اگر حسن بھی اسے دیکھے تو اس کا دیوانہ ہو جائے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ میں عشق کی حقیقت کو آشکار کر کے حسن کو آزمائش میں مبتلا کر رہا ہوں۔ اس میں اشارہ یہ بھی ہے کہ حسن و عشق مختلف وجود نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ میں اس راز سے پردہ اٹھا کر حسن کا راز آشکار کر رہا ہوں۔

اسرارِ جمال کھل رہے ہیں
ہستی کا سراغ پا رہا ہوں

صوفیاء کا کہنا ہے کہ ذاتِ الٰہی کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی کا عرفان ضروری ہے۔ ہم خود کو پہچان کر ہی خدا کو پہچان سکتے ہیں۔ فانی کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ہستی کو سمجھ لیا ہے اور اسی لیے اب میرے دل پر حسن مطلق کی ہستی کے راز بھی منکشف ہو رہے ہیں۔

تنہائی شامِ غم کے ڈر سے
کچھ ان سے جواب پا رہا ہوں

شام غم کی تنہائی سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں کیونکہ اس تنہائی مین ہم محبوب سے باتیں کرتے ہیں۔

لذّت کشِ آرزو ہوں فانیؔ
دانستہ فریب کھا رہا ہوں

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری آرزوؤں سے ہمیں کچھ نہیں مل سکتا اور اگر تقدیر میں محرومی ہے تو یہ محرومی خواہشات سے بدل نہیں سکتی مگر ہم پھر بھی آرزوئیں کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرزوؤں میں لذّت ملتی ہے۔ ورنہ جان بوجھ کر دھوکہ کھانا کیا معنی؟

(۱۸۰)

مانا تیری راہ کا نشاں ہوں
یہ بھی تو بتا کہ میں کہاں ہوں

کہا جاتا ہے کہ اس کائنات کی تمام اشیاء دراصل معرفتِ الٰہی کا ذریعہ ہیں اور ان کے

ذریعہ ہم خدا کو پہچان سکتے ہیں لیکن فانیؔ جو "ہمہ اوست" اور "لاموجود الا اللہ" (خدا کے سوا کوئی موجود نہیں) کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ کسی اور چیز کا وجود ہی کہاں ہے۔ خود میری ذات جس کو خدا تک پہنچنے کا راستہ کہا جاتا ہے وہ بھی کب وجود رکھتی ہے۔

میں تجھ سے جدا ہوں، تو نہیں ہے
تو ہے میرے پاس، میں جہاں ہوں

میں تجھ سے الگ ہو گیا ہوں لیکن تو مجھ سے جدا نہیں ہوا ہے بلکہ میں جہاں بھی ہوں تو میرے ساتھ ہوتا ہے۔

جو حال ہے عرضِ حال بھی ہے
میں آپ ہی اپنی داستاں ہوں

اپنی حالت بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ میرا حال تو میری صورت سے ظاہر ہے گویا میں خود اپنی داستان بن گیا ہوں۔

جو چھپ نہ سکے وہ راز ہے عشق
کچھ کہہ نہ سکے وہ رازداں ہوں

کہا جاتا ہے کہ عشق چھپ نہیں سکتا۔ فانیؔ کے خیال میں عشق ایک ایسا راز ہے جسے کسی نے سمجھا ہی نہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس راز سے جو لوگ واقف ہوتے ہیں وہ بھی اس کو بیان نہیں کر سکتے۔ یعنی اس حقیقت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

مجھ سے نہ ملا سراغِ ہستی
بیٹھی ہوئی گردِ کارواں ہوں

قافلے کے گزرنے کے بعد جو گرد راہ میں اڑتی رہ جاتی ہے اس سے قافلے کے جانے کی سمت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ فانیؔ جو اپنے قافلے سے بچھڑ گئے ہیں اپنے کو گردِ کارواں سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن چونکہ ان کی ذات سے کسی کو اتنا فائدہ بھی نہیں پہنچا جتنا کہ گردِ کارواں سے۔ اس لیے زمین پر جمی ہوئی گرد کہتے ہیں۔ سراغِ ہستی سے مراد ہے زندگی کے حقائق کا علم۔

خم ہے سرِ عرش میرے آگے
کس سجدۂ شوق کا نشاں ہوں

محبوب کے عشق اور اس کے آستاں پر سجدہ ریزی کے شوق نے میری عظمت اس قدر

بڑھادی ہے کہ آسمان بھی میرے آگے سر جھکاتا ہے۔

ہے میری بقا فنا میں فانی
اس باغ میں برق آشیاں ہوں

بقا اور فنا تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ صوفیوں کے نزدیک جب انسان اپنی ہستی کو عشق الٰہی میں فنا کر دیتا ہے تب اسے بقا کا مقام حاصل ہوتا ہے مگر اس شعر میں فانی نے بقا اور فنا لفظی معنی میں استعمال کیے ہیں یعنی زندگی اور موت کے لیے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح آشیاں پر بجلی گرنے سے سب کو آشیاں کے وجود کا پتہ چلتا ہے اسی طرح زندگی کا وجود بھی موت کا محتاج ہے۔ گویا میری (مراد انسان) زندگی بھی فنا میں مضمر ہے۔ اسی لیے وہ زندگی کی اہمیت کے منکر ہیں کیونکہ ع

نیست نہ ہو تو ہست نہیں، ہستی کی کیا ہستی ہے

(۱۸۱)

کیا اب سے موت کو بھی ہم زندگی بنالیں
کیوں کر تری خوشی کو اپنی خوشی بنالیں

عاشق محبوب کی مرضی کو اپنی مرضی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ اس پر بھی راضی ہے کہ اگر محبوب اس کی موت کا خواہش مند ہے تو وہ موت کو زندگی کی طرح عزیز سمجھنے لگے۔ دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ زندگی اگرچہ موت کی طرح تکلیف دہ ہے مگر اس کو بھی ہم محبوب کی خوشی کی خاطر زندگی کہنے پر آمادہ ہیں۔ یہی خیال فانی کے اس شعر میں بھی ہے :

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جیے جانے سے کچھ حاصل نہیں

فرزانگی تو اپنا مقدور ہی نہیں ہے
کہیے تو عقل ہی کو دیوانگی بنالیں

عقل والوں کے طریقے اپنانا ہمارے مقدور سے باہر ہے۔ اگر محبوب کی مرضی ہو تو ہم عقل والوں کو دیوانگی سکھا دیں۔

جن کو خیال پر بھی قابو نہ ہو وہ فانی
تقدیر کیا بناتے، تدبیر ہی بنالیں

فانی جیسا انسان جسے اپنے خیالات پر بھی قابو نہ ہو وہ اپنی تقدیر بدلنے کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے۔ اگر وہ کوئی تدبیر ہی بنالے تب بھی بہت ہے۔ اپنے مزاج کی کم حوصلگی اور آشفتگی کا بہت

سچا نقش پیش کیا ہے۔

(۱۸۲)

کیوں دل کو صرفِ کشمکشِ جستجو کریں
لاؤ اسے شہیدِ غمِ آرزو کریں

حصولِ دنیا کی کوشش کرنا اور اس کے لیے دل کو کشمکش میں مبتلا کرنا فانی کے نزدیک فضول ہے۔ ہاں محبت کے غموں سے اگر دل کو خون کیا جائے تو یہ اس کے لیے مناسب ہے۔

کچھ شغل چاہیے جو نظر کو تو پھر حضور
دل چاک ہو گیا ہے اسی کو رفو کریں

فانی اپنے چاک دل کو رفو اس لیے نہیں کرتے کہ اس کے زخم بھر جائیں گے۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ محبوب کی نگاہیں پھر اسے اپنا نشانہ بنائیں اور اس پر مشقِ ستم کریں۔

تھوڑی سی دیر گریۂ خونیں میں اور ہے
بڑھ لے کچھ اور درد تو دل کو لہو کریں

شاعر کی ایذا پسندی کا یہ حال ہے کہ وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ درد کب اتنا بڑھے کہ آنکھوں سے خون کے آنسو بہنے لگیں۔

ناخوشگوار ہے جو محبت کا تذکرہ
اچھا تو لاؤ اور کوئی گفتگو کریں

محبوب کی مرضی کا عاشق کو اس قدر خیال ہے کہ محبوب کو محبت کا ذکر ناپسند ہے تو وہ اس ذکر سے بھی دستبردار ہونے کو تیار ہے۔

فرقت میں موت مانگنے والوں کا کیا قصور
آخر یہ نامراد کوئی آرزو کریں

ہجر کے غموں سے تنگ آکر عاشقِ نامراد موت کی آرزو نہ کرے تو اور کیا کرے۔ محبوب کے آنے کی آرزو تو پوری ہونے سے رہی۔ ناچار موت ہی کی آرزو کرتا ہے۔ غالب کے مندرجہ ذیل شعر کا بھی بنیادی خیال یہی ہے لیکن غالب کا لہجہ معاندانہ اور جوشیلا ہے۔ فانی کے لہجے میں بے بسی و مایوسی ہے جو غزل کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
(غالب)

ارشاد ہے کہ آئینہ ہم رو برد کریں   مطلب یہ ہے کہ آج ہوئی نذرِ دل قبول

محبوب عاشق سے آئینہ دکھانے کو کہہ رہا ہے۔ اس فرمائش سے عاشق فوراً یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس نے عاشق کے دل کا نذرانہ قبول کر لیا ہے۔ شعر میں دو اشارے ہیں اوّل تو یہ کہ اس نے اپنی خدمت خاص اس کے سپرد کی ہے جس کا مطلب ہے کہ اس کے عشق کا اعتراف کیا ہے۔ دوسرے آئینہ دیکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے عشق کے اظہار کے سبب محبوب میں اپنے حُسن کا احساس اور خود آرائی کا شوق جاگ گیا ہے۔ دل اور آئینہ کی رعایت بھی ظاہر ہے۔

چل کر چمن میں شغلِ مئے بے سبو کریں   فانی اب اُٹھ کہ مست ہیں جھونکے نسیم کے

صبح کا سرور انگیز وقت شراب نوشوں کو مے کشی کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن فانی کو شراب سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ تو بہار کے حُسن سے ہی مدہوش ہونے والوں میں ہیں اور صراحی و جام کے بغیر نشہ حاصل کرتے ہیں۔

(۱۸۳)

زخم نصیب تھا جگر، زخم جگر سے کیا کہیں
ان کی نظر نے کیا کیا، ان کی نظر سے کیا کہیں

ہمیں نہ محبوب کی نظر سے کوئی گلہ ہے نہ زخمِ جگر کی کوئی شکایت۔ زخم جگر ہمارے نصیب میں تھا سو وہ مل کر رہا۔

رسمِ وفا سے بے خبر ہم بھی نہیں مگر حضور
بس بھی تو آنسوؤں پہ ہو، دیدۂ تر سے کیا کہیں

محبوب عاشق کو سرزنش کر رہا ہے کہ محبت میں آنسو بہانا رسمِ وفا کے خلاف ہے۔ عاشق کہتا ہے ہم بھی یہ بات جانتے ہیں مگر کیا کریں کہ آنسوؤں پر ہمارا قابو نہیں اور آنکھیں بے اختیار اشکباری پر مجبور ہیں۔

آہ انھیں کی ہے عطا، خیر وہ بے خبر سہی
دیں گے اثر بھی اب وہی، بابِ اثر سے کیا کہیں

ہم اپنی آہوں میں اثر کی دعا بھی نہیں کرتے۔ یہ غم اور آہیں محبوب کی امانت ہیں۔ وہ جب چاہے گا تو انھیں اثر بھی دے گا۔

راز نیاز ہے کہیں منہ سے نکالنے کی بات
سجدۂ دل کی واردات، سجدۂ سر سے کیا کہیں

محبت دل میں رکھنے کی چیز ہے اظہار کی نہیں۔ محبت کے سجدے سر سے نہیں کیے جاتے بلکہ دل اس طرح سجدہ کرتا ہے کہ سر کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ عبادتِ ظاہری اور عبادتِ عشق کے فرق کو بڑے خوبصورت و مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

شکوۂ غم سے فائدہ شکرِ ستم بھی کیا ضرور
حسن کے شعبدوں کا حال شعبدہ گر سے کیا کہیں

یہ آلام و مصائب محبوب کے حسن کی ادائیں ہیں۔ ان کا شکوہ کرنا یا ان پر شکر کرنا دونوں غیر ضروری ہیں۔ وہ خود ہر بات سے واقف ہے اور ہمارے دل کے جذبات کو بھی جانتا ہے۔ اس کے روبرو ان کو بیان کرنے سے کیا حاصل۔

دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ دردِ دل نہیں
بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں

ہم اپنے دکھوں کی داستان کسی کو یہاں تک کہ خود اپنے دل کو بھی نہیں سناتے کیونکہ دل تو اس سے واقف ہے، اس سے کہنے سے فائدہ؟ اور کوئی ہمارے دکھ کو سمجھ ہی نہیں سکتا اس لیے اور کسی سے کہنا بھی بے کار ہے۔

حسنِ جفا پسند سے حسرتِ عرضِ شوق کیا
تشنہ لبی کا ماجرا آبِ گہر سے کیا کہیں

آبِ گہر = موتی کی چمک جو کسی کی پیاس نہیں بجھا سکتی۔

جس طرح موتی سے اپنی پیاس بجھانے کی درخواست کرنا محض نادانی ہے اسی طرح

ستمگر محبوب سے داستانِ محبت سنا کر مہربانی کی توقع بے کار ہے۔ کیونکہ اس کا دل بھی ہیرے کی طرح خوبصورت مگر سخت ہے۔

دل کے چمن کی ہر کلی دیدہ ہوئی کہ جل گئی
بادِ سحر کو کیا خبر، بادِ سحر سے کیا کہیں

بادِ سحر کا کام کلیوں کو کھلانا ضرور ہے لیکن جو کلیاں دھوپ کی گرمی سے جل چکی ہوں ان سے بادِ سحر کو کیا تعلق۔ ہمارے دل کی ساری آرزوئیں جل کر خاک ہو چکی ہیں۔ اب کسی خوشی کی امید یا تمنا کرنے سے کیا فائدہ؟

فانی اب ان سے عرضِ حال کیجیے بار بار کیا
وہ نئے سرے سے کیا سنیں، ہم نئے سرے سے کیا کہیں

محبوب کے سامنے بار بار اپنی داستانِ غم دہرانے سے کیا حاصل۔ اگر اسے مہربانی کرنا ہوتی تو وہ پہلے ہی کر چکا ہوتا۔

یہ غزل فانی نے دکن کے قیام کے زمانہ میں لکھی تھی۔ اس میں ان حالات اور ناقدریوں کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے جن کا فانی شکار رہے اور ان کی خودداری اور غیور طبیعت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

(۱۸۴)

کیسی بہار اب وہ خزاں کے بھی دن گئے
اب ہم کہیں ہیں، دام کہیں، آشیاں کہیں

چمن سے دور طائر کو صرف چمن کی بہاریں اور اپنا آشیانہ ہی یاد نہیں آتا بلکہ خزاں اور اس جال کی بھی یاد آتی ہے جس کو اس کی گرفتاری کے لیے بچھایا جاتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں غربت میں رہ کر وطن کی تکلیفیں بھی راحت معلوم ہوتی ہیں۔

یوں ہم نشانِ دوست بنے بھی تو کیا بنے
ملتا نہیں کسی کو ہمارا نشاں کہیں

محبت میں فنا ہو کر ہم نے خود کو محبوب کی ذات کا پرتو یا اس کا نشان تو بنا لیا ہے

مگر ہماری ہستی مٹ گئی۔ گویا یہ منزل حاصل تب ہی ہو سکتی ہے جب عاشق اپنے کو فنا کر دے۔

غم رہ گیا ہے عہدِ محبت کی یادگار
یہ بھی نہ ہو نصیبِ دلِ دشمناں کہیں

محبت میں اور تو ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ غم ضرور محبت کی نشانی کے طور پر ہمارے پاس رہ گیا ہے۔ کہیں یہ بھی ہم سے چھین نہ لیا جائے۔ غم کو محبت کی یادگار سمجھ کر اسے سینہ سے لگائے رکھنے کا خیال فانی کے اکثر اشعار میں ملتا ہے۔

(۱۸۵)

وعدوں پہ ہیں کیوں ناحق امید کی تاکیدیں
بندھتی ہیں کہیں ظالم ٹوٹی ہوئی اُمیدیں

مسلسل ناکامیوں نے شاعر کا دل اس طرح توڑ دیا ہے کہ اب اس میں کوئی اُمید نہیں آنے پاتی۔ یہاں تک کہ کسی کے وعدے بھی اب اسے امید نہیں بندھا پاتے۔

یہ فیضِ محبت ہے، اقبالِ محبت ہے
ہر آہ کو حاصل ہیں تاثیر کی تائیدیں

عاشق کی آہوں کو جو تاثیر کی تائید حاصل ہوئی ہے یہ سب محبت کا کرشمہ اور فیضان ہے مراد یہ کہ اگر جذبۂ محبت صادق ہے تو آہ میں اثر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

آغازِ محبت کے اللہ وہ کیا دن تھے
وہ شوق کے ہنگامے، وہ شوق کی تمہیدیں

شاعر آغازِ محبت کا وہ زمانہ یاد کر رہا ہے جب دل میں ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا اور نئے نئے حوصلے اور امیدیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ موجودہ حالت کا ذکر اگرچہ شعر میں نہیں مگر شعر کا پُرحسرت لہجہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ اب وہ دن گزر چکے ہیں اور بقولِ میرؔ:

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے

بیداد اسے کہتے ہیں شوخی تو نہیں کہتے
خود درد بھی دیں اس پر پھر صبر کی تاکیدیں

محبوب کے ظلم و ستم کو تو اس کی شوخی پر محمول کیا جا سکتا تھا، مگر ظلم کر کے وہ عاشق کو رونے دھونے، آہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ یہ تو شوخی نہیں بیداد ہے۔

شہزادۂ والاشاں آئے تھے کہ عید آئی
اس سال مبارک ہوں فانیؔ تجھے دو عیدیں

ریاست حیدرآباد کے جونیئر پرنس شہزادہ معظم جاہ کی سفر سے واپسی عید کے مہینہ میں ہوئی۔ گویا فانیؔ کو دو عیدیں ایک ساتھ ملیں۔

(۱۸۶)

بتایا راستہ عشق مجازی نے حقیقی کا
خدا کی شان رہزن بھی کبھی رہبر نکلتے ہیں

صوفیاء کا قول ہے کہ " المجاز قنطرۃ الحقیقت " یعنی مجاز حقیقت کی سیڑھی ہے اور مادی محبت کے ذریعہ انسان خدا کی محبت تک پہنچتا ہے۔ فانیؔ کہتے ہیں کہ مجاز اگرچہ ایک رہزن ہے جو عاشق کو محبوب حقیقی سے دور کر دیتا ہے لیکن کبھی کبھی یہی رہزن اسے اصل منزل کی طرف رہنمائی کا سبب بھی بنتا ہے اور رہبر کے فرائض انجام دیتا ہے۔

مری آنکھوں سے ہے زخم جگر کو ربطِ پنہانی
ترے پیکاں کے ریزے اشک میں اکثر نکلتے ہیں

زخم جگر کا اگرچہ بظاہر آنکھوں سے کوئی تعلق نہیں لیکن ضرور دونوں میں کوئی پوشیدہ ربط موجود ہے تب ہی تو ہماری آنکھوں سے اکثر محبوب کے تیر کے پیکاں کے ریزے آنسوؤں کے ساتھ نکلتے ہیں۔
شعر میں لکھنوی تکلف ہے۔

الٰہی آگ لگ جائے زمانہ کی دو رنگی کو
جنھیں نازک بدن سمجھو وہی پتھر نکلتے ہیں

فانی دنیا کے اس انداز سے نالاں ہیں کہ لوگ دیکھنے میں کچھ نظر آتے ہیں اور اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں یہاں تک کہ محبوب جس کو وہ نازک بدن سمجھتے تھے وہ سخت دلی میں پتھر سے کم نہیں۔ شعر کی بیساختگی اور اصلیت قابلِ داد ہے۔

مبارک فانیؔ بسمل کہ تیرے قتل کرنے کو
نئی چھریاں نکلتی ہیں نئے خنجر نکلتے ہیں

شعر کے الفاظ نہایت غیر شاعرانہ اور جذباتی پہلو سے محروم ہیں۔ لیکن خیال شاعرانہ ہے۔ محبوب فانی کو گرفتارِ محبت کرنے کے لیے اپنے ناز و ادا کے تمام ہتھیار آزما رہا ہے فانی اس پر خوش ہو کر اپنے کو مبارکباد دیتے ہیں کہ تیری یہ قدر و قیمت کہ اس کے لیے محبوب خاص اہتمام کر رہا ہے۔

(۱۸۷)

جس دلربا سے ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں
آخر اسی نے ہم کو آنکھیں دکھائیاں ہیں

ہم نے جس کسی سے محبت کی اور جسے اپنانا چاہا وہ آخر ہم سے بے وفائی کر کے رخصت ہو گیا۔

پریاں ہیں، فصلِ گل میں چلتی ہیں جو ہوائیں
پھولوں سے اپنی جیبیں بھر بھر کے لائیاں ہیں

بہار کے موسم میں خوشبو سے معطر ہوائیں گویا پریاں ہیں جو پھولوں کو اپنے دامن میں بھر کر اڑتی پھر رہی ہیں۔

ہے رات فصلِ گل کی، اور رت ہے فصلِ گل کی
چن چن کے ہم نے کلیاں سیجیں بچھائیاں ہیں

ایک گلبدن نے موسم بہار میں ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہم نے اس کے لیے کلیوں کی سیج تیار کر کے رکھی ہے اور اس کے منتظر بیٹھے ہیں۔ یہ غزل فانی کے دورِ طالب علمی کی ہے اور حسرت موہانی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اس کا لہجہ اور تاثر فانی کی بعد کی شاعری سے بہت مختلف اور بڑا شگفتہ ہے۔

یاں یاد بھی نہیں دل اس کی تلاش کیسی
کیوں دل چُرا کے تم نے آنکھیں چُرائیاں ہیں

محبوب عاشق کا دل چُرا کر اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا ہے۔ عاشق جسے دل کے جانے کی پروا نہیں ہے بلکہ محبوب کی یہ ادا ہی اس کا سب سے بڑا صدمہ ہے کہتا ہے کہ تم ناحق شرمندہ کیوں ہو۔ نہ ہمیں دل کی تلاش ہے نہ اس کی پروا۔ دل لینے والے کی نفسیات کو غالب نے بھی اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے لیکن فانی کا انداز زیادہ شاعرانہ ہے۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا　　دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

شاید فسانۂ غم سچا سمجھ گئے تم
صدقے ان انکھڑیوں کے یہ کیوں بھر آئیاں ہیں

عاشق نے محبوب کو اپنا افسانۂ غم سُنا تو دیا ہے مگر اب اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ اپنی اس حرکت پر پشیمان ہے۔ اور اسے رونے سے باز رکھنے کے لیے کہتا ہے کہ یہ کہانی کوئی سچی تھوڑی تھی۔ تم نے اس پر یقین کیوں کر لیا۔ محبوب کا یہ خیال ملاحظہ ہو کہ اس کی خاطر اپنی محبت کو جھوٹا بنانے پر بھی تیار ہے۔

تیری ہی اے شبِ غم کچھ کم نہ تھی سیاہی
کیوں بدلیاں یہ کالی گھر گھر کے چھائیاں ہیں

جدائی کی رات کی تکلیفیں اور سیاہی ویسے ہی کیا کم تھی جو اور گھٹائیں بھی گھر کر آ گئی ہیں۔ بادلوں سے تاریکی بڑھنا ایک حقیقت ہے اور محبوب کی یاد میں اضافہ ہونا بھی امرِ واقعہ۔

لاکھوں جتن کیے ہیں مر مر کے ہم جیے ہیں
کیا کہیے کیسی کیسی کڑیاں اُٹھائیاں ہیں

ہم پر جو مصیبتیں پڑی ہیں ہم ہی جانتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ مر مر کے جیے ہیں۔

جوشِ جنوں میں اکثر دشمن سے ہم نے فانی
جو دل پہ بیتیاں ہیں سب کہہ سُنائیاں ہیں

جنون میں اپنے پرائے کی پہچان بھی مٹ گئی ہے اور ہم اپنی داستانِ غم رقیب کو سُناتے ہیں۔

(۱۸۸)

تیور ستم ایجاد کے غمّاز نہیں ہیں
بیداد ہے، بیداد کے انداز نہیں ہیں

محبوب دیکھنے میں اس قدر بھولا بھالا ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی اس کی سخت دلی اور ستم گاری کا اندازہ نہیں لگا سکتا ہے اور اس کے چہرے کے کسی انداز سے اس کی بے دردی کا پتہ نہیں چلتا۔

وہ بے خبرِ شوق ہیں کچھ ان سے نہ کہنا
وہ دردِ محبت! ترے ہمراز نہیں ہیں

محبوب محبت اور دردِ محبت سے ناآشنا ہے اس لیے اس کے سامنے اپنا افسانۂ غم کہنا بیکار ہے۔ شعر میں صرف تکلف ہے اور دوسرے مصرعہ کے الفاظ میں تعقید ہے۔

یہ تیری خموشی کی ادائیں کوئی دیکھے
نغمے ہیں جو شرمندۂ آواز نہیں ہیں

محبوب کی آواز کو تو تمام شعرا نغمہ کہتے آئے ہیں لیکن فانی اس کی خاموشی کو بھی ایسا نغمہ قرار دیتے ہیں جس میں آواز نہیں۔ حقیقت کے اظہار کے ساتھ شاعرانہ جمالیات کی بہترین عکاسی بھی شعر میں ہے۔

ہم تیری محبت کے گرفتار ہیں صیّاد
یہ تارِ نفس مانعِ پرواز نہیں ہیں

قفس سے آزادی حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہم جب چاہیں زندگی کی قید سے آزاد ہو کر قفس سے بھی رہائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہ صیاد کی محبت ہے جو ہمیں اس قید کو قبول کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔ گویا ہم دراصل محبت کے قیدی ہیں۔

دل سے بھی اب آتی نہیں فانی خبر اپنی   مدت ہوئی ہم گوش بر آواز نہیں ہیں

بے خودیٔ محبت نے اس عالم میں پہنچا دیا تھا کہ اپنی خبر بھی نہ رہی تھی۔ ہاں دل کے ذریعہ کبھی کبھی اپنے وجود کی خبر مل جاتی تھی۔ (دل کی دھڑکنیں وجود کی ضمانت ہیں) اب مدت سے ہمیں اپنی کوئی خبر نہیں ملی کیونکہ ہم نے دل کی طرف سے توجہ ہٹا لی ہے۔ شاعر اول تو اپنی بے خودی کا اظہار کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ دل کی دھڑکنیں جو زندگی کی علامت تھیں وہ بھی اب اس قدر مدھم ہو گئی ہیں کہ بغیر کان لگائے انھیں سننا ممکن نہیں۔

(۱۸۹۱)

مجھ کو شکایتِ ستم ناروا نہیں   دل کی سزا یہی ہے تمھاری خطا نہیں

ہم کو محبوب کے ظلم و ستم کی کوئی شکایت، کوئی گلہ نہیں ہے۔ ہمارا گستاخ دل تھا ہی اس سزا کا مستحق۔

کہنا سوالِ وصل پہ کیا فرض تھا "نہیں"   آخر کوئی جواب "نہیں" کے سوا نہیں

عاشق کی التجائے وصل پر محبوب نہیں کے سوا اور کچھ بھی تو کہہ سکتا تھا۔ انکار کے اور بھی طریقے ہو سکتے تھے۔ کیا ضرور تھا کہ صاف انکار کر کے اس کا دل دکھایا جائے۔

عادت ہے التجا و دعا کی وگرنہ میں   کیا جانتا نہیں کہ وہ کافر خدا نہیں

ہم صرف اپنی عادت سے مجبور ہو کر محبوب سے التجا کرتے ہیں ورنہ ہمیں خبر ہے کہ وہ بت ہے خدا نہیں جو کسی پر رحم کرے۔ مومن نے اسی بات کو اپنے شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن   صنم آخر خدا نہیں ہوتا

درد فراق، زخم جگر، حسرتِ وصال   فانیِ غم نصیب کی قسمت میں کیا نہیں

فانی کی قسمت میں ہی غم لکھے ہیں۔ اور کوئی غم ایسا نہیں جو اس کے حصہ میں نہ آیا ہو۔

(۱۹۰)

جانتا ہوں کہ مرا دل مرے پہلو میں نہیں
پھر کہاں ہے جو ترے حلقۂ گیسو میں نہیں

محبوب کو اس بات سے انکار ہے کہ عاشق کا دل اس کے پاس ہے۔ عاشق پوچھتا ہے کہ ہمارے پہلو میں نہیں پھر دل اگر تمھارے پاس نہیں تو اور کہاں گیا۔ گویا دل کا پہلو میں نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ محبوب کے پاس ہے۔

ایک تم ہو کہ تمھارے ہیں پرائے دل بھی
ایک میں ہوں کہ مرا دل مرے قابو میں نہیں

محبوب کی شان ملاحظہ ہو کہ تمام دنیا کے دلوں پر اس کی حکومت ہے اور عاشق کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اس کا اپنا دل بھی اس کے بس میں نہیں۔

دور صیّاد، چمن پاس، قفس سے باہر
ہائے وہ طاقتِ پرواز کہ بازو میں نہیں

اگرچہ قفس سے آزادی مل چکی ہے، صیاد بھی قریب نہیں اور چمن بھی پاس ہے مگر بازوؤں کی قوت ختم ہو چکی ہے اس لیے بدنصیب طائر آزادی کے باوجود اڑنے سے قاصر ہے۔ مجبوری و بے بسی کی موثر تصویر ہے۔

دیکھتے ہیں تمھیں جاتے ہوئے اور جیتے ہیں
تم بھی قابو میں نہیں، موت بھی قابو میں نہیں

محبوب کے رخصت ہونے کا منظر ایسا تھا کہ عاشق اسے برداشت نہ کرسکتا تھا مگر کیا

کہے کہ موت پر اپنا اختیار نہیں اور محبوب کو روکنا بھی بس سے باہر ہے۔

حیف جس کے لیے پہلو میں نہ رکھا دل کو
کیا قیامت ہے کہ فانیؔ وہی پہلو میں نہیں

جس کے لیے ہم نے دل کو فدا کر دیا وہ ہی ہم سے دُور ہے۔

(۱۹۱)

وحشتِ دل اب وہ اگلا سا ستانا چھوڑ دے
خاک اُڑائی جس میں برسوں اب وہ صحرا ہی نہیں

جنون میں عاشق جنگل میں خاک اڑاتا ہے تو اسے سکون ملتا ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ ہم جس صحرا میں خاک اُڑایا کرتے تھے وہ معدوم ہو چکا ہے اس لیے اب عشق ہم پر رحم کھائے اور پہلے کی طرح ہمیں وحشت پر آمادہ نہ کرے۔ اشارہ یہ ہے کہ آج کا ماحول وحشت عشق کے اظہار کے لیے سازگار نہیں ہے۔

ماجرائے دردِ دل کو بے اثر کیوں کر کہوں
بندہ پرور کوئی اس کا سُننے والا ہی نہیں

محبت کی کہانی آج بھی اتنی ہی پُر درد اور پُر اثر ہے لیکن اس کو سننے اور سمجھنے والے نہیں ملتے۔ پہلے شعر کے خیال ہی کا سلسلہ اس شعر میں بھی ہے یعنی محبت کے لیے ماحول کی ناسازگاری۔

جو کلیجہ میں نہ ہو، دل میں نہ ہو وہ داغ کیا
ہو نہ جس میں داغ، وہ دل وہ کلیجا ہی نہیں

جو محبت انسان کے جسم اور دل کو زخمی نہ کر دے وہ محبت کہنے کے قابل نہیں، اور جس دل نے محبت کا زخم نہ کھایا ہو وہ دل کہلانے کا مستحق نہیں۔

عشقِ صادق وہ کہ دل سے لب تک آئے کیا مجال
حُسنِ یکتا وہ کسی نے جس کو دیکھا ہی نہیں

فآنی کے نزدیک محبت وہ ہے جس کا اظہار نہ ہو اور جو محبوب کے دیدار کی تمنا سے بھی غرض نہ رکھے۔ اسی طرح حسن بھی وہ محبت کیے جانے کے لائق ہے جسے کبھی کسی نے دیکھا نہ ہو یعنی محبت کسی کے لیے نہیں کی جاتی بلکہ وہ بجائے خود ایک نعمت ہے۔

زندگی ہے نام لطفِ صحبتِ احباب کا
یہ نہیں فآنی تو جینا کوئی جینا ہی نہیں

فآنی کے نزدیک دوستوں کی صحبت میں زندگی کا اصل لطف ہے جسے یہ میسر نہیں اس کی زندگی زندگی نہیں۔

(۱۹۲)

دنیا سے کچھ نہ پوچھو کیوں سرگرانیاں ہیں
یاروں سے ہمدموں سے کیوں بدگمانیاں ہیں

ہم کیا بتلائیں کہ ہم دنیا سے بددل کیوں ہو گئے ہیں اور دوستوں اور غمگساروں سے کیوں بدگمان ہو گئے ہیں۔ یعنی ہم نے دنیا کی محبت اور ہمدردی کی اصلیت سمجھ لی ہے اسی لیے ہر چیز سے بیزار ہو گئے ہیں۔

اس باغ میں ہیں سارے مرجھانے والے پودے
شادی و غم کے جھگڑے جھوٹی کہانیاں ہیں

دنیا کی خوشی اور غم دونوں محض دھوکا ہیں۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ہر چیز کا انجام فنا ہے۔

ہے عمرِ چند روزہ پانی کا بلبلہ سا
عالم ہے خواب کا سا یا نوجوانیاں ہیں

زندگی پانی کے بلبلہ کی مانند صرف چند ساعت کا وقفہ ہے اور زندگی کی خوشیاں اور نوجوانی کے ولولے خواب کی طرح بے حقیقت۔

یاں ہم نے جس کو پایا اپنی غرض کا پایا
یہ داغ، دوستوں کی دل پر نشانیاں ہیں

دنیا میں ہمیں جو بھی ملا غرض کا بندہ ملا۔ جنھیں ہم دوست سمجھے وہ ہی ہمارے دل پر زخم لگا گئے۔

کرتے تھے فخر جن پر ہم مہرباں سمجھ کر
کیا کیا نہ ان سے ہم پر نامہربانیاں ہیں

جن کی وفا اور مہربانی پر ہمیں بڑا ناز تھا وہی اب نامہربان اور دشمن جاں بن گئے ہیں۔

کیا کیجیے شکایت، ہے دہر جائے عبرت
جیتے ہیں اور جب تک یہ سخت جانیاں ہیں

دنیا کی شکایت کرنے سے کیا حاصل۔ یہاں چار و ناچار جب تک زندگی باقی ہے، جینا ہی پڑے گا۔

(۱۹۳)

بے طرح ہم چپ ہوئے ہیں جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اب رازِ خموشی برملا کہنے کو ہیں

ضبطِ غم سے ہماری یہ حالت ہوئی ہے کہ اب ہمیں چپ لگ گئی ہے۔ نہ جانے اس کا انجام کیا ہوگا۔ کہیں اس خاموشی سے ہمارا راز سب پر ظاہر نہ ہو جائے۔ حسرت موہانی نے یہی بات زیادہ خوبصورت انداز میں کہی ہے:

جب ترا نام آگیا ہم دفعتاً چپ ہو گئے   یوں چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

آزما کر حالِ دل ایمان لاتے ہی بنا
ہم سمجھتے تھے کہ کاہ و کہربا کہنے کو ہیں

کاہ = گھاس   کہربا = ایک پتھر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ گھاس کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

ہم کاہ اور کہربا کے حال کو محض زبانی باتیں خیال کرتے تھے اور کہربا کی کشش کو فرضی جانتے تھے لیکن جب ہم نے دل کو محبوب کی جانب کھنچتے پایا تو ہمیں کہربا کی کشش کا بھی یقین آگیا۔

موت کو ہم پیار سے کہتے ہیں اپنی زندگی
زندگی کو آفتِ صبر آزما کہنے کو ہیں

زندگی ہمارے لیے ایک مصیبت ثابت ہوئی ہے اس لیے ہم موت کو زندگی سمجھ کر اسے پیار کرنے لگے ہیں۔

مل چکا روزِ قیامت خونِ ناحق کا عوض
وہ دعائے مغفرت کو خوں بہا کہنے کو ہیں

محبوب نے عاشق کو بے گناہ قتل کیا ہے۔ عاشق اس سے روز قیامت اپنے خون کا دعویٰ کر کے اس کا عوض لینے کی امید میں تھا مگر محبوب نے اس کی مغفرت کی دعا کر کے عاشق پر جو احسان کیا ہے وہ اس کو اس کے خون کا بدلہ سمجھتا ہے۔ اس لیے اب روز حشر بھی بدلہ ملنے کی اُمید نہیں۔

شکوۂ غارت گری ہائے تغافل کیا کریں
ہم کہ رہزن کو بھی خضرِ رہنما کہنے کو ہیں

محبوب کے تغافل نے ہمیں برباد کر دیا ہے مگر ہم اس کی شکایت بھی لب پر نہیں لا سکتے بلکہ اسے کرم سمجھنے پر مجبور ہیں۔ ہماری مجبوری دیکھو کہ راہزن کو خضر کہتے ہیں۔ شعر میں اشارہ یہ بھی ہے کہ اس کے تغافل نے ہمیں لوٹ لیا یعنی ہماری جان لے لی اور اس طرح محبت کی منزل تک پہنچا دیا۔ اسی لیے ہم اس کی شکایت کرنے کے بجائے اسے خضر اور رہنما کہتے ہیں۔

کون تھا یا رب نمک پاشِ جراحت ہائے دل
زخمِ دامن دار کو ہم بامزا کہنے کو ہیں

اور پڑھ فاؔنی اسی دھن میں کوئی تازہ غزل
نکتہ پردازانِ محفل مرحبا کہنے کو ہیں

فاؔنی کی غزل اہلِ ذوق حضرات کو پسند آرہی ہے اس لیے وہ اسی زمین میں کوئی اور غزل لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں۔

(۱۹۴)

رند رمزِ پارسائے بے ریا کہنے کو ہیں
جَو فروشِ زہد کو گندم نما کہنے کو ہیں

گندم نما جو فروش فارسی کا محاورہ ہے جس کا مطلب ہے وہ شخص جو اصل میں حقیر اور بے وقعت ہو مگر ظاہر کرے کہ وہ بہت بلند مرتبہ ہے۔ مراد مکار اور ریاکار۔ ہماری شاعری میں زاہدوں کو ہمیشہ ریاکار کہا جاتا ہے اور ان کے مقابلے میں رندوں کو بے ریا۔ یہاں فاؔنی نے زاہد اور پارسا لوگوں کے لیے "بے ریا" کا لفظ طنزاً استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اب رند، پارسا لوگوں کی بے ریا پاکیزگی کا پول کھولیں گے اور ان کی ظاہری پاکیزگی کے پیچھے چھپی گندگی کو ظاہر کریں گے۔

حسرت اے شوقِ شہادت، عبرت اے قاتل کہ ہم
نخلِ ماتم کو نہالِ مدعا کہنے کو ہیں

نخلِ ماتم = نخل تابوت - وہ آرائش و سجاوٹ جو تابوت پر کی جاتی ہے۔

ہمیں عشق میں جان دینے کا اس قدر اشتیاق ہے کہ نخلِ ماتم گویا ہمارے لیے نخلِ اُمید کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اس سے ہماری تمام امیدیں وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زندگی ہر ایک کے لیے نمونۂ عبرت ہے۔ خاص طور پر محبوب کو عبرت دلانے میں یہ اشارہ بھی ہے کہ یہ حال اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس سے کہیے جس نے اندازِ جفا دیکھا نہ ہو
جذبِ دل اور وعدۂ روزِ جزا کہنے کو ہیں

یہ خیال کہ جذبۂ محبت میں تاثیر ہوتی ہے اور یہ کہ قیامت کے دن ہر ایک ظالم کو اس کے ظلم و ستم کا بدلہ ملے گا، شاعر کے نزدیک صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ ان کی حقیقت وہ خوب جانتا ہے اور کہتا ہے کہ ان باتوں پر وہ ہی شخص یقین کر سکتا ہے جس نے تمہارے ظلم و ستم نہ دیکھے ہوں۔

تا کجا یہ دلفریبی اے امیدِ جاں بری
چارہ گر اب دردِ دل کو لا دوا کہنے کو ہیں

مریضِ محبت کی حالت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ طبیب بھی مایوس ہو رہے ہیں۔ مگر کچھ لوگ اب بھی اس کی زندگی کی امید لگائے ہوئے ہیں کیونکہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ شاعر ان لوگوں سے مخاطب ہے کہ کب تک اس امید کے دھوکے میں اپنے کو مبتلا رکھو گے۔

پردہ داری چاہیے خوئے فلک کی ورنہ ہم
کشتیٔ غم کے خدا کو ناخدا کہنے کو ہیں

ہرزہ گوئی ختم کر اے فانیؔ آشفتہ سر
اور بھی کچھ شاعرانِ خوش نوا کہنے کو ہیں

ہرزہ گوئی = بکواس

فانیؔ دیوانہ سے کہو اب اپنی بکواس بند کرے کیونکہ ابھی کچھ خوش گفتار شاعر اپنا کلام سنانے والے ہیں۔ یہ غزلیں غالبؔ کسی مشاعرے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ویسے بھی ان میں فرمائشی انداز ہے۔ وہ روانی نہیں جو فانی کی غزلوں کا امتیاز ہے۔

(۱۹۵)

تیرے بغیر باغ میں پھول نہ کھل کے ہنس سکے
کوئی بہار کی سی بات اب کے بہار میں نہیں

محبوب کی جدائی میں بہار کا لطف بھی پھیکا معلوم ہوتا ہے اور پھولوں میں بھی پہلے کی سی شگفتگی نہیں۔ قاعدہ ہے کہ انسان غمگین ہو تو اُسے ہر چیز اداس نظر آتی ہے۔

عشرتِ بے خلل بھی ہے راحت لازوال بھی
اُس کی خوشی ہے غم تو پھر کیا غم یار میں نہیں

ہم غم کو غم نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایسی راحت اور عیش تصور کرتے ہیں جو لافانی ہے کیونکہ یہ غم ہمارے محبوب کی مرضی ہیں۔ فانی کا یہی فلسفہ ہے جو غم کو گوارا بناتا ہے اور ان کی شاعری کو عظمت بخشتا ہے۔ فانی کے نزدیک غم اس لیے بھی قابلِ قدر ہے کہ اسے زوال کا اندیشہ نہیں ہوتا اور یہ ابدی راحت ہے۔

جمع ہیں میری لاش میں زیست کے سارے انقلاب
کون سی وضعِ اضطرار میرے قرار میں نہیں

عاشق جو زندگی بھر مضطرب اور بے چین رہا اگرچہ مر کر خاموش اور بے حرکت ہو گیا ہے مگر اس کی اس خاموشی سے بھی اس کی بے قراریوں کا اظہار ہو رہا ہے اور اس کی لاش زندگی کے انقلابات اور نشیب و فراز کی مجسم تصویر ہے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں:

فانی فسونِ موت کی تاثیر دیکھنا   ٹھہرا وہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا

(۱۹۶)

میرے لب پر کوئی دعا ہی نہیں   اس کرم کی کچھ انتہا ہی نہیں

شاعر دنیا سے اس قدر مایوس ہو چکا ہے کہ اب وہ کسی چیز، کسی خوشی کے لیے دعا بھی نہیں کرتا۔ لیکن اس مایوسی کو وہ اللہ تعالیٰ کا انعام خاص تصوّر کرتا ہے کیونکہ اس نے اسے ہر چیز سے بے پروا کر دیا ہے۔

کشتئ اعتبار توڑ کے دیکھ   کہ خدا بھی ہے ناخدا ہی نہیں

ہمیں صرف کشتی اور ناخدا کا بھروسہ نہیں ہے بلکہ دراصل خدا کا بھروسہ ہے جس کے

سہارے ہم ہر طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ سہارا ایسا ہے جسے کوئی توڑ نہیں کر سکتا۔ کوئی چاہے تو کوشش کر کے دیکھ لے۔

میری ہستی گواہ ہے کہ مجھے
تو کسی وقت بھولتا ہی نہیں

فانی کے نزدیک عاشق کی ہستی ہی عشق یا یادِ محبوب سے عبارت ہے۔ گویا اس کی یاد ہے تو زندگی ہے۔ وہ نہیں تو زندگی بھی نہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ہم کسی وقت تجھے بھول نہیں پاتے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہم زندہ ہیں۔

اب اسے نا امید کیوں کہیے
دل کو توفیقِ مدعا ہی نہیں

ہمارے دل میں کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔ مگر ہم اس حالت کو نا امیدی یا مایوسی کہنے کو تیار نہیں۔ یہ مرتبہ ہمارے دل کو نا امیدیوں سے حاصل ہوا ہے مگر نا امیدی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ بے تعلقی اور نا امیدی میں فرق ہے اور "دل بے مدعا" فانی کے نزدیک بہت بڑی نعمت ہے۔

غم میں لذت کہاں کہ دل نہ رہا
ہائے وہ حسرت آشنا ہی نہیں

عاشق کو غم ہے کہ وہ دل جسے غموں میں بھی لذت ملتی تھی اب ختم ہو گیا ہے اور زندگی میں غموں کے سبب سے جو لطف تھا وہ جاتا رہا۔

مسکرائے وہ حالِ دل سُن کر
اور گویا جواب تھا ہی نہیں

محبوب عاشق کی داستانِ غم کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کا کوئی جواب دے۔ بس وہ اسے سُن کر مسکرا دیا ہے۔

وہی تو ہے وہی تری محفل
ایک فانی ہی مبتلا ہی نہیں

عاشق نے محبوب کی خاطر جان دے دی۔ اور دنیا سے رخصت ہو گیا مگر محبوب پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ اس کی محفل کی رنگینیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ردیف و

(۱۹۷)

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

مآل۔ انجام

غمِ پنہاں نے رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھایا ہے۔ اب ہمارا انجام نزدیک ہے اور شمعِ زندگی بھڑک کر بجھنے والی ہے۔

چلے بھی آؤ وہ ہے قبرِ فانی دیکھتے جاؤ   تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

فانی نے تمھاری محبّت میں زندگی قربان کر دی ہے۔ تم اپنے چاہنے والے کی تربت پر ایک نگاہ تو ڈالتے جاؤ۔ اس کی قبر دور نہیں نزدیک ہے۔ فانی کی یہ غزل قیام لکھنؤ کی یادگار ہے اور اس میں میّت اور مدفن کے ذکر کی تکرار ایک مخصوص رجحان کی عکاس ہے۔

ابھی کیا ہے کسی دن خوں رُلائے گی یہ خاموشی   زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

ہم ضبط کی وجہ سے خاموش ہیں اور اپنا حال زبان سے نہیں کہتے۔ مگر ہمارا حالِ زار ہمارے غم کا ترجمان ہے۔ یہ اظہار اتنا موثر اور پُر جوش ہے کہ محبوب بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکے گا۔ اور ہمارے حال پر خون کے آنسو روئے گا۔

غرورِ حُسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے   کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

تمہیں اپنے حُسن کا واسطہ ذرا عاشق کی بربادی پر بھی نظر کرو جس نے تمھاری خاطر اپنی جوانی کو خاک میں ملا دیا اور اب دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔

اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو   مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

محبوب عاشق کو قتل کرتے وقت اس نظارہ کی تاب نہ لا کر منھ دوسری طرف پھیر لیتا ہے عاشق کو ذبح ہونے کا غم نہیں۔ یہ ضرور چاہتا ہے کہ محبوب اس وقت تو ایک نگاہ اس پر ڈال لے اس لیے کہتا ہے کہ ذرا اس طرف رُخ کر کے میری گردن پر خنجر کی روانی کا منظر تو دیکھ لو۔

بہارِ زندگی کا لُطف دیکھا اور دیکھو گے   کسی کا عیشِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ تم نے زندگی کی ہر خوشی پائی ہے اور آئندہ بھی مسرتیں تمھارے قدم چومیں گی مگر اس بدنصیب عاشق کا انجام بھی دیکھ لو جس کے حصہ میں مرگِ ناگہانی کے سوا کوئی عیش نہ تھا۔

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

کل تک عاشق کے شکوے سننے کی تم کو تاب نہ تھی۔ تو آج اس کی شکوہ گذار زبان خاموش ہوگئی ہے۔ کفن سرکا کر اس کی بے زبانی کا منظر ہی دیکھ لو۔

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانیؔ دیکھتے جاؤ

تمھارے عاشق نامراد کی میت اُٹھائی جا رہی ہے۔ اقربا و دوست آخری دیدار کر چکے ہیں اور ماتم کی آوازیں کچھ اور بلند ہوگئی ہیں۔ تم بھی آکر یہ دردناک منظر دیکھ جاؤ۔

غزل میں کوئی خاص گہرائی یا بلندی نہیں مگر تاثیر اور محاکات کے بھرپور نمونے اس میں پائے جاتے ہیں۔

(۱۹۸)

اُمیدِ انعامِ خاص رکھو کرشمۂ لطفِ عام دیکھو
نصیب تو خیر ہے جو کچھ ہے نصیب کا اہتمام دیکھو

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر نظر کرو جو ہر ایک کے لیے عام ہیں مگر اس سے اپنے لیے انعامِ خصوصی کی توقع رکھو۔ قسمت میں جو محرومیاں ہیں ان کی فکر نہ کرو۔ یہ دیکھو کہ قسمت بنانے والے نے اسے کس توجہ اور اہتمام سے بنایا ہے کہ جو کسی کے نصیب میں نہ تھا (یعنی غم) وہ تمھیں دیا۔ فانیؔ کے نزدیک عیشِ دنیا عام لوگوں کے لیے ہے اور غم و محرومی صرف خاص لوگوں کا حصہ ہے۔

وہ ایک رنگینیٔ نظر ہے جو سو بہاروں میں دیکھتا ہوں
مری محبت کی خامیوں میں ادائے حُسنِ تمام دیکھو

ہماری محبت اگرچہ نامکمل اور خام ہے لیکن اس میں محبوب کے حُسنِ مکمل کی ساری ادائیں موجود ہیں یعنی اس کے حُسن نے ہماری محبت کو عظمت و بلندی عطا کر دی ہے اور اس کا حسن ہماری رنگینیٔ نگاہ کا سبب بن گیا ہے کہ ہم جدھر بھی نگاہ ڈالتے ہیں ہمیں حسن کا ہی جلوہ دکھائی دیتا ہے اور ہر بہار میں اسی کا چہرہ نظر آتا ہے۔

جو ہے وہ کیا ہے سوال یہ ہے کہ اب نگاہوں کا حال یہ ہے
جدھر نگاہیں ذرا اُٹھاؤ اُدھر تمھارا ہی نام دیکھو

عشق کی محویت کا یہ عالم ہے کہ جدھر عاشق کی نگاہ جاتی ہے محبوب ہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور عاشق حیران ہے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسّم کیا

یہ ترکِ بیداد و قدرِ دل کیوں وفا تو اربابِ دل کی خو ہے
جفا سو تقدیرِ آرزو ہے، ہٹاؤ بھی اپنا کام دیکھو

عاشق کی وفاؤں سے متاثر ہو کر محبوب اس کی قدر کرنے لگا ہے اور جفا ترک کرنے پر آمادہ ہے۔ مگر عاشق کہتا ہے ہم نے وفا کر کے کوئی احسان نہیں کیا بلکہ یہ تو عشق کی فطرت ہے اور جور و ستم عاشق کی قسمت۔ تم ان بکھیڑوں میں کیوں اُلجھتے ہو۔ تم تو بس اپنا مشغلہ (جفا) جاری رکھو۔

خدا سے اور پھر گھڑی گھڑی کی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے فانی
دعائیں مانگے ہی جا رہے ہو نہ صبح دیکھو نہ شام دیکھو

دعاؤں سے تقدیریں نہیں بدلتیں۔ خدا نے جو بھی قسمت میں لکھ دیا وہ اٹل ہے پھر دن رات دعائیں کرنا لاحاصل ہے۔ یہ تو خدا سے گستاخانہ چھیڑ چھاڑ ہوئی۔

(۱۹۹)

اب آنکھ اُٹھتی ہے وہ جنبش ہوئی ہلکی سی مژگاں کو
وہ چھیڑا چاہتے ہیں نوکِ نشتر سے رگِ جاں کو

مژگاں = پلکیں

محبوب کی پلکوں کا اٹھنا، عاشق کی جانب نگاہ کرنا اور عاشق کے دل پر اس کے اثر کو بڑی خوبصورتی سے اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔ محبوب کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش ہے۔ شاید وہ اپنی نگاہوں کے نشتر سے ہماری رگِ جاں کے زخموں کو پھر سے چھیڑنا چاہتے ہیں۔

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

بہار آنے پر عاشق کے جنون میں اضافہ ہوا ہے اور اس نے اپنا گریبان چاک کر کے دامن تک پہنچا دیا ہے۔ گریبان اور دامن کے مل جانے کو شاعر نے دونوں کے گلے ملنے سے تعبیر کیا ہے۔ گویا بہار نہیں آئی عید آئی ہے اور اسی لیے دامن و گریبان گلے مل رہے ہیں۔

مرے تلووں سے کانٹوں پر نئی گلکاریاں ہوں گی
مری وحشت مبارک ہو جنونِ عیش ساماں کو

جنون کو مبارک باد دو کہ میرے پائے وحشت صحرا نوردی پر آمادہ ہیں۔ میرے تلووں کے چھالوں میں جب کانٹے چبھیں گے تو لہو سے کانٹوں پر وہ نقش و نگار بنیں گے جو جنون کے لیے ایک نیا سامانِ عیش ہوں گے۔ شعر میں ایذا پسندی کا اظہار ہے۔

بیاباں کو یہاں لے آئے تھے کچھ خاک کے ذرّے
یہی ذرّے اُڑا لے جائیں گے اک دن بیاباں کو

بیاباں کا وجود خاک کے ذرّوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاعر کے مشاہدہ میں یہ بات ہے کہ صحرا میں جب آندھیاں چلتی ہیں تو ان کے ساتھ ریت اُڑ کر کہیں ریگستان بنا دیتی ہے کہیں ریت کے ٹیلے۔ اور پھر یہ ریت اُڑ کر کسی اور سمت چلی جاتی ہے تو وہ ریگستان غائب ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو ذہن میں لیے ہوئے وہ کہتا ہے کہ بیابان کو وجود دینے میں جن ذرّوں کا ہاتھ ہے وہ ہی ذرّے ایک دن اسے اُڑا کر کسی اور سمت لے جائیں گے۔ اگر بیابان سے حقیقی بیابان مراد لیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ بیاباں کا اِدھر سے اُدھر پھرنا عاشق کی خاک کے ذرّوں کے سبب ہے جن کی تڑپ اور بے چینی مر کر بھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر بیابان کو دنیا کے معنوں میں لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اس ویرانہ (دنیا) کا وجود مشت خاک (انسان) سے ہے۔ جب یہ خاک منتشر ہو جائے گی تو ویرانہ کا وجود بھی نہ رہے گا۔

نہ آیا موسمِ گل جب دلِ دیوانہ جیتا تھا
جواب آئے تو یارب آگ لگ جائے گلستاں کو

ہمارا دل بہار کی حسرت لیے ہوئے رخصت ہو گیا مگر اس کے سامنے بہار نہ آنا تھی نہ آئی۔ خدا کرے اب بہار ہی نہ آئے اور آئے تو گلستان میں آگ لگ جائے۔ اس لیے کہ اب اس سے لطف اندوز ہونے والا کون ہے۔

چھُٹے جب قیدِ ہستی سے تو آئے کنجِ تربت میں
رِہا ہوتے ہیں یعنی ہم بدل دیتے ہیں زنداں کو

انسان کو قید سے مفر نہیں۔ زندگی کی قید سے چھوٹتا ہے تو گوشۂ قبر میں مقید ہو جاتا ہے۔ گویا زنداں بدل گیا قید بدستور رہی۔ یہی خیال زیادہ بہتر طریقے سے انھوں نے دوسرے شعر میں پیش کیا ہے۔

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات   مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

خدا غارت کرے دل کو بڑی مشکل میں ڈالا ہے
نہ سمجھا عمر بھر ناداں فریبِ عشق آساں کو

خدا دل کو غارت کرے کہ اس نے ہمیں مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ ناسمجھ محبت کو آسان سمجھا اور عمر بھر اسی دھوکے میں مبتلا رہا۔

نظر سے جب ملی ان کی نظر دل میں اُتر آئی
ہم آنکھوں سے لگا کر دل میں رکھ لیتے ہیں پیکاں کو

پیکاں۔ تیر کی نوک۔ یہاں محبوب کی نگاہوں کو پیکاں کہا ہے۔

محبوب کی نگاہیں اگرچہ تیر کی طرح دل کو چھید جاتی ہیں پھر بھی عاشق ان کو عزیز رکھتا ہے اور دل میں چھپا لیتا ہے۔

دلِ فانی سے گو نکلی مگر آساں نہیں نکلی
عجب شے تھی خدا بخشے امیدِ وصلِ جاناں کو

مسلسل ناکامیوں کے سبب دل سے محبوب کے وصل کی آرزو بھی رخصت ہو گئی مگر یہ کس

طرح دل سے نکلی اس کا بیان بھی مشکل ہے۔

(۲۰۰)

اثر پابندِ بے تابی نہیں تو ضبط بھی کیوں ہو
بَلا سے حالِ دل کچھ بھی سہی ناگفتنی کیوں ہو

ناگفتنی = جو بیان نہ ہو سکے۔

دل کی حالت کتنی بھی خراب کیوں نہ سہی ناقابلِ بیان تو نہیں اس لیے ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنا حالِ دل سُنا کر ہی رہیں گے۔ جب تاثیر نے اپنا طریقہ چھوڑ کر ہماری بے تابیوں سے کنارہ کر لیا ہے تو ہم ہی کیوں آدابِ عشق کی پابندی کریں اور اپنی بے تابیوں پر ضبط کی قید لگائیں مراد یہ کہ غم کی تاثیر حاصل نہ ہوئی تو ہم ضبط سے کنارہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

خدا رکھے محبت کو نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
اجل کہتے ہیں جس کو وہ ہماری زندگی کیوں ہو

آفت رسیدہ لوگوں کے لیے موت زندگی کی طرح خوش آئند ہوتی ہے لیکن محبت کے ماروں کی قسمت میں یہ کامیابی (موت) بھی نہیں۔ غمِ محبت ان کو موت و زندگی کی کشمکش میں تو مبتلا رکھتا ہے مگر مرنے نہیں دیتا۔ شعر کا لہجہ بڑا شدید طنزیہ ہے۔

ستم کا لطف بھی ہے امتیازِ لطف کے دم تک
کرم بھی کیوں نہ ہو بیدادگر، بیداد ہی کیوں ہو

ستم کا لطف اس وقت ہے جب عاشق ستم اور کرم کے فرق سے واقف ہو۔ اس لیے اگر تو چاہتا ہے کہ ہم تیرے ستم کی اذیت سے تڑپیں تو کبھی کبھی کرم کرنا بھی ضروری ہے تاکہ ہم لطف اور ستم میں امتیاز کر سکیں۔ مومن کے انداز میں مکرِ شاعرانہ سے کام لے کر محبوب کو کرم کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔

ٹھکانا ہے سرِ تقدیر پہ ہر خونِ ناحق کا
تری تلوار میرے خون میں ڈوبی ہوئی کیوں ہو

ہمارے خونِ ناحق کا الزام محبوب اپنے سر کیوں لیتا ہے اور اپنی تلوار کو اس کا ذمّہ دار کیوں سمجھتا ہے۔ اس خون کی ذمہ داری تو بڑی آسانی سے تقدیر کے اوپر رکھی جا سکتی ہے یعنی ہماری قسمت میں ہی قتل ہونا تھا۔ تلوار تو بہانہ بن گئی۔ محبوب کی بہانہ جوئی پر اچھا طنز ہے۔

نگاہِ یاس کو رودادِ حسرت کہہ تو لینے دے
ترے دل کو لگے ظالم وہی دل کی لگی کیوں ہو

عاشق کی حسرت بھری نگاہیں محبوب کو غم کی کہانی سنانا چاہتی ہیں۔ محبوب اس پر تیار نہیں اور کہتا ہے مجھے سب علم ہے، اس کہانی کو دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ ضرور نہیں کہ تم جو محسوس کرتے ہو میری وہی حالت ہو۔ میری حالت کو میری نگاہِ یاس ہی پوری طرح بیان کر سکتی ہے اس لیے یہ کہانی اسی کی زبان سے سنو۔ شعر میں کوئی خاص بات نہیں۔ دل کو لگنا اور دل کی لگی صرف مناسبتِ لفظی کی خاطر استعمال ہوا ہے۔

ہماری بے خودی منجملۂ آدابِ الفت ہے
کسی کو دیکھ کر دل روشناسِ آگہی کیوں ہو

روشناس = پہچاننے والا۔

آدابِ عشق کا تقاضا ہے کہ عاشق بے خبر اور بے خود رہے۔ ہم ان آداب کو اس قدر ملحوظ رکھتے ہیں کہ محبوب کو دیکھ کر بھی ہوش میں نہیں آتے۔

کسی کی یاد بھی لپٹی ہوئی ہے دامنِ دل سے
مری میّت پہ فانیؔ نوحہ گر اک بے کسی کیوں ہو

محبّت میں ہر ایک نے ساتھ چھوڑ دیا۔ مرنے کے بعد ہماری لاش پر یا تو ہماری بے کسی ماتم کر رہی ہے یا پھر محبوب کی یاد دل کے قریب موجود ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کی یاد مر کر بھی دل میں باقی ہے۔

(۲۰۱)

گویا نہیں تغافل و تمکیں میں کوئی فرق
اتنی بھی آدمی کو اُمیدِ کرم نہ ہو

تغافل = بے نیازی
تمکین = مراد ناز و غرور

ہم محبوب سے کرم کی اس قدر اُمید واثق رکھتے ہیں کہ اس کی خوئے تغافل کو ادائے ناز سمجھ کر اس پر مطمئن ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا تغافل محض ادا نہیں بلکہ دانستہ بیداد کا ایک انداز ہے۔ اتنا بھی انسان کو کسی سے امید کرم رکھنا ٹھیک نہیں کہ وہ اس کے طرزِ عمل کو بھی نہ پہچان سکے۔

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

فانیؔ کی غم پسندی ایک مخصوص نظریہ اور تجربہ کا نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کی خوشی اور غم دونوں عارضی اور ناپائدار ہیں۔ اگر ہم نے خوشی کو اپنایا تو اس کے گذرنے پر غم سے سابقہ پڑے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان غم کو اپنائے کہ اگر غم اس سے چھن گیا تو اس کے چھن جانے پر کوئی افسوس تو نہ ہوگا۔ غم کو قبول کرنے کا بڑا منطقی استدلال ہے۔

منظور ہر نوشتۂ تقدیر ہے مجھے
لیکن وہ جس میں حرفِ تمنّا رقم نہ ہو

شاعر محبت سے اس قدر بےزار و دل برداشتہ ہے کہ وہ تقدیر سے ہر غم حاصل کرنے پر آمادہ ہے۔ لیکن اپنے نوشتۂ تقدیر میں محبت کا لفظ دیکھنا گوارا نہیں ہے۔ میرؔ نے بھی بڑے کرب کے ساتھ کہا تھا۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

ہر لمحۂ حیات ہے بیگانۂ حیات
فانیؔ حیات ہی سے عبارت عدم نہ ہو

زندگی ایسی ناکامیوں اور مصائب سے معمور ہے کہ اس کے کسی لمحہ کو زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ شاعر کے ذہن میں یہ شبہ ابھرتا ہے کہ کہیں زندگی عدم ہی کا تو دوسرا نام نہیں۔ بقول جگرؔ :

ع : یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

(۲۰۲)

خدا اثر سے بچائے اُس آستانے کو
دعا چلی ہے مری قسمت آزمانے کو

آج دعاؤں کے تیور کہہ رہے ہیں کہ وہ اثر کو حاصل کر کے ہی چھوڑیں گی لیکن خود عاشق کو یہ منظور نہیں کہ محبوب کو کسی طرح کی پریشانی ہو اس لیے وہ دعا کرتا ہے۔ خدا آستانۂ محبوب کو میری دعاؤں کے اثر سے محفوظ رکھے۔ خیال میں کوئی خاص ندرت نہیں اور الفاظ میں بھی تعقید کا عیب ہے۔ مثلاً میری دعا چلی ہے کی جگہ "دعا چلی ہے میری"

بہار لائی ہے پیغامِ انقلابِ بہار   سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

شاعر کی غم پسند طبیعت خوشیوں سے اس قدر بدگمان ہے کہ بہار میں بھی اسے خزاں کا پیغام پوشیدہ نظر آتا ہے اور کلیوں کی مسکراہٹ کو بھی وہ مسکراہٹ کہنے کو تیار نہیں کیونکہ ان کا انجام اس کی نظر میں ہے۔ بقول محشر بدایونی

پژمردگیٔ گل پہ ہنسی جب کوئی کلی   آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

نہ پوچھیے کہ محبت میں مجھ پہ کیا گزری   نہ چھیڑیئے مرے بھولے ہوئے فسانے کو

محبت ایک افسانۂ ماضی بن چکی ہے۔ ہمیں محبت میں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ ذکر کر کے ہمارے زخموں کو نہ کریدیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ اس افسانہ کو دوہرانے کی ہم میں تاب نہیں۔

یہ شعبدے یہ کرشمے کسے میسّر تھے   تری نگاہ نے سکھلا دیے زمانے کو

زمانہ کے حالات میں جو فتنہ پروری اور ستم انگیزی ہے یہ سب محبوب کی نگاہوں سے سیکھی ہے۔ عاشق پر ظلم یا تو زمانہ ڈھاتا ہے یا محبوب۔ مگر بقول فانیؔ زمانہ کی فتنہ انگیزی محبوب کی نگاہوں کے مقابلہ میں کم ہے۔

چمن میں برق نے جھانکا کہ ہم لرز اُٹھے   اب اس سے آگ ہی لگ جائے آشیانے کو

جب بھی بجلیاں چمن کی جانب چمکتی ہیں ہمارا دل اس خوف سے لرز اُٹھتا ہے کہ کہیں میرے آشیاں کا رُخ تو نہیں کر رہی ہے۔ اس روز روز کے دھڑکے سے تو اچھا ہے کہ آشیانے کو ایک بار آگ لگ جائے۔ نفسیاتِ انسانی کی بہت اچھی تصویر ہے۔

خیالِ یار بھی کھویا ہوا سا رہتا ہے   اب ان کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو

بےخودی کا یہ عالم ہے کہ محبوب کا خیال بھی دل میں کھویا کھویا سا رہتا ہے (یعنی ہر وقت دل میں نہیں رہتا) اور اس کی یاد بھی دل میں دیر تک نہیں ٹھہرتی بلکہ خود فراموشی کا شکار ہو جاتی ہے۔

بے خودیٔ محبت کی بہت دلنشیں عکاسی ہے۔ فراقؔ کا شعر ہے:

محبت اب محبت ہو چلی ہے
تجھے کچھ بھولتا سا جا رہا ہوں

نگاہِ لطف نہ فرما نگاہِ ناز کے بعد
جگر میں آگ لگا کر نہ آ بجھانے کو

محبوب نگاہِ ناز سے عاشق کے دل میں آگ لگا کر اب اپنی نظرِ عنایت سے اسے تسکین دے رہا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ یہ کون سا انداز ہے کہ خود آگ لگا کر پھر اسے بجھاتے ہو۔ موضوع کے اعتبار سے شعر میں کوئی ندرت یا حسن نہیں۔

زمانہ بر سرِ آزار تھا مگر فانیؔ
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

زمانہ کے ظلم و ستم کا بدلہ ہم نے اس طرح لیا کہ اس کے دیئے ہوئے زخموں پر اس طرح تڑپے کہ خود زمانہ بھی تڑپ گیا۔ مراد یہ کہ ہماری زبوں حالی دشمنوں کو بھی اس طرح متاثر کرتی ہے کہ ع
دشمن بھی چیخ اٹھا، بے اختیار دیا

(۲۰۳)

اے بیخودی ٹھہر کہ بہت دن گزر گئے
مجھ کو خیالِ یار کہیں ڈھونڈتا نہ ہو

بے خودی کے سبب عاشق کو مدّت سے محبوب کا خیال بھی نہیں آیا ہے۔ وہ اپنی بے خودی سے تھوڑی سی مہلت چاہتا ہے کہ کہیں محبوب کا خیال اسے تلاش نہ کر رہا ہو۔ ذرا سی دیر کو اسے ہوش میں آلینے دے تاکہ وہ خیالِ محبوب کو پھر سے پالے۔ شعر میں اشارہ یہ بھی ہے کہ جب عاشق بے خودی کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پھر محبوب اس کا متلاشی اور تمنائی ہو جاتا ہے۔

ساحل پہ جا لگے گی یونہی کشتیٔ حیات
اپنا خدا تو ہے، جو نہیں ناخدا نہ ہو

اگر ہمارے پاس کوئی مادّی سہارا (ناخدا) نہیں تو کوئی پروا نہیں کیونکہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ہماری زندگی کی کشتی کو پار لگا دے گا۔ جوہر بدایونی کا شعر ہے:

میری کشتی کا قلق یارانِ ساحل کیوں کریں
ناخدا ان کو مبارک ہو خدا رکھتا ہوں میں

اچھا حجاب ہے کہ جب آتے ہیں خواب میں
پھر پھر کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

محبوب کے شرم و حجاب کا یہ عالم ہے کہ وہ خواب میں بھی آتے جھجکتا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔

دل ہی نہیں ہے، جس میں نہ ہو درد عشق کا
وہ درد ہی نہیں ہے، جو ہر دم سوا نہ ہو

جو دل دردِ محبت سے خالی ہو وہ دل نہیں۔ اور جو درد ہر سانس کے ساتھ بڑھتا نہ رہے، درد کہلانے کا مستحق نہیں۔

(۲۰۴)

ہو کے اس کوچہ سے اے بادِ صبا کے جھونکو
آئے جاؤ مجھے دیوانہ بنائے جاؤ

محبوب کے کوچہ سے جو صبا کے جھونکے اس کی خوشبو لے کر آتے ہیں ان سے عاشق کے جنون میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تمنا ہے کہ یہ جھونکے یوں ہی آتے رہیں خواہ ان سے اس کی دیوانگی بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔

حشر تک بے کسیٔ مرگ مجھے روئے گی
چار آنسو مری تربت پہ بہائے جاؤ

میری موت جس بیکسی میں ہوئی ہے اس پر خود بیکسی بھی رویا کرے گی۔ لازم ہے کہ تم بھی میری حالت پر آنسو بہا لو۔

دلِ فانی کو بہت ہے، "ارنی" کا دعویٰ
کوئی بجلی رُخِ روشن سے گرائے جاؤ

ارنی = اپنا جلوہ دکھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے اس کا جلوہ دیکھنے کا تقاضا کیا تھا۔

میرا دل تمھارے دیدار کا تمنائی ہے اور تمھارے جلووں کو دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ذرا اس کو اپنے حُسن کی بجلیوں سے جلا کر خاک کر دو۔ اس میں تلمیح حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی طرف ہے۔

(۲۰۵)

اے زمینِ لکھنؤ، اے آسمانِ لکھنؤ
تم سے رخصت ہو رہا ہے میہمانِ لکھنؤ

یہ غزل شاعر نے لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت کہی ہے اور اس کی سرزمین سے الوداع کہہ رہا ہے۔

گرچہ یہ آوارۂ ملک و وطن کچھ بھی نہیں   تھا مگر منجملۂ دل دادگانِ لکھنؤ

اگرچہ میں اپنے دیس سے نکالا ہوا گمنام انسان ہوں جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں مگر پھر بھی لکھنؤ کے چاہنے والوں میں تھا۔

گرچہ اس ناخواندہ مہماں کی نہ تھی خاطر عزیز   بے تکلّف، تھا یہ خاکِ آستانِ لکھنؤ

لکھنؤ میں میں ایک بِن بلائے مہمان کی طرح تھا اور کوئی میرا چاہنے والا نہ تھا مگر میں نے خود کو اسی خاک کا حصّہ سمجھا ہوا تھا۔

الوداع اے سبزہ و فوارہ و حوض و چمن   رخصت اے جوشِ بہارِ بے خزانِ لکھنؤ

لکھنؤ کی دائم بہاروں اور حسین نظاروں الوداع۔ اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔

رخصت اے بام و درِ ہر کاخ و ایواں الوداع   الوداع اے لکھنؤ اے مردمانِ لکھنؤ

کاخ = محل   ایوان = عمارت

لکھنؤ کی پُرشوکت عمارتوں اور ان کے بسنے والوں سے میں جُدا ہو رہا ہوں۔

داغ ہے دل پر تری آزردگی بے سبب   الوداع اے خاطرِ نامہربانِ لکھنؤ

لکھنؤ کے دورانِ قیام شاعر کو جن تلخیوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کی طرف اشارہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ داغ میرے دل پر ہمیشہ باقی رہیں گے۔

جمع ہیں دونوں جہاں اپنے دلِ رنجور میں   اک جہانِ آرزو ہے، اک جہانِ لکھنؤ

محبت کے داغ اور لکھنؤ میں اٹھائی ہوئی پریشانیوں کے داغ گویا دو الگ دنیائیں ہیں جو ہمارے غمگین دل میں جمع ہیں۔

شکوہ ان بے مہریوں کا گو نہیں اصلا ہمیں   ہاں مگر اتنا ہے خاطر نشانِ لکھنؤ
بے مروّت! یوں تو سب ہیں چاہنے والے ترے (ق)   کم ہیں فانی کی طرح شیدائیانِ لکھنؤ

ہم کو تیری بے مہریوں کی کوئی شکایت نہیں، نہ تیری بے مروّتی کا گلہ ہے۔ مگر تو بھی یاد رکھنا کہ ایسا چاہنے والا تجھے اور کوئی نصیب نہیں ہو سکتا۔

ردیف ہ

(۲۰۶)

تو جانِ مدعائے دل، اور دل جگہ جگہ
ہے ایک شمع، رونقِ محفل جگہ جگہ

محبوب (اللہ تعالیٰ) کی ہستی تمام ہر دل کی آرزو ہے۔ اس کی مثال ایسی شمع کی سی ہے جو تنہا ہے مگر تمام محفلوں کے واسطے روشنی کا سبب ہے۔

حسرت جدا، اُمید جدا، آرزو جدا
دنیائے دل میں ہیں ترے بسمل جگہ جگہ

ہمارے دل کی دنیا میں قدم قدم پر تیرے شہیدانِ ناز پڑے ہیں۔ کہیں حسرتیں ہیں، کہیں اُمیدیں اور کہیں آرزو کے مدفن ہیں۔ یہ سب آپ کے ناز و ادا کے شکار ہیں۔

مٹ کر بھی داغ شاہدِ خونِ شہید ہے
دھویا ہوا ہے دامنِ قاتل جگہ جگہ

محبوب نے اپنے دامن سے عاشق کے خون کے داغ مٹا [illegible] ے دھویا ہے۔ اگرچہ اب خون کے داغ مٹ گئے ہیں مگر اس کا جگہ جگہ سے بھیگا دامن اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی مجرم ہے۔ گویا داغ نے مٹ کر بھی محبوب کے جرم کی گواہی دی ہے۔ اس شعر میں مجرم کی نفسیات کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ کبھی کبھی مجرم کی احتیاط ہی اس کے جرم کا راز فاش کر دیتی ہے۔

تو نے فراقِ دل ہمیں دیوانہ کر دیا
پھرتے ہیں پوچھتے خبرِ دل جگہ جگہ

دل کے چلے جانے سے ہمارے ہوش و حواس بجا نہیں رہے ہیں اور ہم ہر ایک سے اپنے دل کا پتہ پوچھتے پھرتے ہیں۔

رو رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں
ہنستی ہے مجھ پہ دوریٔ منزل جگہ جگہ

محبت کی راہ میں چلتے چلتے طاقت جواب دے چکی ہے۔ رو رو کر ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا ہے اور دوریٔ منزل میری سعیٔ ناکام کا مذاق اُڑاتی ہے۔ یعنی شکستہ پائی کا یہی عالم ہے تو منزل کے فاصلے کو طے کرنا معلوم۔ جگہ جگہ کا لفظ زائد ہے۔ صرف "دوریٔ منزل مجھ پہ ہنستی ہے" کہنا کافی تھا۔

غم اصلِ کائنات ہے دل جوہرِ حیات
دل غم سے، غم ہے دل سے مقابل جگہ جگہ

غم کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اور اس کی رونق کا ضامن ہے اور دل جو انسانی زندگی کا سرمایہ ہے اس کی عظمت و اہمیت کا راز یہی یہ ہے کہ وہ غموں کا مرکز ہے اور ہر جگہ غم اور دل ایک دوسرے کے مقابل نظر آتے ہیں۔

غربت میں سنگِ راہ کچھ آسانیاں بھی تھیں
کھاتی ہے ٹھوکریں مری مشکل جگہ جگہ

غریب الوطنی میں ہمیں مشکلوں سے ہی سابقہ نہیں پڑا، آسانیاں بھی راہ میں آتی رہیں مگر ہم راہ کی مشکلات اور پریشانیوں کے ایسے عادی تھے کہ جہاں آسانیاں ملیں وہ ہمارے لئے رکاوٹ بن گئیں اور جہاں ہموار راستہ ملا ہم ٹھوکر کھا گئے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے   اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اک سرگزشتِ درد ہے ہر ذرّہ خاک کا
پہنچی ہے داستانِ غمِ دل جگہ جگہ

عاشق کے دردِ دل کی داستان مرکر بھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کی خاک کا ایک ایک ذرّہ اس داستان کا ترجمان ہوگیا ہے اور اب یہ ہمہ گیر ہوکر جگہ جگہ پہنچ گئی ہے۔

کیا پوچھتا ہے وعدہ شکن کیا ہے داغِ دل
ابھرے ہیں نقشِ وعدۂ باطل جگہ جگہ

محبوب کی وعدہ خلافیوں نے ہمارے دل کو جلا دیا ہے اور دل پر اس کے جھوٹے وعدوں کے داغ جگہ جگہ نمایاں ہیں مگر اس کی ستم ظریفی دیکھو کہ وہ انجان بن کر ہم سے دریافت کرتا ہے کہ یہ داغ کس چیز کے ہیں؟

اب یادگارِ فاؔنیٔ بسمل ہے اس قدر
گلگوں ہے خاکِ کوچۂ قاتل جگہ جگہ

گلگوں = پھول کی طرح سرخ۔ مراد خون آلود

فاؔنی کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔ صرف محبوب کی گلی میں جگہ جگہ پڑے ہوئے خون کے نشانات اس کی یاد دلاتے ہیں۔

(۲۰۷)

خود ہوش سے پیدا کر ہر لغزشِ مستانہ
ترکِ مئے و مینا کر اے جرأتِ رندانہ

رندوں کو ظاہری وسائل دعلامات کی ضرورت نہیں۔ وہ مئے ومینا کا سہارا نہیں لیتے بلکہ ان کی رندی ومستی میں وہ اثر ہونا چاہیے کہ ہوش میں بھی لغزشِ مستانہ کا انداز پیدا ہو جائے۔

دل معنیٔ صورت ہے اور صورتِ معنی بھی
فرزانے کا فرزانہ، دیوانے کا دیوانہ

صورت = اشیاء کا ظاہری پہلو مراد کائنات۔ معنی = صورت کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت۔

دل کی عظمت و اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اشیاء کی ظاہری صورت میں چھپے ہوئے جلووں کو وہی معنی بھی دیتا ہے اور چھپی ہوئی باطنی حقیقتوں کا ذریعۂ اظہار بھی ہے گویا فرزانگی اور دیوانگی دونوں حالتیں اس میں یکجا ہیں۔ اشیاء کے ظاہری پہلو کو نظر انداز کرنے کی بنا پر اسے دیوانہ قرار دیا ہے لیکن چھپی ہوئی حقیقتوں پر نظر رکھنے کی بنا پر وہ فرزانہ ہے۔

ہے کوئی جو منکر ہو اب شمع کی تمکیں کا
گم ہو گئی شعلوں میں خودداریٔ پروانہ

پروانہ نے شمع کے ناز و تمکیں کا حریف بننا چاہا تھا مگر شمع کے شعلوں نے اس کی خودی کو مٹا کر رکھ دیا۔ اس کا انجام دیکھنے کے بعد کیا اب بھی کوئی شمع کی تمکین اور ناز کا انکار کر سکتا ہے۔

جو مومن و کافر ہیں وہ دل ہی نہیں رکھتے
دنیائے محبت میں کعبہ ہے نہ بتخانہ

فانی کے نزدیک جو لوگ مذہب کی ظاہری رسومات اور پابندیوں میں گرفتار ہیں وہ درحقیقت مذہب کی اصلی روح (عشق الٰہی) سے بیگانہ ہیں۔ محبت کرنے والے کعبہ و بتخانہ میں کوئی فرق نہیں دیکھتے بلکہ ہر جگہ محبوب کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

ہر کلمۂ الحق میں اک کیفِ انا بھر دوں
توبہ سے جو ٹکرا دوں الٹا ہوا پیمانہ

الحق (اللہ ہی ہے) حق پرستوں کا نعرہ ہے لیکن جو لوگ عشق کے جام سے سرشار ہوتے ہیں وہ "الحق" کی جگہ "انا الحق" (میں خدا ہوں) پکارنے لگتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ آج میں چاہتا ہوں کہ توبہ کو اپنے الٹے ہوئے جام سے ٹکرا دوں یعنی زہد و تقویٰ کو خیرباد کہہ کر عشق کی شراب سے سرشار ہو جاؤں تاکہ منصور حلاج کی طرح میری نواؤں میں بھی انا الحق کی سرشاری پیدا ہو جائے۔ مراد یہ کہ جو ذکر اور یادِ الٰہی ہوش و حواس کے عالم میں ہو اس میں کوئی کیفیت نہیں ہوتی۔

کچھ تذکرۂ جنّت ، کچھ تذکرۂ کوثر
کیا یوں بھی نہیں جائز ذکرِ مے و مے خانہ

کوثر = وہ شراب کی نہر جس کا جنت میں ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

جو لوگ شراب کو حرام کہتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کے ذکر سے دل بہلا لیتے ہیں۔ چنانچہ زاہد کا جنت و کوثر کا ذکر اسی شوق کا ثبوت ہے۔

ہر موجِ شکن سے اک طوفانِ بہار اُٹھا
جھاڑا مری وحشت نے جب دامنِ ویرانہ

موسمِ بہار کی آمد نے ہمیں دیوانہ بنا دیا تھا۔ دیوانگی کے عالم میں جب ہم صحرا میں پہنچے تو صحرا میں ہمارے دم قدم سے بہار آ گئی۔ ہم نے جب دامنِ صحرا کو اپنی صحرانوردی سے جھاڑا (یعنی صحرا کی خاک چھانی) تو اس کے ہر ہر گوشہ سے بہار کا ایک طوفان اُمنڈ پڑا۔ مراد یہ کہ دیوانہ بہار کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ بہار اس کے قدموں میں رہتی ہے۔

جوہر بدایونی نے ایک شعر میں یہی خیال اس طرح ادا کیا ہے:

جنوں وہ ہے جو خزاں میں بہار لے آئے
جنوں نہیں جو بہاروں کا انتظار کرے

حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے
اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوۂ جانانہ

تیرے عشق کی حیرت نے مجھے آئینہ بنا دیا ہے۔ یعنی میری ذات بھی آئینہ کی طرح تیرے جلووں کی حامل اور تیرے ناز و ادا کا عکس بن گئی ہے۔ اگر تجھے اپنی شکل دیکھنے کی خواہش ہے تو میری طرف دیکھا کر۔ مراد یہ کہ عشق مکمل ہو کر حسن کا عکاس ہو جاتا ہے اور پھر محبوب خود اس کی دید کا مشتاق ہوتا ہے۔

جوہر بدایونی نے ذرا مختلف انداز میں یہی بات کہی ہے:

طے ہو چکیں نیازِ محبت کی منزلیں
اب کچھ دنوں ہماری تمنا کرے کوئی

فانی ہی نہیں فانی، میں درسِ فنا بھی ہوں
افسانۂ عبرت ہوں اور عبرتِ افسانہ

میری ذات ہی فانی نہیں بلکہ میں دوسروں کو فنا کی تعلیم بھی دیتا ہوں۔ میری زندگی ایک عبرت ناک کہانی کے مانند ہے اور اس کہانی میں عبرت کا عنصر میری ذات کی بدولت داخل ہوا ہے۔ فانی و فنا کی رعایت ظاہر ہے۔

(۲۰۸)

دلِ فانی کی تباہی کو نہ پوچھ
الم لامتناہی کو نہ پوچھ

لامتناہی = نہ ختم ہونے والا۔

دل کی تباہی و بربادی کا غم کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اس ذکر کو چھوڑیئے تو بہتر ہے۔

حسنِ تدبیر نہ رسوا ہو جائے
رازِ تقدیرِ الٰہی کو نہ پوچھ

اچھا ہے جو تقدیرِ الٰہی کے راز فہمِ انسانی کی رسائی سے باہر ہیں کہ کم سے کم انسان اپنی تدبیروں سے دل بہلاتا رہتا ہے۔ اگر تقدیر کا یہ راز کھل جائے تو تدبیرِ انسانی کی بے حقیقتی بھی آشکار ہو جائے اور اس میں کوئی دلچسپی نہ رہے۔

ظلمت افزا ہے ظہورِ خورشید
روزِ فرقت کی سیاہی کو نہ پوچھ

ظلمت افزا = تاریکی بڑھانے والی۔
ظہور = ظاہر ہونا

محبوب کی جدائی میں دن بھی اتنے تاریک ہیں کہ سورج بھی روشنی پیدا کرنے کی بجائے تاریکی میں اضافہ کرتا ہے۔

زندگی جادۂ بے منزل ہے
مسلکِ رہبر و راہی کو نہ پوچھ

زندگی ایک ایسا راستہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ اور اس پر چلنے والے خواہ وہ راہبر ہوں یا راہبر کسی نظم یا قاعدے کے پابند نہیں۔ مراد یہ کہ زندگی کے واقعات کسی نظم و ضابطہ کے پابند نہیں۔

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال   میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

تم میری نگاہوں کی بے ادبی و گستاخی پر برہم ہونے کی بجائے اپنی غلط انداز نگاہوں کو روکو جنھوں نے میرے حوصلہ بڑھا کر مجھے گستاخ کیا ہے۔

اثرِ برقِ تجلّی کو سمجھ   آہ کی شعلہ پناہی کو نہ پوچھ

عاشق کی آہوں میں جو شعلوں کی سی تپش پنہاں ہے اگر اس کی وجہ جاننا ہے تو حُسن کے جلووں کی برق کو دیکھ۔ مراد یہ کہ دلِ عاشق کی تپش کا سبب محبوب کا حسنِ جہاں سوز ہے۔

منع ہے لذّتِ غم بھی فاؔنی   ہمہ گیرئ نواہی کو نہ پوچھ

نواہی = ممنوعات، جو چیزیں شریعت کے مطابق منع ہوں۔

شریعت عشق کے ممنوعات اتنے ہمہ گیر ہیں کہ کوئی چیز ان کے دائرے سے باہر نہیں۔ چنانچہ عاشق کے لیے صرف دنیا کی لذتیں ہی ممنوع نہیں بلکہ یہ بھی منع ہے کہ وہ غم میں بھی لذّت محسوس کرے۔

(۲۰۹)

دل کی طرف حجاب تکلّف اُٹھا کے دیکھ
آئینہ دیکھ اور ذرا مُسکرا کے دیکھ

محبوب عاشق کے دل کی طرف نظر کرتا بھی ہے تو بہت جھجکتے ہوئے اور تکلّف کے ساتھ۔ عاشق اس سے کہتا ہے کہ دل تو تیرا آئینہ ہے اس لیے اس کو دیکھنے میں یہ تکلّف کیسا۔ تجھے چاہیے کہ اس کو اسی طرح خوشی اور اپنائیت کے ساتھ دیکھ جس طرح تو آئینہ دیکھتا ہے۔

اس دَور میں یہ طرزِ جفا آزما کے دیکھ
دل کی بجائے دل کے سکوں کو مٹا کے دیکھ

محبوب عاشق کے دل کو برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اگر عاشق اسے باز رہنے کو کہے تو ظاہر

ہے کہ وہ کیوں باز آئے گا۔ اس لیے عاشق کہتا ہے کہ تم اب جفاؤں کا نیا انداز اختیار کرو اور دل کی بجائے دل کے سکون کو مٹاؤ۔ سکون مٹانے کا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق کے قریب رہ کر اس پر بجلیاں گرائی جائیں۔ اس طرح سے محبوب کی جفا کا سلسلہ بھی جاری رہے گا اور عاشق کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا۔ شعر میں مکر شاعرانہ ہے۔

تسلیم کی نظر سے کرشمے رضا کے دیکھ
بیگانگیِ دوست کو دنیا بنا کے دیکھ

تسلیم و رضا = ہر بات پر خوشی سے راضی رہنا۔

محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کی ہر بات پر عاشق سر تسلیم جھکا دے اور اس کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لے۔ اگر وہ بیگانگی برتنا چاہتا ہے تو عاشق بھی اسی میں خوش رہے۔ یہ منزل حاصل ہو جائے تو پھر عشق کی دنیا بدل جاتی ہے۔

اس شورشِ حیات کو حد سے بڑھا کے دیکھ
اک فتنہ اور حشر سے پہلے اٹھا کے دیکھ

فانی اس کے قائل ہیں کہ درد حد سے گذر کر دوا بن جاتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کے مصائب سے چھٹکارا پانے کا طریقہ یہ ہے کہ زندگی کے مصائب کو حد سے بڑھا دیا جائے اور قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا کر دی جائے۔

یوں دیکھتا ہے تیرگیٔ آب و گل میں کیا
شعلوں سے کھیل، دل کو جلا اور جلا کے دیکھ

اس کثیف اور مادّی دنیا میں حقیقت تک رسائی حاصل کرنا اور محبوب کے حسن کا دیدار کرنا اسی وقت ممکن ہے جب آدمی اپنی ہستی اور اپنے دل کو عشق (یا غم) کے شعلوں سے جلا کر خاک کر دے۔ یعنی اس اندھیرے میں روشنی عشق سے حاصل ہوتی ہے اور عشق کا مطلب ہے شعلوں سے کھیلنا۔

ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی
ایمان زندگی پہ نہ لا آزما کے دیکھ

فانی مادّی زندگی اور حقیقی زندگی (دل کی زندگی) میں فرق کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتے ہیں کہ جب تک تم خود زندگی کو آزما کر نہ دیکھ لو اس وقت تک اسے زندگی نہ کہو کیونکہ ہر زندگی حقیقی زندگی نہیں ہوتی۔ اس شعر میں فانی اقبال کے اس نظریہ زندگی سے بہت قریب دکھائی دیتے ہیں۔ ع : ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں۔ ہے زندگی

تیری تجلیوں سے کسی طرح کم نہیں
دل کی تجلیوں کو کبھی آزما کے دیکھ

محبوب کو اپنے حسن پر بہت ناز ہے مگر عاشق کہتا ہے کہ کبھی تم اپنے سے نگاہ ہٹا ہمارے دل کی طرف دیکھو۔ اس میں بھی وہ ہی حسن ہے جو تمھارے جلووں میں۔ یہ فانی کا مستقل فلسفہ ہے کہ عشق میں بھی وہ ہی دلکشی اور عظمت ہوتی ہے جو حسن کا خاصہ ہے۔

اب کی ادائے خاص سے کر امتحانِ دل
جو برق طور پر نہ گری ہو گرا کے دیکھ

عاشق کو دعویٰ ہے کہ اس کا عشق حضرت موسیٰ کے عشق سے زیادہ صادق اور باحوصلہ ہے اور وہ محبوب کے جلووں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ محبوب سے ملتجی ہے کہ تو ہمارے حوصلہ کا امتحان لے کر دیکھ لے اور وہ بجلیاں ہم پر گرا جو طور پر بھی نہیں گرائی تھیں۔

ہاں اہلِ دل کے حال سے غفلت محال ہے
اچھا یقیں نہیں ہے؟ مجھی کو بھلا کے دیکھ

محبت کا جذبہ اگر صادق اور کامل ہے تو اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ فانی کو اپنے عشق پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ محبوب سے کہتا ہے کہ اگر تم کو اس بات کا یقین نہیں ہے تو ذرا ہم کو بھلا کر تو دکھاؤ۔ یعنی تم ایسا نہیں کر سکو گے۔

دنیا کو دیکھنا تو میسّر نہیں تجھے
ذرّے کو دیکھنا ہے تو دنیا بنا کے دیکھ

کل کو سمجھنے کے لیے اس کے اجزاء کا مطالعہ و مشاہدہ کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے کُل کا عکس یا ترجمان سمجھ کر دیکھیں۔ اگر تم دنیا کی حقیقت یا اس کی کُلی روح کو سمجھنا چاہتے ہو تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ان مادّی مظاہر کو ان کی حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کرو اور ذرّہ کو عالم کا عکس خیال کرو۔ شعر میں صوفیوں کے اس مسلک کی طرف اشارہ ہے کہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے۔

فانیؔ سفینہ اب بھی نہ ڈوبے تو کیا کرے
طوفان کو نہ دیکھ، ستمِ ناخدا کے دیکھ

طوفان کا مقابلہ تو کیا بھی جا سکتا ہے لیکن اگر ناخدا ہی دشمنی پر آمادہ ہو تو کشتی کا ڈوبنا یقینی ہے۔

ردیف ی

(۲۱۰)

عشق نے دل میں جگہ کی تو قضا بھی آئی
درد دنیا میں جب آیا تو دوا بھی آئی

تخلیق کائنات کے وقت خدا نے جب درد بنایا تو ساتھ ہی ہر درد کی دوا بھی پیدا کی۔ مگر دردِ عشق کے ساتھ موت کو دنیا میں بھیجا گیا۔ مراد یہ کہ دردِ عشق کی دوا اگر ہے تو صرف موت ہے۔

دل کی ہستی سے کیا عشق نے آگاہ مجھے
دل جب آیا تو دھڑکنے کی صدا بھی آئی

دل جب آیا = دل جب محبت میں گرفتار ہوا۔
دل کی دھڑکنیں عشق کی مرہونِ منّت ہیں۔ اگر عشق دل میں گھر نہ کرتا تو اس میں دھڑکن بھی

نہ ہوتی اور کسی کو اس کے وجود کا علم نہ ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں عشق نہ ہوتا تو ہم اپنے وجود کی حقیقت سے ناآشنا رہتے۔

صدقے اُتریں گے، اسیرانِ قفس چھوٹے ہیں
بجلیاں لے کے نشیمن پہ گھٹا بھی آئی

صیّاد کی قید سے رہا ہو کر جب ہم آشیاں کی سمت گئے تو سب سے پہلے بجلیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا گویا ہماری آزادی کا صدقہ اُتارنے کو گھٹائیں اپنے ساتھ بجلیاں بھی لے کر آئیں۔ اپنی بدنصیبی اور محرومی کا اظہار ہے کہ خواہ ہم قفس میں ہوں یا آشیاں میں، مصائب ہر جگہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔

ہاں نہ تھا باب اثر بند، مگر کیا کہیے
آہ پہونچی تھی کہ دشمن کی دعا بھی آئی

محبوب کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے جو آہ و فریاد کی اس کے قبول نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ باب اثر بند تھا بلکہ ہماری آہوں کے ساتھ ساتھ رقیب کی دعائیں بھی در قبول تک پہنچ گئیں اور ہم سے پہلے [illegible] کامیاب ہوگیا۔

آپ سوچا ہی کیے اس سے ملوں یا نہ ملوں
موت مشتاق کو مٹی میں ملا بھی آئی

محبوب کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ عاشق کی موت کے قریب ہونے پر بھی وہ سوچتا رہا کہ عاشق سے ملے یا نہ ملے اور وہ غریب دیدار کی تمنّا لیے ہوئے موت کی آغوش میں جا سویا۔

نہ سمجھا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

لو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا
آج بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

مرتے وقت آخری سانس ہچکی کی شکل میں نکلتی ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہچکی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ کوئی یاد کر رہا ہے۔ عاشق کو موت کی ہچکی آئی ہے مگر وہ خوش فہمی سے یہ سوچتا ہے کہ

محبوب نے یاد کیا ہے اور اس بات پر خوش ہے کہ چلو اس نے یاد تو کیا گو وقتِ آخر ہی سہی۔

دیکھ یہ جادۂ ہستی ہے سنبھل کر فانیؔ
پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا بھی آئی

فانیؔ زندگی کی راہ پر ہوشیار ہو کر اور سنبھل کر چلو کیونکہ موت ہر لمحہ گھات میں ہے کون جانے کس وقت وار کر دے۔ یعنی زندگی کے ساتھ ہر وقت موت کا خطرہ درپیش ہے۔ بات پرانی ہے مگر اندازِ بیان دلچسپ اور پُر تاثیر ہے۔

(۲۱۱)

فانیؔ کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خوابِ محبّت کی تعبیر نظر آئی

محبوب کے ہاتھ سے قتل ہونا عاشق کی معراج ہے چنانچہ شاعر محبوب کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر خود کو مبارکباد دیتا ہے کہ آج تیرے خوابوں کی تعبیر تجھے مل جائے گی۔

پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی
لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی

آسمان پر بادلوں کو دیکھ کر عاشق کا جنون عود کر آیا ہے اور آسمان پر بجلی کی لہریں اسے زنجیر نظر آ رہی ہیں جو لوگ اسے پہنانے کو لا رہے ہیں۔ میرؔ کے اس شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

جب میں نے دعاؤں کا رُخ سوئے فلک دیکھا
تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی

عام عقیدہ ہے کہ دعا قبولیت کے لیے آسمان کی طرف جاتی ہے۔ شاعر جب اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے اور اپنی دعاؤں کو آسمان کی طرف جاتے دیکھتا ہے تو اس پر یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ دعا (جو انسانی تدبیروں میں سے ایک ہے) وہ تقدیر کی محتاج ہے یعنی انسان لاکھ دعائیں کرے، ہوگا وہی جو تقدیر کا چاہا ہے۔

ہر عیش کی محفل میں پروانہ کا ماتم تھا
جو شمع نظر آئی، دلگیر نظر آئی

ہم نے دنیا کی کوئی محفل عیش ایسی نہ پائی جو غم کے اثر سے آزاد ہو۔ چنانچہ جس محفل میں شمع روشن دیکھی (شمع کا روشن ہونا خوشی کی دلیل ہے) اسے پروانے کے غم میں آنسو بہاتے اور جلتے دیکھا۔

کعبہ میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا   اے قصرِ وفا تیری تعمیر نظر آئی

اہل معرفت کے نزدیک کعبہ و کلیسا، مسجد و بت خانہ سب یکساں ہیں کیونکہ دونوں ہی محبوب کے آستانے ہیں جہاں چاہنے والے اپنے جذبۂ پرستش کی تسکین اور اپنی وفا کے اظہار کے لیے جاتے ہیں۔

جب خون ہوا دل کا آنکھوں میں وہ آبیٹھے   آہوں کا حجاب اٹھا تاثیر نظر آئی

جب تک عاشق اپنے کو محبوب سے الگ تصور کرتا ہے اور اسے پانے کے لیے آہ و فریاد کرتا ہے اس کی آہیں اس کے اور اس کے محبوب کے درمیان آڑ بنی رہتی ہیں۔ جب اس نے اپنے دل کو خون کر لیا یعنی محبت میں مٹا دیا اور نالہ و فریاد سے دست کش ہو گیا تو دوری بھی ختم ہو گئی اور محبوب نظروں کے سامنے آگیا۔ گویا اپنی خواہشات کو ختم کرنا اور اپنی ہستی کو مٹانا دیدارِ محبوب کی شرطِ اولیں ہے۔

کایا غمِ دنیا کی وحشت نے پلٹ دی ہے   خاکِ رہِ ویرانہ اکسیر نظر آئی

وحشتِ عشق کی بدولت دنیا کے غم و آلام اذیّت کی جگہ ہمارے لیے ذریعۂ راحت بن گئے ہیں اور ان کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ گویا خاکِ ویرانہ ہمارے لیے اکسیر کا اثر رکھتی ہے کہ اس کی بدولت غمِ دنیا نے ایک نیا رنگ (رنگ حقیقت) اختیار کر لیا ہے۔ ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق ہر چیز کو بلندی و عظمت عطا کرتا ہے چنانچہ غم دنیا اس کی بدولت غم جاناں بن گیا ہے اور ویرانہ کی خاک عاشق کے قدموں کی برکت سے اکسیر بن گئی ہے۔ بنیادی خیال یہ ہے کہ عشق کے ذریعہ آدمی دنیا کے غموں سے نجات بھی پا سکتا ہے اور غم دنیا کو محبوب کا تحفہ سمجھ کر انھیں باعثِ مسرت سمجھتا ہے۔ بقولِ اصغر

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

اس خیال کو کہ انسان پر جو آفتیں اور بلائیں نازل ہوتی ہیں وہ دل ہی کی بدولت ہوتی ہیں، شاعر نے بڑے خوبصورت انداز میں یہاں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر دنیا کی تمام آفتوں اور مصیبتوں کو باہم یکجا کیا جائے تو اس سے دلِ عاشق کا ایک دھندلا سا ہیولیٰ تیار ہو سکے گا۔ یعنی دنیا کی ساری بلائیں بھی ان آلام کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو عاشق کے دل میں موجود ہیں۔

دل اُن کے نہ آنے تک لبریزِ شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

جب تک محبوب سامنے نہیں تھا دل میں اس کے خلاف ہزاروں گلے اور شکایتیں تھیں مگر اس کے آنے کے بعد یہ عالم ہے کہ اس سے شکایت تو بجا' اس کے خلاف شکایتیں جو دل میں آئی تھیں وہ اپنا قصور محسوس ہوتی ہیں۔ وادات عشق کی ایسی ہی سیدھی سادی تصویر سودا کے اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔

ہزار حرف شکایت کا دیکھتے ہی تجھے
زباں یہ شکر ہو بے اختیار گذرے ہے

فانیؔ غمِ ہستی نے زندہ ہی مجھے سمجھا
جب تک میرے مرنے میں تاخیر نظر آئی

ہم نے جو زندگی گذاری وہ اگرچہ در اصل زندگی نہیں بلکہ صرف موت کا انتظار تھی پھر بھی دنیا کے غموں نے ہمیں زندہ سمجھ کر وہ غم ہم پر مسلط کیے کہ الامان والحفیظ یعنی غم تو اس کو دیے جاتے ہیں جو زندہ ہو لیکن باوجود اس کے کہ ہماری زندگی کا صرف، الزام تھی ہم ان غموں سے بچ نہ سکے۔

(۲۱۲)

مشتاق نگاہوں کی اللہ رے رسوائی
میں محوِ تماشا ہوں دنیا ہے تماشائی

میری پُر شوق نگاہیں محبت کی رسوائی کا سبب بن گئیں یعنی میں محبوب کو دیکھنے میں ایسا محو و بیخود ہوا کہ لوگوں کے لیے میں تماشا بن گیا اور رازِ محبت سب پر کھُل گیا۔

تیری ہی نگاہوں کے سب دیکھنے والے تھے
تدبیر بگڑ بیٹھی تقدیر نہ کام آئی

تو نے جب سے نگاہ پھیری ہے تدبیر و تقدیر دونوں ہم سے خفا ہیں۔ گویا یہ دونوں بھی تیری نگاہوں کے اشاروں کے پابند ہیں۔ شعر کا بے ساختہ انداز قابلِ تعریف ہے۔

بیداد کے اس تیور، اس حُسن کے میں صدقے
ان کو مرے مرنے پر آئی تو ہنسی آئی

محبوب اس درجہ ستمگر ہے کہ اس کے تیور ہمیشہ مجھ سے بگڑے ہی رہے اور کبھی ہنس کر نہ ملا۔ اب اس کو ہمارے مرنے پر ہنسی آئی ہے۔ اگرچہ یہ ہنسی اس کی بیداد اور ظلم کا ثبوت ہے کہ ہماری موت پر افسردہ ہونے کی بجائے وہ مسکرا رہا ہے مگر ہمیں اس کا غم نہیں بلکہ اس کے حسین چہرہ پر ہنسی دیکھ کر ہم قربان ہوئے جا رہے ہیں۔

لبریزِ تموّج تھا اک خطِ پیمانہ
محفل سے جو وہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

محبوب جب انگڑائی لے کر محفل سے اُٹھا تو محفل کا عجیب عالم ہو گیا۔ یہاں تک کہ شراب کے جام بھی اس کے حسن کے نشہ سے سرشار ہو گئے اور پیمانوں کی لکیروں میں موجیں اُٹھنے لگیں اور طوفان کا عالم پیدا ہو گیا۔ یہ شعر تغزل اور محاکات کی اچھی مثال ہے۔

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

دنیا کی تلخیوں نے ہمیں اس قدر آشفتہ مزاج بنا دیا ہے کہ بہار و خزاں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں رہا۔ بس جب لوگوں کی زبان سے ذکرِ بہار سنتے ہیں تو ہم بھی جان لیتے ہیں کہ بہار کا موسم آگیا ہے۔ دوسرے مصرع کی بے ساختگی قابلِ داد ہے۔

(۲۱۳)

ہر ستم کا یہ تقاضا ہے کہ ہو فریاد بھی
اب تو جینا ہی پڑے گا شاد بھی ناشاد بھی

محبوب کو ہماری آہ و فریاد میں لطف ملتا ہے اسی لیے وہ ہم پر ظلم کرتا ہے۔ اس کی اس خواہش کے احترام میں ہم زندہ رہیں گے چاہے وہ کسی طرح ہو۔ یعنی ہماری زندگی بھی اپنی خوشی کی نہیں محبوب کی مرضی کے لیے ہے۔

گلشنِ تصویر میں تھے طائرِ تصویر ہم
کیا کہیں کیوں کر رہے، مجبور بھی آزاد بھی

جس طرح کسی تصویر کا پرندہ آزاد ہوتے ہوئے بھی پرواز کی طاقت نہیں رکھتا، اسی طرح دنیا میں ہماری زندگی ہے کہ گو بہ ظاہر آزاد ہیں مگر حقیقت میں مجبور۔ "گلشنِ تصویر" کہہ کر دنیا کے بے اصل ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

خیر ہے! کیا چاہتی ہے اے نسیمِ کوئے یار
اب تو ظالم میری مٹی ہو چکی برباد بھی

ہماری حسرت تھی کہ مرنے کے بعد ہماری خاک محبوب کی گلی میں اُڑے مگر یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی اور ہماری خاک یوں ہی برباد ہوئی۔ اب محبوب کے کوچے سے ہوائیں کیوں آ رہی ہیں۔ خدا جانے اب ان کو کیا منظور ہے، ہماری مٹی تو کب کی برباد ہو چکی۔ مٹی برباد ہونا محاورتاً ناکام و مایوس ہونے کے معنی میں آتا ہے اور لفظی معنی ہوا میں خاک کا اڑنا ہے۔ یہاں بہ یک وقت دونوں معنی مراد ہیں۔

(۲۱۴)

گردش وہی یہاں بھی سپہرِ کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

سپہرِ کہن = بوڑھا آسمان

کہا جاتا ہے کہ انسان کے جوہر پردیس میں نمایاں ہوتے ہیں اور جو خوشی اسے وطن میں نہیں مل پاتی، پردیس میں حاصل ہو جاتی ہے مگر فانیؔ کو شکوہ ہے کہ ہماری محرومی میں پردیس جا کر بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور آسمان یہاں بھی اسی طرح ہمارا دشمن ہے جیسا کہ وطن میں تھا۔ ع

بہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیداست

آزردہ کیوں ہوئے میری آشفتگی سے تم
آخر یہی تو زلفِ شکن در شکن میں تھی

آشفتگی = بکھرنا، وحشت۔

محبوب عاشق کی آشفتگی پر خفا ہے۔ عاشق کہتا ہے میری آشفتگی پر کیوں خفا ہوتے ہو۔ آخر تمھاری زلفوں میں بھی تو یہی آشفتگی ہے۔ مراد یہ کہ عاشق کی یہ آشفتگی تمھاری حسین و پریشان زلفوں کی پیدا کی ہوئی ہے اس لیے اس پر عتاب بے جا ہے۔

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے
میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

مجھے اپنے آشیاں کی کوئی خبر نہیں۔ بس یہ جانتا ہوں کہ جب میں قفس میں اسیر تھا تو باغ پر بجلی گری تھی۔ اس شعر سے فطرت انسانی کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ تمام امکان و قرائن سامنے ہوتے ہوئے بھی کسی بری بات کو اس وقت تک یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا جب تک کوئی اس کی یقینی شہادت نہ دیدے۔ اور جب تک دھوکہ دے سکے انسان خود کو دھوکہ میں رکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے قفس سے چھوٹنے کے بعد بھی طائر آشیاں کے بارے میں صرف اندازے لگا رہا ہے خود جاکر تصدیق کرنے سے گریز کرتا ہے۔ بقول غالب : گری ہو جس پہ کل بجلی وہ آشیاں کیوں ہو

بعدِ فنا بھی کم نہ ہوئیں بے قراریاں
لاشہ نہ تھا مرا کوئی بجلی کفن میں تھی

موت بھی عاشق کی بے قراری کو کم نہ کر سکی اور مرنے کے بعد اس کی لاش کفن میں بجلی کی مانند تڑپ رہی تھی۔

بے پردہ ذکرِ یار ہے در پردہ یادِ یار
میری زباں پہ ہے جو دل برہمن میں تھی

یہ شعر فانی کی وسیع المشربی کا نمونہ ہے۔ وہ بت پرستی کو بھی خدا پرستی ہی کی ایک شکل خیال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک برہمن جو بہ ظاہر بتوں کا کلمہ پڑھتا ہے اس کا دل بھی درحقیقت محبوبِ حقیقی ہی کی یاد میں محو ہے۔ زاہد و برہمن میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ زاہد کی زبان پر بھی اسی کا نام ہے جس کی یاد برہمن کے دل میں چھپی ہوئی ہے۔ ؏

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

وہ گل ہے گل جسے تیری خلوت میں بار تھا
وہ شمع شمع ہے جو تری انجمن میں تھی

جو پھول محبوب کی خلوت میں مہکتے ہیں اور جو شمع اس کی محفل میں جلتی ہے حقیقتاً وہ ہی پھول اور شمع کہلانے کے مستحق ہیں اور ان کی قسمت قابلِ رشک ہے۔

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

پہلے محبوب کی شوخیوں میں بھی ایک سادگی اور معصومیت کا انداز تھا۔ اب اس کی شوخیاں رخصت ہو کر سادگی کا انداز آ گیا ہے مگر نہ جانے کیوں اس کی سادگی میں بھی قیامت کا بانکپن ہے۔ عمر کی مختلف منزلوں پر جو نازک فرق حسن کی طبیعت میں نمایاں ہوتا ہے اس کو بڑے لطف سے اس شعر میں پیش کیا ہے۔

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

محبوب کی جدائی میں سارے چمن میں خاک سی اُڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور پھولوں کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ ع : تم کیا گئے کہ بیت گئے دن بہار کے

اے یاس تو نے آ کے اسے بھی مٹا دیا
لذت سی کچھ جو شکوۂ رنج و محن میں تھی

یاس کے غلبہ کی وجہ سے عاشق نے تڑپنا اور فریاد کرنا بھی بند کر دیا ہے۔ یاس سے اسے یہ شکوہ نہیں کہ اس نے ساری امیدوں کا خون کر دیا بلکہ صرف اتنی شکایت ہے کہ اسے اشکوں میں اور تڑپنے میں جو مزہ ملتا تھا اس سے محروم ہو گیا۔

لو آج مرگِ فانیؔ بے کس سے مٹ گئی
وہ اک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی

فانی کی ہستی اس کے ہم وطنوں کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی تھی۔ چلو آج اس کی موت نے اس خلش کو ختم کر دیا۔ اہلِ وطن کی بدسلوکی و ناقدری کی فانی کو ہمیشہ شکایت رہی۔

(۲۱۵)

اپنی جنّت مجھے دکھلا نہ سکا تو واعظ
کوچۂ یار میں چل دیکھ لے جنّت میری

واعظ جنّت کی ترغیب دلا کر عاشق کو محبوب کی پرستش سے باز رکھنا چاہتا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ تو جس جنّت کا ذکر کرتا ہے اسے نہ تو نے خود دیکھا ہے نہ کسی کو دکھا سکتا ہے مگر ہمیں عشق کی بدولت اس دنیا میں جنّت مل چکی ہے۔ تو چاہے تو کوچۂ محبوب میں چل کر اس کو آنکھوں سے دیکھ لے۔ مراد یہ کہ محبوب کا کوچہ جنّت سے بڑھ کر ہے، جسے یہ نصیب ہو اُسے جنّت کی کیا پروا۔

ساری دنیا سے انوکھی ہے زمانہ سے جُدا
نعمت خاص ہے اللہ رے قسمت میری

میری جیسی قسمت دنیا میں کسی کو نہیں ملی۔ زہے قسمت کہ یہ میرے لیے مخصوص عطیہ ہے، بہ ظاہر شکر ہے مگر لہجہ کے طنز نے شکایت بنا دیا ہے۔

شکوۂ ہجر پہ سر کاٹ کے فرماتے ہیں
پھر کروگے کبھی اس منہ سے شکایت میری

اس جرم کی سزا میں کہ عاشق نے محبوب سے جدائی کا شکوہ کیا ہے محبوب نے اس کا سر تن سے جُدا کر دیا ہے کہ لو اور میرا شکوہ کرو۔ شعر میں کوئی خوبی نہیں بلکہ محبوب کا انتہائی ہیبتناک تصور پیش کیا ہے۔

تیری قدرت کا نظارہ ہے مرا عجزِ گناہ
تیری رحمت کا اشارا ہے ندامت میری

اپنے گناہوں پر میری عاجزی کا اظہار تیری قدرت کا اعتراف ہے اور گناہوں پر ندامت تیری ہی رحمت کا ایما ہے جس نے اسے عفوِ گناہ کا وسیلہ بنا دیا ہے۔ مراد یہ کہ تقدیر کا پابند ہوتے ہوئے گناہ کرنا، ان پر شرمندہ ہونا اور خدا تعالیٰ کا گناہوں کو معاف کرنا شاعر کے نزدیک صرف اس لیے ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی قدرت و رحمت کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

تو تبسم بھی شریکِ نگہِ ناز ہوا   آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

عاشق کی وفاؤں کے عوض محبوب سے اس کو صرف ایک نگاہِ ناز ملی تھی۔ یعنی وہ ایک نگاہ پُرغرور ڈال دیتا تھا۔ عاشق اس پر ہی خوش تھا مگر آج جب اس کی نگاہوں کے ساتھ تبسم بھی شامل ہوگیا ہے تو عاشق کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ محبوب نے آج اس کی قیمت بڑھا دی ہے۔

یہ والہانہ سپردگی فانی کے اس شعر میں بھی موجود ہے۔

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں   آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سستی ہے

فیضِ یک لمحۂ دیدار سلامت فانی   غم ہر روز ہے بڑھتی ہوئی دولت میری

محبوب کی ایک جھلک، ایک لمحہ کے دیدار نے ہمیں غم کی ایسی دولت دے دی ہے جس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

(۲۱۶)

سزا تجویز کی تو نے جو مرگِ ناگہاں میری
محبت بھی کوئی تقصیر تھی اے آسماں میری

جرم محبت پر آسمان نے ہمیں مرگ ناگہاں کی سزا کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی خطا تھی جس پر ایسی سخت سزا دی گئی۔

یہ اُن پر مرنے والوں میں، وہ صدقے ہونے والوں میں
دل و جاں دونوں ان کے ہیں، نہ دل میرا نہ جاں میری

محبوب کو دیکھنے کے بعد میرے دل و جان دونوں میرے اختیار میں نہیں رہے۔ دل اس کے عاشقوں میں شامل ہوگیا اور جان اس کے فدائیوں میں۔

نہایت بامزہ ہے عشق کے ماروں کا افسانہ
زبانِ حال کو از بر ہے ساری داستاں میری

کشتگانِ عشق کا قصہ اس قدر دلچسپ ہے کہ جو سنتا ہے اُسے فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری زبانِ حال (میری حالت) نے اسے زبانی یاد کر لیا ہے۔ مراد یہ کہ چاہے کسی سے میں اپنا حال کہوں یا نہ کہوں میری حالتِ زار ہر ایک کو یہ افسانہ سنا دیتی ہے۔

شہیدِ ناز ٹھہروں، کشتۂ انداز کہلاؤں
کرو تم ذبح مجھ کو ایسی قسمت ہے کہاں میری

ہماری قسمت میں تو گھُل گھُل کر مرنا لکھا ہے۔ یہ تقدیر ہماری کہاں ہے کہ تم اپنے ہاتھ سے ہمیں قتل کرو اور ہم تمہارے شہید کہلائیں۔

جفا پر صبر کرنا، غم سے گھُلنا، جان دے دینا
وفائیں کیجیے گا رفتہ رفتہ امتحاں میری

میری وفا کا امتحان تو مگر رفتہ رفتہ۔ میں وفا کے ہر امتحان میں پورا اُتروں گا یعنی تمہاری جفائیں خاموشی سے سہوں گا اور غم سے گھُل گھُل کر آخر جان دے دوں گا۔ یعنی محبت کی آزمائشوں کی ابتدا جفاؤں سے ہوتی ہے اور خاتمہ عاشق کی موت پر۔

دکھا دو جلوۂ عارض اگر تم دیکھنا چاہو
نظر محوِ تماشا اور زباں گرمِ فغاں میری

اگر تم میری محویت دید اور فریاد کا منظر دیکھنا چاہو تو اپنا چہرہ بے نقاب کر دو۔ مومن کے انداز کا ناکام حربہ ہے۔ محبوب کو اپنی بدحالی کے تماشہ کا شوق دلا کر اس کے چہرہ کو بے نقاب کرانا مقصود ہے۔

شبِ غم کٹ گئی فانی سحر وہ ہوتی آتی ہے
قضا اللہ جانے رہ گئی ظالم کہاں میری

ہجر کی رات ہم نے شب بھر موت کا انتظار کیا۔ اب صبح ہونے کو بھی آئی مگر کمبخت موت نہ جانے کہاں رہ گئی۔

(۲۱۷)

ڈرو نہ تم کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری
کہ روشناسِ اجابت نہیں دعا میری

محبوب کو ڈر ہے کہ کہیں عاشق کی دعائیں قبول نہ ہو جائیں۔ مگر عاشق اسے اطمینان دلاتا ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہماری دعاؤں نے قبولیت کا کبھی منہ ہی نہیں دیکھا۔

وہ تم کہ تم نے جفا کی تو کچھ بُرا نہ کیا
وہ میں کہ ذکر کے قابل نہیں وفا میری

یہ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے کہ محبوب کی جفائیں اور ظلم بھی لوگوں کی نظر میں قابلِ اعتراض نہیں بلکہ بجا ہیں اور ہماری وفاؤں کو بھی وہ اعتبار حاصل نہیں جو اس کی جفاؤں کو ہے۔

چلے بھی آؤ کہ دنیا سے جا رہا ہے کوئی
سنو کہ پھر نہ سنو گے تم التجا میری

اگر اب بھی تم نے ہماری فریاد پر توجہ نہ کی تو پھر اس کے بعد کوئی فریاد نہ سنو گے کیونکہ اب ہم اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ شعر کے پُرحسرت لہجہ نے اسے خوبصورت بنا دیا ہے۔

کچھ ایسی یاس سے حسرت سے میں نے دم توڑا
جگر کو تھام کے رہ رہ گئی قضا میری

میرے مرنے کا منظر اس قدر پُرحسرت و یاس تھا کہ خود موت بھی تڑپ کر رہ گئی۔

خدا نے زہر کی تاثیر بخش دی فانیؔ
ترس گئی تھی اثر کو بہت دوا میری

دوا ہمارے مرض کا علاج کرنے میں ناکام تھی اور اثر کے لیے ترس رہی تھی۔ آج اس میں تاثیر پیدا ہو گئی کہ اس نے ہمیں موت سے ہمکنار کر دیا۔ یعنی خدا نے اسے اثر تو بخشا مگر زہر کا اثر۔ مراد یہ کہ ہمارے مرض کا مداوا موت تھی۔ ہماری بدنصیبی کے اثر سے دوا نے اُلٹا اثر دکھایا مگر یہ ہی ہمارے کام آگیا۔

(۲۱۸)

مجبوریٔ عریاں کو یہ خلعتِ مختاری
اللہ رے کرم ہم اور توفیقِ گنہ گاری

مسئلۂ جبر فانیؔ کا پسندیدہ موضوع ہے۔ کہتے ہیں انسان اگرچہ قسمت کے آگے مجبور و بے بس

ہے پھر بھی اس کو اپنے گناہوں کا ذمّہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ گویا اس کی مجبوریوں کو اختیار کا نام دے کر انھیں چھپایا گیا ہے۔ یعنی اختیار ملا تو صرف گناہ کرنے کے لیے۔ شعر میں چھپا ہوا طنز قابلِ غور ہے۔ بقول میر:

ع: چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

فانی مرے مسلک میں ممنوع ہے ہشیاری
احساسِ خطاکاری ہے رازِ خطاکاری

فانی کے نزدیک احساسِ گناہ میں ہی گناہ کا راز مضمر ہے۔ یعنی گناہ وہ ہے جس کو کرنے میں یہ احساس موجود ہو کہ یہ گناہ ہے۔ بے خودی کے عالم میں جو گناہ انسان سے سرزد ہوتے ہیں ان میں احساسِ گناہ نہیں ہوتا اس لیے وہ مواخذہ کی حد سے باہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے بے خودی کو اپنا مسلک بنا لیا ہے کہ گناہ کا احساس ہی نہ پیدا ہو سکے۔

امید کے دم سے ہے امید کے دم تک ہے
اربابِ تمنّا پر احسانِ دل آزاری

انسان کو مایوسی اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کوئی امید قائم کرے اور وہ پوری نہ ہو اگر عاشق کے دل میں امیدیں نہ پیدا ہوں تو وہ ناامیدی کی اذیت سے بھی بچا رہے۔ گویا اس کی دل آزاری کی ذمہ داری خود اس کی امید پر عائد ہوتی ہے۔

آسان ہوئی منزل آثار مبارک ہوں
اب پاؤں نہیں اُٹھتے اب راہ ہوئی بھاری

زندگی کی دشوارگذار راہوں پر چلتے چلتے اب یہ عالم ہے کہ پیروں میں آگے بڑھنے کی سکت نہیں رہی۔ یہ تھکن اور واماندگی اس بات کی علامت ہے کہ اب منزل (موت) نزدیک ہے۔ اس لیے شاعر خود کو مبارکباد دیتا ہے کہ منزل کے یہ آثار تجھے مبارک ہوں۔

وہ ایک اچٹتی سی قاتل کی نظر توبہ
دم توڑ دیا دل نے گو زخم نہ تھا کاری

محبوب کی ایک اچٹتی ہوئی نظر عاشق کی موت کا سبب بن گئی اور اگرچہ دل پر جو زخم لگا وہ کاری نہ تھا پھر بھی عاشق اس سے جاں بر نہ ہو سکا۔

خوش ہوں کہ ترے غم میں جیتا ہوں نہ مرتا ہوں
جینا ہے ہوس کوشی مرنا ہے ریاکاری

عشق میں زندہ رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ عشق سچا نہیں بلکہ اس میں ہوش شامل ہے اور مرجانے میں ریاکاری کا گمان ہوتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم عشق میں اس حال میں بسر کر رہے ہیں کہ نہ زندوں میں شمار ہے نہ مُردوں میں۔

نہیں ضرور کہ مرجائیں جاں نثار ترے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہوجائے

تم سے مجھے اُمیدیں کیا عفو کے قابل ہیں
میں ہی تمہیں دیتا ہوں تکلیف ستم کاری

محبوب ہم پر جو ظلم و ستم کر رہا ہے اس کا ذمہ دار وہ نہیں بلکہ ہم خود ہیں کیونکہ نہ ہم اس سے امیدِ لطف رکھیں نہ وہ اس کی سزا میں ہم پر ظلم کرے۔ کیونکہ ہمارا یہ جرم کہ ہم اس سے امیدِ لطف رکھتے ہیں، قابل معافی نہیں۔

سرکارِ محبت سے فرمانِ سکوں آیا
گذری حدِ شورش سے جب شورشِ بیداری

عاشق کی بیخودی و خاموشی اسی کا اپنا فعل نہیں بلکہ محبوب کے اشارہ پر ہوتی ہے جب عالمِ ہوش میں اس کا اضطراب و شورش حد سے بڑھ گئی تو بارگاہِ محبت سے اس کے لیے سکون (موت) کا فرمان آگیا۔

فانی مری وحشت نے پھر شکل بدل ڈالی
پھر بخیۂ دامن میں مصروف ہے بے کاری

عاشق اپنا دامن چاک کر کے پھر اسے رفو کرنے میں مصروف ہے۔ بظاہر بخیہ گری ہوشیاری کا کام ہے لیکن حقیقت میں یہ بھی جنون ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے (کیونکہ وہ دامن کو اس لیے سی رہا ہے کہ جب یہ سل جائے تو پھر چاک کرے)۔

(۲۱۹)

ہر گھڑی انقلاب میں گذری
زندگی کس عذاب میں گذری

ہماری زندگی میں مسلسل انقلابات آتے رہے اور زندگی ایک عذابِ مسلسل بنی رہی۔ شاعر کو غم اس بات کا ہے کہ زندگی میں کسی چیز کو ثبات و قرار نہیں۔ اور یہ مسلسل انقلابات کا نشانہ ہے۔

شوق تھا مانعِ تجلّیِ دوست   اُن کی شوخی حجاب میں گذری

محبوب کی شوخی اسے پردہ میں نہیں رہنے دیتی لیکن وہ بے حجاب ہونے کے باوجود حجاب یا پردہ میں ہے کیونکہ ہمارا حد سے بڑھا ہوا شوق ہمیں اس کی جانب دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا گویا اس کے حُسن کا پردہ بن جاتا ہے۔

کرم بے حساب چاہا تھا   ستم بے حساب میں گذری

ہماری کم نصیبی دیکھو کہ ہم نے زندگی میں بے پایاں خوشیاں چاہی تھیں مگر اس کے برعکس بے پایاں غم اور ظلم و ستم ہمارے حصّہ میں آئے۔ فانؔی چونکہ غم کو ایک نعمت سمجھتے ہیں اور اس کو ہر خوشی سے بڑھ کر جانتے ہیں اس لیے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے کرم کی آرزو کی تھی مگر محبوب کا کرم ہمیں ستمِ بے حساب کی شکل میں ملا۔

رازِ ہستی کی جستجو میں رہے   خوابِ تعبیر خواب میں گذری

زندگی ایک خواب ہے۔ اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی خواب کو معنی پہنانے کی کوشش کرے۔ ہم نے جو رازِ ہستی کی تلاش میں عمر گذاری گویا وہ خواب میں خواب کو سمجھنے کی کوشش تھی۔ فانؔی نے "خواب" کو مونث باندھا ہے جو عام استعمال کے خلاف ہے۔

کچھ کٹی ہمّتِ سوال میں عمر   کچھ اُمّیدِ جواب میں گذری

ہماری زندگی کا عرصہ کچھ تو محبوب کے سامنے حالِ دل بیان کرنے کی ہمّت باندھنے میں گذر گیا اور باقی اس کے جواب کی اُمّید میں۔

کس خرابی سے زندگی فانؔی   اس جہانِ خراب میں گذری

ہم نے اس دنیا میں زندگی کس طرح رو رو کر گذاری ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

محبوب جب مسکراتا ہے تو اس کے تبسم کی بجلیوں میں ہمیں وہ سب کچھ نظر آجاتا ہے جو حضرت موسیٰؑ نے طور پر دیکھا تھا اور یہ بجلی ہمارے ہوش و خرد کو جلا دیتی ہے۔

محضر ہے یہی قتلِ شہیدانِ وفا کا
جلاد کی چتون ہے جو شرمائی ہوئی سی

محضر = فرمان
چتون = ماتھے کی شکن

محبوب کی اداؤں میں جب شرم کا انداز شامل ہوجاتا ہے تو عاشق اس ادا پر مرمٹتے ہیں گویا اس کی ادائے شرمگیں عاشقوں کے قتل کا پروانہ ہے۔

سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردۂ دل سے
امّید کی آواز ہے تھرّائی ہوئی سی

دل کی لمحہ بہ لمحہ مدھم ہوتی ہوئی دھڑکنیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اب امّید دل کا خاتمہ بھی نزدیک ہے۔ مایوسی کی کیفیت کو بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے۔ جگر کا شعر ہے:

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

درپیش ہے پھر مسئلۂ طاقتِ دیدار
پھر کچھ نگہِ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

دوست جلوہ دکھلانے پر آمادہ ہے مگر عاشق کو یہ پریشانی ہے کہ اس کے جلووں کی تاب لا بھی سکے گا یا نہیں۔ اس کی نگاہیں جو کب سے اس لمحہ کی منتظر تھیں اب اس آزمائش کے ڈر سے گھبرائی ہوئی ہیں۔ لفظ "پھر" نے شعر کے معنویت اور حسن میں اضافہ کر دیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نگاہوں نے پہلے بھی تجلّی دوست کی خواہش کی تھی اور اس کی تاب نہ لا سکی تھیں۔

اک عالمِ دل سے یہی دنیا یہی فردوس
ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

افلاطون اور اس کے مدرسۂ فکر کے فلسفیوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے انسان کی روح عالمِ اعیان (IDEAS OF GOD) میں رہ چکی ہے اور اس کائنات نیز عالمِ آخرت یا فردوس میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اعیان کا ہی عکس ہے۔ چونکہ انسان کی روح ان اعیان سے واقف رہ چکی ہے۔ اس لیے وہ دنیا اور فردوس میں جو کچھ بھی دیکھتا ہے اس کے لیے اجنبی نہیں بلکہ دیکھا ہوا سا لگتا ہے۔ اس شعر میں ایک لطیف اشارہ قرآنِ پاک کی اس آیت کی طرف بھی ملتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "جنتی فردوس کی نعمتوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ یہ تو ہمیں دنیا میں بھی مل چکی ہیں اور جو انھیں ملے گا وہ ہوگا بھی دنیا کی نعمتوں سے ملتا جلتا"۔ "عالمِ دل" سے مراد وہ حقائق ہیں جو ہماری روح میں موجود ہیں۔

میرے دلِ برباد کے دھندلے سے نشاں ہیں
اس باغ میں کلیاں جو ہیں مرجھائی ہوئی سی

باغ میں جو مرجھائی ہوئی اور بن کھلی کلیاں ہیں یہ میرے دل کی پژمردگی کا خفیف سا نقشہ پیش کرتی ہیں۔

ہر سانس ہے فانیؔ مجھے گویا دمِ آخر
سمجھا ہوں محبت میں قضا آئی ہوئی سی

میں عشق میں ہر لحظہ موت کا انتظار کرتا ہوں اور ہر سانس پر سوچتا ہوں کہ شاید یہی آخری سانس ہو۔ شعر میں نزاکت یہ ہے کہ میری زندگی کا ہر لمحہ جاں کنی میں گذرتا ہے اور ہر سانس آخری سانس کی طرح مشکل سے نکلتی ہے۔

(۲۲۱)

لحد میں چین سے رہنے نہ دے گی یاد اس غم کی
بچھاؤ تم نہ بزمِ ناز میں صف میرے ماتم کی

محبوب اپنی محفل میں صفِ ماتم بچھا کر ہماری موت کا ماتم کر رہا ہے اس کے اس غم کی یاد ہمیں قبر میں بھی بے چین رکھے گی اور موت کے بعد بھی ہمیں سکون نصیب نہ ہو گا یعنی پچھتاوا ہو گا۔

جو آئے ہو تو ٹھہرو دم نکلتا دیکھتے جاؤ
مری جاں میہمانِ لب ہے اور وہ بھی کوئی دم کی

محبوب دمِ آخر عاشق کے پاس آیا ہے اور فوراً ہی جانے کو تیار ہے۔ عاشق اسے روکتا ہے کہ میری جان نکلنے میں زیادہ دیر نہیں اور دم لبوں پر آ چکا ہے۔ تم بھی یہ منظر دیکھ کر جانا۔

چمن میں شام آئے، شب گزاری، صبح چل نکلے
ملی تھی کیا ازل میں زندگانی ہم کو شبنم کی

جس طرح باغ میں شبنم شام کو آتی ہے۔ رات گذارتی ہے اور صبح ہوتے ہی رخصت ہو جاتی ہے اسی طرح ہم بھی دنیا کے باغ میں مختصر عرصہ ٹھہر کر رخصت ہو گئے۔

بناؤں دل کو خوگر ہائے کیوں کر رنجِ بے حد کا
بھلا دوں دل سے کیوں کر یاد تیرے لطفِ پیہم کی

انسان کی فطرت ہے کہ اگر اچھے دنوں کے بعد اسے برے دن گذارنا پڑیں تو ان کا سہنا زیادہ گراں ہوتا ہے۔ عاشق بھی چونکہ کسی زمانہ میں محبوب کے لطف و عنایت کے مزے اٹھا چکا ہے اس لیے اب غموں کی برداشت اور اس عنایت کو بھولنا اس کے لیے ممکن نہیں۔

الٰہی خیر، ہوتا ہے مجھے تلوار کا دھوکا
وہ قاتل کی کمر میں دیکھنا بجلی سی کیا چمکی

خدا خیر کرے۔ آج محبوب کی کمر میں کوئی چیز بجلی کی طرح چمکی دکھائی دیتی ہے۔ شاید یہ تلوار ہے جو ہمارے قتل کے لیے باندھی گئی ہے۔ اگرچہ شاعر کو یقین ہے کہ یہ تلوار ہی ہے مگر وہ اسے تسلیم کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ کسی ناگوار صورت حال کا یقین کرنے میں پس و پیش فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔

دکھایا کل تماشا قابلِ نظّارہ عبرت نے
طلوعِ صبح نے جب محفلِ پروانہ برہم کی

صبح کا طلوع ہونا اگرچہ امید و خوشی کی علامت سمجھا جاتا ہے مگر صبح کے طلوع ہونے پر پروانہ کا جو انجام ہوتا ہے وہ اہلِ نظر کے لیے سامانِ عبرت ہے اور وہ پروانہ کی محفل برہم ہوتے دیکھ کر ہر خوشی میں چھپے ہوئے غم کو دیکھ لیتا ہے۔

دلِ مرحومِ فانؔی کی جواں مرگی کا ماتم ہے
چلی آتی ہیں امڈی آرزوئیں ایک عالم کی

محبت کی دنیا میں فانؔی کی جواں مرگی کا ماتم بپا ہے اور سارے جہان کی امیدیں اس کے ماتم میں شریک ہیں۔

(۲۲۲)

پہچانا ازل میں ایک تڑپتا ہوا جگر
کیا بات ہے تری نگہِ انتخاب کی

اہل نظر کے نزدیک غم ایک عظیم نعمت ہے جو خاص خاص لوگوں کو ہی ملتی ہے اور خوشیاں کم نظروں کے حصّہ میں آتی ہیں۔ فانؔی قسامِ ازل کے شکر گزار ہیں کہ اس نے روزِ ازل میرے لیے جس چیز کو منتخب کیا وہ ایک درد نصیب اور تڑپتا ہوا دل تھا وہ اس کے اس انتخاب کی داد دیتے ہیں۔

ہجر و وصال دونوں مرے حق میں قہر ہیں
یہ امتحاں کا رنگ، وہ صورت عتاب کی

ہجر میں تو تکلیف ہوتی ہے وہ ہوتی ہے مگر وصال بھی ہمیں راس نہیں بلکہ وہ بھی ہمارے لیے قہر ہے کیونکہ ہجر اگر محبوب کے عتاب کا نتیجہ ہوتا ہے تو وصال میں بھی ہمارے ضبط اور صبر کا امتحان اور آزمائش ہوتی ہے۔

بس کھل گیا کہ جوشِ جنوں کا ہے سلسلہ
تفسیرِ زلفِ یار ہے تعبیر خواب کی

ہم نے عالمِ وحشت میں جو خواب پریشاں دیکھا تھا اس کی مفصّل تعبیر زلف یار کی برہمی میں نظر آتی ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کی زلفوں کی برہمی ہمارے حواس کی برہمی کا سبب ہے۔

جس دل پہ کی نظر وہی پہلو میں پھر نہ تھا
شوخی تو دیکھیے نگہِ انتخاب کی

محبوب کی نگاہیں اتنی شوخ و بے باک ہیں کہ جس پر وہ ایک نظر ڈالتا ہے اس کا دل پہلو سے نکل کر محبوب کے قبضہ میں چلا جاتا ہے اور جس کو وہ اپنا ہدف بنانا چاہتا ہے وہ بغیر کسی عذر کے اس کا ہو جاتا ہے۔

(۲۲۳)

ہم اپنے جی سے گذرے یوں سحر کی　　شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی

ہجر کی رات اتنی طویل ہو گئی تھی کہ کٹنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے اس کو یوں مختصر کر دیا کہ جان دے کر اس کا سلسلہ ختم کر دیا۔

تمہیں کس دل سے اپنی جان کہیے　　وفا اُس نے تو کی اور عمر بھر کی

عاشق محبوب کو اپنی جان کہتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کی طرح عزیز بھی ہے اور بے وفا بھی (زندگی کو اس کی ناپائداری کی وجہ سے بے وفا کہا جاتا ہے) مگر فانی کہتے ہیں کہ ہم محبوب کو اپنی زندگی کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ زندگی نے تو تمام عمر ہمارا ساتھ بڑی وفاداری سے دیا اور محبوب سے اتنی بھی وفا نہ ہو سکی۔ تشبیہ کا نیا انداز ہے۔

انہیں بے چین کرنا چاہتا ہے　　قضا آئی ہے کیا دردِ جگر کی

ہمارا دردِ جگر اتنا بڑھا ہے کہ اب محبوب بھی اس سے متاثر ہونے لگا ہے۔ لگتا ہے کہ

دردِ جگر کی قضا آ گئی ہے۔ مراد یہ کہ درد سے محبوب بے چین ہونے لگا ہے اور وہ ہماری طرف ملتفت ہوگا جس سے درد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن بہ ظاہر الفاظ سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ گویا دردِ جگر اپنی گستاخی کی سزا بھگتے گا۔

کشش کیسی کہاں کا جذبۂ دل   وہ آئے ہیں بن آئی ہے اثر کی

محبوب عاشق کے غم خانہ میں آیا ہے۔ عاشق کو خیال ہوتا ہے کہ محبوب کا یوں غیر متوقع طور پر آنا اس کے جذبۂ دل یا کشش محبت کا نتیجہ ہے۔ لیکن پھر وہ خود ہی کہتا ہے کہ محبوب کا آنا صرف اس کی عنایت و کرم ہے۔ اس میں نہ جذبہ کی تاثیر کو دخل ہے نہ دل کی کشش کو۔ اس کے اتفاقاً آ جانے سے جذب و تاثیر دونوں کو ناز کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا ہے اور بس۔

ہم اکثر جا کے ویرانے سے پلٹے   ہمارے گھر سے ویرانی نہ سرکی

گھر کی ویرانی مکینوں کے آ جانے سے ختم ہو جاتی ہے مگر ہمارے گھر کی ویرانی ہماری موجودگی میں بھی بدستور قائم رہتی ہے۔ ہم چاہے گھر میں ہوں یا دشت میں، گھر پر ویرانی ہی کا قبضہ رہتا ہے۔

میرا قتل ان کے ہاتھوں، یہ تو باتیں   کچھ ان کے منھ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

نامہ بر محبوب کی طرف سے عاشق کے قتل کا پیغام لے کر آیا ہے مگر اس کو یقین نہیں کہ محبوب اس پر یہ کرم کرنے کو تیار ہوگا۔ اسے شبہ ہے کہ یا تو نامہ بر نے یہ بات خود تصنیف کر لی ہے، یا محبوب نے اس کو بہلانے کے لیے جھوٹی تسلی دی ہے۔

تمھارے عشق کا اللہ رے فیض   جگر میں دھوم ہے دردِ جگر کی

تمھارے عشق کی بدولت ہمارا دل اور جگر درد کی دولت سے بہرہ یاب ہوا ہے اور دل میں درد کی آمد سے ایک رونق ہے اور ہنگامہ مچا ہوا ہے۔

نگاہِ شوق کے دم تک تھیں آنکھیں   اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی

جب تک آنکھوں میں محبوب کی دید کا شوق تھا آنکھیں آنکھیں کہلانے کی مستحق تھیں اب یہ آنکھیں نہیں بلکہ نگاہوں کی مٹی ہوئی یادگاریں ہیں۔ مراد یہ کہ جس آنکھ میں محبوب کا شوق نہیں وہ بے نور ہے۔

اٹھا ہاتھ اے تصوّر فاتحہ کو   یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

ہمارے پاس اب نہ دل باقی ہے نہ جگر بلکہ دونوں کے مزار سینہ میں رہ گئے ہیں جس پر ہم تصوّر میں فاتحہ پڑھا کرتے ہیں۔

شبِ فرقت کٹی یا عمرِ فانی   اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی

شب ہجر میں صبح ہونے کا سوال نہ تھا لیکن موت نے آکر شب ہجر کی سحر بھی کر دی یعنی زندگی کے ساتھ شب ہجر کا بھی قصّہ ختم کر دیا۔

(۲۲۴)

دیا اک جان کے دشمن کو دل، جان نذرِ دلبر کی
یہ ہے اپنی کہانی، قصّہ کوتہ، زندگی بھر کی

ہماری زندگی کی کہانی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ ہم نے اپنا دل اور جان ایک دشمن جان کے حوالے کر دیئے۔

الٰہی کیا خبر لاتا ہے قاصد وصلِ دلبر کی
بلائیں لے رہی ہیں میری تدبیریں مقدّر کی

محبوب سے ملاقات کی تدبیریں تو ناکام ہو چکی تھیں۔ اب تدبیروں نے تقدیر پر بھروسہ اور اس کی خوشامد شروع کر دی ہے۔ دیکھیں اب قاصد ہمارے خط کے جواب میں محبوب کی طرف سے پیغامِ وصل لے کر آتا ہے یا اب بھی نہیں۔ یعنی وصلِ محبوب میں تدبیریں بے سود ہیں، تقدیر سے کچھ ہو تو ہو۔

قضا آئی، طبیب آیا، وہ آئے دیکھ کون آیا
کسی نے اے جنوں زنجیر کھڑکائی مرے در کی

اے جنوں ذرا دیکھنا ہمارے دروازہ پر کوئی دستک دے رہا ہے ذرا دیکھ یہ موت ہے یا طبیب یا محبوب۔ شعر میں اشارہ یہ ہے کہ مایوسی میں بھی اُمید کا سہارا رہتا ہے۔

وہ شامِ وصلِ دشمن زلف سُلجھاتے ہیں رُک رُک کر
انھیں یاد آگئیں کیا گتھّیاں میرے مقدر کی

محبوب رقیب سے ملنے کے لئے سرگرم آرائش ہے لیکن وہ اپنی زلفیں سلجھاتے سلجھاتے رک جاتا ہے۔ شاید اسے ہماری قسمت کی الجھنیں (بدنصیبی) یاد آرہی ہیں۔ محبوب کا رقیب سے ملاقات کی تیاری کرنا عاشق کی بدنصیبی ہے۔ مقدر کی الجھنوں اور زلفوں کے بلوں میں جو تعلق ہے وہ بدیہی ہے۔ شعر میں محاکات کا لطف پیدا ہوگیا ہے۔

اجل کی آرزو ہو دل میں فانی اور دُنیا ہو
خدا رکھے یہی رونق ہے اس اُجڑے ہوئے گھر کی

ہمارے دل میں اب کوئی آرزو یا تمنا باقی نہیں سوائے موت کی آرزو کے۔ خدا اسے برقرار رکھے کہ اسی سے اس اُجڑے گھر میں کچھ رونق ہے۔ بقولِ غالب:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

(۲۲۵)

کم ہے یا بڑھ گئی وحشت ترے دیوانوں کی
دامنوں کی ہے خبر اب نہ گریبانوں کی

دیوانۂ عشق اب گریبان اور دامن سے بھی بے نیاز ہوگیا ہے یعنی اسے چاک نہیں کررہا ہے۔ معلوم نہیں یہ جنون کم ہونے کی علامت ہے یا اس بات کی کہ اب وہ جنون کی حد سے بھی گزر چکا ہے اور ہر قید سے آزاد ہوگیا ہے۔

فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی
دامنوں کی خبر آئی، نہ گریبانوں کی

گریبان و دامن کے مضمون کو دوسری طرح پیش کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اب کی برس دامن و گریبان پھاڑنے کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ بہار تو ہی بتا کہ دیوانے دشت میں کس حال میں ہیں۔

دل کے تیور تو بجھے یاس کے چھینٹوں سے مگر
نہ بجھی آگ لگائی ہوئی ارمانوں کی

مایوسیوں اور ناکامیوں نے دل کا تو کام تمام کر دیا مگر آرزوؤں کی آگ کو نہ بجھا سکیں۔ مراد یہ کہ دل کے مٹنے پر بھی آرزوئیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ ان کی خلش باقی رہتی ہے۔

حُسن مجبورِ تغافل ہے ادب شرطِ وفا
رہ گئی شرمِ غمِ عشق کے افسانوں کی

ہم اپنا فسانۂ غم محبوب کو نہ سُنا سکے۔ اس میں کچھ تو ہمارا ادب عشق آڑے آیا اور کچھ محبوب کی خوئے تغافل۔ محبوب سے التفات کی امید تو تھی ہی نہیں، اچھا ہی ہوا جو ہماری داستانِ عشق زبان تک نہ آئی اور رسوا ہونے سے بچ گئی۔

چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہیں توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

چشمِ مست کو پیمانہ سے تشبیہ دینا عام بات ہے۔ فانی اس تعریف میں اضافہ کرتے ہیں کہ ساقی کی نگاہیں اس قدر خمار آلودہ ہیں کہ پیمانے بھی اسے دیکھنے پر مجبور ہیں۔

طوق مَنّت کے بڑھا ہو گئی مَنّت پوری
بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

طوق بڑھانا۔ مَنّت پوری ہونے پر طوق اُتار دینا۔

کسی مراد کے لیے گلے میں یا ہاتھ میں کڑا ڈالنا پڑتا تھا دستور تھا جو مراد پوری ہونے پر اُتار دیا جاتا تھا۔ محبوب نے عاشق کی موت کی مراد مانگی ہے اور اس مَنّت کا طوق گلے میں ڈالا ہے۔ شاعر اسے خوش خبری دیتا ہے کہ آج تیری مراد پوری ہو گئی ہے کیونکہ موت نے دیوانوں کو قیدِ حیات

سے رہائی دے دی ہے اب تو بھی گلے کا طوق بڑھا دے (اُتار دے)۔

اب جفا ہے نہ وفا، یادِ وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

حُسن و عشق کی محفلیں اُجڑ جاتی ہیں۔ شمع و پروانہ دونوں رخصت ہو جاتے ہیں لیکن پروانہ کی وفا کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی رہ جاتی ہے۔

دل میں رگ رگ سے کھنچ آئی ہیں لہو کی بوندیں
دعوتیں سینۂ فانیؔ میں ہیں پیکانوں کی

عاشق کو محبوب کی پاسداری کا اس قدر خیال ہے کہ اس کے سارے جسم کا خون سمٹ کر دل میں جمع ہو گیا ہے تاکہ محبوب کا تیر جب دل میں لگے تو اس کے لیے خون کی کمی نہ ہو جائے۔

(۲۲۶)

مجھے قسم ہے ترے صبر آزمانے کی   کہ دل میں اب نہیں برداشت غم اُٹھانے کی

ہم جانتے ہیں کہ تیرا ظلم و ستم صرف ہمیں آزمانے کے لیے ہے لیکن ہم تیری اس ادا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اب ہم میں غم اُٹھانے کی تاب نہیں اس لیے اب آزمائش کو ختم کر دے۔ اندازِ بیان کی بے بسی نے شعر کو خوبصورت بنا دیا ہے۔

ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر صیّاد   نہ توڑ دل کہ امانت ہے آشیانے کی

قید میں ہمیں اس کی پروا نہیں کہ صیّاد ہمیں ذبح کر دے۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں آشیاں سے دُور رکھ کر ہمارے دل کو نہ توڑے کیونکہ ہمارا دل آشیانے کی امانت ہے یعنی دل کی ہستی آشیانہ کی محبّت سے قائم ہے۔

خیالِ یار ہے اک حُسن و عشق کی دُنیا   مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی

ہمارے دل میں خیال دوست کے علاوہ کوئی دوسرا خیال نہیں۔ مگر اس کا خیال بذاتِ خود

حسن و عشق کی ایک وسیع دنیا ہے اور اس کی کیفیات کے ذریعہ ہم دنیا کی گردشوں سے بھی بیگانہ نہیں بلکہ زمانہ کی ساری گردشیں ہماری نظر میں ہیں۔ مراد یہ کہ زمانہ کی گردشیں بھی دنیائے حسن و عشق ہی کا ایک حصہ ہیں۔

زبانِ حال ٹھہر، داستانِ عشق نہ چھیڑ   کہ خوابِ مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی

شاعر اپنی بگڑی ہوئی حالت سے کہتا ہے کہ عشق کی داستان کو ابھی سنانا شروع نہ کر (یعنی افسانہ بگڑا کہ لوگوں کو عشق کا علم ہو جائے) یہ داستان اگر شروع ہوگئی تو اس کا اختتام موت پر ہوگا۔ شاعر اپنی زبوں حالی کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ میرا حال بِن کہے سب پر ظاہر ہوا جاتا ہے اور میری داستان کا انجام دُور نہیں۔ کہانی سے نیند آنا عام مشاہدہ کی بات ہے۔

گلہ ضرور نہیں حالِ بے خودی معلوم   تمھاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی

محبوب کو گلہ ہے کہ عاشق نے اسے یاد کرنا چھوڑ دیا۔ عاشق عذر کرتا ہے کہ اگر ہم بے خودی میں تمھاری یاد سے غافل ہوگئے تو اس کا شکوہ نہ کرنا چاہیے ہماری بے خودی کا حال تو ظاہر ہی ہے اور تمھاری یاد نے بھی تمھاری فراموش کاری کی عادت سیکھ لی ہے اور اسے بھول جانے کی عادت ہوگئی ہے۔ بات کہنے کا انداز بالکل نیا اور دلچسپ ہے۔

نہ دل کے ظرف کو دیکھو نہ طور کو دیکھو   بلا کی دُھن ہے تمھیں بجلیاں گرانے کی

اس میں اشارہ طور کے واقعہ کی طرف ہے جہاں اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی تجلی دکھائی تھی اور اسے دیکھ کر حضرت موسیٰ بے ہوش ہوگئے تھے اور طور جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔ شاعر محبوب (خدا) سے مخاطب ہے کہ جلوہ دکھانے سے پہلے عاشق کی تابِ دیدار کو دیکھ لینا چاہیے یہ نہیں کہ ہر ایک پر حسن کی بجلیاں گرا دیں۔ اندازِ بیان ضرورت سے زیادہ شوخ ہے۔ غالبؔ نے اسی بات کو سلیقہ کے ساتھ یوں کہا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

نہ سانس کا ہے بھروسہ نہ آہ میں تاثیر   وہ کیا پھرے کہ ہوا پھر گئی زمانے کی

محبوب کے روٹھنے سے سارا زمانہ ہمارا مخالف ہوگیا ہے۔ تاثیر نے ہماری آہوں سے منہ موڑ

لیا ہے یہاں تک کہ خود ہماری سانسیں بھی اب ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے   ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

محبوب سے عاشق نے اس کے ظلم کا شکوہ کیا تو وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکا۔ اور جب کچھ بن نہ پڑا تو گھبرا کر روٹھ کے چل دیا۔ محبوب کی بے ساختہ اداؤں کی بڑی دلکش مصوّری ہے۔

جبینِ درد ہے بیتابِ سجدہ اے فانؔی   کدھر ہے خاک ترے دل کے آستانے کی

فانؔی کے بعد کوئی دل ایسا نہیں جو دردِ عشق کا مسکن بننے کے قابل ہو۔ اب دردِ عشق فانؔی کے برباد شدہ دل کے آستانے پر سجدہ کرنا چاہتا ہے۔

(۲۲۷)

ادائیں آ گئیں کوئے بتاں کی   زمیں تک ہے رسائی آسماں کی

حسینوں کے کوچہ کی زمین عاشقوں کی بربادی کا سبب اور ان کی دشمن ہے۔ اب آسمان جو عاشقوں کا دشمن ہوا ہے تو شاید اس نے بھی زمین تک رسائی حاصل کر کے کوئے بتاں کے انداز سیکھ لیے ہیں۔ یعنی کوئے بتاں عاشقوں کے حق میں آسمان سے بھی زیادہ ستم انگیز ہے۔

زباں کٹتی ہے ذکرِ آشیاں پر   تمنّا بھی بہت تھی آشیاں کی

ہمیں بہت آرزو تھی کہ آشیاں بنا کر چمن سے دن گزاریں۔ اس آرزو کو قسمت نے یوں پامال کیا ہے کہ ہم زبان پر آشیاں کا نام بھی نہیں لا سکتے اور یہ نام لینے پر زبان کاٹ لی جاتی ہے۔ شعر کی بے ساختگی نے حسن کو دو بالا کر دیا ہے۔

امیدِ مہر ہے ایمان اپنا   قسم ہے اس دلِ نامہرباں کی

ہم اپنے بے وفا دل کی قسم کھاتے ہیں کہ محبوب سے ہمیں اب بھی مہربانی کی اُمید ہے اور اسی امید کو ہم اپنی جان و ایمان خیال کرتے ہیں۔ ظفر احمد صدیقی کا شعر ہے:

اب بھی امیدِ مہر ہے ان سے   اپنی معصومی وفا کی قسم

یہ دل ہے یادگارِ ناوکِ ناز
نشانی ہے یہ زخمِ بے نشاں کی

ہمیں اپنا دل اس لیے عزیز ہے کہ یہ کسی کے نازوادا کا نشانہ بنا تھا اور یہ محبت کے بے نشاں زخم کی یادگار ہے۔

نویدِ ربط ہے ہر جور لیکن
کہاں سے لاؤں طاقت امتحاں کی

محبوب کا دیا ہوا ہر غم اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو ہم سے تعلقِ خاص ہے جو وہ ہمیں کو اس قابل سمجھتا ہے۔ لیکن کیا کریں کہ اب مزید امتحان کی طاقت ہم میں باقی نہیں۔

مری تربت کے سنّاٹے میں اب تک
صدائیں گونجتی ہیں الاماں کی

ہماری بے چینی و اضطراب مر کر بھی ختم نہیں ہوا بلکہ قبر سے ابھی تک "الاماں" کی آوازیں آ رہی ہیں۔

حرم میں آ ہی نکلے ہیں تو فانیؔ
یہ کیا کہیے کہ نیت تھی کہاں کی

فانیؔ جیسے بُت پرست کو حرم میں دیکھ کر لوگ پوچھتے ہیں کہ آج یہاں کیسے آ گئے۔ فانیؔ کہتے ہیں کہ اب آ گئے ہیں تو سمجھ لو کہ یہیں کے ارادہ سے چلے تھے۔ اب یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ میں کس ارادہ سے چلا تھا۔ شعر کا حُسن یہ ہے کہ بغیر کہے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کہاں کا ارادہ تھا۔

(۲۲۸)

قسم نہ کھاؤ تغافل سے باز آنے کی
کہ دل میں اب نہیں طاقت ستائے جانے کی

عاشق کی حالتِ زار دیکھ کر محبوب کے دل میں رحم آیا ہے اور وہ غفلت نہ برتنے کی قسم کھا رہا ہے۔ عاشق کو یقین ہے کہ وہ مہربانی تو کر نہیں سکتا۔ اگر تغافل چھوڑ دیا تو ستم کرے گا اس لیے وہ تغافل سے باز آنے سے روکتا ہے کہ ہمارے دل میں اب ظلم اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔

ہماری موت نے کچھ مختصر کیا ورنہ
کچھ انتہا ہی نہ تھی عشق کے فسانے کی

عشق کی طویل داستان ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ وہ تو کہو موت نے اس کو ختم کر دیا۔

گری نہ برق کچھ اس خوف سے مرے ہوتے
تڑپ کے آگ بجھا دوں نہ آشیانے کی

میں جب تک آشیاں میں رہا بجلیاں اس پر نہیں گریں کیونکہ انھیں خیال تھا کہ میرے تڑپنے اور لوٹنے سے لگائی ہوئی آگ بجھ جائے گی (زمین پر لوٹنے سے آگ بجھتی ہے) مراد یہ ہے کہ ہم تو اپنی آگ میں جلتے ہی ہیں کسی اور آگ کی حاجت نہیں۔

تمھارا درد تو درماں بنا لیا ہم نے
اب اور سوچیے تدبیر دل دکھانے کی

محبوب کا غم اب ہمارے لیے راحت اور عین زندگی بن چکا ہے۔ اگر وہ ہمیں ستانا چاہتا ہے تو اور کوئی تدبیر سوچے۔

زمانہ کفرِ محبّت سے کر چکا تھا گریز
تری نظر نے پلٹ دی ہوا زمانے کی

کفرِ محبت ۔ گناہ محبت

لوگوں نے گناہ محبت سے توبہ کر لی تھی اور اس سے بچنے کا تہیہ کر چکے تھے مگر محبوب کی ایک ہی نگاہ نے سب کے ارادوں کو متزلزل کر دیا اور سب کی توبہ توڑ دی۔

پلٹ پلٹ کے قفس ہی کی سمت جاتا ہوں
کسی نے راہ بتائی نہ آشیانے کی

ہم قیدِ قفس کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ آشیانہ کا راستہ بھی یاد نہیں اور قفس سے

آزاد ہونے کے بعد بھی آشیاں کی طرف جانے کے بجائے بار بار لوٹ کر قفس کی طرف ہی آتے ہیں۔ بے بسی کی کس قدر مؤثر تصویر ہے۔

نجات دی غمِ دنیا سے دردِ دل نے مجھے
یہ ایک راہ ملی غم سے چھوٹ جانے کی

دنیا کے رنج و غم ہمیں پریشان کیے ہوئے تھے۔ دردِ عشق کا خدا بھلا کرے کہ اس نے دل میں آکر ہمیں تمام غموں سے رہائی دلادی ورنہ ان سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا بقول حسرتؔ:

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

وہ صبحِ عید کا منظر ترے تصوّر میں
وہ دل میں آکے ادا تیرے مسکرانے کی

محبوب کی مسکراہٹ کا تصور ہمارے لیے عید کی صبح کے منظر سے زیادہ مسرت خیز اور پُر لطف ہوتا ہے۔

بتا رہا ہے ہر انداز خاکِ فانیؔ کا
یہ خاک ہے اسی کافر کے آستانے کی

مرنے کے بعد بھی فانیؔ کی خاک اُڑا کر محبوب کی گلی ہی کی طرف جاتی ہے۔ کوئے محبوب کی خاک سے اس کا یہ ربط دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا خمیر ضرور محبوب کے کوچہ کی خاک سے ہی تیار ہوا ہوگا۔

(۲۲۹)

دیر میں یا حرم میں گذرے گی
عمر تیرے ہی غم میں گزرے گی

ہر مذہب کا مقصد اور منزل ایک ہی ہے گو بظاہر راستے کتنے ہی مختلف ہوں۔ ہم دیر میں رہیں یا کعبہ میں ہمارے تصوّر میں محبوب (خدا) ہی رہے گا۔

کچھ اُمیدِ کرم میں گذری عمر
کچھ اُمیدِ کرم میں گذرے گی

عشق کی قسمت میں کامیابی نہیں صرف انتظار ہے۔ بقول غالبؔ :

ع : اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

زندگی یادِ دوست ہے یعنی
زندگی ہے تو غم میں گذرے گی

عشق اور غم لازم و ملزوم ہیں۔ ہم نے چونکہ دوست کی یاد کو اپنی زندگی بنا لیا ہے۔ اس لیے لازمی ہماری زندگی غموں میں بسر ہوگی۔ مومنؔ نے اس خیال کو تغزل کے انداز میں پیش کیا ہے : چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

اب کرم کا یہ ماحصل ہے کہ عمر
یادِ عہدِ ستم میں گذرے گی

عاشق کی قسمت میں خوشی کا کوئی لمحہ نہیں۔ جب تک محبوب ظلم و ستم کرتا تھا تو وہ تڑپتا ہی تھا اب جو اس نے جفا چھوڑ کر کرم شروع کیا تو گذشتہ ظلم و ستم کی یاد بے چین رکھتی ہے۔

دل کو یادِ نشاطِ وصل نہ چھیڑ
غم میں گذرے ہے غم میں گذرے گی

غم کے لمحات میں عشقِ گذشتہ کی یاد دل کو اور زیادہ تڑپاتی ہے۔ شاعر محبوب کی پچھلی ملاقاتوں کی یاد سے کہتا ہے کہ ہمیں اس طرح چھیڑ کر اور نہ تڑپاؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ غم ہی ہمارا مقدر ہے تو پھر خوشی کی یاد سے بھی کیا حاصل۔

حسرت دم بدم میں گذری عمر
عبرت دم بدم میں گذرے گی

ہماری گذشتہ زندگی کا ہر لمحہ حسرتوں میں گذرا۔ اب جبکہ یہ حسرتیں بھی مٹ چکی ہیں تو بقیہ عمر ان حسرتوں کا ماتم کرنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے میں بسر ہوگی۔ حسرت خواہش کا نتیجہ ہوتی ہیں اور عبرت ناکامیوں کا۔ فانیؔ کے نزدیک زندگی نام ہے خواہشیں پیدا کرنے کا اور ان کی ناکامی پر افسوس کرنے کا۔

حشر کہتے ہیں جس کو اے فانیؔ
وہ گھڑی شرحِ غم میں گذرے گی

ہماری داستانِ غم اتنی طویل ہے کہ قیامت کا روز جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ برسوں کے برابر ہوگا، وہ بھی ہماری داستان بیان کرنے میں ہی گذر جائے گا۔

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دُنیا نہ رہے گی

فانی دنیا کے معروضی وجود کے قائل نہیں بلکہ اس کو ایک موضوعی (SUBJECTIVE) حقیقت مانتے ہیں یعنی کائنات کا وجود ہمارے ذوقِ نظر پر منحصر ہے۔ جب تک ہمارا ذوقِ نظر سلامت ہے دنیا کا وجود بھی ہے۔ اگر ہم نے منہ پھیر لیا (یعنی دنیا سے رخصت ہو گئے) تو یہ دنیا بھی نہ رہے گی۔

ایذا نہ رہے گی جو گوارا نہ رہے گی
چھیڑا مجھے دنیا نے تو دُنیا نہ رہے گی

دنیا کی دی ہوئی اذیتیں اور غم ابھی تو ہم برداشت کر رہے ہیں لیکن اگر یہ غم ہماری برداشت کی حد سے گذر گئے تو پھر دنیا اور اس کے غم دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا (یعنی ہم اس کو خاک میں ملا دیں گے) اس لیے دُنیا اگر اپنی خیر چاہے تو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے اور ہمیں چھیڑنے سے باز رہے۔

دل لے کے یہ کیا ضد ہے کہ اب جان بھی کیوں ہو
یہ بھی نہ رہے گی بہت اچھا نہ رہے گی

محبوب دل لے کر اب جان لینے پر بھی مُصر ہے۔ اگر اس کی یہی مرضی ہے تو ہم اس پر بھی راضی برضا ہیں۔

یہ دردِ محبّت غمِ دنیا تو نہیں ہے
اب موت بھی جینے کا سہارا نہ رہے گی

غمِ حیات کے مارے ہوؤں کو موت کا خیال سکون دیتا ہے کہ موت ان غموں کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ مگر محبت کا غم مر کر بھی نہیں جاتا۔ اور اس غم میں موت کا خیال بھی سہارا نہیں بن سکتا۔

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی
جس دن مجھے جینے کی تمنّا نہ رہے گی

فانی کب وہ دن آئے گا کہ ہمارے دل سے زندگی کی آرزو ختم ہو گی اور ہم ہر قید سے آزاد ہوں گے۔ شعر میں اظہار اس بات کا ہے کہ جبرِ زیست یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ زندگی ایک عذاب ہے پھر بھی انسان اسے قائم رکھنے اور اس سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔

(۲۳۱)

اُٹھ چلے ہم تو، ان کی محفل تک
پھر ہماری خبر ہی جائے گی

محبوب ہمیں اپنی محفل سے اُٹھا تو رہا ہے لیکن یہاں سے اُٹھ کر پھر ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے اور ہماری بجائے ہماری موت کی خبر یہاں آئے گی۔

اب یہی اپنی زندگی ہے تو خیر
زندگی بھی گذر ہی جائے گی

شاعر کے نزدیک زندگی غم سے عبارت ہے اور زندگی کے خاتمہ تک غموں سے نجات ممکن نہیں۔ شاعر اس جبرِ حیات کو صرف اس اُمید پر برداشت کر رہا ہے کہ زندگی بھی بہر حال گزشتنی ہے۔ کبھی تو ختم ہو ہی جائے گی۔

آہ پھر آہ ہے رسا نہ سہی
کچھ تو دل میں اُتر ہی جائے گی

لاکھ ہماری آہیں بے اثر سہی مگر پھر آہیں ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو دوست کے دل پر اثر کریں گی۔

(۲۳۲)

جب دل میں ترے غم نے حسرت کی بِنا ڈالی
دنیا مری راحت کی قسمت نے مِٹا ڈالی

جس دن سے ہمارے دل میں غم محبت کی بنیاد رکھی گئی اسی وقت سے ہمارے حصّہ کا سارا سکون اور خوشیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ قاعدہ ہے کہ نئی بنیاد اُٹھانے کے لیے پُرانی عمارت کو منہدم کر دیا جاتا ہے۔

اب برقِ نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب
جس شاخ کو تاکا تھا وہ شاخ جلا ڈالی

ہمارا آشیاں جل چکا تھا۔ اب بجلیاں ہر شاخ کا رُخ کیوں کرنے لگیں۔ ان کا نشانہ تو بس وہ شاخ تھی جس پر ہمارا آشیانہ تھا سو وہ جل چکی۔ یہی خیال فانیؔ کے اس شعر میں بھی ہے:

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا

اظہارِ محبت کی حسرت کو خدا سمجھے
ہم نے یہ کہانی بھی سو بار سُنا ڈالی

ہم نے کچھ نہیں تو سیکڑوں بار اپنی کہانی محبوب کو سُنا ڈالی۔ خدا سمجھے اس بیتابیٔ دل کو کہ جانتے ہوئے کہ محبوب پر اس کا اثر نہیں ہوگا پھر بھی ہم اپنی کہانی دُہراتے رہے۔

جینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے
کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی

محبت میں یا تو محبوب ظلم وستم سے عاشق کی جان لے لیتا ہے ورنہ اپنی عنایتوں سے نواز کر اسے زندگی بخش دیتا ہے۔ مگر ہمارے محبوب نے ان دونوں رسموں کو ترک کر دیا ہے اور ہمیں زندگی اور موت کے درمیان کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔

جینے میں نہ اب فانیؔ مرنے میں شمار اپنا
ماتم کی بساط اس نے کیا کہہ کے اُٹھا ڈالی

ماتم کی بساط = وہ فرش جو کسی کی موت پر سوگوار لوگوں کے بیٹھنے کے لئے بچھایا جاتا ہے۔
عاشق نے اس امید پر جان دی تھی کہ محبوب بھی اس کے غم میں شریک ہوگا لیکن اُس نے آکر ماتم کی بساط ہی اُٹھا دی (یعنی اسے عاشق کے جان دینے کا ہی اعتبار نہیں) اب عاشق افسوس کرتا ہے کہ ہمارا جان دینا بے کار ہی گیا اور نہ ہم زندوں میں شامل رہے نہ مُردوں میں۔

(۲۳۳)

ہر بلائے شامِ فرقت دیکھ لی — ہم نے دنیا میں قیامت دیکھ لی

شبِ فرقت کی بَلائیں قیامت کی بَلاؤں سے کم نہیں۔ اس کی بدولت ہم نے دنیا میں ہی قیامت کا مزہ چکھ لیا۔

پھر نہ اس دل کو ہوئی راحت نصیب — تو نے جس دل میں محبت دیکھ لی

محبوب کو جس شخص کی محبت کا یقین ہو جائے تو وہ اس پر اور زیادہ جفا کرتا ہے۔ چنانچہ جس کی محبت کا اس کو اندازہ ہو جائے اس کے نصیب سے خوشیاں بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔

ذوقِ نظّارہ سلامت چاہیے ‏ ‏ ‏ جس طرف دیکھا وہ صورت دیکھ لی

ہمہ اوست کے نظریہ کے مطابق ہر چیز میں خدا کا جلوہ موجود ہے اور کوئی شے اس سے خالی نہیں۔ اگر انسان کے اندر شوقِ دید اور نگاہ بینا ہے تو وہ ہر طرف اور ہر چیز میں محبوب کی صورت دیکھ سکتا ہے۔

واہ ری رنگینیٔ بزمِ خیال ‏ ‏ ‏ دل کے ہر گوشہ میں جنّت دیکھ لی

محبوب کے تصوّر کی بدولت ہمارا دل جنت کا نمونہ بن گیا ہے اور اس کے گوشہ گوشہ میں ایک رنگین محفل سجی ہوئی ہے۔ ایک شعر میں فاؔنی نے تقریباً اسی خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

فردوس بداماں ہے ہر نقشِ خیال ان کا ‏ ‏ ‏ یہ شانِ تصوّر ہے، تصویر کو کیا کہیے

آپ نے انجام دیکھا عشق کا ‏ ‏ ‏ آپ نے فاؔنی کی تربت دیکھ لی

اگر تم کو عشق کے انجام کی خبر نہیں تو آؤ فاؔنی کی قبر دیکھ لو کہ عاشق کا یہی انجام ہوتا ہے

(۲۳۴)

یہ ہستیٔ دو روزہ گویا کہ نہیں فانی
اللہ رے ترا اے دل اندازِ پریشانی

دل غموں سے اس طرح پریشان و مضطرب ہے گویا کہ یہ غم عارضی نہیں بلکہ دائمی ہیں۔ اگر وہ زندگی کو فانی جانتا تو اس طرح بے چین و پریشان نہ ہوتا۔ دوسرے مصرع کے الفاظ میں تعقید ہے جو ناگوار معلوم ہوتی ہے۔

تعبیر اجل نے دی اس خوابِ پریشاں کی
ہم مر کے تجھے سمجھے اے ہستیٔ انسانی

شاعر کے نزدیک زندگی ایک خواب پریشاں ہے لیکن انسان جب تک جیتا رہتا ہے اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ اس کا یہ خواب اس وقت ٹوٹتا ہے جب موت اسے جگاتی ہے۔ اور تب اسے حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور اس خواب پریشان کی تعبیر ملتی ہے۔

کیونکر میں کہوں تم نے آئینہ نہیں دیکھا
بے وجہ نہیں ہرگز آئینہ کی حیرانی

آئینہ کو شاعری کی اصطلاح میں حیران کہتے ہیں کیونکہ وہ ٹکٹکی باندھ کر اپنے مقابل ہر چیز کو تکتا رہتا ہے۔ اس حیرانی کی وجہ فانی کے نزدیک یہ ہے کہ محبوب آئینہ کے سامنے گیا ہے جس کے حُسن کو دیکھ کر آئینہ میں حیرانی کا انداز آگیا ہے۔

سُن میری خموشی سے افسانۂ غم میرا
دزدیدہ نگاہی سے کر پرسش پنہانی

دزدیدہ نگاہی = چوری سے نگاہ ڈالنا۔

محبوب اور عاشق کے درمیان زبان اور نگاہ کے رابطے ضروری نہیں۔ عاشق کی داستانِ غم زبان سے نہیں خاموشی کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے اور محبوب اس کی غم خواری اور پرسشِ حال سب کے روبرو نہیں کرتا بلکہ اس کی دزدیدہ نظریں پردے میں عاشق کا حال دریافت کرتی ہیں۔ عاشق کی تسکین کے لیے یہ لطفِ خاص ہی بہت ہے۔

کیا ہم شبِ وصل اُن سے فرقت کا گلہ کرتے
تھی رات بہت تھوڑی اور بات تھی طولانی

وصل کی رات ہم نے اس خوف سے محبوب سے جدائی کی تکلیفوں کی شکایت نہیں کی کہ کہیں اس طویل داستان کو بیان کرنے ہی میں یہ قیمتی لمحات نہ گذر جائیں۔

یاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

ہم نے اپنی وحشت کے سبب ویرانہ آباد کر رکھا ہے۔ اُدھر ہمارے خالی گھر پر ویرانی قبضہ کیے ہوئے ہے۔ ویرانے کا آباد ہونا اور گھر میں ویرانی کا آباد ہونا پُر لطف ہے۔

پھر خواب میں طوق آیا زنجیر نظر آئی
درپردہ ہے وحشت کی پھر سلسلہ جنبانی

معلوم ہوتا ہے ہمارے جنون کا سلسلہ پھر سے شروع ہونے کو ہے جو خواب میں ہمیں طوق اور زنجیر دکھائی دینے لگے ہیں۔ میر نے دلچسپ انداز میں کہا ہے:

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

مانا کہ غمِ جاناں غارت گرِ ساماں ہے
رکھا ہی یہاں کیا ہے جز بے سروسامانی

ہم جانتے ہیں کہ محبت عاشق کے ساز و سامان کی دشمن ہے مگر ہمیں اس کی فکر نہیں کیونکہ ہم پہلے ہی بے سروسامان ہیں۔ غالب نے کہا ہے:

دل میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

مشکل مرے مرنے کی مشکل ہے کہ آساں ہو
کچھ نازکیٔ قاتل کچھ اپنی گراں جانی

ہماری مشکل کا حل صرف یہ تھا کہ محبوب اپنے ہاتھ سے ہمیں قتل کرتا سو ہمیں یہ بات مشکل ہی دکھائی دیتی ہے۔ اوّل تو وہ اس قدر نازک ہے دوسرے ہم سخت جان۔ دیکھیں یہ ناؤ کیسے پار لگتی ہے۔

فانی وہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غمِ راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

غمِ راحت = خوشی کی حسرت۔

میں ایسا غمِ دائم کا عادی ہوں کہ غم کو ہی راحت سمجھتا ہوں اور میرے دل میں کبھی خوشی کی تمنا بھی پیدا نہیں ہوئی۔ مراد یہ کہ زندگی میں خوشی کی تمنا ہی غم کا سبب بنتی ہے۔ اگر انسان اس سے آزاد

ہو جائے تو دکھ سے نجات پا سکتا ہے۔

(۲۳۵)

آپ کی آرزو کیے ہی بنی   دل کو آخر لہو کیے ہی بنی

ہم نے بہت چاہا کہ تیری آرزو نہ پیدا ہو اور عشق کر کے اپنے دل کو خون نہ کریں مگر ایسا نہ ہو سکا اور تیری آرزو میں دل کو خون کرنا ہی پڑا۔

ترے خیال سے بچنے میں عمر گذری ہے   اُتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

فاش ہوتا نہ رازِ غم کب تک   دل سے کچھ گفتگو کیے ہی بنی

ہم نے غم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے اپنا راز دل سے کہہ دیا۔ دل اس کی تاب نہ لا سکا۔ اور یہ بات سب پر آشکار ہو گئی۔ لیکن ہم بھی مجبور تھے۔ آخر کب تک درد کی تاب لاتے اور دل سے بھی اس کو چھپاتے۔

ہم بھی جینے کی تاب لا نہ سکے   موت کی آرزو کیے ہی بنی

جہاں تک ہو سکا ہم نے زندگی کے آلام و مصائب کا مقابلہ کیا لیکن جب یہ مصائب حد سے بڑھ گئے تو آخر موت کی آرزو کرنا ہی پڑی۔

سجدۂ شکرِ درد واجب تھا   خونِ دل سے وضو کیے ہی بنی

محبوب نے غم کی جو نعمت عطا کی ہے اس کے لیے سجدۂ شکر ادا کرنا لازمی تھا۔ اس سجدہ کے لیے وضو خونِ دل سے ہی کرنا پڑا۔ مراد یہ کہ غموں کو راحت بنانے اور انھیں محبوب کا انعام سمجھ کر سینہ سے لگانے کے لیے انسان کو اپنے دل یعنی آرزوؤں کا خون کرنا پڑتا ہے۔

حُسن بیتابِ خودنمائی تھا   دل ہمیں روبرو کیے ہی بنی

حسن اپنے جلوے دکھانے کو بے تاب تھا اور کوئی اس کے جلووں کی تاب نہ لا سکتا تھا اس لیے ہمیں دل کو آئینہ بنا کر سامنے کرنا پڑا کیونکہ صرف ہمارا دل ہی اس کے جلووں کا امین بن سکتا تھا۔

مراد یہ کہ تخلیقِ کائنات اور انسان کی ہستی کی پیدائش کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے حسن کو نمایاں کرنا چاہتا تھا۔

چاکِ دامن رفو کیے ہی بنی
چاکِ دامن کے مشغلے کے لیے

ہم اپنا دامن اس لیے سیتے رہتے ہیں تاکہ دامن چاک کرنے کا مشغلہ جاری رکھ سکیں۔ اور بار بار اسے چاک کرتے رہیں۔ فانی کے نزدیک تعمیر کی ہر کوشش تخریب کا پیش خیمہ ہے پھر بھی جبرِ فطرت یہ ہے کہ انسان تعمیر پر مجبور ہے۔

کھو گئے ہم کچھ اس طرح فانی
کہ انھیں جستجو کیے ہی بنی

محبوب کے سامنے ہم کچھ اس طرح بے خود ہو گئے کہ انھیں پرسشِ حال کرنا ہی پڑی۔

(۲۳۶)

مانا حجابِ دید مری بے خودی ہوئی
تم وجہِ بے خودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی

محبوب نے عاشق کے سامنے اپنے چہرہ کو بے نقاب کیا لیکن وہ اس کے حسن کی تجلّی سے اس قدر بے خود ہوا کہ پھر بھی دیدار نہ کر سکا۔ محبوب اس کی محرومی کا ذمّہ دار اس کی بیخودی کو ٹھہراتا ہے۔ لیکن عاشق کہتا ہے کہ مانا میری بے خودی تمھارے دیدار میں مانع ہوئی مگر اس بے خودی کا سبب کون ہے؟ اصل ذمہ داری تمھاری ہے نہ کہ بے خودی کی۔ اندازِ تخاطب دلچسپ اور روزمرہ کا ہے۔

دل ہے وہ طاقِ غم کدۂ عمرِ دوش کا
رکھی ہے جس پہ شمعِ تمنّا بجھی ہوئی

عمرِ دوش = ماضی کا زمانہ

اب دل میں پامال آرزوؤں کی حسرت کے سوا کچھ بھی باقی نہیں۔ گویا ہمارا دل ماضی کے غمکدہ کا ایک ایسا طاق ہے جس پر ناکام آرزوؤں کی بجھی ہوئی شمعیں رکھی ہیں۔

میں منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ ہوں
تصویرِ گردباد وفا ہوں مٹی ہوئی

گردباد = بگولہ

ہماری ہستی مٹ چکی ہے اور ہم منزلِ فنا کی ایک شکستہ نشانی کی مانند ہیں یعنی منزلِ فنا کی نشان دہی کرتے ہیں۔ کبھی ہمارے دل میں آرزوؤں اور تمنّاؤں کا طوفان موجزن تھا لیکن اب وہ بھی ختم ہو چکا ہے اور ہم اس طوفان کی ایک مٹی ہوئی تصویر کی مانند رہ گئے ہیں۔

تعمیرِ دل نے تجھ سے لیا انتقامِ عشق
تیری ہی بزم جلوہ گہِ عاشقی ہوئی

حُسن نے اپنی بزم آرائیوں اور جلوہ نمائیوں کے لیے دل کی تعمیر کی تھی مگر عشق جو حُسن کا مدِ مقابل تھا اس نے حُسن سے یوں انتقام لیا کہ اس کی بزم (دل) میں اپنے ڈیرے ڈال دیئے۔ بنیادی تصور حسن پر عشق کی برتری و فوقیت ہے۔

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مِری زندگی ہوئی

موت فانؔی کی سب سے بڑی تمنّا تھی۔ وہ تو ان کو نہ ملی مگر غموں نے ان کی زندگی کو موت کا نمونہ بنا دیا۔ وہ اس پر بھی خوش ہیں کہ چلو میری زندگی ہی موت بن گئی ہے۔ اب مجھے فکر نہیں کہ موت خواہ کبھی بھی آئے۔

مرحوم کس ادا کے تماشائیوں میں تھا
پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

ہمارا دل جو محبوب کی اداؤں کا تماشائی تھا اس کا انجام یہ ہوا کہ مر کر وہ خود بھی تماشہ بن گیا اور اس کی لاش ایک تماشہ بنی پھر رہی ہے۔ خدا جانے وہ کس درجہ تماشے کا شیدائی تھا۔ لفظ تماشہ اور تماشائی سے رعایت لفظی مقصود ہے۔ مراد یہ کہ دلِ عاشق کی خاک خواص و عوام کا

مرجع بن گئی ہے۔ یہ اہمیت اسے عشق کے سبب حاصل ہوئی ہے۔

دنیائے دل میں یاس کی اللہ رے دار و گیر
جو آرزو کہ خلق ہوئی کشتنی ہوئی

کشتنی = موت کی مستحق
دار و گیر = سزا

مایوسی نے دل پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ کسی تمنّا کو سر اُٹھانے کی اجازت نہیں۔ جہاں کوئی آرزو دل میں پیدا ہوئی، فوراً اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔

کیجے دعا کہ اُف تو کرے دردمندِ عشق
اوّل تو دل کی چوٹ، پھر اتنی دُکھی ہوئی

اگر شدّتِ تکلیف یا غم میں کوئی شخص ساکت ہو جائے تو اسے رُلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عاشق کے دل پر غموں کا ایسا شدید وار ہوا ہے کہ اسے چپ لگ گئی ہے اور اس کے منھ سے اُف بھی نہیں نکل رہی ہے۔ شاعر اس کے غمگساروں سے کہتا ہے کہ دعا کرو کہ اس کے منھ سے کوئی کراہ ہی نکل جائے کہ دل کی بھڑاس کچھ تو نکلے۔ ورنہ اتنی شدید چوٹ اور یہ خاموشی۔ (کہیں موت کا سبب نہ بن جائے۔)

میرا وجود کفر مری زندگی گُناہ
ہستی کو ہوش، ہوش کو لازم خودی ہوئی

عشق میں ماسوا کا تصوّر جرم ہے۔ عاشق کے لیے محبوب سے جدا اپنی ہستی کا تصوّر کرنا بھی گناہ ہے۔ لیکن زندگی کے لیے ہوش اور احساس خودی لازمی ہے۔ گویا ہماری زندگی ایک گناہ ہے اور ہمارا وجود (یا وجود کا احساس) ہی سب سے بڑا کفر ہے۔

فلسفۂ ہمہ اوست کا کہنا ہے "لا موجود الا اللہ" یعنی خدا کے سوا کوئی موجود نہیں۔ لیکن اگر ہم اپنی ہستی اور وجود کو تسلیم کرتے ہیں تو گویا ہم خدا کے سوا کسی اور کو مانتے ہیں جو شاعر کے نزدیک کفر ہے۔

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

دل سے جو صدا آ رہی ہے وہ مدتوں پہلے کی سُنی ہوئی آواز محسوس ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس پردے میں کوئی اور بول رہا ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ عارف کا دل حُسنِ ازل کا مظہر اور امین ہوتا ہے اور اس کی آواز دراصل صدائے غیبی ہوتی ہے جس کو انسان نے روزِ الست سُنا تھا۔ اگر غور کرے تو انسان اپنے دل کے ساز میں چھپی ہوئی حقیقت کے نغموں کو سُن سکتا ہے۔

ندائے عشق تو دوشم در اندروں دارم
فضائے سینۂ حافظ ہنوز پر ز صدا ست

لازم ہے احتیاط، ندامت نہیں ضرور
لے اب چھری تو پھینک لہو میں بھری ہوئی

محبوب عاشق کو قتل کر کے نادم ہے۔ وہ اس کے قتل کی نشانیوں کو چھپانے کی بجائے ندامت سے ڈوبا کھڑا ہے۔ عاشق کو گوارا نہیں کہ یہ الزام محبوب کے اوپر آئے۔ اس لیے کہتا ہے کہ بس ندامت ہو چکی۔ احتیاط لازمی ہے اس لیے اس لہو سے بھری چھری کو جلد اپنے ہاتھ سے پھینک دو۔

فانی میں ہوں وہ نقطۂ موہومِ اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہیں ملی ہوئی

عدم کی دونوں حدوں سے زندگی کے وجود سے قبل کا اور موت کے بعد کا زمانہ مراد ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری ہستی کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ وہ محض ایک خیالی نقطہ ہے جس پر عدم کی دو حدیں آ کر مل گئی ہیں۔ اقلیدس میں نقطہ کا وجود موہوم مانا جاتا ہے۔ انسان کی مختصر ہستی کو بھی شاعر اسی طرح ایک موہوم نقطہ تصور کرتا ہے جس سے پہلے بھی عدم تھا اور جس کے بعد بھی عدم کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس کے نزدیک عدم ایک حقیقت ہے اور ہستی محض وہم۔

ع : خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں

(۲۳۷)

شباب ہوش کی فی الجملہ یادگار ہوئی
جو عمر صرفِ تماشائے حُسنِ یار ہوئی

فی الجملہ = حاصل کلام۔ قصہ مختصر

جو عمر ہم نے حُسنِ یار کے دیکھنے میں گزاری۔ وہی درحقیقت ہمارے کمالِ ہوش کا زمانہ تھا۔ اس سے دُور ہو کر تو ہم ہوش سے بھی دور ہو گئے۔

حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ دل سے پوچھ
نظر تو ایک جھلک کی گناہ گار ہوئی

محبوب کو دیکھنا جرم ٹھہرا ہے۔ ہماری نظر تو اس گناہ دید کی مرتکب صرف ایک مرتبہ ہی ہوئی تھی لیکن دل میں اس جرم کے ارتکاب کی جتنی خواہش تھی اس کا حساب ممکن نہیں۔ قانون کی رو سے جرم کا ارادہ بھی ارتکابِ جرم کا حکم رکھتا ہے۔

بساطِ عجز میں اک آہ تھی متاعِ حیات
سو وہ بھی صرفِ ستم ہائے روزگار ہوئی

بساطِ عجز = عجز کا سرمایہ
متاعِ حیات = زندگی کا سرمایہ

ہم عاجزوں کے حصّہ میں تقدیر نے صرف ایک آہ رکھی تھی جو ہماری واحد دولت تھی۔ افسوس کہ یہ آہ بھی دنیا کے ظلم وستم پر صرف ہو گئی۔ (محبت میں آہ کرنا بھی نصیب نہ ہوا۔)

بقدرِ مستیٔ دل ہے خمارِ غم بدنام
خزاں خراب باندازۂ بہار ہوئی

خمار = نشہ کے اُترنے کی کیفیت

جس قدر بہار پُرکیف اور رنگین ہو گی خزاں کی غارت گری اسی کے اندازہ کے مطابق ہو گی۔ اسی طرح غم جو دل کی تباہی کے لیے بدنام ہے اس میں غم کی اتنی ذمہ داری نہیں بلکہ خود دل کی مستی ذمہ دار ہے۔ مراد یہ کہ دل جس قدر خوشیوں کے نشہ میں مدہوش ہو گا اتنا ہی اسے خمارِ غم سے واسطہ پڑے گا۔

نہیں کہ آہ میں تاثیر ہی نہیں لیکن
یہ دل فگار کبھی آسماں نگار ہوئی

دل فگار = دل کو چھیدنے والی   آسماں فگار = آسمان میں سوراخ کرنے والی

ہماری آہیں بے اثر تو نہیں۔ لیکن یہ خود ہمارے دل کو ہی زخمی کرتی رہتی ہیں۔ کبھی ان سے اتنا نہ ہو سکا کہ آسمان میں بھی سوراخ کر دیتیں۔

کرم ہے راز اُمید کرم کی ہستی کا
اُمید تیرے کرم کی اُمید وار ہوئی

ہمیں تیرے کرم کی اُمید ہے۔ اور ہمارے دل میں اس اُمید کا وجود بھی تیرے کرم کا مرہونِ منّت اور اس کا نتیجہ ہے۔

بَلا سے ہجر میں جینے کی انتہا تو ہے
وہ ایک بار ہوئی یا ہزار بار ہوئی

جُدائی کے غم کیسے ہی تکلیف دہ سہی مگر ان کے سبب زندگی سے چھٹکارا پانے کی صورت تو نکلی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ موت ایک بار نہیں بلکہ بار بار آتی ہے۔ مُراد یہ کہ ہجر میں عاشق سیکڑوں بار موت سے دوچار ہوتا ہے۔

ازل میں خلق ہوئی تھی جو بجلیوں کی رُوح
تری نگاہ، مری جان بے قرار ہوئی

روزِ ازل خالقِ عالم نے بجلیوں کے لیے جو تڑپ اور بے چینی تخلیق کی تھی وہ کچھ تو تیری نگاہوں کو دے دی اور کچھ میری روح کو۔ مراد یہ کہ عاشق کے دل اور محبوب کی نگاہوں کی مثال صرف بجلی میں مل سکتی ہے۔

مرے وجود کی حجّت، مرے عدم کی دلیل
وہ اک نظر تھی جو شاید جگر کے پار ہوئی

محبوب کی جو نگاہیں ہمارے جگر میں اُتر سی گئیں انھوں نے ہمیں زندگی کا احساس بھی عطا کیا اور وہ ہی ہمارے مٹنے کا سبب بھی بن گئیں۔ لفظ "شاید" نے شعر میں حسن پیدا کر دیا ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ اس طرح جگر میں اُتری کہ خود عاشق کو بھی پتہ نہ چل سکا۔

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسّم ہوئی، بہار ہوئی

اگر محبوب کی توجہ اور التفات حاصل نہ ہو تو بہار بھی خزاں معلوم ہوتی ہے اور خزاں میں اگر اس کی عنایت شامل ہو تو بہار بن جاتی ہے۔ الفاظ شاعر کے خیال کی پوری وضاحت کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ دونوں مصرعوں میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس کا تغافل اور کس کا تبسّم۔

اُمیدِ مرگ پہ فانیؔ نثار کیا کیجے
وہ زندگی کہ ہوئی بھی تو مستعار ہوئی

مستعار = ادھار مانگی ہوئی۔

موت نے ہمیں غموں سے نجات کا آسرا دیا ہے۔ اس پر ہم کیا چیز نثار کریں کیونکہ ہمارے پاس صرف ایک زندگی ہے وہ بھی اپنی نہیں مانگے کی ہے۔ بنیادی خیال موت کی آرزو اور زندگی کی ناپائداری۔

(۲۳۸)

حاصلِ بےخبری، لازمۂ ہوش ہوئی
یاد تیری کسی عنواں نہ فراموش ہوئی

ہم چاہے عالمِ بےخبری میں ہوں یا ہوش کی حالت میں، دونوں حالتوں میں تیری یاد سے باہر نہیں ہوتے۔ گویا تیری یاد بےخبری و ہوش دونوں کا حاصل ہے۔

اللہ اللہ وہ رحمت ہے خطاکاروں پر
جو خطا ہونے سے پہلے ہی خطاپوش ہوئی

اللہ تعالےٰ کی رحمت کا یہ عالم ہے کہ وہ خطائیں سرزد ہونے سے پہلے ہی ان کی پردہ پوشی کر دیتا ہے۔

وہ گھڑی بھی شبِ بے صبح تجھے یاد ہے جب
میں بھی خاموش ہوا شمع بھی خاموش ہوئی

ہجر کی رات کی کوئی صبح نہیں ہوتی۔ شاعر اس کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے بھی ایسی ایک رات گذاری تھی جس کی کوئی سحر نہ تھی اور جب صبح کے انتظار میں شمع بھی بجھ گئی تھی اور ہماری زندگی کا چراغ بھی خاموش ہو گیا تھا۔

مجھ پہ الزام پرستارئ صورت کیا خوب
خود تری یاد ہی صورت گرِ آغوش ہوئی

شاعر کے نزدیک صورت پرستی (اصنام پرستی) کی تہ میں دراصل یہ جذبہ کارفرما ہے کہ انسان محبوب حقیقی کا قرب چاہتا ہے۔ گویا محبوب کی یاد یا اس کے وصل کی آرزو ہی اسے صورت پرستی پر اکساتی ہے۔ تو پھر اس کے لیے عاشق موردِ الزام کیوں ہو۔ اصل خطا تو محبوب کے شوق کی ہے۔

وہم ہستی کا بھی احساس نہیں تیرے بغیر
زندگی ہجر میں اک خوابِ فراموش ہوئی

زندگی ایک واہمہ تھی۔ تیری جدائی میں یہ واہمہ بھی ختم ہوتا محسوس ہوتا ہے اور زندگی ایک بھولا بسرا خواب معلوم ہوتی ہے۔

خاکِ دل ہے عجب اضداد کی دنیا فانیؔ
منزلِ عشق ہوئی جلوہ گہہ ہوش ہوئی

انسان کا دل عجیب مجموعۂ اضداد ہے۔ یہ بیک وقت عشق کی منزل بھی ہے اور عقل و ہوش کی جولاں گاہ بھی۔

(۲۳۹)

آہ اب تک تو بے اثر نہ ہوئی　　کچھ تمھیں کو مری خبر نہ ہوئی

ہم نے جب بھی آہ کی اس کا اثر ضرور ہوا۔ ایک تمھارے سلسلہ میں ضرور ہماری آہیں

بے اثر ہو گئی ہیں کہ تمھیں اب تک ہماری کوئی خبر نہیں۔

شام سے فکرِ صبح کیا شبِ ہجر
مر رہیں گے اگر سحر نہ ہوئی

جُدائی کی رات میں سرِشام سے صبح کی فکر کرنا بے سود ہے۔ اگر صبح نہ بھی ہوئی تو ہم مر کر اس رات کا خاتمہ کر دیں گے۔ مراد یہ کہ جُدائی کی رات کاٹنے سے مرنا آسان ہے۔

کس سے دل کا سراغ پائیں گے ہم
تو ہی اے آرزو اگر نہ ہوئی

دل کی ہستی اور وجود آرزوؤں کے دم تک ہے۔ اگر آرزو مٹ گئی تو دل کے وجود کی کوئی علامت یا نشانی بھی باقی نہ رہے گی۔

خلق سمجھی مجھی کو دیوانہ
چارہ فرمائے چارہ گر نہ ہوئی

چارہ فرما ہونا = علاج کرنا

دنیا والوں نے ہم کو دیوانہ ٹھہرایا حالانکہ دیوانہ تو وہ چارہ گر ہے جو ہمارے علاج کی کوشش کرتا ہے۔ علاج اس کا ہونا چاہیے نہ کہ ہمارا۔ مراد یہ کہ دیوانۂ عشق کا علاج کرنا خود دیوانگی ہے۔ مومن کا شعر ہے:

گو چارہ ساز حضرتِ عیسیٰ ہی کیوں نہ ہوں
گر دردِ عشق ہے تو اُمیدِ شفا عبث

کچھ نظر کہہ گئی زباں نہ کھُلی
بات ان سے ہوئی، مگر نہ ہوئی

محبوب سے ملاقات کے وقت نگاہوں کے درمیان تو پیغامات کا تبادلہ ہوا مگر زبان کی خموشی کے سبب بات ادھوری رہی۔

شکوہ کیا ان سے خونِ ناحق کا
زندگی تھی، ہوئی بسر نہ ہوئی

محبوب سے ہم اپنے خونِ ناحق کا کیا گلہ کریں، اس لیے کہ زندگی کوئی ایسی اہم چیز نہیں جس کے لیے اس سے محاسبہ کیا جائے۔

حشر کا دن بھی ڈھل گیا فانیؔ
دل کی روداد مختصر نہ ہوئی

غمِ دل کا افسانہ اس قدر طویل تھا کہ قیامت کا دن بھی ڈھلنے لگا مگر یہ قصّہ ختم ہونے میں نہ آیا۔ قیامت کا دن اپنے طولانی ہونے کے باوجود میرے دل کی روداد کی طوالت کے مقابلہ میں مختصر ثابت ہوا۔

(۲۴۰)

مضمحل سعیٔ چارہ گر نہ ہوئی   اور شفا، قصّہ مختصر، نہ ہوئی

ہمارے معالج کوشش کرنے سے نہ تھکے اور سعیٔ چارہ فرمائی کرتے رہے لیکن ہمیں نہ اچھا ہونا تھا نہ ہوئے۔ مراد یہ کہ مرضِ محبت کا علاج ممکن نہیں۔ اکبر نے کتنی سچی بات کہی ہے:

ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش   سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعیٔ طبیب پر

ترکِ تدبیر کو بھی دیکھ لیا   یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی

دردِ عشق دوا سے اور بڑھتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ تدبیر کو ترک کر کے دیکھیں شاید اس طرح درد میں کمی آئے مگر یہ طریقہ بھی کارآمد ثابت نہ ہو سکا۔ یعنی ترکِ تدبیر بھی ایک تدبیر تھی جو دوسری تدبیروں کی طرح ناکام ہوئی۔

اللہ اللہ یہ حسنِ پرسشِ حال   کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی

محبوب اس طرح ہماری پرسش حال کرتا ہے کہ بہ ظاہر اس کی نظریں بھی ہماری جانب نہیں اٹھتیں۔ مراد یہ کہ عشق ایک ایسا ربطِ پنہاں ہے کہ اس کے لیے زبان یا نگاہ کے ظاہری واسطوں کی بھی ضرورت نہیں۔

کس مُنھ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا   پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ   ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی

محبوب کی نگاہ عاشقوں پر اس طرح پڑی کہ سب کے ہوش رخصت ہو گئے اور کسی کو کسی خبر نہ ہوئی۔ مومن کا شعر ہے۔

کیا تم نے قتلِ جہاں اک نظر میں   کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

ہجر کے بھی ہزار پہلو تھے
یوں بھی اک وضع پر بسر نہ ہوئی

ہم نے چاہا تھا کہ ہم اپنے دل کو جُدائی کی تکلیفوں کا عادی بنالیں تاکہ کم ازکم زندگی میں یکسانیت تو پیدا ہو مگر یہ بھی نہ ہوسکا کیونکہ ہجر کی تکالیف بھی ایک وضع کی نہ تھیں بلکہ ان کے بھی ہزاروں پہلو تھے۔ مراد یہ کہ انقلابات اور تبدیلیاں زندگی کا لازمی حصّہ ہیں ان سے نہ خوشی میں مفر ہے نہ غم میں۔

صبح ہوتی نہیں ہماری شام
ورنہ کس شام کی سحر نہ ہوئی

ہر شام کے بعد صبح ضرور آتی ہے۔ ایک ہماری قسمت میں ایسی شام ہے کہ اس کی کبھی صبح نہیں ہوتی۔ یہاں صبح خوشیوں کی اور شام غم کی علامت ہے۔

آج تسکین دردِ دل فانؔی
وہ بھی چاہا کیے مگر نہ ہوئی

دل کی بے چینی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ آج محبوب خود عاشق کو تسکین دینے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے چین نہ آیا۔ یعنی عشق کی معراج یہ ہے کہ وہ محبوب کے قرب اور وصل سے بھی بے نیاز ہوجائے اور اس کی تڑپ محبوب کے ملنے سے بھی کم نہ ہو۔

(۲۴۱)

اس کشمکش ہستی میں کوئی راحت نہ ملی جو غم نہ ہوئی
تدبیر کا حاصل کیا کہیے تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی

اس زندگی کی کشاکش میں جو خوشی ملتی ہے اس کا انجام غم ہوتا ہے اور تقدیر کی گردش کے سامنے ہر تدبیر بے اثر رہتی ہے۔

اللہ رے سکونِ قلب اس کا جس نے لاکھوں دل توڑ دیئے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

محبوب جس نے لاکھوں دلوں کو کچل کر پامال کر دیا ہے اور جس کی زلفوں نے ساری

دنیا کا سکون درہم برہم کر دیا ہے۔ وہ خود اس قدر پرسکون و مطمئن اور زلفیں سنوارے بیٹھا ہے جیسے اس کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔

غم راز ہے ان کی تجلّی کا جو عالم بن کر عام ہوا
دل نام ہے ان کی تجلّی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

غم (عشق) اور دل جُدا جُدا چیزیں نہیں بلکہ دونوں حسنِ حقیقی ہی کے جلوے ہیں۔ حُسن کی تجلّی ساری کائنات میں کارفرما ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو تجلی عام ہو جائے اور عالم (موجودات) کی صورت اختیار کر لے وہ عشق ہے اور جو جلوہ پوشیدہ رہے اور خارجی عالم میں ظاہر نہ ہو وہ دل کہلاتا ہے۔ مراد یہ کہ دل حُسن کی جلوہ گاہ ہے اور عشق حُسن کا دوسرا نام۔ یہ کائنات عشق کی نمود کے سبب ہے۔

دل کی یہ ویرانی ہی عجب ہے وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں ان کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

دل محبوب کا مسکن ہے پھر بھی یہ ویران ہی نظر آتا ہے۔ جب محبوب خود اس دل میں رہ کر اس کی ویرانی کو کم نہ کر سکا تو پھر کون اس کو دُور کر سکتا ہے۔ مراد یہ کہ ویرانی دل کا مقدّر ہے۔

انسان کی ساری ہستی کا مقصود ہے فانیؔ ایک نظر
یعنی وہ نظر جو دل میں اُتر کر زخم بنی مرہم نہ ہوئی

دردِ عشق حیاتِ انسانی کا مقصد اور اس کی منزل ہے اور یہ درد محبوب کی اس نگاہِ ناز کا مرہونِ منّت ہے جو دل میں اُتر کر ایسا زخم ہو جاتی ہے جو کبھی بھرتا ہی نہیں اور خود محبوب کی نگاہِ لطف بھی اس زخم کی چارہ سازی نہیں کر سکتی۔

(۲۴۲)

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

محبوب کو دیکھنے کے لیے ظاہری وسائل کی ضرورت نہیں۔ نہ اس کا قرب ہی ضروری ہے بلکہ

اس کا فرمان ہے کہ دل کی آنکھیں کھلی رکھو اور میرا جلوہ دُور سے دیکھو۔ یہ شعر معرفت کا ہے۔

آتے ہی تیرے وعدۂ فردا کا اعتبار
گھبرا کے مر نہ جائے تو پھر کیا کرے کوئی

عاشق کے نصیب میں خوشی کا منہ دیکھنا نہیں ہے۔ محبوب اس سے کل کی ملاقات کا وعدہ کرتا ہے۔ جوں ہی عاشق کو اس وعدہ کا یقین آتا ہے وہ خوشی سے جان دے دیتا ہے۔ غالب کا اندازِ بیان زیادہ دلچسپ اور نفسیاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج
جب دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی

محبوب ہر وقت ہمارے دل میں رہتا ہے لیکن آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ اس کو حجاب تو نہیں کہہ سکتے بس ایک ضد ہے جس کی خاطر وہ دل میں رہ کر بھی آنکھوں سے مستور رہنا چاہتا ہے۔ فانی نے معرفت کے خیال کو تغزل کے رنگ میں ڈبو کر پیش کیا ہے۔

کہتے ہیں حُسن ہی کی امانت ہے دردِ عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

عاشق کو اپنے عشق پر ناز تھا اور اس کی بنا پر وہ خود کو محبوب کی عنایتوں کا حقدار خیال کرتا تھا لیکن محبوب نے یہ کہہ کر اس کا سارا غرور ختم کر دیا کہ یہ دردِ عشق بھی تو میرا ہی ودیعت کیا ہوا ہے۔ بنیادی خیال حسن اور عشق کی وحدت — اندازِ بیان بے مثال ہے۔

خالی ہے بزمِ ذوقِ طلب اہلِ ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

یہ بزم عالم اہلِ ہوش سے خالی ہے۔ یعنی ایسے صاحبانِ بصیرت جو تیرے جلووں کو دیکھ سکیں اور تیری تمنّا کر سکتے ہوں، اب نہیں۔ ظاہر بیں لوگ بہت ہیں جو مدعی ہوش و خرد تو ہیں لیکن حقیقتاً

ہوش سے بے گانہ ہیں کیونکہ وہ تیری تمنا کی عظمت سے بھی آگاہ نہیں۔

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو
اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

فانیؔ ایسے دل سے بے زار ہیں جس کے درد کا علاج ممکن ہو۔ وہ ایسے غم کے خواہشمند ہیں جس کو موت بھی ختم نہ کر سکے۔ درد لا دوا کی تمنا فانیؔ کی شاعری کا بنیادی خیال ہے۔

فانیؔ دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور
غافل نہیں کہ ان سے تقاضا کرے کوئی

دعائے مرگ کو بار بار دہرانے سے کیا حاصل۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال سے غافل نہیں۔ وہ بن مانگے بھی دیتا ہے۔ زندگی کی ناقابل برداشت تکلیفوں کے باوجود خدا کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم رکھنے کا جذبہ اِس شعر میں بھی نمایاں ہے۔

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانیؔ اس جئے جانے سے کچھ حاصل نہیں

(۲۴۳)

ہر چند کہ ہے لیکن ملتا ہے نشاں کوئی
پہلو میں تجھے ڈھونڈھے اے درد کہاں کوئی

درد کا وجود مسلّم ہے (سینہ کی کسک اس کی موجودگی کا ثبوت ہے) مگر اس کا ڈھونڈنا یا دیکھنا ممکن نہیں کیونکہ درد کا کوئی نشاں نہیں ہوتا۔

یا کہتے تھے کچھ کہیے، جب اس نے کہا کہیے
تو چپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی

جب تک محبوب سامنے نہ تھا ہم نے اس سے کہنے کے لیے بہت سی باتیں سوچی تھیں مگر جب اس سے ملے اور اس نے پرسش حال کی تو زبان بند ہوگئی۔ میرؔ کا شعر ہے:

یوں کہتے تھے، یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

برگشتہ مقدر کی تاثیر، ارے توبہ
دل ہی پہ پلٹ آئی، کی آہ جہاں کوئی

ہماری بدنصیبی کا یہ عالم ہے کہ آہوں میں بھی اُلٹی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی آہوں کا اثر کسی اور پر نہیں ہوتا خود اپنی حالت اور تباہ ہو جاتی ہے۔

(۲۴۴)

بعد فانی نہ رہا مصرفِ زنداں کوئی
دستِ وحشت میں ہے دامن نہ گریباں کوئی

فانی کے دم سے جنونِ عشق کا نام زندہ تھا۔ اس کے بعد نہ کوئی زنداں کو آباد کرنے والا ہے اور نہ کوئی دامن و گریباں کو چاک کرتا ہے۔

یہ تو معلوم نہیں کیا ہے یہ دُنیا لیکن
صرفِ صد رقص ہے صورت کدۂ جاں کوئی

مشہور فلسفی ہیگل کا کہنا ہے کہ کائنات کی اصل ایک بنیادی SPIRIT یا روح تھی اور یہ دنیا اس کا مادّی اظہار ہے۔ فانی کہتے ہیں دنیا کی حقیقت کیا ہے یہ تو ہم نہیں جانتے۔ اتنا معلوم ہے کہ یہ ایک صورت کدۂ جاں ہے یعنی اس مادی وجود کے پیچھے ایک حقیقی روح پوشیدہ ہے اور یہ صورت کدہ ایک حالت پر قائم نہیں ہے بلکہ مصروف رقص ہے یعنی اس میں مسلسل ارتقا جاری ہے۔

میری ویرانیٔ دل ہے کہیں رسوا کہیں راز
کوئی ذرّہ ہے یہاں اور نہ بیاباں کوئی

ذرّہ و بیاباں = جزو کل۔ اشارہ انسان اور ذاتِ الٰہی سے ہو سکتا ہے۔

اس دنیا میں نہ کسی ذرّہ کا وجود ہے نہ کوئی بیاباں ہے۔ یہ سب اعتبارات ہیں جن کی خالق میرے دل کی ویرانی ہے۔ دل کی ویرانی سے مراد جذبۂ عشق ہے۔ فانی کے نزدیک عشق ہی کائنات کی اصل حقیقت ہے اور عاشق (انسان۔ جزو) اور محبوب (کُل) دونوں میں عشق ہی کی

کارفرمائی ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان کی شکل میں یہ جذبہ ظاہر اور رسوا ہو گیا ہے اور حسن کی شکل میں یہ ایک راز ہے۔

کون ہے میرے سوا فیضِ چمن سے محروم
گل بداماں ہے کوئی خار بداماں کوئی

دنیا کے چمن میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملا ہے چاہے وہ پھول ہوں یا کانٹے۔ مگر ہم ایسے محروم ہیں کہ دونوں سے کچھ بھی ہمارے حصہ میں نہیں آیا۔

ہائے اس بزم میں وہ شوقِ تحیّر کا ہجوم
دلِ بے تاب کوئی دیدۂ حیراں کوئی

محبوب کی محفل کا حال نہ پوچھو۔ وہاں حیرت و شوق کا وہ ہجوم ہے کہ جو ہے وہ دل کی مانند بے تاب اور آنکھ کی طرح حیران ہے۔

تو بھی کر دے غلطی ہائے محبّت کو معاف
آ کہ اُمیدِ وفا پر ہے پشیماں کوئی

ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے محبت میں تجھ سے وفا کی اُمید کی تھی۔ ہم اپنے اس جرم پر شرمندہ ہیں۔ تو بھی ہماری اس غلطی کو معاف کر دے اور درگزر کر۔ یعنی جو محبوب سے وفا کی اُمید رکھتا ہے اسے آخر ش پشیمانی ہی ہوتی ہے۔

برق نے میرے قفس کو بھی نشیمن سمجھا
آہ ایسا بھی نہ ہو سوختہ ساماں کوئی

ہماری سوختہ سامانی کا یہ عالم ہے کہ قفس میں بھی بجلیوں سے پناہ نہیں ملتی اور بجلی قفس کو بھی آشیانہ سمجھ کر پھونک دیتی ہے۔ عام طور پر بجلیوں کا نشانہ نشیمن ہوتا ہے اور قفس کو اس کی زد سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ مگر شاعر کی بدنصیبی نے یہاں بھی اسے نہیں چھوڑا ہے۔

نہ ملی خلق سے مظلومیٔ دل کی کوئی داد
میری قسمت میں نہ تھا جور نمایاں کوئی

ہم پر ظلم تو بے شمار ہوئے مگر ایسا کوئی جور ہماری تقدیر میں نہ تھا جس کے اثرات ظاہر میں بھی نمایاں ہوتے۔ اسی لیے دنیا نے کبھی ہمیں مظلوم نہ سمجھا اور نہ ہماری فریاد سُنی۔

مجھ سے مطلب نہ سہی کاش میسر ہو تجھے
حسنِ تغیّر بھی اے گردشِ دوراں کوئی

زمانہ مسلسل گردش میں رہتا ہے اور روز نت نئے انقلاب آتے ہیں۔ لیکن یہ انقلابات تباہی و بربادی کا موجب ہوتے ہیں۔ شاعر کی تمنا ہے کہ کاش کبھی گردشِ دوراں کو کوئی حسین تغیّر بھی میسر ہو جائے۔ چاہے اس سے ہماری ذات کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مگر اس میں تبدیلی تو آئے۔

عمر سب نزع کے عالم ہی میں گذری فانیؔ
زندگی کا نہ ہوا موت پہ احساں کوئی

اگرچہ ہماری تمام عمر نزع کے عالم میں گذری لیکن حقیقی موت میسّر نہ ہو سکی۔ موت کو زندگی کا نذرانہ نہ مل سکا اس لیے موت پر زندگی کا کوئی احسان نہ رہا۔

(۲۴۵)

ظلم اور بھی اے فلک رہا ہے کوئی
پھر ظلم کی راہ تک رہا ہے کوئی

شاعر آسمان سے پوچھتا ہے کہ کیا تیرے پاس کوئی ظلم اور باقی ہے۔ اگر ہے تو وہ بھی دے دے کیونکہ ہم تیری جانب سے مزید ظلم کے منتظر ہیں۔ یعنی آسمان چاہے ظلم کرتے کرتے تھک جائے ہم ظلم سہتے سہتے نہیں تھکیں گے۔

معلوم نہیں کیا ہے محبّت لیکن
کانٹا دل میں کھٹک رہا ہے کوئی

ہم تو یہ نہیں جانتے کہ محبت کس کو کہتے ہیں۔ ہاں ایک کانٹا سا ہمارے دل میں چبھ رہا ہے۔ اسی خلش کا نام محبت تو نہیں۔ شیفتہ کا شعر ہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اُس وعدہ فراموش سے یہ کون کہے
کب سے تری راہ تک رہا ہے کوئی

محبوب عاشق سے ملاقات کا وعدہ کر کے بھول چکا ہے۔ کاش کوئی اس سے جا کر کہہ دے کہ کوئی دیر سے تمھاری راہ دیکھ رہا ہے۔

کیا حوصلہ آزما ہے طوفانِ حیات
بڑھتا ہے کوئی، جھجک رہا ہے کوئی

زندگی کے مصائب اس قدر شدید اور صبر آزما ہیں کہ کوئی ایک فرد ہی اس طوفان میں آگے بڑھتا ہے۔ ورنہ ہر راہی اس منزل میں قدم رکھتے ہوئے جھجکتا ہے۔ اس شعر میں محاکات کا مکمل نمونہ ہے اور پورا منظر آنکھوں کے سامنے نظر آ جاتا ہے۔

کتنی تری جستجو کی لذّت ہے عزیز
رستہ پا کر بھٹک رہا ہے کوئی

عشق میں محبوب کو پانے میں وہ لذّت نہیں جو اس کی تلاش میں ہے اسی لیے عاشق اس کا پتہ پا لینے کے باوجود بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کو سفر میں جو لطف ملتا ہے وہ منزل پر پہنچنے میں نہیں۔ بقول اقبال: اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ٹھہرا ہے یہ اب ذکرِ وفا کا مفہوم
کچھ جوشِ جنوں میں بک رہا ہے کوئی

یہ دنیا اس قدر وفا ناآشنا ہے کہ وفا کے تذکرے کو دیوانے کی بڑ سمجھتی ہے اور اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی۔

مے خانۂ عالم میں ہے ہل چل فانیؔ
پیمانہ مگر چھلک رہا ہے کوئی

ہل چل سے اشارہ ہنگامۂ "کُن" کی طرف ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج میخانہ ہستی میں ہل چل مچی ہوئی ہے۔ وجود کا نشہ ہر چیز پر چھا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیمانۂ ازل کی شراب چھلک کر ہر ایک کو مخمور کر رہی ہے۔ اس شعر کا لہجہ نہایت دلچسپ اور خیال نیا ہے۔

(۲۴۶)

مر کر مریضِ غم کی وہ حالت نہیں رہی
یعنی وہ اضطراب کی صورت نہیں رہی

لوگ کہتے ہیں کہ موت مریضِ غم کے لیے سکون کا باعث ہے۔ فانیؔ کا خیال ہے کہ سکون تو موت کے بعد بھی نہیں مل سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اضطراب کی صورت بدل جائے گی۔ زندگی میں یہ بے قراری کی صورت میں تھا اور موت میں اس نے سکون کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ہر لمحۂ حیات رہا وقفِ کارِ شوق
مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

ہم زندہ اس لیے نہیں کہ زندگی ہمیں راس آ گئی ہے بلکہ اصلیت یہ ہے کہ عشق کے کاروبار نے ہمیں مرنے کی فرصت بھی نہ دی۔ محاورہ کا بڑا بے ساختہ استعمال ہے۔

اک نالۂ خموش مسلسل ہے اور ہم
یادش بخیر ضبط کی طاقت نہیں رہی

ایک وہ بھی زمانہ تھا جب ہم محبوب کے ہر ظلم و ستم کو خوشی سے برداشت کرتے تھے مگر اب ہم میں ضبط کی طاقت نہیں اور ہماری زندگی ایک فریادِ مسلسل بن گئی ہے۔ اگرچہ ضعف کے سبب یہ فریاد بھی خاموشی کے پردے میں ہے۔ یعنی پہلے خاموشی ضبط کے سبب تھی اب ناطاقتی کے سبب۔

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

دُنیا سے محبت اور وفا اُٹھ چکی ہے۔ اب دوستوں سے بھی وفا کی اُمید یا بے وفائی کا گلہ نہیں تو پھر زمانہ کی شکایت کیا کریں۔ شکوہ اسی وقت کیا جاتا ہے جب توقع ہو۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ   کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

وہ عہدِ دل فریبیٔ تاثیر اب کہاں
مدّت سے آہ، آہ کی حسرت نہیں رہی

ایک زمانہ تھا جب ہمیں اپنی آہوں کی تاثیر پر ناز تھا مگر اب ان کی تاثیر کا بھرم ٹوٹ چکا ہے اس لیے نہ ہم آہ کرتے ہیں نہ آہ کرنے کی حسرت ہے۔

ان کے تو دل سے نقشِ کدورت بھی مٹ گیا
ہم شاد ہیں کہ دل میں کدورت نہیں رہی

محبوب کے دل میں عاشق کے خلاف جو نفرت تھی اب وہ بھی نہیں رہی اور وہ بالکل بے تعلق ہوگیا۔ لیکن عاشق سادہ دِلی سے سمجھ رہا ہے کہ نفرت کا اظہار نہ ہونا محبت کے سبب ہے۔ خیال رہے کہ نفرت بھی تعلق کی دلیل ہے۔

دل اور ہوائے سلسلہ جنبانیٔ نشاط
کیوں پاسِ وضعِ غم تجھے غیرت نہیں رہی

ہوا = خواہش۔

سلسلہ جنبانیٔ نشاط = خوشی سے تعلق پیدا ہونا۔

عاشق کے دل میں خوشی کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ وہ اپنے غم پسند دل کو غیرت دلاتا ہے کہ تجھے اپنی وضع کچھ تو پاس کرنا چاہیے۔ تیرا مسلک تو غم ہے۔ خوشی سے تجھے کیا واسطہ۔

اے دردِ عشق اب تو خدا کے لیے نہ چھیڑ
دل میں کراہنے کی بھی طاقت نہیں رہی

شاعر غمِ عشق کو خدا کا واسطہ دیتا ہے کہ اب اور غم نہ دے کیونکہ اب تو ہم میں آہ کرنے کی سکت بھی باقی نہیں۔

ہر بے گنہ سے وعدۂ بخشش ہے روزِ حشر
گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی

اللہ تعالیٰ نے قیامت میں تمام پرہیزگاروں اور گناہ سے بچنے والوں کو بخشنے کا وعدہ کیا ہے۔ شاعر بخشش کو گناہ گاروں کا حق سمجھتا ہے اور افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ یہ وعدہ تو گناہ گاروں سے ہونا چاہیے تھا۔ اور گناہ گار تیری رحمت کے بھروسہ پر اپنے گناہوں پر نازاں تھے۔ مگر تو نے انھیں اس مراعات سے محروم کر دیا۔ اس میں ایک طنزیہ پہلو یہ بھی موجود ہے کہ جو بخشش بے گناہوں کے لیے ہو وہ شانِ رحمت تو نہیں۔

اے عرضِ شوق مژدہ کہ دل چاک ہو گیا
تکلیفِ پردہ دارئ حسرت نہیں رہی

عاشق اپنی آرزوؤں کی پردہ داری کے خیال سے خاموش تھا اور محبوب سے عرضِ حال نہیں کر پاتا تھا لیکن اب تکلیفیں سہتے سہتے دل پارہ پارہ ہو گیا۔ لیکن عاشق خوش ہے کہ اب پردہ داری کی اذیت سے تو نجات مل جائے گی اور محبوب پر حال ظاہر ہو جائے گا۔ غالبؔ نے کہا ہے:

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق
تکلیفِ پردہ دارئ زخمِ جگر گئی

پتھرا گئی تھی آنکھ مگر بند تو نہ تھی
اب یہ بھی انتظار کی صورت نہیں رہی

عاشق کی آنکھیں آخری وقت میں پتھرا گئی تھیں لیکن اس وقت بھی محبوب کے انتظار میں کھلی ہوئی تھیں۔ لوگوں نے یہ کیا کیا کہ اس کی آنکھیں بند کر دیں اور اب انتظار کی صورت بھی باقی نہ رہی۔

قاعدہ ہے کہ مرنے کے بعد میّت کی آنکھیں بند کردی جاتی ہیں۔

عبرت نے بے کسی کا نشاں بھی مٹا دیا
اُڑتی تھی جس پہ خاک وہ تربت نہیں رہی

عاشق کی قبر کا نشان جب تک باقی تھا اس وقت بھی اس پر پھول ڈالنے والا یا چراغ جلانے والا کوئی نہ تھا۔ اس پر ہمیشہ خاک ہی اُڑتی رہی اور قبر عاشق کی بے کسی کی نشانی بنی رہی۔ لیکن اب وہ نشان بھی مٹ گیا اور دیکھنے والوں کے لیے نشانِ عبرت رہ گیا ہے۔

محشر میں بھی وہ عہدِ وفا سے مُکر گئے
جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

محبوب نے عاشق سے کل کا وعدہ کیا تھا۔ کل کا مطلب قیامت ہے۔ ہم اسی لیے قیامت کے منتظر تھے کہ اس روز تو محبوب اپنا وعدہ وفا کرے گا۔ لیکن حشر آنے پر بھی ہماری اُمیدیں پوری نہ ہوئیں اور وہ وعدہ سے مکر گیا۔ اس طرح قیامت کی جو خوشی تھی، مٹی میں مل گئی۔

کس منہ سے غم کے ضبط کا دعویٰ کرے کوئی
طاقت بقدرِ حسرتِ راحت نہیں رہی

ہماری ناتوانی کا یہ حال ہے کہ اتنی طاقت بھی باقی نہیں کہ کسی خوشی کی تمنا کریں۔ اسی لیے ہم غم کی تمنا یا ضبطِ غم کا دعویٰ نہیں کرتے۔ خیال رہے کہ فانی کے نزدیک غم ہی راحت ہے۔

فانی امیدِ مرگ نے بھی دے دیا جواب
جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

محبوب کی جدائی میں امیدِ مرگ ہماری زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھی اور اسی پر ہم زندہ تھے۔ لیکن اب یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔ اب ہجر کی گھڑیاں کس طرح گذریں گی۔

(۲۴۷)

وہ نظر کامیاب ہو کے رہی   دل کی بستی خراب ہو کے رہی

ہم نے دل کی بستی کو ویرانی و تباہی سے بچانے کی لاکھ کوشش کی مگر محبوب کی نگاہوں کے آگے ہماری ایک نہ چلی اور دل ویران ہو کر ہی رہا۔

عشق کا نام کیوں کریں بدنام   زندگی تھی عذاب ہو کے رہی

ہم اپنی تکلیفوں کا ذمہ دار عشق کو نہیں ٹھہراتے۔ زندگی کی تقدیر میں تو تکلیفیں لکھی تھیں۔ عشق برباد نہ کرتا تب بھی کوئی اور اس کی بربادی کا سبب بن جاتا۔ ع

غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

نگہِ شوق کا مآل نہ پوچھ   سر بسر اضطراب ہو کے رہی

مآل = انجام

محبوب کی طرف پُرشوق نظروں سے دیکھنے کا جرم ہم سے سرزد ہوا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ہماری زندگی اضطرابِ مسلسل کا شکار ہو کر رہ گئی۔

تم نے دیکھا کہ مرگِ مظلومی   جانِ صد انقلاب ہو کے رہی

مظلوم کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔ دیکھو کہ عاشق کی مظلومی کی موت کتنے زبردست انقلابات کا پیش خیمہ بن گئی۔ مراد یہ کہ محبوب کا دل بھی پگھل گیا۔

چشمِ ساقی کہ تھی کبھی مخمور   خود ہی آخر شراب ہو کے رہی

مخمور = نشہ میں مبتلا۔

ساقی کی آنکھیں جو کبھی خود نشہ میں مخمور نظر آتی تھیں اب وہ مجسم شراب بن گئی ہیں اور رند اُسے دیکھ کر مدہوش ہو جاتے ہیں۔

تابِ نظّارہ لا سکا نہ کوئی   بے حجابی حجاب ہو کے رہی

محبوب بے حجاب سامنے آئے تب بھی کوئی اس کے حسن کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا اور اس کی بے حجابی ہی پردہ بن جاتی ہے۔ بقول غالبؔ:

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز   آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

حشر کے دن کسی کی ہر بیداد   کرم بے حساب ہو کے رہی

زندگی میں محبوب نے جو ظلم و ستم عاشق پر کیے تھے حشر کے دن عاشق ان کی وجہ سے رحمت کا سزاوار ٹھہرا اور محبوب کو ان کی تلافی کرنا پڑی۔ گویا اس کا ظلم عاشق کے حق میں کرم بن گیا۔

سامنے دل کا آئینہ رکھ کر   ہر ادا لاجواب ہو کے رہی

دل عاشق ایک آئینہ ہے۔ محبوب اس آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر اپنے حسن کو اور بھی نکھارتا ہے، یہاں تک کہ اس کی ہر ادا بے مثال ہو جاتی ہے۔ مراد یہ کہ حسن عشق کا مرہونِ منت ہے اور عشق ہی کے سبب اس میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

ہم سے فانی نہ چھپ سکا غمِ دوست   آرزو بے نقاب ہو کے رہی

ہم نے غمِ عشق کو چھپانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اور ہماری محبت عالم آشکار ہو گئی۔

(۲۴۸)

تھم تھم کے آ رہی ہیں دمِ نزع ہچکیاں
رہ رہ ٹوٹتی ہیں امیدیں رہی سہی

دمِ نزع ہچکیاں آنا فانی کے نزدیک اس بات کی علامت ہے کہ مرنے والے کے دل میں جو آرزوئیں ہیں وہ اس طرح جھٹکوں کے ساتھ ٹوٹ رہی ہیں۔

دشوار تو نہیں غمِ ہستی کا خاتمہ
ان کی خوشی یہی ہے تو ان کی خوشی سہی

زندگی کے غموں سے نجات پانا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن چونکہ محبوب کی مرضی یہی ہے اس لیے ہم اس کی خوشی کی خاطر زندگی کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ محبوب کی مرضی کا یہ احترام فانی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

لے امتیازِ جور ہی ہم نے اُٹھا دیا
تو بے وفا نہیں ہے تو اچھا یہی سہی

محبوب جور بھی کرتا ہے اور اس پر بھی بضد ہے کہ اسے بے وفا نہ کہا جائے۔ عاشق کو چونکہ ہر حال میں اس کی خاطر داری منظور ہے اس لیے کہتا ہے کہ چلو تمھاری بات مانے لیتے ہیں اور دل سے جور اور وفا کا فرق مٹا کر تمھاری جفا کو ہی وفا سمجھے لیتے ہیں۔

(۲۴۹)

دل کی لگی نہیں تو خیر اب کوئی دل لگی سہی
فتنۂ شامِ غم کے بعد فتنۂ حشر ہی سہی

دل کی لگی (محبت) میسّر نہیں تو دل لگی (تفریح) ہی سہی۔ لاؤ دل بہلانے کو فتنۂ قیامت ہی برپا کریں۔ مراد یہ کہ شبِ ہجر کی بلاؤں کو جھیلنے کے بعد قیامت کی مصیبتیں ایسی ہیں جیسے کوئی دل بہلانے کے لیے مشغلہ شروع کر دے۔

سازِ خیالِ یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے
نغمۂ آرزو سنا نوحۂ یاس ہی سہی

محبّت کے ساز سے آرزوؤں کے نغمے نکلیں یا مایوسی کے نوحے، ہم ہر حال میں اس کو چھیڑتے ہی رہیں گے اور کبھی خاموش نہ ہونے دیں گے۔ اس میں غالبؔ کے شعر سے استفادہ ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

شیوۂ عاشقی نہیں ہجر میں آرزوئے مرگ
ہاں نہیں زندگی عزیز، موت ہی زندگی سہی

جدائی کے غم سے گھبرا کر موت کی تمنّا عشق کے آداب کے خلاف ہے۔ مانا کہ غمِ ہجر کی وجہ سے زندگی سے دل بیزار ہے اور موت ہی ایک واحد سہارا ہے۔ پھر بھی ہم اس کی آرزو نہ کریں گے۔

عرصۂ حشر دور ہے خاکِ دلِ حزیں سہی
مشقِ خرامِ ناز کر، واں نہ سہی یہیں سہی

عاشق کے نزدیک محبوب کی فتنہ پرور رفتار ہی قیامت کے فتنے جگائے گی لیکن ابھی عرصۂ قیامت دور ہے۔ جب تک اس کے خرامِ ناز کی مشق کے لیے وہ اپنے دل کی خاک کو پیش کرتا ہے کہ تمھیں تو فتنے جگانے سے مطلب ہے عرصۂ حشر نہ سہی خاکِ دل ہی سہی۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ جو فتنے قیامت میں ہوں گے وہ دلِ عاشق میں ہر وقت برپا رہتے ہیں اور دونوں فتنوں کا محرک محبوب کی رفتار ہے۔

سر نہیں سنگِ در تو ہے ترک نہ کر نمازِ عشق
خاکِ جبیں سے کام لے، سجدۂ بے جبیں سہی

عشق کے سجدوں کے لیے پیشانی کا ہونا ضروری نہیں۔ محبوب کا سنگِ در سلامت رہے۔ جب تک یہ موجود ہے عاشقوں کی خاک اس پر سجدہ ریز رہے گی اور بے جبیں کے نمازِ عشق ادا ہوگی۔ مراد یہ کہ جذبۂ عشق مر کر بھی فنا نہیں ہوتا۔

ہے ترے تیرِ ناز کے رُخ پہ نشانہ منحصر
دل ہو جگر ہو کوئی ہو، تیرِ نظر کہیں سہی

محبوب کے ناز و انداز کے تیروں کو نشانہ لینے کی بھی حاجت نہیں۔ یہ تیر کسی طرف کو چلیں، عاشقوں کے دل و جگر خود ہدف بننے کے لیے اسی سمت پہنچ جاتے ہیں۔

اے دمِ واپسیں ٹھہر، دردِ فراق المدد
ایک ہی آج اشکِ غم حاصلِ آستیں سہی

عاشق اپنی ختم ہونے والی سانسوں کو روکتا ہے اور موت سے کہتا ہے کہ مجھے صرف اتنی مہلت دیدے کہ کم سے کم ایک آنسو تو دردِ فراق سے مستعار لے کر اپنی آستین میں جذب کر لوں۔

اشارہ یہ ہے کہ فراق میں جو آنسو آنکھوں سے نکل کر آستین میں جذب ہوتے ہیں وہی عاشقوں کا سب سے بڑا سرمایہ اور اس کے لیے سفرِ عدم میں زادِ راہ ہیں۔

میں ہوں رہینِ انتظار آئیے یا نہ آئیے
اپنے یقیں کو کیا کروں آپ کی ہاں نہیں سہی

یہ جانتے ہوئے کہ محبوب کی ہاں کا مطلب نہیں ہوتا ہے اور اس کے وعدے جھوٹے ہوتے ہیں عاشق پھر بھی ان پر یقین کیے ہوئے ہے۔ وہ چاہے آئے یا نہ آئے عاشق سراپا انتظار ہے۔ اشارہ یہ بھی ہے کہ انتظار میں جو لذت ہے وہ ملاقات میں بھی نہیں۔

سُن تو لیا ہے حالِ دل، دیکھیے سُن کے کیا کہیں
پھر مرے منھ کی بات ہے کیسی ہی دلنشیں سہی

محبوب نے حالِ دل سُن تو لیا ہے لیکن پتہ نہیں اس کا جواب کیا ہوگا۔ کیونکہ غمِ دل کی روداد لاکھ مؤثر اور دلنشیں سہی مگر ہے تو ہمارے منہ کی بات۔ اس لیے اس میں اثر ہونا مشکوک ہے۔

دلِ زار پر کرم تیری رضا کے ہے سپرد
ایک نگاہ، اور اگر یہ بھی نہیں، نہیں سہی

ہم تو تیری مرضی کے بندے ہیں۔ ہم تجھ سے صرف ایک نگاہ کے طالب ہیں اور اگر تجھے یہ بھی منظور نہیں تو پھر اس سے بھی دستبردار ہو سکتے ہیں۔

(۲۵۱)

مانا کہ بات وعدۂ فردا پہ ٹل گئی
اور بے وفا جو کل بھی نہ یہ آج کل گئی

آج ہم تمھارے کل کے وعدہ پر اعتبار کر تو لیں لیکن اگر کل بھی تم نے اسی طرح ٹال مٹول کی تو پھر؟

اس خانۂ خراب کی بربادیاں نہ پوچھ
یادش بخیر آہ بھی دل سے نکل گئی

ہمارے خانۂ دل کی ویرانی کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اب امیدوں کا تو کیا ذکر آہیں بھی اس کو چھوڑ کر رخصت ہوگئیں۔ ناامیدی کی انتہا یہ ہے کہ انسان آہ کرنا بھی چھوڑ دے۔ آہ نکل جانے سے شعر میں ایہام کا انداز آگیا ہے۔

تم کیوں گئے تھے آئنہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا جو شرم و شرارت میں چل گئی

اب تک محبوب اپنی اداؤں سے بے خبر تھا اور اس میں شوخی و شرارت کا انداز تھا۔ مگر جب اس نے آئینہ دیکھا تو احساسِ حسن کے ساتھ شرم کا انداز بھی شامل ہوگیا۔ گویا وہ شرم و شرارت کی کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ لیکن اس کا ذمہ دار وہ خود ہے کہ کیوں آئینہ کے سامنے بے حجاب ہوا۔ لڑکپن و جوانی کی نفسیات کی اچھی مصوری کی ہے۔

کچھ کہہ کے چارہ ساز نے تسکین دی تو ہے
سنتا تو ہوں کہ اب مری حالت سنبھل گئی

ہماری حالت کے بارے میں چارہ گر نے دوستوں کو کچھ بتا کر تسکین دی ہے۔ اگرچہ معلوم نہیں کہ اس نے کیا کہا ہے۔ یہ بات یا تو مژدۂ صحت ہوسکتی ہے یا موت کی اطلاع۔ بہرحال دونوں صورتیں ہمارے لیے خوش خبری ہیں۔

آتی ہے خاکِ جادۂ ہستی سے بوئے دل
کس آرزو بھرے کی تمنا نکل گئی

جادہ = راستہ

آج زندگی کی راہوں کی خاک میں دل کی بو محسوس ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا امیدوں بھرا دل خاک میں مل گیا۔ فانی کے نزدیک محبت میں خاک ہو جانا ہی عاشق کی سب سے بڑی مراد ہے۔

دل کیوں شبِ فراق تڑپ کر ٹھہر گیا
کیوں اضطراب کیا تری صورت بدل گئی

ہجر کی رات میں دل تڑپتے تڑپتے خاموش ہو گیا ہے۔ دل کا پُرسکون ہونا اور اضطراب کا ختم ہونا شاعر کے نزدیک ممکن ہی نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ شاید دل نے بے چینی کے اظہار کا کوئی نیا طریقہ اختیار کر لیا ہے اور اب اضطراب کی شکل تبدیل ہو گئی ہے۔

ان گردشوں کو روک کہ دل خون ہو گیا
اے آسماں ٹھہر میری حسرت کچل گئی

آسمان کی گردشوں نے دل کے ارمانوں کو تو پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ دل میں صرف حسرتیں باقی تھیں سو دل کو کچل کر ان حسرتوں کو بھی ختم کر دیا۔ اب تو یہ گردش رُک جائے۔

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چنی، شاخ جل گئی

اس حقیقت کو کہ تعمیر ہی تخریب کا پیش خیمہ یا سبب ہے فانی نے اپنے ذاتی تجربہ کے ذریعہ بڑی خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے جب بھی کسی شاخ پر آشیانہ بنانے کا ارادہ کیا وہی شاخ بجلیوں کا نشانہ بنی۔ شاید آشیاں بنانے کی خواہش کا دوسرا نام ہی برق ہے۔ اسی بات کو غالب نے ایک فلسفیانہ انداز میں کلیہ کے طور پر یوں شعر میں کہا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اللہ رے نوکِ نشترِ غم کی لگاوٹیں
اک اک لہو کی بوند یہ ظالم مچل گئی

نشترِ غم کی نوک کو ہمارے دل سے ایسی لگاوٹ تھی کہ اس نے ضد کر کر کے ایک ایک قطرہ خون دل سے نکال لیا۔ عاشق کو اس پر ناز ہے کہ غم نے اسے اس قابل سمجھا۔

فانی کے دل سے آیۂ "لاتقنطو" کے بعد
زاہد وہ دلفریبیٔ حسنِ عمل گئی

آیتِ قرآنی ہے "لاتقنطو من رحمت اللہ" اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

فانی زاہد سے مخاطب ہیں کہ جب سے ہم نے یہ پڑھا ہے نیکیوں کی کشش ختم ہو گئی ہے اور ہم خدا کی رحمت کے بھروسے پر گناہ کرنے لگے ہیں۔

(۲۵۲)

موت بھی فرقت میں ٹل کر رہ گئی
آخری صورت نکل کر رہ گئی

جدائی کی تکلیفوں سے رہائی کی آخری صورت موت کی اُمید تھی لیکن موت بھی ہم سے دُور بھاگتی رہی۔

اہلِ دنیا حشر جس کو کہہ اُٹھے
وہ نظر کیا چال چل کر رہ گئی

جس کو ساری دنیا قیامت سمجھ بیٹھی وہ دراصل محبوب کی نگاہوں کا برپا کیا ہوا ایک فتنہ تھا۔

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ
طور پر اک شمع جل کر رہ گئی

طور اور عاشق کا دل دونوں محبوب (حقیقی) کی جلوہ گاہ ہیں۔ لیکن دل کو طور پر اس لحاظ سے فوقیت اور برتری حاصل ہے کہ طور پر تو حسن کی صرف ایک بجلی کوندی تھی لیکن دل میں اس کے حسن کے جلووں سے آج تک چراغاں ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کا جلوہ طور سے مخصوص نہیں۔ اس کی اصل جلوہ گاہ عاشق کا دل ہے۔

زندگی دوسری کروٹ تھی موت
زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

موت اور زندگی میں زیادہ فاصلہ نہیں۔ زندگی کی دوسری کروٹ کا نام موت ہے لیکن افسوس کہ ہم یہ فاصلہ بھی طے نہ کر سکے اور ہماری زندگی ایک کروٹ بدل کر رہ گئی۔ یعنی ہم موت اور زندگی کے درمیان کے حالت میں تڑپتے رہے۔

لب رہے نا آشنائے دردِ دل
آہ بھی دل سے نکل کر رہ گئی

ہم نے اپنے درد کو ہونٹوں تک نہ آنے دیا۔ اگر آہ بھی کی تو اس طرح کہ دل سے تو آہ نکلی مگر ہونٹوں تک نہ آپائی۔

چُن لیا تیری محبّت نے مجھے　　اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

محبوب نے اپنے غموں کے لیے ہماری ذات کو منتخب کیا اور دنیا دیکھتی رہ گئی یعنی غم کی جو دولت ہمیں ملی ہے کسی کے حصّے میں نہیں آئی۔

اب کہاں فانؔی وہ جوشِ اضطراب　　کیا طبیعت تھی سنبھل کر رہ گئی

جس اضطراب و بے چینی پر ہمیں ناز تھا وہ اب باقی نہیں۔ اب تو طبیعت پر ایک سکون سا طاری ہے۔

(۲۵۳)

مہر کی جو نگاہ تھی خنجرِ بے پناہ تھی
دردِ جگر کی ہر دوا دردِ مآل ہو گئی

محبوب نے ہمارے رنج و غم کے درماں واسطے ہم پر نگاہِ مہر ڈالی لیکن اس نے بھی خنجر کا کام کیا اور ہمارے زخم تازہ ہو گئے (قاعدہ ہے کہ ہمدردی سے تکلیف کا احساس بڑھتا ہے) گویا ہمارے لیے دوا بھی انجامِ کار درد ہی بن گئی۔

موت فراقِ یار میں در پئے انقلاب ہے
نیند جو کل حرام تھی آج حلال ہو گئی

فراق میں عاشق پر نیند حرام تھی۔ موت نے آکر اسے سُلا دیا۔ گویا اس نے ایک انقلاب برپا کر دیا کہ حرام کو حلال بنا دیا۔ نیند حرام ہونا محاورہ ہے۔ رعایتِ لفظی کی خاطر حلال کا لفظ لائے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ہجر میں آنکھ لگنا ممکن نہیں۔ موت ہی آنکھیں بند کر دے تو دوسری بات ہے۔

فرصتِ یک نظر کے بعد حوصلۂ دعائے وصل
کیوں دلِ قدر ناشناس اب یہ مجال ہو گئی

ہمارے بے ادب دل کی گستاخیاں دیکھو کہ محبوب کے دیدار کی اجازت ملنے کے بعد

اب اس کے وصل کی دعائیں مانگنے کی ہمت کر رہا ہے۔

میری وفا جفا فروش، گریہ تبسم آفریں
عشق کی ساری کائنات صرفِ جمال ہوگئی

ہماری دولت اور کل کائنات یا تو ہماری وفائیں تھیں یا آنسو۔ ہم نے یہ دولت محبوب کے حسن کی نذر کر دی ہے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ ہماری وفاؤں سے اس کی خوئے جفا میں ترقی ہوئی اور ہمارے آنسوؤں کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر تبسم آگیا ہے۔ اپنی وفا اور عجز اور محبوب کے غرور و ناز کا اظہار مقصود ہے۔

حُسن کی وہ لطافتیں، عشق کی وہ نزاکتیں
ہائے وہ زندگی جو اب خواب و خیال ہوگئی

شاعر تاسف کے ساتھ وہ زمانہ یاد کرتا ہے جب زندگی عشق کی بدولت دلکش و رنگین تھی اور حُسن کی لطافت و عشق کی نزاکت ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔

(۲۵۴)

اجل جو آئے تو اپنا بھی کام ہو جائے
تمام عمر کا قصّہ تمام ہو جائے

کاش موت آجائے تو ہمارا کام بن جائے اور زندگی بھر کی مصیبتوں سے ہمیں نجات مل جائے۔

نگاہِ ناز کا صدقہ نیاز مند ہیں ہم
کبھی قبول ہمارا اسلام ہو جائے

ہم بھی تیرے نیاز مندوں میں ہیں۔ تجھے اپنی بے نیازی و غرور کا صدقہ ہمارا اسلام بھی قبول کرے۔

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

محبت میں جان دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ نہ یہ محبت کے لیے لازمی ہے۔ بلکہ عاشق کی زندگی ایسی ہونا چاہیے جو موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہو اور جسے زندگی نہ کہہ سکیں۔

تری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام
الٰہی اپنی سحر کی بھی شام ہو جائے

شاعر خدا سے التجا کرتا ہے کہ تو نے ہر شام کی صبح پیدا کی ہے ہماری شبِ غم کو بھی سحر بنا دے۔ ایک اور شعر میں بھی فانی نے یہی بات کہی ہے:

فرمانِ سحر تیرا ہر شام پہ جاری ہے　　میری شبِ غم کو بھی تاکیدِ سحر فرما

(۲۵۵)

رہ جائے یا بلا سے یہ جان رہ نہ جائے
تیرا تو اے ستم گر ارمان رہ نہ جائے

ہم نہیں چاہتے کہ تیرے دل میں ستم کرنے کی جو حسرت ہے وہ باقی رہ جائے۔ تو مشقِ ستم جاری رکھو۔ خواہ اس میں ہماری جان جائے یا رہے۔ پہلے مصرعہ کے الفاظ میں جھول ہے۔ ”جان رہ جائے یا نہ رہ جائے“ کی جگہ ”جان رہ جائے یا جائے“ ہونا چاہیے تھا۔

جو دل کی حسرتیں ہیں سب دل میں ہوں تو بہتر
اس گھر سے کوئی باہر مہمان رہ نہ جائے

ہم نہیں چاہتے کہ کوئی حسرت ہمارے دل سے نکلے۔ یہ حسرتیں دل میں مہمان ہیں اور ہم ایسی بے مروتی نہیں کر سکتے کہ مہمانوں کو باہر نکال دیں۔ بنیادی تصور غم سے لگاؤ۔

اے سوزِ غم جلا دے اے دردِ خوں رلا دے
کچھ ان کی دل لگی کا سامان رہ نہ جائے

محبوب کو عاشقوں کے رلانے اور جلانے میں لطف آتا ہے۔ اسی لیے عاشق کی تمنا ہے کہ غم کی آگ اسے جلا کر خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دے تاکہ محبوب کی خوشی پوری ہو جائے۔

سب منزلیں ہوئیں طے، محشر ہے اور اے دل
یہ ایک رہ گیا ہے میدان، رہ نہ جائے

غمِ دنیا کے سارے مراحل تو سر کر لیے، ایک فتنۂ محشر رہ گیا ہے۔ اے دل اس کو بھی آزما کر دیکھ لے۔ مراد یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں جو بلائیں جھیلی ہیں اس کے بعد قیامت کی مصیبتوں کو اٹھانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

وہ جامِ کفر پرور بھر دے کہ مست کر دے
مستوں کے دل میں ساقی ایمان رہ نہ جائے

چونکہ عاشق محبوب کو خدا کا درجہ دیتا ہے اس لیے عشق کفر کے مترادف ہے۔ شاعر محبوب (ساقی) سے عشق کا ایسا جام طلب کرتا ہے جو اس کے دل کو عشق سے معمور کر دے اور ہر دوسرے خیال سے (یہاں تک کہ ایمان سے بھی) دل کو پاک کر دے۔

آ کر پلٹ نہ خالی اے مرگ جان لے جا
فانیؔ کے سر یہ تیرا احسان رہ نہ جائے

موت نے عاشق پر احسان کیا ہے کہ شبِ غم اس کی مزاج پرسی کو آئی ہے۔ عاشق اس کا احسان مند نہیں ہونا چاہتا اس لیے اپنی جان اسے نذر کرتا ہے۔ خواہشِ مرگ کا اظہار بالکل نئے انداز سے کیا ہے۔

(۲۵۶)

کیوں نہ نیرنگِ جنوں پر کوئی قرباں ہو جائے
گھر وہ صحرا کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے

عاشق کا گھر وحشت کی وجہ سے صحرا کی مانند اُجاڑ اور ویران ہے اور جب بہار آتی ہے اور جنون میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ گھر بھی زنداں بن جاتا ہے یعنی قید خانے کی طرح تنگ اور محدود محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس کی ویرانی اور تنگی چونکہ جنون کی کرشمہ سازی کے سبب ہے اس لیے

شاعر جنون کی اس جادوگری کی داد دیتا ہے کہ اس نے گھر کو کیا کیا شکلیں دے دی ہیں۔

برق دم لینے کو ٹھہرے تو رگِ جاں ہو جائے
فتنۂ حشر مجسم ہو تو انساں ہو جائے

انسان کی زندگی اور اس کی ہستی فتنوں اور بلاؤں کا مجموعہ ہے۔ فتنۂ حشر جب مجسم ہوا تو انسان کہلایا۔ اور اس کی شہ رگ جس پر زندگی کا دارومدار ہے دراصل برق کی ایک ٹھہری ہوئی شکل ہے یعنی بے چینی اور بے قراری اس کی سرشت میں شامل ہے۔ مراد یہ کہ انسان کو بلاؤں سے مفر نہیں۔

جوہر آئینۂ دل ہے وہ تصویر ہے تو
دل وہ آئینہ کہ تو دیکھ کے حیراں ہو جائے

دل کے آئینہ میں چمک تیرے حسن سے ہے۔ اور خود دل کی درخشانی اور صفا کا یہ عالم ہے کہ اگر تو بھی دیکھے تو حیرت میں پڑ جائے۔ یعنی حسن اور عشق دونوں ایک دوسرے کی زینت کا سبب ہیں اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم۔ شعر میں لطف یہ ہے کہ حیرانی خود آئینہ کی صفت ہے لیکن اس کی چمک محبوب کو حیران بنا دیتی ہے۔ گویا تماشا اور تماشائی میں فرق باقی نہیں رہتا۔

غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں
دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے

غم وہ دولت ہے جو صرف خوش نصیبوں کو ملتی ہے اور زندگی وہ بلا ہے جس کا علاج صرف موت ہی سے ممکن ہے۔

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا
عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

عشق اس معنی میں کفر ہے کہ خدا کے سوا دوسرے کا خیال دل میں رہتا ہے لیکن

اہلِ دل کے نزدیک عشق ہی اصلِ ایمان ہے کیونکہ یہ انسان کو وفا سکھاتا ہے اور عقل جو خدا کا اعتراف تو کرتی ہے مگر اس یقین سے محروم ہے جو عشق کو حاصل ہے گویا اس کی حیثیت ایک ایسے کافر کی ہے جو مجبوراً مسلمان ہو مگر دل سے قائل نہ ہو۔

ذرّہ وہ رازِ بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا
دشتِ وحشت ہے وہ ذرّہ جو بیاباں ہو جائے

اس شعر میں وحدت الوجود کے عقیدہ کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ تمام اشیا کی اصل ایک ہے۔ ذرّہ اور بیاباں میں بظاہر جزو اور کُل کا تعلق ہے لیکن حقیقت میں دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ذرّہ میں بیاباں کا راز مضمر ہے۔ جب تک یہ راز فاش نہ ہو ذرّہ ذرّہ رہتا ہے۔ اور جب یہ حقیقت کھل جائے تو ذرّہ ہی بیاباں بن جاتا ہے۔

غمِ محسوس وہ باطل جسے کہتے ہیں مجاز
دل کی ہستی وہ حقیقت ہے جو عریاں ہو جائے

حقیقت و مجاز بھی تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک کائنات میں حقیقت صرف ذاتِ الٰہی کی ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مجاز یا دھوکا ہے۔ شاعر کے نزدیک دل ذاتِ الٰہی (یعنی حقیقت) سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ ایک لطیفۂ الٰہی ہے اور عالم محسوسات کے تاثرات یعنی غم محض باطل ہے۔

خلد مے خانہ کو کہتے ہیں بقولِ واعظ
کعبہ بت خانہ کو کہتے ہیں جو ویراں ہو جائے

واعظ جنّت کی جن نعمتوں کا ذکر کرتا ہے ان میں شرابِ طہور بھی شامل ہے۔ گویا اس کے قول کے مطابق جنت بھی ایک شراب خانہ ہے۔ اسی طرح کعبہ جو خدا کا گھر کہلاتا ہے پہلے بتوں کا مرکز تھا جو ویران ہو کر کعبہ بن گیا۔ مراد یہ کہ رندی اور زہد، بت پرستی اور اسلام یہ سب ظاہر بیں نگاہوں کے قائم کیے ہوئے امتیازات ہیں۔ حقیقت بیں نظریں ان مظاہر سے گذر کر ہر چیز میں ایک حقیقت کارفرما دیکھ لیتی ہیں۔

سجدہ کہتے ہیں درِ یار پہ مر جانے کو
قبلہ وہ سر ہے جو خاکِ رہِ جاناں ہو جائے

اہلِ دل کے نزدیک محبوب کے در پر جان دینا سب سے بڑی عبادت ہے اور جو لوگ محبت کی راہ میں خاک ہو جاتے ہیں وہ قبلہ کی طرح قابلِ ادب و احترام ہیں۔

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فآنی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

کاش جلد وہ دن آئے جب ہم موت کے دامن میں سکون پا جائیں اور زندگی اپنے اس ظلم و ستم پر نادم ہو جو اس نے تمام عمر ہم پر کیے۔ فآنی کے اکثر مقطعوں کی طرح یہ بھی بے پناہ مقطع ہے اور اگرچہ پوری غزل آورد سے بھری ہوئی ہے مگر اس میں آمد اور اثر پایا جاتا ہے۔

(۱۵۷)

جس سمت نگاہِ یک نگر جائے   تو آئے نظر جدھر نظر جائے

یک نگر = ایک حقیقت کو دیکھنے والی۔

ہم چاہتے ہیں کہ تیرا جلوہ نگاہوں میں اس طرح سما جائے کہ جدھر نظر اُٹھائیں تیری ہی شکل دکھائی دے۔

اچھا ہے جو نالہ بے اثر جائے   کیوں میری بلا کسی کے سر جائے

عاشق تکلیف سے مجبور ہو کر نالے تو کر رہا ہے مگر نہیں چاہتا کہ ان میں اثر پیدا ہو اور اس کے غم سے کوئی اور (محبوب) بھی متاثر ہو۔

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا   ڈرتا ہوں کہ زخم دل نہ بھر جائے

عاشق کو محبت کے زخم اس قدر عزیز ہیں کہ وہ ان کا مندمل ہونا نہیں چاہتا اور ناخنِ غم کو دعوت دیتا ہے کہ اسے کرید کر تازہ کرتا رہے۔

جیتے بھی ہیں تم پہ مرنے والے   غم زہر نہیں جو کام کر جائے

محبوب عاشق پر طعنہ زن ہے کہ تم کیسے محبت کرنے والے ہو کہ اب تک زندہ ہو۔ عاشق کہتا ہے کہ محبت کرنے والے مر تو نہیں جایا کرتے۔ غم محبت زہر تو نہیں ہے جو عاشق کا کام تمام کر دے۔ مرنے والوں کا جینا زبان کا پُر لطف استعمال ہے۔ کام تمام کرنے کی جگہ "کام کر جائے" کہنے میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مر جائیں تو مشکل آسان ہو جائے۔

کر خوئے جفا نہ یک بیک ترک   کیا جانیے مجھ پہ کیا گذر جائے

ہم تیرے ظلم و ستم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر اب تو نے دفعتاً اس عادت کو ترک کر دیا تو نہ معلوم ہمارا کیا حال ہو۔ اگر جفا ترک کرنا ہے تو بتدریج کمی کر۔

اُٹھ جائے جدھر نگاہِ ساقی   نشتر رگِ ہوش میں اُتر جائے

ساقی کی مخمور نگاہیں جس سمت کو اُٹھ جاتی ہیں دیکھنے والوں کے ہوش رخصت ہو جاتے ہیں۔

فانی تو اور سکوں کی اُمید   دل اور تیرے جیتے جی ٹھہر جائے

جب تک دل میں دھڑکن باقی ہے اس وقت تک سکون ملنا ناممکن ہے اور جیتے جی دل کی دھڑکن کا ختم ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے سکون کی اُمید ہی عبث ہے۔

(۲۵۸)

ہوش رہے نہ دوش کا فکرِ مآل رہ نہ جائے
خلوتِ یادِ یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے

دوش = کل، عمر گذشتہ   مآل = انجام

دل میں محبوب کی یاد کے ساتھ کوئی دوسرا خیال نہیں رہنا چاہیے۔ عاشق کا دل یادِ محبوب کا خلوت کدہ ہے۔ ماضی کے غموں اور مستقبل کے اندیشوں کو بھی دل سے نکال دینا چاہیے۔

عشق ہے جب جنوں تو پھر شاد ہو اے دلِ حزیں
کوئی گلہ اُٹھا نہ رکھ، کوئی سوال رہ نہ جائے

دیوانہ کی کوئی بات قابلِ گرفت نہیں ہوتی۔ عاشق اپنے دل سے مخاطب ہے کہ جب محبوب کی نظر میں عشق دیوانہ پن ہے تو پھر تجھے آزادی ہے کہ جنون کی آڑ لے کر اس سے جو چاہے، شکایت کر اور جو چاہے مانگ۔ وہ تجھ پر خفا نہیں ہو سکتا۔ شاد عظیم آبادی کا شعر ہے:

دیوانہ بن کے اُن کے گلے سے لپٹ بھی جاؤ   کام اپنا کرلو شاد بہانہ بہانہ میں

وعدہ فریب ہے تو اور تند ہو اے ہوائے شوق
ہاں رہِ انتظار میں گردِ ملال رہ نہ جائے

محبوب کے وعدے اگر دھوکا ہیں تب تو ہماری ہوائے شوق کو اور بھی تیز ہونا چاہیے تاکہ اس کے جھوٹے وعدوں نے انتظار کی راہوں پر غم و ملال کی جو گرد ڈال دی ہے وہ اس ہوا سے اُڑ جائے۔ مراد یہ کہ محبوب کے وعدے چاہے سچ ہوں یا جھوٹ عاشق کو تو انتظار کی لذّت چاہیے۔ اسے محبوب کی وعدہ خلافی سے غمگین نہیں ہونا چاہیے۔

تابِ نظارۂ جلال حشر میں بخش کر مجھے
شانِ جمال بھی دکھا شانِ جمال رہ نہ جائے

محشر میں اللہ تعالیٰ کی شانِ جلال کا اظہار ہوگا۔ شاعر اس سے نہیں گھبراتا کیونکہ اسے یقین ہے کہ خدا ہی اس کا سامنا کرنے کی تاب بھی انسان کو دے گا۔ اسے ڈر یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صرف خدا کی شانِ جلال ہی سامنے آئے اور اس کا لطف و کرم جو صفتِ جمال کا مظہر ہے اِس سے محروم رہ جائیں۔ شاعر کا مقصد شانِ جمال کا نظارہ ہے جس کی خاطر وہ جلال و عتاب کو بھی برداشت کرنے پر تیار ہے۔

عجز اِدھر اُدھر غرور، دونوں غیور سے غیور
دامنِ مدعا سے دور دستِ سوال رہ نہ جائے

غیور = غیرت مند۔

محبوب میں غرور ہے اور عاشق میں عجز۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر غیرت مند ہیں۔ نہ وہ بن مانگے دے گا نہ عاشق دستِ طلب دراز کرے گا۔ ڈر ہے کہ کہیں اس خودداری کے پیچھے عاشق کا دستِ طلب مدعا سے محروم نہ رہ جائے۔

اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال
زخمِ جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے

اندمال = زخم کا بھرنا۔

عاشق کو اپنے تیر کا نشانہ بنا کر اب محبوب پشیمان ہے کہ کس طرح اس کے زخموں کا اندمال کرے۔ عاشق کو اس کی ندامت گوارا نہیں اس لیے کہتا ہے جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب انجام خدا پر چھوڑو اور ہمارے زخموں کی فکر کرنے کی بجائے اپنے تیر کو دیکھو کہ کہیں دل میں ہی نہ رہ جائے۔

جبر قبول عام کر، کارِ فغاں تمام کر
غیرتِ غم کو رام کر اُف کی مجال رہ نہ جائے

شاعر محبوب کو مشورہ دیتا ہے کہ اپنے عاشقوں کو جبر قبول کرنے آمادہ کرے اور نالہ و فغاں کی رسم کو ختم کر دے۔ پرستارانِ غم کو اپنی مرضی کا تابع کرے تاکہ تیری جفا پر کسی کو اُف کرنے کی مجال نہ رہے۔

نزع میں دادِ آہ دے، اب نہ حیا کو راہ دے
عہدِ کرم نباہ دے، پرسشِ حال رہ نہ جائے

محبوب کی شرم و حیا عاشق کی پرسشِ حال میں مانع رہی۔ مگر اب جبکہ عاشق کا آخری وقت ہے اب تو حیا کو چھوڑ کر اس کی محبت کا اعتراف کرلے۔ اس کی آہوں اور نالوں کی داد دے اور عہدِ کرم کو پورا کر دے۔

فانیٔ زار جاں بری عشق میں مصلحت نہیں
جانِ ودائعِ دل کے بعد ہو کے وبال رہ نہ جائے

عشق میں زندہ رہنا نہ صرف آدابِ عشق کے خلاف ہے بلکہ مصلحت کے بھی منافی ہے کیوں کہ دل کے چلے جانے کے بعد زندگی بھی وبال اور دو بھر ہے۔

(۲۵۹)

اے کاش شہادت کے ارمان نکل جاتے
قاتل کی نگاہوں کے تیور ہی بدل جاتے

کاش محبت میں ہمارا شوق شہادت پورا ہو جاتا تو محبوب کو ہماری وفا کا یقین آجاتا اور اس کے تیور بدل جاتے۔

آتے وہ تو فرقت کے دکھ کیا ہیں اجل کیسی
آئی ہوئی ٹل جاتی آئے ہوئے ٹل جاتے

اگر محبوب ایک بار ہمارے غم خانہ میں آجاتا تو ہماری آئی ہوئی موت ٹل جاتی اور فرقت کے سارے دکھ غائب ہو جاتے۔ شعر میں کوئی خاص بات نہیں۔

سر اب مجھے بھاری ہے صدقہ ترے خنجر کا
یہ بار اُتر جاتا جو وار سے تھے چل جاتے

محبت میں ہمیں اپنا سر بھی وبال معلوم ہو رہا ہے۔ تجھے اپنے خنجر کا واسطہ جو وار بھی تو کر سکتا ہے ہم پر آزما اور ہمیں اس بوجھ سے نجات دلا دے۔

(۲۶۰)

راز تھے میرے زخم ہائے جگر تو ذرا تم نے سی دیے ہوتے

محبوب خفا ہے کہ عاشق کے زخم جگر کی بدولت محبت کا راز دنیا پر عیاں ہو گیا۔ عاشق

ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے کہ اگر تم کو ایسی ہی راز داری منظور تھی تو تم نے ہی ذرا ان زخموں کو رفو کر دیا ہوتا۔ یعنی اگر تم اتنی غفلت نہ برتتے تو ہمارا حال بگڑ کر اس طرح محبت کی رسوائی کا سبب نہ بنتا۔

ضبط کا حوصلہ نکل جاتا   کچھ ستم اور بھی کیے ہوتے

محبوب کے ظلم و ستم ہمارے ضبط کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ وہ اور بھی ستم کرے تاکہ ہمارے ضبط کا امتحان ہو جائے۔

زندگی بے دلوں پہ تہمت تھی   مر نہ جاتے اگر جیے ہوتے

کون کہتا ہے کہ عاشقوں نے دل کے جانے کے بعد بھی زندگی گزاری۔ ان کی زندگی تو صرف ایک الزام تھی۔ اگر وہ محبت میں واقعی جیتے رہتے تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

کچھ سمجھ کر قفس میں اے صیّاد   چار تنکے ہی رکھ دیے ہوتے

کاش صیّاد سمجھ سے کام لیتا اور ہمارے قفس میں چار تنکے ہی لا کر رکھ دیتا۔ اس طرح ہماری حسرتِ تعمیر بھی نکل جاتی اور اس پہ بھی بے رحمی کا الزام نہ آتا۔

گُل دیے تھے تو کاش فصلِ بہار   تو نے کانٹے بھی چُن لیے ہوتے

شاعر فصلِ گُل سے شکایت کرتا ہے کہ تو نے ہمیں پھول تو دیے لیکن ان کے ساتھ کانٹے بھی تھے۔ تجھے پھول دینا تھے تو کانٹے تو نکال دیے ہوتے۔ یعنی ایسی خوشی جس میں غم کی آمیزش ہو، بے کار ہے۔

تھے بھر ان کے دیے ہوئے فانیؔ   اور صدمے اُٹھا لیے ہوتے

زندگی کے غم بھی محبوب ہی کا تحفہ ہیں۔ ان سے گھبرانے کے بجائے جتنے غم بھی ملیں دامن میں بھر لے۔

(۲۶۱)

تیغ و خنجر بھی جو بسمل نہیں ہونے پاتے   مر کے شرمندۂ قاتل نہیں ہونے پاتے

وہ عشاق جو محبوب کی تلوار سے شہید ہوتے ہیں انھیں مرنے کے لیے محبوب کا شرمندۂ احسان ہونا پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ عشاق جو جان دینے کے لیے تیغ اور خنجر کے محتاج نہیں انھیں خنجر قاتل کا احسان نہیں اُٹھانا پڑتا ہے۔ مراد یہ کہ عشق میں بے خنجر و تیغ جان دینا عاشق کے شایانِ شان ہے۔

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے پھرتے ہیں
بزمِ رنداں میں جو شامل نہیں ہونے پاتے

جو لوگ میخانۂ عشق میں داخل ہونے کی صلاحیت اور حوصلہ نہیں رکھتے وہ پھر کعبہ اور بت خانہ کی گلیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ مراد یہ کہ محبوب تک پہنچنے کا سیدھا راستہ عشق کی راہ سے گذرتا ہے لیکن اس کو اختیار کرنے کی ہمّت بہت کم لوگ رکھتے ہیں۔ دیر و حرم کی راہیں آسان ضرور ہیں لیکن یہ منزل کی طرف رہنمائی نہیں کرتیں۔

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

ہماری حالت اس ڈوبنے والے کی طرح ہے جس کو موجوں کے تھپیڑے بار بار ساحل پر پہنچانا چاہتے ہیں مگر بدنصیبی اس کا رُخ ساحل کی طرف نہیں ہونے دیتی اور وہ پھر ساحل سے دور کر دیتی ہے۔

دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں
درد جب تک نہ ملے دل نہیں ہونے پاتے

فانی نے نزدیک دل کی اہمیت درد کی وجہ سے ہے۔ اور اگرچہ دل تو ہر ایک کو مل جاتا ہے لیکن دلِ دردمند ایسی نعمت ہے جو سب کو نہیں عطا ہوتی۔

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں، منزل نہیں ہونے پاتے

اہلِ معرفت کی نزدیک دیر و حرم صرف نقشِ منزل ہیں منزل نہیں۔ یعنی یہ خدا کی طرف ہماری رہنمائی تو کرتے ہیں لیکن خدا کی جلوہ گاہ نہیں۔ اسی لیے شاعر محبوب سے ہی پوچھتا ہے کہ اب تجھے کہاں ڈھونڈھیں۔

بہت خوب صورت اور بلند پایہ شعر ہے۔

کوئی چٹکی سی کلیجہ میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

محبت کا درد جس کی خلش اور کسک ہر وقت ہم اپنے سینہ میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ خلش ہمیں تیری یاد دلاتی رہتی ہے اور ہم تیری یاد سے کسی وقت غافل نہیں ہونے پاتے۔ درد یادِ محبوب کا ایک ذریعہ ہے اسی لیے فانی کو عزیز ہے۔ شعر میں بے پناہ تاثر ہے۔

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

ہم محبت میں کامیابی کے خواہش مند نہیں۔ بلکہ وہ ارمان جن کا حصول ہماری کوششوں کی دسترس سے باہر ہے (یعنی ناکام ارمان اور حسرتیں) انھیں ہم اپنے محبوب کا خاص تحفہ خیال کرتے ہیں۔

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانیؔ
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

صوفیہ کے نزدیک یہ کائنات تجلّیٔ الٰہی کا عکس ہے۔ لیکن اس شعر میں فانیؔ کہتے ہیں کہ تجلّی بھی حسن کا ایک پردہ ہے۔ محبوب حقیقی کا حُسن ان تجلّیات سے بھی ماوراء ہے جن سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے حُسن کی خلوت میں خود اس کے جلووں کو بھی باریابی میسّر نہیں۔ اور کوئی تو کیا خود اس کا عکس بھی اس کے سامنے آنے کی مجال اور تاب نہیں رکھتا۔ اس شعر میں خدا کی یکتائی اور بے مثال ہونے کو بڑے دلکش اور تغزل کے رنگ میں پیش کیا ہے۔

(۲۶۲)

بے داد کے خوگر تھے فریاد تو کیا کرتے
کرتے تو ہم اپنا ہی کچھ تم سے گلا کرتے

تمھارے ظلم و ستم کے تو ہم اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اس کی شکایت کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اگر تم ہمیں اجازت دیتے تو ہم اپنے دلِ ناصبور ہی کی کوئی شکایت تم سے کر لیتے۔ یعنی محبوب کے ظلم و ستم بجا ہیں۔ ان پر بے صبری کا اظہار عاشق کی کمزوری ہے۔

تقدیر محبت تھی مر مر کے جیے جانا
جینا ہی مقدر تھا ہم مر کے بھی کیا کرتے

محبت کرنے والوں کی تقدیر میں موت نہیں بلکہ مر مر کے جیے جانا لکھا ہے۔ اس لیے ہم نے موت کی تمنا ہی نہ کی۔

مہلت نہ ملی غم سے اتنی بھی کہ حال اپنا
ہم آپ کہا کرتے اور آپ سنا کرتے

مسلسل غم و آلام نے ہمیں اتنی فرصت بھی نہ دی کہ اگر کوئی دوسرا غمگسار نہ تھا تو کم سے کم اپنی کہانی خود سے کہہ کر ہی کچھ غم ہلکا کر لیتے۔

جان اس پہ فدا کر کے نادم اسے چاہا تھا
تدبیر تو اچھی تھی، تقدیر کو کیا کرتے

ہم نے جان اس امید میں دی تھی کہ محبوب اپنے کیے پر نادم ہوگا اور ہماری وفا کی صداقت پر یقین کر لے گا۔ اس تدبیر کی کامیابی کا ہمیں پورا یقین تھا مگر تقدیر کی دشمنی نے اس تدبیر کو بھی کارگر نہ ہونے دیا۔ یعنی وہ نادم ہونے کے بجائے اور خفا ہے کہ ہم اس کے جور کی تاب نہ لا سکے۔

احباب سے کیا کہیے اتنا نہ ہوا فانؔی
جب ذکر مرا آتا مرنے کی دعا کرتے

ہم دوستوں کی کیا شکایت کریں۔ ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ہمارے لیے مرنے کی دعا ہی کرتے یعنی دعائے مرگ ہی ہمارے لیے سب سے اچھی دعا تھی۔

(۲۶۳)

قصۂ زیست مختصر کرتے   کچھ تو اپنی سی چارہ گر کرتے

مرضِ عشق کا علاج طبیبوں کے بس کا نہ تھا تو اتنا تو کر سکتے تھے کہ زہر دے کر مریضِ عشق کو زندگی کی کشمکش سے نجات دلا دیتے۔ مگر ان سے یہ بھی نہ ہوا۔

سچ ہے ہر نالہ کیوں رسا ہوتا
میرے نالے تھے کیوں اثر کرتے

اپنے نالہ و فریاد کی بے اثری پر طنز کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ہر نالہ رسا تو نہیں ہوتا۔ کچھ نالے ایسے بھی ضرور ہوتے ہیں جن میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہمارے حصہ میں ایسے ہی بے اثر نالے آئے ہیں۔ اگر ان کا اثر محبوب پر نہیں ہوا تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔

موت کی نیند سو گئے بیمار
روز کس شام کو سحر کرتے

بیمارِ غم تھک کر موت کی نیند سو گیا ہے۔ آخر وہ بھی کب تک محبوب کے انتظار میں جاگ جاگ کر راتیں کاٹتا رہتا۔

خود وفا کیا وفا کا بدلہ کیا
لطف احسان تھا اگر کرتے

ہم اپنی وفاؤں کو تو اس قابل نہیں سمجھتے کہ تم سے ان کا بدلہ طلب کریں۔ اگر تم مہربانی کرتے تو تمھارا احسان تھا۔ نہیں کی تو کوئی شکایت نہیں۔ عشق کا یہ بے غرض انداز میر کے بعد فانی کا ہی حصہ ہے۔

کر لیا تیرے نام پر سجدہ
اب کہاں قصدِ سنگِ در کرتے

ہم محبت کی اس منزل پر ہیں کہ سجدہ کے لیے تیرے سنگِ در کی بھی ضرورت نہیں رہی بلکہ جہاں تیرا نام آتا ہے ہم وہیں سجدہ کر لیتے ہیں۔

آس ہوتی تو اس سہارے پر
صبر ممکن نہ تھا مگر کرتے

محبت میں صبر یوں بھی ممکن نہیں۔ اگر محبوب سے وفا کی امید ہوتی تو اس سہارے پر صبر کر لیتے۔ مگر جب اس سے کوئی امید نہیں تو پھر کس لیے صبر کریں۔

کاش آئینہ ہاتھ سے رکھ کر
تم مرے حال پر نظر کرتے

محبوب کو اپنی آرائش سے اتنی فرصت نہیں کہ وہ ہماری طرف دیکھے۔ کاش وہ آئینہ کو چھوڑ کر کبھی ہمارے حال پر نظر کرے۔ اشارہ یہ ہے کہ ہماری حالت کو دیکھ کر بھی اسے اپنے حسن کی سحر کاریوں کا اندازہ ہو جائے گا اور آئینہ کی حاجت نہ رہے گی۔

طولِ رودادِ غم معاذ اللہ   عمر گذری ہے مختصر کرتے

غموں کی کہانی اس قدر طویل ہے کہ ساری عمر ہم اسے مختصر کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر یہ کہانی مختصر ہونا تھی نہ ہوئی۔ مراد یہ کہ زندگی کے رہتے غموں سے نجات ممکن نہیں۔ شعر کا اندازِ بیان قابل داد ہے۔

غم نے مہلت نہ دی کہ ہم فانیؔ   اور کچھ دن ابھی بسر کرتے

غموں نے ہماری زندگی کا خاتمہ کر دیا ورنہ ابھی کچھ اور دن جی لیتے۔

(۲۶۴)

ہم موت بھی آئے تو مسرور نہیں ہوتے
مجبورِ غم اتنے بھی مجبور نہیں ہوتے

غم فرقت کے دوران اگر کوئی چیز مریضِ غم کی خوشی کا باعث ہو سکتی ہے تو وہ موت ہے لیکن ہمیں غموں نے اس طرح گھیر لیا ہے کہ کوئی شے یہاں تک کہ موت کا خیال بھی ہمیں خوش نہیں کر سکتا۔

دل ہی میں نہیں رہتے آنکھوں میں بھی رہتے ہو
تم دور بھی رہتے ہو تو دور نہیں ہوتے

تم جس قدر بھی دور رہنا چاہو مگر ہم سے دور نہیں رہ سکتے کیونکہ تمھارے جلوے صرف دل ہی میں نہیں، ہماری آنکھوں میں بھی بسے ہوئے ہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے:

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ، پر یہ تو بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

پڑتی ہیں ابھی دل پر شرمائی ہوئی نظریں
جو وار وہ کرتے ہیں بھرپور نہیں ہوتے

محبوب ابھی تیر اندازی کے فن میں نو مشق ہے۔ اس کی شرمائی ہوئی نظریں عاشق کے دل کو نیم بسمل تو کر جاتی ہیں مگر ان کا وار بھرپور نہیں ہوتا۔

امید کے وعدوں سے دل کچھ تو بہلتا تھا
اب یہ بھی ترے غم کو منظور نہیں ہوتے

پہلے تیری فرقت میں ہم اپنے دل کو امید سے بہلا لیتے تھے مگر تیرے غم کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ یعنی اب دل میں کوئی امید باقی نہیں رہی اور صرف غم کی حکومت ہے۔

اربابِ محبّت پر تم ظلم کے بانی ہو
یہ ورنہ محبت کے دستور نہیں ہوتے

اربابِ محبّت پر ظلم کا بانی محبوب ہے اس لیے کہ اس سے پہلے محبّت میں عاشقوں پر ظلم کرنے کا دستور نہ تھا۔

کونین پہ بھاری ہے اللہ رے غرور ان کا
اتنے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے

مانا کہ غرور حسن کی ایک ادا ہے مگر تمھارا سا غرور بھی نہیں دیکھا کہ تمھاری نگاہ میں دونوں جہان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

ہے عشق ترا فانیؔ تشہیر بھی شہرت بھی
رسوائے محبّت یوں مشہور نہیں ہوتے

تشہیر = بدنامی۔ محبت کرنے والے رسوا تو ہوتے ہیں مشہور نہیں ہوتے مگر فانیؔ کا عشق اس کی شہرت کا سبب بھی ہے اور تشہیر (بدنامی) کا باعث بھی۔ یعنی فانیؔ جو عزّت ملی وہ کسی عاشق کو نصیب نہیں۔

کچھ بس ہی نہ تھا ورنہ یہ الزام نہ لیتے
ہم تجھ سے چھپا کر بھی ترا نام نہ لیتے

ہم کو اعتراف ہے کہ ہم نے تنہائیوں میں تم کو پکارا ہے۔ لیکن ہم اس کے لیے مجبور تھے۔ اگر ہمارا اپنے دل پر اختیار ہوتا تو اس بے ادبی سے باز رہتے۔ یعنی احتیاط عشق کا تقاضا ہے کہ محبوب کا نام کبھی لبوں پر نہ آئے۔

نظریں نہ بچانا تھیں نظر مجھ سے ملا کر
پیغام نہ دینا تھا تو پیغام نہ لیتے

اول محبوب نے عاشق سے نظریں ملائیں جس سے اس کو خیال پیدا ہوا کہ یہ بھی مجھ سے تعلق خاطر رکھتا ہے۔ لیکن جب عاشق نے اس کی طرف محبّت آمیز نگاہوں سے دیکھا تو وہ بالکل بے تعلق ہو گیا۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر تمھیں میرا پیغامِ محبّت قبول نہ کرنا تھا تو پھر لگاوٹ کا اظہار کیوں کیا تھا۔

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی
اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

محبوب خفا ہے کہ عاشق نے آہ کیوں کی۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر تمام عمر میں ایک آہ کر لی تو یہ کوئی ناقابلِ معافی جرم تو نہیں۔ کیا محبت میں سانس لینا بھی گناہ ہے۔ مراد یہ کہ عاشق کی تو سانسیں بھی آہ بن جاتی ہیں۔ جس کو محبوب آہ سمجھ رہا ہے وہ دراصل سانس ہی تھی آہ نہ تھی۔

اب مے میں نہ وہ کیف نہ اب جام میں وہ بات
اے کاش ترے ہاتھ سے ہم جام نہ لیتے

ایک مرتبہ محبوب کے ہاتھ سے شراب پینے کے بعد اب یہ عالم ہے کہ کسی اور کے ہاتھ سے شراب پینے میں کوئی لطف ہی نہیں۔

قابو ہی غمِ عشق پہ چلتا نہیں ورنہ
احسانِ غمِ گردشِ ایّام نہ لیتے

اگر غمِ عشق پر ہمارا اختیار ہوتا تو غمِ زمانہ کے احسان مند ہونے کی بجائے اس کو ہی اپنا لیتے۔ مگر کیا کریں کہ غمِ عشق پر ہمارا کوئی بس نہیں۔ یعنی غم سے مفر ممکن ہی نہیں۔ اگر کسی کو غمِ حیات کی جگہ غمِ دوست مل جائے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔

ہم ہیں وہ بلا دوست کہ گلشن کا تو کیا ذکر
جنّت بھی بجائے قفس و دام نہ لیتے

شاعر کی غم پسندی کا یہ عالم ہے کہ قفس کے بدلے میں دونوں جہان کے عیش و آرام بھی اسے منظور نہیں۔

خاموش بھی رہتے تو شکایت ہی ٹھہرتی
دل دے کے کہاں تک کوئی الزام نہ لیتے

جب ہم نے جرمِ محبت کا ارتکاب کیا ہے تو اب الزام سے بچنا ممکن نہیں۔ اگر ہم نے شکایت نہ بھی کی اور خاموش رہے تب بھی محبوب اس کو ملال و شکایت پر ہی محمول کرے گا۔

اللہ رے ترے دل کی نزاکت کا تقاضا
تاثیرِ محبّت سے بھی ہم کام نہ لیتے

محبوب اس قدر نازک مزاج ہے کہ وہ عاشق کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کے دل کو کسی طرح بھی متاثر کرنے کی کوشش کرے۔ آہ و فغاں اور شکوہ و شکایت کا تو کیا ذکر وہ اس کا بھی روادار نہیں کہ عاشق تاثیرِ محبت سے کام لے اور اس کے دل کو نرم کرے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم جہاں تک ہو سکا تمھاری طبعِ نازک کا پاس کرتے رہے لیکن اگر ہمارے جذبۂ محبت نے تاثیر دکھائی تو اس میں ہمارا کیا قصور!

تیری ہی رضا اور تھی ورنہ ترے بسمل
تلوار کے سائے میں بھی آرام نہ لیتے

محبت کی بے چینی مرکر بھی ختم ہونے والی نہ تھی۔ عاشق جو محبوب کی تلوار کے سایہ میں آکر خاموش اور پُرسکون ہوگیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے آرام آگیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ محبوب کی مرضی کا پاس کرکے خاموش ہوگیا ہے۔

اک جبر ہے یہ زندگیٔ عشق کہ فانیؔ
ہم مفت بھی یہ عیشِ غمِ انجام نہ لیتے

زندگی کے ہر عیش اور خوشی کا انجام غم ہے۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم کبھی اس کو قبول نہ کرتے مگر کیا کریں کہ یہ زندگی ہم پر جبراً لاد دی گئی۔

(۲۶۶)

نظر کے سامنے دل میں سما کے آئے تھے
وہ آپ اپنے تصوّر میں آ کے آئے تھے

محبوب کا تصوّر دل میں اس طرح بس گیا تھا کہ پھر عاشق کی نگاہیں بھی اس کے جلووں کو دیکھنے لگیں یعنی اس کا تصوّر مجسّم بن گیا۔

گداز عشق سے پہلے عطا ہوا تھا مجھے
وہ شمعِ بزمِ محبّت جلا کے آئے تھے

دل کی گداختگی اور گداز مجھے عشق سے پہلے ہی مل گیا تھا اور میرا دل سوزِ محبت کے قابل بن گیا تھا۔ محبوب نے میرے دل کو اپنا مسکن بنانے سے پہلے ہی اس میں محبت کی شمع جلا کر روشنی کر دی تھی۔ یعنی ساری کائنات میں صرف انسان کا دل ہی محبوب کے جلووں کا امین بن سکا کیونکہ اس میں جو گداز اور صلاحیت تھی وہ اور کسی چیز میں نہ تھی۔

انھیں انھی کی نگاہوں سے میں نے دیکھ لیا
مری نگاہ کا پردہ اٹھا کے آئے تھے

محبوب کا دیدار میں نے آنکھوں کے واسطے کے بغیر کیا ہے کیونکہ میری نظریں

(ظاہری وجود) تو اس کے حسن کا پردہ تھا۔ جب اس کے حسن نے اس پردہ کو اُٹھا دیا اور میرے اور اس کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہا تب میں نے اس کا جلوہ دیکھا۔ گویا میں نے اس کو اسی کی نگاہوں سے دیکھا۔ صوفیہ کے نزدیک ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ اسی وقت ممکن ہے جب عارف اپنی ہستی کو اس کی محبت میں فنا کر دے اور من و تو کا فرق مٹا دے۔

تمام عالمِ ہستی بنا گئے دل کو
تمام عالمِ ہستی پہ چھا کے آئے ہیں

محبوب کی تجلّی سارے عالم پر چھائی ہوئی تھی اور جب وہ میرے دل میں آیا تو اس نے دل کو بھی کائنات کی وسعت عطا کر دی۔ یعنی تجلّیاتِ الٰہی سارے عالم کی تخلیق کا سبب بنیں۔ اور ان تجلّیات کا سب سے بڑا مظہر انسان کا دل ہے۔

مجالِ دید ہی فانیؔ نہ تھی وہ آئے تو کیا
کسی پہ برقِ تجلّی گرا کے آئے ہیں

محبوب کے سامنے آنے سے میرے ہوش و حواس اس طرح منتشر ہو گئے جس طرح طور پر اس کی تجلّی دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کا حال ہوا تھا۔ مراد یہ کہ محبوب کے جلوے عاشق پر برق تو گرا دیتے ہیں مگر اس کا دیکھنا ممکن نہیں۔ اس کی ایک مثال طور ہے دوسرا دلِ عاشق۔

(۲۶۷)

ہم سے اے بے اثری ظلم یہ کیوں کر اُٹھے
آسماں ٹوٹ پڑے دستِ دُعا گر اُٹھے

دعاؤں کی بے اثری کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائیں تو بجائے سکون کے اور زیادہ بلائیں نازل ہوں۔ گویا آسمان ہم پر ٹوٹ پڑے۔ اس محرومی کو ہم کیسے برداشت کریں۔

بزمِ جاناں میں نہیں قابلِ شرکت دلِ زار
کہ یہ دیوانہ ہے کیا جانیے کیا کر اُٹھے

ہمارا دل محبوب کی بزم میں جانے کے قابل نہیں ہے۔ دل ٹھہرا دیوانہ۔ دیوانہ کا کیا اعتبار کہ دیوانگی میں کون سی بے حجابیات سرزد ہو جائے۔

ہے انھیں مدِّ نظر آج تماشا دل کا
درد سے کوئی یہ کہہ دے کہ سنبھل کر اُٹھے

محبوب آج دل کی بے چینی کا تماشا دیکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ذرا دردِ دل کو خبردار کر دو کہ آج سنبھل کر اُٹھے۔ ایسا نہ ہو کہ بے تابی حد سے گزر جائے اور محبوب کو ناگوار ہو۔ غم کی بے اختیاری میں بھی محبوب کی مرضی کا یہ خیال فانیؔ کے اشعار کا حُسن ہے۔

مدد اے بے خودیٔ دل، مدد اے دردِ جگر
ہاتھ سینے سے، نہ زانو سے مرا سر اُٹھے

عاشق کی بگڑی ہوئی حالت نے محبوب کا دل پگھلا دیا ہے۔ وہ اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر تسلّی کے لیے دل پر ہاتھ رکھے ہے۔ عاشق کی تمنا ہے کہ اس کے درد اور بے خودی کی یہی حالت رہے تاکہ محبوب کا ہاتھ اس کے سینے سے نہ اُٹھے اور اس کا سر محبوب کے زانو پر رہے۔ ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کاش ہمارا درد اس قدر بڑھ جائے کہ ہمارا ہاتھ سینے سے نہ ہٹ سکے اور سر کبھی زانو سے الگ نہ ہو۔ سر بہ زانو ہونا غم کی شدّت کو ظاہر کرتا ہے۔

موت کہتی ہے کہ للہ اٹھاؤ خنجر
نازکی کہتی ہے زنہار نہ خنجر اُٹھے

محبوب عاشق کے قتل کے لیے تیار ہے۔ موت کا اصرار ہے کہ جلد فیصلہ ہو جائے مگر محبوب کی نزاکت اسے خنجر اُٹھانے سے روک رہی ہے۔

جس جگہ بیٹھ گیا، بیٹھ گیا فانیؔ زار
اب تو شاید ترے کوچے سے وہ مر کر اُٹھے

فانیؔ کی ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ ایک بار جہاں بیٹھ جائے پھر اُٹھنا ممکن نہیں۔ تیرے

کوچے میں وہ آگیا ہے تو اب مر کر ہی یہاں سے اُٹھے تو اُٹھے۔

(۲۶۸)

اسیرِ غم وہ رُخِ بے حجاب کر کے مجھے   کدھر گیا ہمہ تن اضطراب کر کے مجھے

محبوب نے ایک بار اپنا بے نقاب چہرہ دکھا کر ہمیں مجسّم بے چینی و اضطراب بنا دیا اور اس کے بعد خود نگاہوں سے چھپ گیا ہے۔

شبِ فراق اجل سر پہ رکھ گئی احساں   امیدوارِ عنایاتِ خواب کر کے مجھے

جدائی کی رات موت نے ہمیں آرام کی نیند سُلا دیا۔ اس کا یہ احسان ویسے تو کبھی نہ لیتے مگر اس امید میں کہ شاید خواب ہی میں محبوب کا دیدار ہو جائے۔ ہم نے موت کا یہ احسان بھی گوارا کر لیا۔

تری جفا سے ہے بڑھ کر مری وفا کا شمار   وگرنہ تو ہی بتا دے حساب کر کے مجھے

ہمارے خیال میں تو ہماری وفائیں شمار میں تمھاری جفاؤں سے زیادہ ہیں۔ اگر تمھارا خیال اس کے برعکس ہو تو تم حساب کر کے بتاؤ۔ مراد یہ کہ نہ محبوب کی جفائیں شمار کی جا سکتی ہیں نہ میری وفائیں۔

(۲۶۹)

نہیں کہ وحشتِ دل چارہ گر نہیں ہے مجھے
جنونِ چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے

عاشق طبیب سے مخاطب ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے جنون نہیں۔ مجھے وحشتِ دل تو ہے ہی لیکن تیری طرح میں وحشتِ دل کے علاج کے جنوں میں مبتلا نہیں ہوں۔ مراد یہ کہ وحشتِ دل کا علاج ممکن نہیں۔ جو ایسی ناممکن بات کے درپے ہو وہ بھی پاگل ہے۔ ع

بڑی دیوانگی ہے ایک دیوانے کو سمجھانا

خرابِ لذّتِ جانکاہئ محبّت ہوں
مآلِ عشق سے قطعِ نظر نہیں ہے مجھے

جاں کاہی = جان لیوا تکالیف

ایسا نہیں ہے کہ ہمیں عشق کا انجام نہیں معلوم۔ ہم جو اس آگ میں کودے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تکلیفوں میں ہمیں بے اندازہ لذّت ملتی ہے۔

نہیں یہ مردنِ دشوار بے سبب یعنی
یقینِ مژدۂ پیغامبر نہیں ہے مجھے

قاصد محبوب کے پاس سے جو خوشخبری (غالباً وصال کی) لے کر آیا ہے اُس سے خوش ہو کر ہم نے جان دینی چاہی ہے لیکن جان دینے میں بھی دشواری پیش آ رہی ہے۔ اس دشواری کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ شاید ہمارے دل کو اس مژدہ کا یقین نہیں آیا ہے۔ اگر یقین آ جاتا تو دم بڑی آسانی سے نکل جاتا۔ ع : کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔

جنوں سہی اثرِ بے خودئ غم نہ سہی
تمہیں خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے

محبوب عاشق کی بے خودئ غم کو جنون کہہ کر اس کی تحقیر کر رہا ہے۔ عاشق بے خودی کے اس عالم میں ہے کہ اس پر بھی کچھ اثر نہیں لیتا بلکہ کہتا ہے کہ چلو تم ہی ٹھیک کہتے ہو۔ بقول غالب۔ ع : عشق ہم کو نہیں وحشت ہی سہی

نہ بارِ منّتِ ناخن نہ خطرۂ سوزن
مجالِ بخیۂ زخمِ جگر نہیں ہے مجھے

سوزن = سوئی بخیہ = سینا

عشق کی مجبوری کا یہ عالم ہے کہ ہمیں اپنے زخموں کو سینے کی بھی اجازت نہیں۔ مگر ہم اس سے بھی خوش ہیں کہ اب ہمیں ناخن کا یا سوئی کا احسان مند بھی نہیں ہونا پڑے گا یعنی

زخموں کو سیتے تو ناخنوں سے انھیں کریدتے اور پھر سیتے۔

یہ کیا ہے پھر کہ مجھے اک جہاں نظر آیا
خمارِ بادۂ وحدت اگر نہیں ہے مجھے

نظریۂ وحدت الوجود کے ماننے والوں کے نزدیک اصلی وجود صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے لیکن سوال یہ اُٹھتا ہے کہ یہ باقی کائنات پھر کیا چیز ہے۔ یہ سارا "ہنگامہ" کیا حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف فلسفی اس کی مختلف توجیہیں کرتے ہیں۔ کوئی کائنات کو حقیقت کا عکس کہتا ہے۔ کوئی اسے شیون الٰہی (IBEAS OF GOD) سے تعبیر کرتا ہے۔ فانی اسے صرف وہم خیال کرتے ہیں اور اس کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب بادۂ وحدت کا نشہ ہوتا ہے تب حسنِ ازل کے سوا کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔ لیکن جب اس نشہ کا اُتار ہونے لگتا ہے تو میری نظر میں عالمِ کثرت کا وجود بھی ابھر آتا ہے لیکن یہ بھی بادۂ وحدت ہی کے خمار کا نتیجہ ہے۔ خمار بھی ظاہر ہے کہ نشہ ہی کی ایک کیفیت ہے جس میں انسان کے احساسات پورے بیدار نہیں ہو پاتے اور اسے کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی نگاہوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں
تلاشِ چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

حقیقت نگر = حقیقت کو دیکھنے والی۔

سالکانِ راہِ حقیقت ایسی آنکھ کی تمنا کرتے ہیں جو حقیقت (ذاتِ الٰہی) کا براہِ راست مشاہدہ کر سکے اور مجاز کے دھوکے میں نہ آئے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے اس آنکھ کی جستجو نہیں کیونکہ مجھے تو حقیقت کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ عالمِ مجاز کہاں ہے۔

بقولِ فانی : جز ترے کچھ نظر نہیں آتا — آرزو بن گئی مجسم کیا

ہلاکِ تلخیٔ تاثیرِ شکوہ ہوں فانی
شکایتِ گلۂ بے اثر نہیں ہے مجھے

ہمیں اپنی فریاد کی بے اثری کا رونا نہیں بلکہ ہمیں فریاد کے پُرتاثیر ہونے نے برباد کر دیا

یعنی اس نے محبوب پر اس طرح اثر کیا کہ وہ ہم سے اور برہم ہوگیا۔

(۲۷۰)

عہدِ خرد میں عشق کی رسوائیاں نہ پوچھ
آنے لگی ہے ذکرِ وفا سے حیا مجھے

عقل کی دنیا میں عشق کو اس قدر بدنام و رسوا کیا گیا ہے کہ اب ہم محبت اور وفا کا نام لیتے بھی شرماتے ہیں۔

کیوں شوخیٔ کرم یہ ازل میں بجائے دل
بخشا گیا ستم کدۂ مدّعا مجھے

روزِ ازل سب کو تو دل عطا ہوئے لیکن ہمارے حصّے میں دل کے بجائے آرزوؤں اور تمنّاؤں کا ایک محشرستان آیا۔ تیرا یہ عطیہ اگرچہ کرم اور شوخی کی وجہ سے تھا لیکن ہمارے لیے ستم ثابت ہوا۔

ہوں وہ فریب خوردۂ رہبر کہ لاکھ بار
پلٹا کے لے چلا ہے مرا نقشِ پا مجھے

ہمیں رہبروں نے اس قدر فریب دیے ہیں کہ اب کسی پر بھروسہ نہیں رہا اور جدھر چلنے کو رہبر کہے اس کے مخالف سمت چلتے ہیں۔ چنانچہ بارہا آگے بڑھنے کے بجائے اپنے نقشِ قدم پر پیچھے لوٹ گئے ہیں۔

آئینہ تھا کہ نقش بدیوار ہوگیا
تم دیکھتے مجھے تو کوئی دیکھتا مجھے

تمھاری بے توجہی کی وجہ سے دنیا نے بھی ہم سے بے رخی کی اور کسی پر ہماری صلاحیتیں نہ ظاہر ہوسکیں۔ گویا ہم ایک ایسے آئینے کی طرح ہیں جو دیکھنے والوں کی بے توجہی سے دیوار پر بنے نقوش کی طرح دھندلا اور گرد آلود ہوجائے۔

(۲۷۱)

پا لیا ذوقِ طلب نے ماورائے دل مجھے
جب مجھے منزل نے کھویا، مل گئی منزل مجھے

عشق میں منزل اس وقت ملتی ہے جب انسان منزل کی تمنّا ختم کر دے اور دل کو خون کر لے۔ ہم نے دل کو مٹا کر آرزوؤں سے چھٹکارا پا لیا ہے اور عشق کے لیے جس ذوق طلب کی ضرورت ہے وہ ہمیں حاصل ہو گیا ہے۔

یادِ عہدِ بیخودی جب تو ہی تو تھا میں نہ تھا
وہ بھی دن تھے جب کوئی مشکل نہ تھی مشکل مجھے

عالم ہوش میں شاعر بے خودی کے اس دور کو یاد کر رہا ہے جب اسے محبوب کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ اپنی ہستی کا احساس تھا اور نہ اس کے لیے کوئی بات مشکل یا ناممکن تھی۔ بلکہ ہر کام آسان تھا۔

فطرتِ غم رفتہ رفتہ میری فطرت بن گئی
اضطراب دل ہے فانیؔ اضطرارِ دل مجھے

اضطراب = بے چینی
اضطرار = مجبوری یا بے بسی

ہم نے فطرتِ غم کو اپنی فطرت بنا لیا ہے اور اپنی زندگی کو غم کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ اب دل کا تڑپنا ہمارے لیے ایسا ہی لازمی ہو گیا ہے جیسے دوسروں کے لیے دل کا دھڑکنا۔ یعنی تڑپنے پر ہی ہماری زندگی کا دار و مدار ہے۔

(۲۷۲)

گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے
ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے

زندگی کی کوئی مسرت ایسی نہیں جس کا انجام غم پر نہ ہو۔ اسی لیے فانیؔ مسکراہٹ کو

خوشی کی علامت نہیں بلکہ دُکھوں کا ایک پردہ تصور کرتے ہیں اور پھولوں کے کھِلنے میں انھیں خزاں کی آمد کا پیغام سُنائی دے جاتا ہے۔

حد یہ جب پہنچی نظر، حدِّ نظر آگے بڑھی
جو نظر آیا زیادہ، کم نظر آیا مجھے

سفر ذہن کا ہو یا نظر کا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ انسان جس چیز کو حدِّ نظر سمجھتا ہے جب اُس تک پہنچتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ حدِّ نظر اور آگے ہے اور جو چیزیں دور سے بہت بڑی لگتی ہیں جب ان کی حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔

کس کو کہیے ماسوا، جب تو نہیں تو کچھ نہیں
تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے

جب اس کائنات میں تو ہی اصلِ حقیقت ہے تو پھر کوئی چیز تجھ سے الگ نہیں۔ تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ سارا عالم تجھ ہی سے ہے۔ تیری ذات سے واقفیت گویا سارے عالم سے واقفیت ہے۔ اسی لیے ہم کسی شے کو ماسوا نہیں کہتے اور تجھ سے الگ نہیں سمجھتے۔ اس شعر میں بھی نظریہ "ہمہ اوست" کی ترجمانی ہے۔

نوحۂ تدبیر تھا تقدیر کا ایک ایک حرف
خطِ پیشانی صفِ ماتم نظر آیا مجھے

پیشانی کی لکیریں جو قسمت کا لکھا کہلاتی ہیں فانی کے نزدیک ماتم کی صفیں ہیں جو تدبیروں کے ماتم کے لیے بچھائی گئی ہیں اور نوشتۂ تقدیر کا ہر حرف انسانی تدبیروں کے حق میں پیغام موت ہے۔ مراد یہ کہ تقدیر کے سامنے تدبیریں بے کار ہیں۔

جو تجھے سمجھا اسے دنیا سمجھ سکتی نہیں
راز تھا جو راز کا محرم نظر آیا مجھے

جس نے محبوب (اللہ تعالیٰ) کو دیکھا اور سمجھا ہے وہ خود دنیا والوں کے لیے ایک

معمہ بن جاتا ہے۔ گویا محبوب کی ہستی ایک ایسا راز ہے کہ جو لوگ اس راز سے واقف ہوتے ہیں وہ بھی ایک راز بن جاتے ہیں (اس کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں)

آں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

زخم کے مرہم بھی دیکھے، مرہم بے زخم بھی
زخمِ دل ہی زخم بے مرہم نظر آیا مجھے

دنیا میں ہم نے ہر زخم کے مرہم دیکھے۔ ایسے مرہم بھی دیکھے جن کے لیے کسی زخم کی حاجت نہیں یعنی جنھیں مرہم سمجھا جاتا ہے مگر جن سے کسی زخم کا علاج ممکن نہیں۔ ایک دل کے زخم ایسے دیکھے جن کا مرہم کہیں نہیں ملتا۔

میں نے فانی ڈوبتی دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

جب محبوب خفا ہوتا ہے تو ساری کائنات بے روح اور دم توڑتی محسوس ہوتی ہے۔ عاشق کی نفسیات کا بڑا خوبصورت اور سچا بیان ہے۔

(۲۷۳)

غم مجسّم نظر آیا تو ہم انساں سمجھے
برق جب جسم سے وابستہ ہوئی جاں سمجھے

غم کو مجسّم کر دیا گیا تو انسان کا وجود بنا اور دنیا کی ساری آفتیں اور بلائیں اس جسم میں شامل ہوئیں تو زندگی قرار پائیں۔ مراد یہ کہ انسانی ہستی کا خمیر ہی غموں اور بلاؤں سے ہوا ہے۔ ان سے مفر ممکن نہیں۔

شوق کی گرمیٔ ہنگامہ کو وحشت جانا
جمع جب خاطرِ وحشت ہوئی ارماں سمجھے

عشق کی شدت اور بیتابیٔ شوق کا دوسرا نام جنون ہے۔ اسی جنون کی ذرا ٹھہری ہوئی

شکل آرزوئیں اور ارمان ہیں۔ یعنی آرزوؤں کا حاصل کچھ نہیں۔ یہ بھی دیوانگی کے لاحاصل مشغلوں میں سے ایک ہے۔

حکمِ وحشت ہے کہ زنداں کو بھی صحرا جانو
دل وہ آزاد کہ صحرا کو بھی زنداں سمجھے

جنوں کا تقاضا ہے کہ زنداں کو بھی صحرا بنا دیں یعنی زنداں کی تنگی کو بھی صحرا کی وسعت اور ویرانی دیدیں۔ اور ہمارا دل ایسا آزاد فطرت ہے کہ اس کے لیے یہ قیود بھی ناگوار ہیں اور صحرا بھی اسے زنداں کی طرح تنگ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں مصرعوں میں عشق کی آزاد فطرتی کا اظہار ہے۔

فانیؔ اس عالمِ ظاہر میں سراپا غم تھا
چھپ گیا خاک میں تو ہم غمِ پنہاں سمجھے

فانیؔ جب تک زندہ رہا اس کی زندگی مجسم غم بنی رہی۔ مر کر بھی اس کے غم فنا نہیں ہو سکتے۔ یہ ضرور ہے کہ خاک میں پنہاں ہو کر یہ غم غمِ نہاں بن گئے ہیں۔ خیال رہے کہ غمِ پنہاں میں جو سوزش ہوتی ہے غمِ ظاہر میں نہیں ہوتی۔

(۲۷۴)

جس قدر چاہیے جلووں کو فراوانی دے
ہاں نظر دے تو مجھے فرصتِ حیرانی دے

کائنات میں ہر سمت محبوب کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں اور عاشقوں کو دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں لیکن انسان اپنی بے بضاعتی کے باعث ان جلووں سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ شاعر محبوب سے ملتجی ہے کہ تو چاہے اپنے جلووں کو اور بھی وسعت دے دے مگر مجھے بھی وہ طاقت دے کہ ان کے اثر سے عشق یا تحیر میں مبتلا ہو سکوں۔ اقبال کے اس شعر میں بھی اسی سے ملتا ہوا خیال ہے ؎

کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

ترجمانِ غمِ دل رنگِ شکستہ ہے نہ آہ
کون اس عہد میں اب دادِ زباں دانی دے

دل کے دو ترجمان یا تو آہیں ہوتی ہیں یا چہرے کی اُڑتی ہوئی رنگت مگر ہمارا غم اس قدر شدید ہے کہ یہ دونوں بھی اس کا پوری طرح اظہار نہیں کر پاتے۔ اب ہم کس سے امید کریں کہ وہ ہمارے غمِ دل کی ترجمانی کرے گا۔

وحشتِ تازہ کا نوروز مبارک اے عشق
پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عریانی دے

نوروز = بہار کا جشن جو ایران میں منایا جاتا ہے اور اس موقع پر شاہی دربار سے درباریوں کو خلعت عطا ہوتے ہیں۔

شاعر شاہِ عشق سے کہتا ہے کہ بہار کی آمد پر ہمارے جنون میں نیا جوش پیدا ہو گیا ہے۔ یہ گویا نوروز ہے۔ اس خوشی میں ہم کو بھی عریانی کا خلعت ملنا چاہیے۔ جوشِ جنوں میں جامہ دری کو خلعتِ عریانی سے تعبیر کیا ہے۔

پھر تجھے زحمتِ درباں، نہ مجھے شکوۂ غیر
میری قسمت کو جو تو خدمتِ دربانی دے

محبوب اگر اپنے دروازہ کی پاسبانی کا کام دربان کی بجائے ہماری قسمت کو سونپ دے تو زیادہ بہتر ہے۔ قسمت ہماری دشمن ہے وہ خانۂ محبوب میں داخل ہونے کی خوشی ہمیں کبھی نصیب نہ ہونے دے گی۔ اس طرح محبوب کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ اسے دربان رکھنے کی ضرورت نہ پڑے گی اور ہم دربان کی بدسلوکی سے بھی بچ جائیں گے۔ مراد یہ کہ محبوب سے دور رکھنے کے لیے ہماری بدنصیبی ہی کافی ہے۔ دربان کی کیا ضرورت ہے۔

خلشِ درد سے کم مایۂ غم ہیں محروم
جنسِ حرماں کو خدا عزتِ ارزانی دے

ابھی اہلِ غم دردِ محبت کی خلش سے پوری طرح لذّت آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ شاعر کی دعا ہے کہ جلد یہ نعمت ان کو عطا ہو جائے۔ کسی چیز کی ارزانی اس کی ناقدری کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن درد جتنا عام ہوگا اس کی قدر میں اضافہ ہوگا۔

ہے ہوس ہوش تو اس ہوش سے میں باز آیا
کاش پھر بے خبری مژدۂ نادانی دے

اہلِ ہوش کے نزدیک بے غرض محبت نادانی ہے اور مطلب کی محبت جس میں کوئی فائدہ ہو ہوش مندی کی علامت ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ اگر ہوس کا نام ہوش ہے تو میں ایسے ہوش سے باز آیا۔ اس سے تو مجھے اپنی نادانی زیادہ عزیز ہے۔

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یا رب
در و دیوار دیے، اب انھیں ویرانی دے

فانی کی غم پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ ویرانی اور تباہی کو سب سے بڑا انعام تصوّر کرتے ہیں اور خدا سے ملتجی ہیں کہ تو نے ہمیں گھر عطا کیا، یہ تیرا کرم تھا۔ اب اسے ویران کر کے اپنے کرم کی تکمیل کر دے۔

سُن کے افسانہ، دل پھر متبسّم ہو جا
گریۂ شوق کو پھر دعوتِ طغیانی دے

شاعر کی تمنّا ہے کہ اس کی آرزو اور محبوب کی بے نیازی ہمیشہ اسی طرح قائم رہے۔ وہ عاشق کا فسانۂ غم سُن کر اسی طرح مسکرا دے اور اس کی بے نیازی پر عاشق کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ پڑے۔

رہ نہ جائے کہیں دشواریٔ فانی باقی
اُس کی مشکل کو بھی اب رخصتِ آسانی دے

تو ہر ایک کی مشکل کو آسان کرتا ہے۔ فانی کی مشکل کو بھی آسان کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ

اس کی دشواریاں اسی طرح باقی رہ جائیں۔

(۲۷۵)

اِدھر نہ دیکھ مجھے بے قرار رہنے دے
مری نظر میں مرا اعتبار رہنے دے

شاعر نہیں چاہتا کہ محبوب اس کی طرف نگاہِ لطف سے دیکھے اور اس کی بیقراریوں کو ختم کرے کیونکہ یہ بے تابیاں اور بے قراریاں ہی اس کے وجود کا حاصل اور منشا ہیں۔ مراد یہ کہ زندگی کا اعتبار اور عظمتِ غمِ محبت سے ہے۔ یہ غم نہیں تو زندگی بے معنی ہے۔

بقیدِ حشر بھی عہدِ وفائے عہد نہ کر
خرابِ شوق کو اُمید وار رہنے دے

عشق کا لطف وصال میں نہیں بلکہ انتظار میں ہے۔ اس لیے عاشق نہیں چاہتا کہ محبوب قیامت کے روز بھی ملاقات کے وعدے کو وفا کرے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اُمید اور انتظار کی حالت میں رہنا چاہتا ہے۔

نویدِ زندگیٔ دل کی تاب سہل نہیں
ابھی کچھ اور مجھے سوگوار رہنے دے

نوید = خوش خبری۔

فانی کی غم پسند طبیعت کسی خوشی کی تاب نہیں لا سکتی۔ وہ محبوب سے کہتا ہے کہ ہمیں غمگین ہی رہنے دو۔ ابھی ہم میں کسی خوش خبری کو سننے کی تاب نہیں۔ ہمیں زندگیٔ دل کا مژدہ نہ سناؤ۔

یقینِ لطف میں گم کر نہ لذّتِ بیداد
جو ہو سکے تو غمِ انتظار رہنے دے

تیرے ظلم وستم میں جو مزا ہے وہ تیری مہربانیوں میں نہیں۔ اس لیے اچھا ہے کہ ہمیں تیرے لطف وکرم کا یقین نہ آئے اور ہم انتظار کی تکلیفوں میں مبتلا رہیں۔

دل معرفتِ شوق سے بیگانہ بنا دے
دیوانۂ ہشیار کو دیوانہ بنا دے

ہم عشق میں تکمیل کا درجہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں اور معرفت کے حصول کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ خواہش اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی ہم میں احساس موجود ہے اور ہماری دیوانگی میں بھی ہوش کا انداز پایا جاتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ محبوب ہمیں حقیقت میں دیوانہ بنا دے کہ یہ ہوش بھی باقی نہ رہے۔

ہر جلوۂ محسوس کو مرہونِ نظر کر
اس بزم میں ہر شمع کو پروانہ بنا دے

اس بزمِ کائنات کی ہر شے میں حُسنِ حقیقی کا ہی جلوہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ جلوے پوشیدہ ہیں اور نگاہوں کی دسترس سے دور۔ شاعر محبوبِ حقیقی سے التجا کرتا ہے کہ تو اپنے جلووں کو نمایاں کر کے نظروں پر آشکار کر دے تاکہ ہر چیز تیری شیدا ہو جائے اور تیرے حُسن کا پروانہ بن جائے۔

پھر اک نگہِ مست! کہ بے کیف ہے عالم
مے خانہ بہ یک گردشِ پیمانہ بنا دے

محبوب کی نگاہیں پیمانہ کی طرح ہیں۔ اگر وہ اپنی مست نگاہوں سے دیکھ لے تو ساری دنیا مے خانہ بن جائے اور دنیا پر چھائی ہوئی بے کیفی دور ہو جائے۔

آ اور دلِ برباد میں اک حشر بپا کر
جا اور دلِ آباد کو ویرانہ بنا دے

محبوب جب آتا ہے تو عاشق کے ویران دل میں ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا ہے اور اس کے جانے سے آباد دل ویرانے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شاعر کی خواہش ہے کہ اس کی آمد و رفت اسی طرح جاری رہے۔

حیرت کدۂ ناز میں دل بھی ہے نظر بھی
اب دوست جسے آپ سے بیگانہ بنا دے

دل اور نظر دونوں محبوب کے ناز و ادا کے تماشائی بن کر حیرت کدۂ ناز میں حاضر ہیں۔ اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ دونوں میں سے کس پر اس کی نگاہ پڑتی ہے اور کس کو بیخود بناتی ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کی ایک نظر عاشق کے دل اور نگاہ دونوں کو بے خود کرنے کو کافی ہے۔

یک رنگیٔ دل لازمِ صد رنگِ جنوں کر
کعبہ کی بِنا ڈال کہ بُت خانہ بنا دے

کعبہ میں ایک خدا کی پرستش ہوتی ہے اور بُت خانہ میں متعدد معبودوں کی مگر اہلِ دل کی نگاہ میں کعبہ و بت خانہ میں کوئی فرق نہیں اور عاشق الٰہی کو ہر جگہ محبوب کا ہی جلوہ نظر آتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ طالب اپنے کو محبت کے رنگ میں رنگ لے تب کعبہ و بُت خانہ کا فرق مٹ جاتا ہے اور کثرت میں بھی وحدت نمایاں رہتی ہے۔

قربان تیری شانِ حکیمانہ پر ہر بات
اب بات بہ اندازِ کریمانہ بنا دے

شاعر خدا تعالیٰ سے مخاطب ہے کہ تیری ہر بات میں کوئی حکمت و مصلحت ہوتی ہے اسی لیے ہم ہر چیز کو تیری شانِ حکیمی کا اظہار سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں لیکن اب تو اپنی شانِ کریمی کا اظہار کر دے اور ہماری بگڑی کو بنا دے۔ مراد یہ کہ زندگی کی کامیابیاں خدا کی رحمت و کرم ہیں اور پریشانیاں و غم اس کی مصلحت۔

اک بوند لہو کی ہے تو یہ حال ہے دل کا
وہ موجِ تبسم کہیں دریا نہ بنا دے

دل جو ایک قطرۂ خون ہے اس نے یہ ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اگر اس میں محبوب کے حُسن کی موجیں بھی شامل ہو گئیں تب تو یہ قطرہ دریا بن جائے گا۔ یعنی محبت دل کی وسعت

کی بھی ضامن ہے اور اسی کے سبب دل پر طوفان بھی آتے ہیں۔

افسانۂ دل یوں کوئی سنتا نہیں فانیؔ
اب موت کسی دن مجھے افسانہ بنا دے

محبوب یوں تو ہماری داستانِ دل سننے کو تیار نہیں اور اسے ہماری محبت کا اعتبار نہیں۔ جب موت ہماری زندگی کو ایک بھولا ہوا افسانہ بنا دے گی تو شاید وہ اس پر یقین کرے گا۔

(۲۷۷)

مجبوریٔ مشکور کی تصویر دکھا دے
اے دستِ کرم پردۂ تدبیر اُٹھا دے

انسان تقدیر کے آگے مجبور و بے بس ہے لیکن اس کو تدبیر کرنے پر آمادہ کر کے اس کی مجبوریوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ محبوب (اللہ تعالیٰ) اس پردہ کو ہٹا کر اس کے پیچھے چھپی ہوئی مجبوری کو بے نقاب کر دے تاکہ اسے تدبیروں کے فریب سے نجات مل جائے اور وہ اپنی مجبوری پر شاکر ہو کر رہ سکے۔

حد کفرِ غم ہوش کی ایماں سے ملا دے
اس ہستیٔ موہوم کو توفیق بنا دے

فانیؔ کے نزدیک بے خودی و خود فراموشی اصلِ ایمان ہے اور ہوش کا غم کفر ہے کیونکہ اس میں بے خودیٔ عشق کا انکار لازم آتا ہے۔ وہ محبوب سے التجا کرتا ہے کہ اس کفر کی حدیں ایمان سے ملا دے یعنی مجھے بے خودی محبت کا عرفان عطا کر دے تاکہ میری زندگی جو وہم سے زیادہ نہیں تیرے خیالوں سے ہم آہنگ ہو کر عظمت حاصل کر لے۔

آدابِ طلب سیکھ، طلب بے ادبی ہے
مجرم ہے وہ سائل جو درِ دل پہ صدا دے

عشق میں محبوب سے کوئی خواہش کرنا آدابِ عشق کے خلاف ہے۔ دل کی نگری میں

سوال کرنے والا مجرم سمجھا جاتا ہے۔ جو کچھ محبوب سے ملے اسے بخوشی قبول کر کیونکہ آدابِ الفت یہی ہیں۔

جو سوز محبت سے ہوا سرد وہ دل ہوں
وہ شمع ہوں جس کو پرِ پروانہ بجھا دے

سرد ہونا یہاں خاموش ہو جانے کے معنی میں آیا ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ آتشِ محبت کی شدت نے ہمارے دل کو سرد کر دیا ہے یا مٹا دیا ہے۔ گویا میں ایسی شمع کی مانند ہوں جس کو پروانے نے بجھا دیا ہو۔ رعایت لفظی کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں۔

نسبت کرمِ دوست سے آساں نہیں فانی
ناکام تو ہے ذوقِ تمنّا کو دعا دے

ہم اپنی آرزوؤں اور تمنّاؤں کے احسان مند ہیں کہ ان کی بدولت ہمیں محبوب سے نسبت تو حاصل ہو گئی۔ اگرچہ ہم اس کے کرم سے محروم ہیں مگر اس سے اُمیدواری کی نسبت تو ہے۔ یہ تعلق بھی کیا کم ہے۔

(۲۷۸)

یاد آ جاتے ہیں جب وہ اگلی صحبت کے مزے
لوٹتا ہے دل مرا دوزخ میں جنّت کے مزے

جب ہم گذری ہوئی ملاقاتوں کو یاد کرتے ہیں تو جدائی کی تکلیفیں بھی راحت بن جاتی ہیں اور ہمیں دوزخ میں بھی جنت کا لطف مل جاتا ہے۔

صبح ہوتے ہی بُھلا دے کوئی یا رب کس طرح
رات بھر باہم وہ شکووں کے شکایت کے مزے

محبوب سے ملاقات ہونے پر باہم جو شکوے شکائتیں ہوتی ہیں انھیں صبح ہوتے ہی بھلا دینا آسان نہیں ہے۔

جب کیا اظہارِ غم ظالم نے جھنجھلا کر کہا
آگے آگے دیکھنا تم میری چاہت کے مزے

اظہارِ غم پر متاثر ہونے کی بجائے محبوب الٹا جھنجھلا کر کہتا ہے کہ ابھی کیا ہے عشق کسے کہتے ہیں یہ تو تم کو اب پتہ چلے گا۔

اے اجل! گھبرائے گا تنہائی تربت سے دل
یہ ابھی بھولا نہیں ہے جوشِ وحشت کے مزے

ہمارا دل وحشت کے ہنگاموں کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ قبر کے پُر سکون اور خاموش گوشہ میں جنون کی ہنگامہ آرائی کی یاد اسے چین نہ لینے دے گی۔

ایک غم سو راحتیں، اک عشق سو کیفیتیں
یاس کی لذّت جدا کچھ اور حسرت کے مزے

عشق کی بدولت عاشق کو طرح طرح کے لطف میسّر آتے ہیں اور غم و یاس اسے الگ الگ مزہ دیتے ہیں۔

ہم ہیں اور بیتابیٔ دل، دل ہے اور دردِ فراق
وہ ہیں اور اللہ رکھے عیش و عشرت کے مزے

محبت کر کے ہمارا یہ حال ہے کہ ہر وقت بے چینی و بے تابی ہمارے ساتھ ہے مگر محبوب پر اس کا ذرا اثر نہیں اور وہ اپنے عیش و عشرت میں مست ہے۔

ربطِ حسن و عشق سے واقف نہ تھے تو چین تھا
واقفیت میں کہاں ناواقفیت کے مزے

حسن اور عشق میں جو ربط و تعلق ہے جب تک ہمیں اس کا علم نہ تھا ہم آرام سے تھے۔ اب جب سے اس کا علم ہوا ہے سارا لطف ہی جاتا رہا۔

کیا رفو کی داد مجھ سے چاہتا ہے چارہ گر
کھو دیے کمبخت تو نے سب جراحت کے مزے

چارہ گر نے ہمارے زخموں کا علاج کیا ہے اور اپنے اس کارنامہ پر نازاں ہو کر ہم سے

داد چاہ رہا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ اس نے ہمیں اس لطف سے محروم کر دیا جو زخموں کے ذریعہ ہمیں حاصل ہوتا تھا۔

جمع ہیں لاکھوں حسیں سب بے تکلّف بے حجاب
کیا ہی دلکش ہیں تماشائے قیامت کے مزے

قیامت کے میدان میں شاعر کو تماشہ کا لطف حاصل ہو رہا ہے کہ سارے حسین جنھوں نے عاشقوں پر ظلم کیے تھے اب اس طرح جواب دہی کے لیے جمع ہیں کہ انھیں نقاب یا حجاب کا بھی ہوش نہیں۔

ان سے رسم و راہ کیا جاتی رہی، جاتے رہے
خط کتابت کے مزے، صاحب سلامت کے مزے

محبوب سے تعلق کیا ختم ہوا کہ نامہ و پیام اور سلام دعا کا لطف ہی جاتا رہا۔

قبر پر آکر وہ فانیؔ "بے مروّت" لکھ گئے
مجھ سے پوچھے کوئی لفظِ بے مروّت کے مزے

عاشق کی موت کو محبوب اس کی بے مروتی پر محمول کر رہا ہے اور اس کی قبر پر "بے مروت" لکھ گیا ہے۔ اس شکایت کی تہہ میں جو اپنائیت اور لگاؤ ہے اس کی وجہ سے عاشق کو یہ الزام بھی عزیز ہے۔

(۲۷۹)

فرصت ہی نہیں کوئی گھڑی رنج سے غم سے
سو کام لگے ہیں دلِ ناکام کے دم سے

درد و غم ہماری زندگی میں اس طرح شامل ہو گئے ہیں کہ ایک لمحہ کی فرصت نہیں اور ہمارا دل جو ناکام ہو چکا ہے اب بھی اس کو سیکڑوں کام لگے ہیں غموں کو کام کہنا فانیؔ کی جدّت ہے۔

من جائیں اگر تم ہمیں جھوٹوں بھی منا لو
وعدہ سے، دلاسے سے، تسلّی سے، قسم سے

عاشق کی ناراضگی دیرپا نہیں ہوتی۔ اگر محبوب جھوٹ موٹ بھی کوئی وعدہ کرلے یا تسلّی دے دے تو وہ فوراً من جائے۔ شعر کا لطف یہ ہے کہ اپنے منانے کے لیے محبوب کو خود ہی طریقے بتا رہا ہے۔

کہتے ہیں جسے عشق وہ ایمان ہے اپنا
کچھ دیر سے مطلب نہ ہمیں کام حرم سے

ہم دیر اور حرم دونوں سے بے نیاز ہیں اور خدا کی محبت کو ایمان کا حاصل جانتے ہیں؛ محبت کے لیے کعبہ و بت خانہ کی قید ضروری نہیں۔ یہ وسیع المشربی تصوف کے راستہ سے اُردو شاعری میں آئی ہے اور اکثر شعراء کے یہاں اسی خیال کی گونج سُنائی دیتی ہے۔

(۲۸۰)

کسی کو کیا مرے سود و زیاں سے
گرے کیوں برق بچکر آشیاں سے

سود و زیاں = نفع و نقصان۔

بجلیاں گلشن میں ہمارے آشیانہ سے بچ کر کیوں گریں۔ ان کو کیا پرواہ ہے کہ ہمارا آشیانہ بچے یا رہے۔ بقول شاعر:

دریا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں لہے

کہ جب تو ہی باندھے دشمنی پر
تو پھر کیا شکوہ کیجے آسماں سے

جب محبوب ہی ہم سے دشمنی پر آمادہ ہے تو آسمان کے ظلم و ستم کی کیا شکایت۔ اس کا تو کام ہی ستم توڑنا ہے۔

مٹاتے ہیں خطِ تقدیر کو ہم
جبیں گھستے ہیں تیرے آستاں سے

اگر محبوب چاہے تو قسمت کے لکھے کو بدل دے اور ناکامیوں کو کامیابی سے بدل دے۔ ہم اسی اُمید پر اس کے در پر پیشانی رگڑتے ہیں کہ شاید تقدیر کا لکھا مٹ جائے۔

پچرا کر دل پلٹ جانا، مکرنا
یہ چالیں سیکھ لیں تم نے کہاں سے

محبوب دل لے کر مکر گیا ہے۔ عاشق کو اس کے بھولے پن کو دیکھ کر تعجب ہے کہ ایسی چالیں وہ کہاں سے سیکھ آیا ہے۔

بہت سر پیٹتی ہیں آرزوئیں   کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے

ہماری موت پر رونے والا کوئی نہیں۔ صرف ہماری آرزوئیں اور تمنائیں ہماری میت پر ماتم کر رہی ہیں۔

(۲۸۱)

کیا کیا نہ اس نے کام لیا اک حجاب سے
اکثر صفیں نظر کی الٹ دیں نقاب سے

محبوب کے حُسن کی برق پاشیوں کا یہ عالم ہے کہ نقاب میں سے بھی اس کا حُسن دیکھنے والوں کی نظروں کو گھائل کر دیتا ہے اور نگاہوں کی صفیں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ گویا اس کا حجاب بھی وہی کام کرتا ہے جو اس کا جلوہ کرتا ہے۔

دل کیا ہے پوچھ اپنے رُخِ بے نقاب سے
شاید نشانِ ذرّہ ملے آفتاب سے

جب سورج کی روشنی خاک کے ذرّوں پر پڑتی ہے تو ذرے چمک اٹھتے ہیں اور ان کی بے حقیقت ہستی جگمگانے لگتی ہے۔ عاشق کے دل کو محبوب کے حُسن سے وہی نسبت حاصل ہے جو ذرہ کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ اگر تم ہمارے دل کی حقیقت جاننا چاہتے ہو تو اپنے حُسنِ بے نقاب سے پوچھو۔ شعر کا خیال بھی نہایت بلند ہے اور انداز بیان بھی۔

جاتی ہے اے امید کہاں دل اُجاڑ کے
چل دے کوئی نہ اٹھ کے جہانِ خراب سے

امیدیں ہمارے دل سے رخصت ہو چکی ہیں۔ زندگی امید کے دم تک ہے۔ اب ہماری زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔

کل تک جو تم سے کہہ نہ سکا حالِ اضطراب
ملتی ہے آج اس کی خبر اضطراب سے

جب تک ضبط ہو سکا ہم نے ضبط کیا اور محبوب کے سامنے بھی اپنی بے چینی کا حال ظاہر نہ ہونے دیا مگر آج بے خودی و اضطراب نے یہ حال کر دیا ہے کہ کچھ کہنے کی حاجت نہیں اور بے چینی و اضطراب سے ہمارا حال سب پر ظاہر ہو گیا ہے۔

یا میرے بے شمار گناہوں سے در گذر
یا میرے عذر سُن کرم بے حساب سے

میرے گناہوں کا شمار اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے لیے صرف تیرے کرم کی ضرورت ہے، تو چاہے تو انھیں بغیر پوچھے ہی معاف کر دے اور چاہے تو کرم بے حساب سے کام لے کر میرے عذر کو قبول کر۔

اے آرزوئے دید وہ دن کیا ہوئے کہ دل
لبریزِ شکوہ تھا نگہِ کامیاب سے

ایک وہ زمانہ تھا کہ محبوب کے جلووں سے ہماری نگاہیں کامیاب تھیں اور دل کو نگاہوں کی خوش نصیبی پر رشک اور شکایت تھی۔ مگر آج اس کی دید سے محروم ہیں اور صرف آرزوئے دید باقی ہے۔

فانی جہانِ عشق میں ہوں لاکھ انقلاب
غم بدگماں نہیں اثرِ انقلاب سے

عشق کی دنیا میں خواہ کتنے ہی انقلاب کیوں نہ آئیں لیکن غمِ محبت پر ان انقلابات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ غم ایک ایسی پائدار حقیقت ہے کہ کوئی انقلاب اس کو متغیر نہیں کر سکتا۔

(۲۸۲)

مشتاق خبردار رہیں دل سے جگر سے
ملتی ہے زمانہ کی نظر ان کی نظر سے

آج زمانہ کی نظریں محبوب کی نظروں سے مل کر کچھ ساز باز کر رہی ہیں۔ عاشق ذرا اپنے دل و جگر سے ہوشیار رہیں یعنی اگر دونوں فتنے یک جا ہو گئے تو پھر عاشقوں کی خیر نہیں۔

منھ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کے اثر سے
خورشیدِ قیامت نے مرے دامنِ تر سے

تر دامنی گنہگاری کا استعارہ ہے اور غزل میں خورشید قیامت کی گرمی کے اثر سے مضمون آفرینی کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری تر دامنی (گناہوں کی کثرت) کا یہ عالم ہے کہ خورشیدِ قیامت بھی اس کو خشک کرنے سے معذور رہا اور آخر اس نے شرمندہ ہو کر میرے ہی دامن میں منھ چھپا لیا۔ بنیادی خیال، اپنے گناہوں کی کثرت کا احساس اور یہ یقین کہ اگر گناہوں پر ندامت ہے تو قیامت میں خورشید کی گرمی بھی کوئی ضرر نہ پہنچا سکے گی۔

یہ سایہ بھی اُٹھا میری اُمید کے سر سے
مُنھ موڑ لیا آہ نے دُنیائے اثر سے

ہم اس سہارے پر زندہ تھے کہ کبھی تو ہماری آہوں کی رسائی اثر تک ہوگی مگر آج ہماری آہوں نے خود ہی اثر کی طرف سے مُنھ پھیر لیا اور آخری سہارا بھی جاتا رہا۔

دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں
ملنے کو تو ملتی ہے نظر ان کی نظر سے

یوں تو اب بھی محبوب سے نگاہیں چار ہو جاتی ہیں لیکن اس کی نگاہوں میں اب وہ دلنوازی نہیں جو دل کا پیغام دل تک پہنچا دے۔

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے
سینہ میں دھواں خیر ہے اُٹھتا ہے کدھر سے

خدا خیر کرے آج سینہ سے یہ دھواں کیسا اُٹھ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج دل کی آگ میں وہ چیزیں بھی جل جائیں جو ہم نے بڑی احتیاط سے رکھ چھوڑی ہیں یعنی محبوب کے پیکاں کے

چیتھڑے اور پرانے زخموں کے ٹانکے۔ یعنی دل میں ان چیزوں کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ ڈر ہے یہ بھی نہ جل جائیں۔

امیدِ اثر اور اُن آہوں کو جو نکلیں
اللہ کا گھر پھونک کے اللہ کے گھر سے

آہوں نے ہمارے دل کو جلا کر خاک کر دیا ہے اور اب خدا سے اثر کی طالب ہیں لیکن دل کو جلا کر انھوں نے گویا خدا کے گھر کو جلایا ہے۔ اس گستاخی کے بعد یہ امید فضول ہے کہ ان آہوں کو خدا اثر سے نوازے گا۔

کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزمِ نوازش
لبیک کی آتی ہے صدا چاکِ جگر سے

لبیک = استقبالیہ کلمہ۔ مرحبا۔
ناوک = تیر

ہمارے زخمِ جگر آج پھر کسی جراحت تازہ کے منتظر ہیں اور ان سے لبیک کی آوازیں آ رہی ہیں۔ شاید پھر محبوب کے تیر ہمارے دل پر عنایت کا ارادہ رکھتے ہیں۔

عرفانِ محبت سے جُدا دل نہیں ہوتا
لیتے ہیں یہاں فالِ خبر ذوقِ خبر سے

جذبۂ محبت کا شعور اور عرفان ہی دل کی زندگی یا وجود کا ضامن ہے۔ ہمارے دل میں اس آگہی کا جو ذوق اور آرزو ہے اس کو ہم ایک فالِ نیک خیال کرتے ہیں کہ اس کی بدولت ہمیں دولت عرفان مل جائے گی۔ مراد یہ کہ محبت میں ذوق اور جستجو دل کی ہستی کی ضامن بھی ہے اور منزل کے یقین کی حامل بھی۔

بیکاریٔ وحشت میں ہم اے گریۂ وحشت
دیوار کی صورت کو ملا دیتے ہیں در سے

جنون کے عالم میں ہمارا شغل یہ ہے کہ آنسوؤں کی مدد سے گھر کی دیواروں کو اس طرح

منہدم کر دیتے ہیں کہ دیواریں دروازہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
روتی ہے گلے مل کے سحر شامِ سحر سے

مریضِ شبِ غم صبح ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو چکا ہے۔ اسے صبح کا ایسا انتظار تھا کہ اب صبح جو آئی ہے تو بجھتی ہوئی شمع سے (جو آمدِ صبح کی علامت بھی ہے اور مریضِ ہجر کی ہمدم بھی) گلے مل کر اس کا ماتم کر رہی ہے۔

(۲۸۳)

اک سرگذشتِ غم ہے کہ اب کیا کہیں جسے
وہ وارداتِ قلب، تمنّا کہیں جسے

محبت کی داستان ہمارے نزدیک دراصل غم ہی کی کہانی ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اب زندگی ہے نام اس اُمید دور کا
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

ہماری زندگی کا آسرا اور ہمارے ناکام اور ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا اب صرف وہ ایک امید ہے جو ہمارے بس میں نہیں بلکہ بہت دور کی اُمید ہے (یعنی اُمیدِ مرگ)۔

دل حاصلِ حیات ہے اور دل کا ماحصل
وہ بے دلی کہ جانِ تمنّا کہیں جسے

انسان کی زندگی کا دارومدار دل پر ہے اور دل کی ساری کائنات وہ بے دلی یا بے خودی ہے جو تمناؤں کا حاصل ہے اور عشق کی بنیاد۔

کیفیتِ ظہورِ فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دُنیا کہیں جسے

"تعرف الاشیاءَ بِاَضدادھَا" چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس اصول کے مطابق اس دنیا کی اصل صرف اتنی ہے کہ یہ فنا یا عدم کے ظہور کی ایک کیفیت ہے۔ یعنی ع : نیست نہ ہو تو ہست نہیں ہستی کی کیا ہستی ہے۔

فانی کا یہ مستقل فلسفہ ہے کہ وہ زندگی کو عدم کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

صحرا کا اجتہاد ہے ذرّہ کی ہر نمود
ذرّہ کا اعتبار ہے صحرا کہیں جسے

اجتہاد = نئی راہ نکالنا۔

ذرّہ اور صحرا یا دوسرے الفاظ میں جزو اور کل کے باہمی تعلّق کو ظاہر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ذرّہ اور صحرا میں فرق صرف یہ ہے کہ صحرا جس کی ہستی بے شمار ذرّوں پر منحصر ہے جب پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے تو ذرّے نمودار ہو جاتے ہیں اور صحرا کے بغیر ذرّے کا وجود معتبر نہیں۔ یعنی اس کی ہستی صحرا ہی کے تعلق سے قائم ہے۔

کیا قہر ہے لطافتِ دل پر گراں نہیں
وہ پیرہن غبارِ تمنّا کہیں جسے

دل چونکہ محبوب کی جلوہ گاہ ہے اس لیے وہ ایک لطیف اور اعلیٰ شے ہے۔ اس کے مقابلے میں خواہشیں اور تمنّائیں ایک غبار ہیں جو اس لطیف ہستی کو گرد آلود کر دیتی ہیں۔ شاعر کو حیرت ہے کہ دل کی لطافت نے تمنّا کے غبار کو اپنا پیراہن بنانا کیوں کر گوارا کر لیا ہے۔

کب تک رہینِ ذوقِ تماشا رہے کوئی
اب وہ نگاہ دے کہ تماشا کہیں جسے

رہینِ ذوق تماشا = دیدار کی آرزو میں گرفتار۔

شاعر نہیں چاہتا کہ عشق میں کسی کا احسان مند ہو۔ یہاں تک کہ وہ ذوقِ تماشا کا رہونِ منّت ہونا بھی نہیں چاہتا۔ وہ محبوب (خدا تعالیٰ) سے ایسی نگاہ کا طالب ہے جو خود تماشا ہو۔ یعنی اس میں محبوب کے جلوے سمائے ہوں۔

ہے اتّصالِ قطرہ و دریا پہ منحصر
وہ آبروئے قطرہ کہ دریا کہیں جسے

قطرہ دریا سے الگ ہوتا ہے تو بے آبرو ہو جاتا ہے یعنی اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ گویا دریا ہی قطرے کی آبرو ہے کیونکہ قطرہ جب دریا میں ملتا ہے تو اس سے الگ نہیں رہتا بلکہ اسی کا حصّہ بن جاتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک انسان اور خدا کی ذات میں بھی یہی نسبت ہے۔

دریوزۂ فنا میرے مسلک میں ہے حرام
در پردہ زندگی کا تقاضا کہیں جسے

دریوزہ = بھیک۔

ہمارے مذہب میں موت کی تمنّا بھی حرام ہے کیونکہ دراصل یہ بھی زندگی کی خواہش یا طلب ہے۔ یعنی موت کی تمنا کرنے والے کو اُمید ہوتی ہے کہ موت کے بعد اُسے ایک ایسی زندگی ملے گی جو موت کی قید سے آزاد ہوگی۔

فانیؔ سکوتِ موت نے دل سے مٹا دیا
وہ نقشِ بے قرار کہ دنیا کہیں جسے

دنیا کی زندگی حقیقت میں بے قراریوں اور گردشوں ہی کا نام ہے۔ دل کی بے قراری کا سبب بھی دنیا سے تعلّق ہے جس کی وجہ سے دل ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔ اس اضطراب کو اگر کوئی مٹا سکتا ہے تو صرف موت کا ہاتھ ہے۔ مراد یہ کہ زندگی اور سکون دو متضاد چیزیں ہیں۔

(۲۸۴)

دوری ہی پھر اچھی تھی نزدیکیٔ منزل سے
کشتی کو ملا ساحل، ٹکرا گئی ساحل سے

ہم وہ بدنصیب ہیں کہ کامیابی ہمیں راس نہیں آتی چنانچہ جب ہماری کشتی ساحل تک پہنچی
اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ ساحل سے دور رہتی اور کبھی منزل تک نہ پہنچ

شاید مرے مرنے کا دلچسپ نہ تھا منظر
آج ان سے مری حالت دیکھی گئی مشکل سے

محبوب ہمیشہ ہمیں تڑپا کر لطف لیتا تھا۔ لیکن آج نزع کے وقت اس سے بھی ہمارا تڑپنا نہ دیکھا گیا۔ شعر میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔

ایمانِ محبت کی بجھتی نہیں چنگاری
اٹھتا ہے دھواں اب تک خاکِ حرمِ دل سے

فانی کے نزدیک محبت ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا مسکن دل ہے اس لیے دل حرم کا مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محبت ایک ایسا ایمان ہے جو ایک مرتبہ حاصل ہو جائے تو پھر ہاتھ سے نہیں جاتا۔ چنانچہ ہمارا کعبۂ دل اگرچہ جل کر خاک ہو چکا ہے مگر محبت کی آگ ابھی تک نہیں بجھی اور اس راکھ سے اب بھی دھواں نکل رہا ہے۔

ہوتا نہیں اب ان کی محفل میں شمار اپنا
یوں بیٹھے ہیں ہم جیسے اُٹھ سے گئے محفل سے

محبوب کی محفل میں ہم بیٹھے تو ضرور ہیں لیکن اس طرح کہ یہاں کے بیٹھنے والوں میں ہمارا شمار نہیں اور ہمارے وجود کو ہر ایک اس طرح نظر انداز کیے ہوئے ہے گویا ہم یہاں ہیں ہی نہیں۔

وہ ہم سے کہاں چھپتے ہم خود ہیں حجاب[1] ان کا
محمل میں جو چھپتے ہیں چھپتے نہیں محمل سے

صوفیوں کے ایک گروہ کے نزدیک مجاز بھی دراصل حقیقت کا ایک پردہ ہے اس سے جُدا کوئی چیز نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا محبوب (اللہ تعالیٰ) لاکھ پردہ نشین سہی لیکن ہماری نظروں سے کیوں کر چھپ سکتا ہے کیونکہ جس طرح کوئی پردہ نشین محمل میں بیٹھ کر محمل سے نہیں چھپ سکتا اسی طرح

---

[1] اکثر دیوانوں میں حجاب کی جگہ "جواب" لکھا ہے لیکن جواب سے وہ معنی نہیں نکلتے جو حجاب سے۔

محبوب ہم سے نہیں چھپ سکتا۔ اس لیے کہ ہم اس سے جدا کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ہماری ہستی ہی وہ پردہ ہے جس نے اس کے حسن کو اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔

تجھ کو یہ خبر ہوگی ہم کو تو نہ تھی ناصح
پہلی ہی نظر اٹھ کر لڑ جائے گی قاتل سے

ناصح عاشق کو ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے تمھیں انجام عشق سے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا اس لیے اب شکایت بے سود ہے۔ عاشق جواب میں کہتا ہے کہ تم کو پہلے سے معلوم ہوگا مگر ہم تو یہ نہیں جانتے تھے کہ ایک ہی نظر میں ہم اس کا نشانہ بن جائیں گے۔

غربت میں غنیمت ہے اتنا بھی نشاں فانی
کچھ خاک کے ذرّے ہیں لپٹے ہوئے منزل سے

ہماری منزل تک پہنچنے کی تمنّا اس طرح پوری ہوئی ہے کہ ہماری خاک کے چند ذرّے منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ غربت کی مصیبتوں نے ہمیں اس طرح مٹا دیا کہ یہ چند ذرّے ہی ہماری ہستی کا نشان رہ گئے ہیں۔ لیکن ہم اس کو بھی غنیمت جانتے ہیں۔

(۲۸۵)

چونک پڑتے ہیں ذکرِ فانی سے
نیند اچٹتی ہے اس کہانی سے

محبوب ہم سے اس قدر بیزار ہے کہ ہمارے ذکر سے چونک جاتا ہے اور اس کی نیند ہماری داستانِ غم سن کر اُڑ جاتی ہے۔

تیری نامہربانیوں کی قسم
لاگ ہے دل کو مہربانی سے

لاگ = دشمنی

شاعر محبوب کی نامہربانی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ ہمیں تیری یہی ادائے نامہربانی عزیز ہے اور ہمارا دل مہربانی کا حریف ہے۔ یعنی ہمیں تیری جفائیں کرم سے زیادہ عزیز ہیں۔

ہم نے اپنا سراغ پا ہی لیا
آپ کی شانِ بے نشانی سے

محبوب کی ہستی بے نشان ہے اور اس کو پانا آسان نہیں۔ اسی طرح اپنی ہستی کا سراغ پانا بھی دشوار ہے لیکن جو عاشق محبوب کی بے نشانی کے راز سے واقف ہو جاتا ہے یعنی اس کا عرفان حاصل کر لیتا ہے وہ پھر اپنی ہستی کی تہہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ مراد یہ کہ عرفانِ حسن کے ذریعہ ہی انسان کو عرفانِ ذات کی منزل بھی مل جاتی ہے کیونکہ اس کی ہستی میں اور محبوب کی ذات میں کوئی فرق نہیں۔

حشر کو بھی ہے دور کی نسبت
چشمِ بد دور اس جوانی سے

محبوب کی جوانی کو قیامت کہنا شعراء کا عام طریقہ ہے مگر فانی کہتے ہیں کہ محبوب کی جوانی اس قدر قیامت خیز ہے کہ حشر کا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ صرف دور کی نسبت دونوں میں ہے۔

مژدۂ مرگِ ناگہاں کی پناہ
فتنۂ عمرِ جاودانی سے

عمرِ جاوداں ایک بلا ہے جس کے فتنوں سے بچنے کے لیے شاعر مرگِ ناگہاں کی پناہ کا طالب ہے۔

کاش میری زبان سے سنتے
اب جو سنتے ہو بے زبانی سے

عاشق کے مرنے کے بعد محبوب اس کی لاش پر آنسو بہا رہا ہے۔ عاشق آرزو کرتا ہے کہ کاش وہ پہلے مہربان ہو جاتا اور جو داستان میری لاش زبانِ حال سے اسے سنا رہی ہے وہ میں خود اسے سناتا۔

کچھ خبر بھی ہے روٹھنے والے
زندگی روٹھتی ہے فانی سے

تم کو خبر نہیں کہ تمہارے روٹھنے سے ہماری جان پر آ بنی ہے اور زندگی ہم سے روٹھی جا رہی ہے۔

(۲۸۶)

آہ سے یا آہ کی تاثیر سے
جی بہل جاتا کسی تدبیر سے

آہوں سے یہ مقصد نہیں کہ ان میں اثر ہی پیدا ہو۔ بلکہ یہ تو ہجر میں دل بہلانے کا ایک ذریعہ ہیں۔

اب سے غم سہنے کی عادت ہی سہی
صلح کر لیں لاؤ چرخِ پیر سے

جب آسمان ہمارا دشمن ہی ٹھہرا اور غموں کے علاوہ اس سے کچھ اور ملنے کی امید نہیں تو اس مسلسل جنگ سے کیا حاصل۔ کیونکہ نہ ہم غم سہنے کی عادت ڈال لیں اور آسمان سے صلح کر لیں۔

جبر کو کیوں کر نہ سمجھوں اختیار
تم نے باندھا ہے مجھے زنجیر سے

ہمیں اپنی زندگی کا جبر بھی اختیار کی طرح عزیز ہے کیونکہ ہماری مجبوری یا اسیری محبوب کی عطا کی ہوئی ہے۔ یہ رضا شیوگی فانی کے یہاں محبت کے اثر سے آئی ہے۔

کام اب اس تدبیر پر ہے منحصر
واسطہ جس کو نہ ہو تقدیر سے

جب تک تدبیریں تقدیر کی پابند ہیں ہمیں کامیابی کی امید نہیں۔ کامیابی کا انحصار اس تدبیر پر ہے جو تقدیر کی محتاج نہ ہو۔ یعنی کامیابی ناممکن ہے۔

اس نگاہِ ناز کا اللہ رے فیض
نسبتیں ہیں زخمِ دل کو تیر سے

محبوب کی نگاہوں نے عاشق کے دل پر ایسے زخم لگائے ہیں کہ دیکھنے والوں کو زخمِ تیر کا شبہ ہوتا ہے۔ یہ اس نگاہِ ناز کا احسان ہے کہ اس نے دل کو یہ نسبت عطا کی ہے۔

ہوشیار او چرخِ بے پروا خرام
بچ کے میری خاکِ دامنگیر سے

آسمان ہمیں خاک میں ملانا چاہتا ہے مگر اسے خبردار کر دو کہ ہمیں مٹا کر وہ بھی چین سے نہیں رہ سکے گا۔ ہماری خاک اس سے انتقام لے گی۔ مراد یہ کہ مظلوم کی آہ رائیگاں نہیں جاتی۔

عشقِ فانی اس پہ یہ اپنی بساط
کھیلتی ہیں بجلیاں تصویر سے

ہم اپنی زندگی کی بے بضاعتی اور بے حقیقتی کے باوجود عشق کا دم بھرتے ہیں جیسے کوئی کاغذ بجلیوں کی زد پر رکھ دیا جائے۔ عشق کو بجلی اور انسانی زندگی کو تصویر سے تشبیہ دی ہے۔

دادِ خود نمائی لے وحدتِ تمنّا سے
آئینہ طلب فرما کثرتِ تماشا سے

صوفیہ کے نزدیک اس عالم میں اللہ تعالیٰ کی ذات ایک واحد حقیقت ہے باقی جو چیزیں ہیں وہ اسی وحدت کے مختلف روپ یا جلوے ہیں۔ کثرت کے ان مظاہر کا وجود صرف اس لیے ہے کہ حُسن کو اپنا جلوہ دیکھنا مقصود تھا اور اس نے اسی مقصد کے لیے یہ آئینے تخلیق کیے۔ جس طرح حسنِ دوست یکتا اور یگانہ ہے اسی طرح عشق یا تمنا جو اسی کی پیدا کردہ ہے ہر صورت میں اسی کی طلبگار رہے اور وہ بھی یگانہ ہے۔ محبوب جب کثرتِ تماشا کے آئینوں میں اپنے حُسن کا نظارہ کرتا ہے تو وہ جذبۂ عشق یا طلب محض جو تمام عالم میں کارفرما ہے۔ اس کی خودنمائی کی داد دیتا ہے۔

اور ہو نہ ہو حاصل انتظارِ فردا سے
اُٹھ گیا محبت کا اعتبار دُنیا سے

محبوب کے وعدوں پر اعتبار کر کے ہم اس کے ایفاء کا انتظار کرتے رہے۔ اس سے ہمیں تو کچھ حاصل نہ ہوا اور محبت سے لوگوں کا اعتبار جاتا رہا اور اب کوئی کسی کے وعدے کا اعتبار نہیں کرتا۔

حشر میں وہ کیوں پوچھیں، کہہ نہ دوں جو نسبت ہے
شانِ بے نیازی کو آرزوئے رسوا سے

روزِ حشر اللہ تعالیٰ ہر مجبور کی داستان سنے گا اور اسے اس کی تکالیف کا بدلہ دلوائے گا۔ شاعر چونکہ خود اُسی کے عشق کا ستایا ہوا ہے اس لیے ڈرتا ہے کہ کہیں اس کی طرف سے حشر میں بھی بے نیازی کا اظہار نہ ہو اور اس کی داستانِ درد یہاں بھی محبوب تک نہ پہنچ پائے۔ اس لیے پہلے ہی اس تعلق کو ظاہر کر دینا چاہتا ہے جو عشق کی آرزوئے رسوا کو محبوب کی شانِ بے نیازی کے ساتھ ہے۔

عشرتِ تجلّی کی لذّتیں ذرا ٹھہریں
اکتسابِ غم کر لوں حُسنِ بے تماشا سے

اکتساب کرنا = سیکھنا۔

محبوب کے دیدار میں جو لطف ہے اس کے مقابلے میں فانی اس کی دوری کے غم کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے وہ نظارۂ جمال کی لذتوں سے کہتے ہیں کہ تم ذرا ٹھہرو۔ پہلے میں اپنا دامن اس غم محرومی سے بھر لوں جو محبوب کے نادیدہ حسن کی عنایت سے حاصل ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کی تجلی ہم جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں غمِ عشق اس قدر عزیز ہے کہ ہم نے خود اس کے جلووں کو پردے میں چھپا رکھا ہے تاکہ لذّتِ غم میں کمی نہ آئے۔

ان کی دل نوازی میں کوئی شک نہیں لیکن
ان کی دل نوازی کو لاگ ہے تمنّا سے

محبوب کی دل نوازی اور مہربانی میں کوئی شبہ نہیں لیکن وہ اپنے عاشقوں کو خواہشات سے بلند دیکھنا پسند کرتا ہے اور تمنا کا دشمن ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کی عنایتیں حاصل کرنے لیے دل کو خواہشات سے پاک کرنا ضروری ہے۔

لے ترا تصوّر بھی جا کے اب نہ آئے گا
رسمِ ہوش اٹھتی ہے عاشقی کی دنیا سے

شاعر کے نزدیک اگر وحشت میں محبوب کا تصوّر دل میں موجود ہے تو وحشت میں بھی ہوشیاری کا پہلو ہے۔ اسی لیے اس نے عشق میں تمام پُرانی رسموں کو خیرباد کہہ دیا ہے اور بیخودی میں اس حد تک گم ہو گیا ہے کہ محبوب کا تصوّر بھی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ بیخودی میں خود کو بھول جانا عام شیوہ ہے۔ فانی اس سے بھی آگے ہیں کہ محبوب کو بھی بھول گئے ہیں۔

اس نظر نے چُن چُن کر آج پھر مٹا ڈالا
اضطرابِ ناپیدا، پھر سکون پیدا سے

اضطرابِ ناپیدا = چھپا ہوا اضطراب   سکون پیدا = ظاہری سکون

محبت میں ہم بظاہر پُرسکون نظر آتے ہیں لیکن اس سکون کے پیچھے بھی ہزاروں بے چینیاں چھپی ہوئی ہیں۔ مگر آج محبوب کی نظروں نے اس طرح ہم پر وار کیے کہ یہ فرق بھی قائم نہ رہ سکا۔

قصّۂ جنوں اب تک یاد ہے مگر اتنا
انتہا ہے ذرّوں پر، ابتدا ہے صحرا سے

ابتدائے جنوں میں عاشق صحراؤں کی خاک چھانتا ہے اور محبوب کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن اس وحشت کی انتہا یہ ہے کہ صحرا کا ایک ایک ذرّہ اسے جلوۂ محبوب کا حامل نظر آنے لگتا ہے۔

اُس جگہ کو حاصل ہے اعتبار ساحل کا
حد جہاں پہ قطرہ کی مل گئی ہے دریا سے

جہاں قطرے کا جداگانہ وجود ختم ہو کر قطرہ دریا میں گم ہو جاتا ہے وہی مقام ہے جسے قطرہ کی منزل (ساحل) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ فنا کا یہ فلسفہ اُردو شاعری میں عام رہا ہے۔ غالؔب نے کہا ہے:

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

حُسن کی اداؤں کو دیکھ ہی لیا ہوتا
کام آپڑا فانیؔ عشق کارفرما سے

ہماری ساری زندگی عشق کے زیرِ اثر ہے اور عشق ہی ہماری زندگی کی کارفرما قوت ہے۔ ہم اس طرح فنا فی العشق ہوئے ہیں کہ دیدارِ دوست کی آرزو سے بھی بے نیاز ہیں۔ لیکن اگر اسے دیکھ لیتے تو بہتر ہی تھا کہ اس طرح ہمارے جذبۂ عشق کا ربط حسن کی اداؤں سے قائم ہو جاتا۔

کیا ہوا باندھی ہے صدقے نالۂ شبگیر کے
آسماں پر اکھڑے جاتے ہیں قدم تاثیر کے

ہمارے راتوں کے نالوں نے وہ شدت اختیار کی ہے کہ اثر کو ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہوا جا رہا ہے اور اس کے قدم اکھڑے جاتے ہیں۔ مراد یہ کہ نالوں نے اثر پر فتح پالی ہے۔

بے مروّت بن کے اب کیا سوئے صحرا جائیے
لوٹتے ہیں پاؤں پر حلقے مری زنجیر کے

جنون کا تقاضا ہے کہ صحرا کی خاک چھانی جائے لیکن پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیر روک دیتی ہے۔ اس خیال کو فانی اس طرح ادا کرتے ہیں کہ زنجیر ہمیں پاؤں پڑ کر روک رہی ہے اس لیے ہم ایسی بے مروتی نہیں کر سکتے کہ اس کی التجا کو رد کر کے صحرا کو چل دیں۔

ضبط باقی غم سلامت ہے تو سُن لینا کبھی
آہ گھبرا کر نکل آئی کلیجہ چیر کے

ہمارے دل میں غم اور ضبطِ غم کی جو کشمکش جاری ہے یہ اگر یونہی چلتی رہی تو دیکھنا ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب سینہ پھٹ جائے گا اور آہیں باہر نکل آئیں گی۔

وصل سے محروم میں ہوں ورنہ گستاخی معاف
بوسے لیتا ہے تصوّر آپ کی تصویر کے

تم ہمیں اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دیتے مگر تمھیں خبر بھی ہے کہ ہمارا تصور ہر وقت تمھاری تصویر کے بوسے لیتا ہے۔

مجھ کو مضطر دیکھ کر کہتا ہے قاتل پیار سے
آ ادھر سائے میں سو جا دامنِ شمشیر کے

محبوب کے نزدیک ہماری بے چینیوں کا صرف یہ علاج ہے کہ اس کی تلوار کے سائے میں سو جائیں۔ دوسرے مصرعے نے شعر میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ کہنے کا انداز روایتی ہے۔

ساتھ جائے گا مری میّت کے سامانِ خلش
دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں میں نے تیرے تیر کے

تمہارے تیروں کے پیکاں ہمارے دل میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کا نکلنا ممکن نہیں مر کر بھی یہ اسی طرح ہمارے دل میں رہیں گے اور ہمیں بے چین کرتے رہیں گے۔

میرے مرتے ہی دلِ بے تاب کو چین آ گیا
زندگی صدقہ میں اُتری گردشِ تقدیر کے

ہماری تقدیر میں جو پریشانیاں تھیں وہ زندگی کے ساتھ رہیں اور مر کر ہی انھوں نے چھوڑا۔ گویا ہماری زندگی گردشوں کے صدقہ میں اُتر گئی۔

سعئ درماں بے اثر، فکرِ دوا بے فائدہ
زخمِ دل اے چارہ گر قائل نہیں تدبیر کے

چارہ گر ہمارے زخمِ دل کے علاج کی بیکار کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہ زخم ہیں جو کسی تدبیر یا کسی کوشش سے بھر نہیں سکتے۔

یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہہ کر چلے
ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

یاس نے اس طرح دل پر قبضہ کیا ہے کہ ہمارے ارمان ہمارے برگشتہ مقدر کا ماتم کرتے ہوئے دل سے رخصت ہو گئے۔ یاس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اب ارمانوں کی دل میں گنجایش نہیں ہے۔

دیکھیے کیا ہو وہ اور آزردگیٔ بے سبب
ہم خطا ناکردہ خوگر عذرِ بے تقصیر کے

ہمارا اور محبوب کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ وہ تو بغیر کسی وجہ کے ہم سے خفا رہتا ہے اور ہم بغیر کسی خطا و قصور کے معافی مانگتے ہیں۔ دیکھیے اس محبت کا انجام کیا ہو۔

دیکھ فانیؔ وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

ہماری تدبیروں کی کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ بلکہ ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ کب تقدیر ان تدبیروں کو مٹا کر مٹی میں ملا دے۔

(۲۸۹)

سمائیں آنکھوں میں کیا شعبدے قیامت کے
مری نظر میں ہیں جلوے کسی کی قامت کے

ہم نے محبوب کے حسین قد کے فتنوں کو دیکھا ہے۔ اسی لیے قیامت کے فتنے ہماری نظروں میں نہیں سما سکتے۔ محبوب کے قد کو قیامت سے مثال دینا شاعری میں عام بات ہے۔

یہاں بلائے شبِ غم، وہاں بہارِ شباب
کسی کی رات، کسی کے ہیں دن قیامت کے

بے چینی و اضطراب کی بدولت ہماری راتیں قیامت بن گئی ہیں اور محبوب کے شباب و حسن نے اس کے دنوں کو قیامت بنا دیا ہے۔ قیامت کا لفظ عاشق کے سلسلے میں مصیبت کے اظہار کے لیے ہے اور محبوب کے لیے حسن کی فتنہ سامانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ستارے ہوں تو ستارے، نہ ہوں تو برقِ بلا
چراغ ہیں تو یہ ہیں بے کسوں کی تربت کے

تیرے برباد عاشقوں کی قبر پر کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں۔ یہ کام یا تو ستارے انجام دیتے ہیں یا ستارے نہ ہوں تو بجلیاں اس پر روشنی کرتی ہیں۔

اُلٹ دیا غمِ عشقِ مجاز نے پردہ
حجابِ حُسن میں کچھ راز تھے حقیقت کے

حُسنِ حقیقی نے اپنے جلووں پر مجاز کے پردے ڈال رکھے تھے اور رازِ حقیقت ان پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہم جو عشقِ مجاز میں مبتلا ہوئے تو یہ حسنِ حقیقی سے دوری کا باعث نہیں تھا بلکہ غمِ عشق نے ان پردوں کو ہٹا دیا اور مجاز کے پردوں میں چھپے ہوئے راز کو آشکار کر دیا۔ صوفیہ کا قول ہے : المجاز قنطرۃ الحقیقت۔ یعنی مجاز حقیقت کا پُل ہے۔

اُڑا لیے ہیں کچھ انداز موت نے فآنی
عتابِ یار کے، روزِ سیاہِ فرقت کے

موت اوروں کے لیے کتنی ہی خوفناک اور تکلیف دہ سہی، ہمارے نزدیک تو یہ محبوب کے غصے یا فرقت کی اذیتوں کے برابر بھی نہیں۔ ہاں کسی قدر اُن سے مشابہ ضرور ہے۔

(۲۹۰)

اُبھری ہوئی ہے چوٹ دلِ دردمند کی
رکھنا قدم تصوّرِ جاناں سنبھال کے

آج دل کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے ہیں اور ان کی خلش اس قدر بڑھ گئی ہے کہ محبوب کا تصوّر بھی دل میں نہیں آسکتا۔ نازک خیالی کی خوبصورت مثال ہے۔

کہتے ہیں جن کو عرفِ محبت میں داغِ دل
وہ نقش تو نہ ہوں ترے پائے خیال کے

جن کو عام لوگ دل کے داغ کہتے ہیں یہ درحقیقت محبوب کے خیال کے نقشِ پا ہیں جو اس کے گذرنے کے بعد دل پر جم کر رہ گئے ہیں۔

ہنگامۂ شباب ہے اے دل ذرا ٹھہر
جاتا ہے تو کہاں مجھے آفت میں ڈال کے

دل ایسے وقت میں عاشق کا ساتھ چھوڑ رہا ہے جب اس کے سینے میں جوانی کی آرزوؤں نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ وہ دل سے مخاطب ہے کہ ایسی مصیبت میں ہمیں چھوڑ کر تو کہاں جا رہا ہے۔

قربان ایک آمدِ دل پر ہزار غم
صدقے اس ابتدائے قیامت مآل کے

قیامت مآل = جس کا انجام قیامت ہو۔

شاعر غم کو ایک نعمت خیال کرتا ہے اور دل چونکہ غموں کی آماجگاہ ہے اس لیے دل کی آمد کو اپنے لیے سب سے بڑا انعام سمجھتا ہے اور اس پر ہزاروں غم نچھاور کرنے کو تیار ہے۔ دل کا وجود چونکہ غموں کے ہجوم کا پیش خیمہ ہے اس لیے اسے وہ ابتدائے قیامت مآل کہتا ہے یعنی ایسا آغاز جس کا انجام قیامت خیز ہو۔

(۲۹۱)

غم مٹا دیا غم کا لذّت آشنا کر کے
کیا کیا ستم گر نے خوگرِ جفا کر کے

محبوب نے مسلسل جفائیں کر کے ہمیں جفاؤں کا عادی بنا دیا لیکن ہمارے حق میں یہ اچھا نہ ہوا۔ غم ہماری سب سے بڑی دولت اور ہماری زندگی کا سرمایہ تھا لیکن جب غم سے ایذا کے بدلے راحت ملنے لگی تو گویا غم ہی مٹ گیا۔ محبوب کا ہم پر یہ احسان نہیں ظلم ہے۔

کہتے ہو وفا کی بھی ایک حد معیّن تھی
کس قدر پشیماں ہوں ترکِ مدعا کر کے

ہم عشق کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں دل میں کوئی آرزو اور مدعا باقی نہیں رہتا۔ مگر ہماری اس سپردگی کی قدر کرنے کی بجائے محبوب طعنہ دیتا ہے کہ بس تمہاری وفا کی یہیں تک حد تھی۔ ہمیں اپنے ترکِ مدعا پر پشیمانی ہے کہ اس کی بدولت ہم پر یہ الزام لگا۔

وہ مری شکایت پر چُپ کھڑے ہیں محشر میں
بُت انھیں بنا پایا اب خدا خدا کر کے

قیامت کے دن ہماری شکایتوں کا کوئی جواب محبوب سے بن نہیں پڑ رہا ہے اور وہ حیرانی کے عالم میں بُت بنا کھڑا ہے۔ اس طرح آج بڑی مشکل سے ہماری یہ تمنّا پوری ہوئی ہے کہ محبوب کو سامنے بٹھا کر ہم اس کی پرستش کریں۔ "بت بنا پانا" اور "خدا خدا کر کے" میں جو ایہام ہے اس نے شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ فانیؔ نے بڑے خوبصورت انداز میں پوری صورتِ حال کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

وہ مرے جنازے پر بعدِ مرگ آئے ہیں
مدعا ہوا حاصل ترکِ مدعا کر کے

ہم نے مر کر آرزوؤں سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ اب موت ہی کی بدولت ہماری آرزو بھی پوری ہوئی ہے کہ محبوب ہماری لاش پر آیا ہے۔ گویا جب آرزوئیں مٹ گئیں تب آرزوؤں کی تکمیل ہوئی۔

لذّتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی
دل ٹھہر گیا فانیؔ موت کی دعا کر کے

گفتنی = جو زبان سے ادا ہو سکے۔

مرنے میں جو لذّت ہے اس کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ جب ہی تو موت کی دعا کرتے ہی دل ٹھہر گیا ہے۔ دل کے ٹھہرنے میں سکون آجانا اور دل کا رُک جانا دونوں اشارے پائے جاتے ہیں۔

(۲۹۲)

کچھ ہوش گنوانے کے چرچے کچھ ہوش میں پھر آجانے کے
یہ دونوں عالم کچھ بھی نہیں، ٹکڑے ہیں مرے افسانے کے

یہ زندگی اور موت کے بعد دوسرا عالم ہمارے افسانۂ زندگی کے دو ٹکڑے ہیں۔ مراد یہ کہ زندگی کی کہانی اس مادی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ موت کی بے ہوشی کے بعد پھر سے ہوش میں آنا ہے۔

کچھ حیرت کے آثار سے ہیں، کچھ دل ٹھہرا سا جاتا ہے
وحشت سے گذرے جاتے ہیں انداز ترے دیوانے کے

عشق میں وحشت کے بعد دوسرا عالم حیرت ہے۔ ہماری دیوانگی بھی اب وحشت کی حدوں سے گزر کر مقامِ حیرت میں داخل ہوگئی ہے اور دل میں آشفتگی کی جگہ سکون اور ٹھہراؤ آنے لگا ہے۔

دل کی جو حقیقت ہے کیا کہیے، حسن بھی دل ہے عشق بھی دل
ہر شمع جلائی جاتی ہے پردے میں کسی پروانے کے

شاعر کے نزدیک اس کائنات کی اصل دل ہے یہاں تک کہ خود عشق اور حُسن بھی دل ہی کے جلوے ہیں۔ جس طرح پروانے کے دل میں جلنے والی محبت کی شمع اور شمعِ محفل میں کوئی فرق نہیں، اسی طرح حُسن میں اور دلِ عاشق میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ حسن کی ہر شمع کسی پروانے کے پردے میں روشن ہوتی ہے۔

بیداد یہ کہیے اُف نہ کریں، کہیے تو تڑپ کے دم دے دیں
کچھ شغل ہمیں بھی آتے ہیں سرکار کے دل بہلانے کے

عاشق کو محبوب کی خوشی اس قدر عزیز ہے کہ اس کی خاطر خوشی سے ہر غم برداشت کرنے کو بھی تیار ہے اور اس کی مرضی ہو تو تڑپ تڑپ کر جان دینے پر بھی آمادہ ہے۔

اک جادہ ہے غمِ دنیا کا، اک راہِ محبت ہے فانیؔ
ہر آفت کے دو رستے ہیں اور وہ بھی مرے غم خانے کے

غمِ محبت اور غمِ دنیا یہ دو راستے ہیں جن سے دنیا کی تمام آفتیں گذر کر آتی ہیں اور یہی

دور استے ہمارے گھر تک کے ہیں۔ مراد یہ کہ ہماری زندگی ہمیشہ مبتلائے غم و آلام رہی۔ کبھی یہ غم غمِ دنیا کے روپ میں آئے ہیں اور کبھی غمِ محبت کے۔

(۲۹۳)

نظر آج اُن سے رہ گئی مل کے
آخری کچھ پیام تھے دل کے

دمِ آخر عاشق کی نگاہیں محبوب سے ملیں تو ہٹ نہ سکیں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ درحقیقت وہ دل کے آخری پیغام نگاہوں کے ذریعہ اس تک پہنچانا چاہتا تھا۔

تو نے دیکھے ہیں اے نسیمِ سحر
کچھ فدائی تھے شمعِ محفل کے

شمع پر جان نثار کرنے والے پروانے اب محفل میں کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ ان کی خبر شاید نسیمِ سحر کو ہو، اسی سے دریافت کرنا چاہیے۔ اشارا یہ ہے کہ صبح دم پروانوں کی خاک بھی باقی نہ رہی۔ اس کو ہوا نے منتشر کر دیا۔

خلشیں تھیں ہمارے دم کے ساتھ
آج کانٹے نکل گئے دل کے

ہماری ساری مصیبتیں اور کلفتیں زندگی کے ساتھ تھیں۔ آج دم سینے سے نکلا تو اس کے ساتھ سارے کانٹے نکل گئے۔

پھول کو پھول جاننے والے
کل یہ چھینٹے تھے خونِ بسمل کے

باغ میں جو پھول نظر آرہے ہیں دراصل یہ وہ خون کے چھینٹے ہیں جو عاشقوں کے تڑپنے سے اِدھر اُدھر بکھر گئے ہیں اور محبوب ان کو پھول خیال کرتا ہے۔

تیز تر جادۂ وفا سے گذر
مٹ رہے ہیں نشان منزل کے

شاعر خود سے مخاطب ہے کہ وفا کی راہ سے تیزی سے گذر کیونکہ اس راہ میں منزل کے نشان مٹتے جا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ نشان بالکل مٹ جائیں اور منزل معدوم ہو جائے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا سے وفا کا وجود ختم ہوتا جا رہا ہے۔

مل بھی جاتے ہیں چھوٹنے والے
چھوٹ جاتا ہے یوں کوئی مل کے

زندگی میں جُدا ہونے والے پھر مل بھی جاتے ہیں لیکن تم ہم سے مل کر یوں جُدا ہوئے ہو کہ اب ملنے کی کوئی امید بھی نہیں۔

خاک ہے تو اسی گلی کی خاک
اللہ اللہ یہ حوصلے دل کے

دل کی بلند حوصلگی اور ہمت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خمیر میں محبوب کے کوچہ کی مٹی شامل ہے۔ مراد یہ کہ دل کو محبوب سے جو ربط ہے وہی اس کی عظمت و بلندی کا ضامن ہے۔

ان کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں
ان کی نظروں نے کیا کیا مل کے

محبوب سے نظر ملا کے ہمارا یہ حال ہے کہ ہمیں اپنے حال کی بھی خبر نہیں۔ ہمارے دل کی حالت کا علم ہوگا تو اس کی نگاہوں کو ہی ہوگا اور وہ ہی کچھ بتا سکتی ہیں۔

مرگِ فانی میں اب تو دیر نہ کر
سہل فرمانے والے مشکل کے

فانی خدا کے حضور ملتجی ہیں کہ تو ہر ایک کی مشکل آسان کرتا ہے۔ میری مشکل بھی آسان کردے اور جلد موت عطا کردے۔

(۲۹۴)

یوں چلے، گر جانبِ دلبر چلے
سر کے بل یا جائے، یا بے سر چلے

محبوب کے کوچہ میں جانے کے آداب یہ ہیں کہ یا تو قدموں کے بجائے سر کے بل چل کے جائے یا سر کو ہی نذر کردے۔

باغِ دنیا کوئی اپنا گھر نہ تھا
آئے تھے گل گشت کرنے، کر چلے

دنیا سے رخصت ہونے کا ان لوگوں کو کوئی غم نہیں ہوتا جو اسے ایک تماشا گاہ سمجھتے ہیں۔ ہم بھی تماشا کرنے آئے سے سو کر چلے۔ یہ ہمارا گھر تو نہ تھا جہاں سے جانے کا غم کریں۔

یہ تقاضا ہے ہوائے شوق کا   اس طرح چل جس طرح صرصر چلے

صرصر = آندھی۔

ہمارے جذبۂ شوق کا تقاضا ہے کہ محبوب کی سمت جائیں تو آندھی کی طرح تیزی سے جائیں۔ ہوا اور صرصر میں جو مناسبتِ لفظی ہے وہ ظاہر ہے۔

ہاں کوئی جادو جگاؤ آنکھ سے   ہاں کوئی چلتا ہوا منتر چلے

محبوب کی آنکھیں اس قدر سحرکار ہیں کہ وہ ہر دم اپنی نظروں سے کوئی جادو جگاتا رہتا ہے۔ شاعر محبوب کو دعوت دیتا ہے کہ اپنی نگاہوں سے پھر کوئی جادو جگاؤ اور کوئی کارگر منتر چلاؤ

خنجرِ قاتل کا شکوہ کیا کریں   جیتے جی ہم دل کے ہاتھوں مر چلے

ہم کو مٹانے میں محبوب کے خنجر کا کوئی قصور نہیں۔ قصوروار تو ہمارا دل ہے جس نے ہمیں محبّت میں مبتلا کر کے جیتے جی مار دیا۔

کر چکے تم پر فدا جانِ عزیز   ہم ادا حقِّ محبّت کر چلے

ہم نے محبت میں جان قربان کر کے محبّت کا حق ادا کر دیا ہے۔

کس خوشی سے ہم چلے سوئے لحد   بعد مدّت جیسے کوئی گھر چلے

انسان کا آخری ٹھکانا اور اصلی گھر قبر ہی ہے۔ اسی لیے ہم خوشی خوشی لحد کی طرف جا رہے ہیں۔

مل گئی فانیؔ محبّت کی سزا   دے کے دل ہم جان صدقہ کر چلے

ہم نے محبّت میں محبوب کو دل دیا۔ اس جرم کی سزا یہ ملی کہ ہم کو جان بھی دینا پڑی۔

کی وفا یار سے ایک ایک جفا کے بدلے
ہم نے گن گن کے لیے خونِ وفا کے بدلے

محبوب ہماری آرزوؤں اور وفاؤں کا قاتل ہے اور ہم پر جفائیں کرتا ہے۔ اس کا بدلہ ہم یوں لیتے ہیں کہ ایک ایک جفا کے بدلے میں اس سے وفا کرتے ہیں۔ عاشق کی مجبوری کو نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

کی سپردِ درِ بت خانہ اجل نے مری خاک
کس کو سونپا مجھے ظالم نے خُدا کے بدلے

عاشق کے دل میں بتوں کی جو تمنا تھی وہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کا خمیر بتخانہ کی خاک سے ہوا تھا۔ چنانچہ مرنے کے بعد اس کی خاک درِ بت خانہ کے ہی سپرد کر دی گئی اور

ع : پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مگر عاشق کو افسوس ہے کہ مر کر بھی وہ خدا سے دور ہی رہا۔ اور خدا کی بجائے بتوں کے سپرد کیا گیا۔

لطف، بیداد، حیا، غصّہ، تغافل، شوخی
رنگ کیا کیا نہ تلوّن نے ادا کے بدلے

محبوب متلوّن مزاج ہے اور ایک رنگ پر قائم نہیں رہتا۔ اس کی ادا میں کبھی ستم نمایاں ہوتا ہے تو کبھی حیا۔ کبھی غصّہ و تغافل تو کبھی لطف اور شوخی۔

ہائے میں کشتۂ انداز ہوں یا رب کس کا
حور آئی مجھے لینے کو قضا کے بدلے

ہم ایسے حسین کے عاشق ہیں کہ ہمارے لینے کو موت بھی حسین بن کر آئی ہے۔ موت بھیانک ہوتی ہے اور حوریں حسین۔

تیر سے، تیغ سے، خنجر سے، سناں سے مارا
کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے

محبوب نے ہمیں قتل کرنے کے لیے سارے ہتھیار آزمائے ہیں اور ہماری موت کے لیے کتنے ہی طریقے استعمال کیے ہیں۔ محبوب کی سفاکی اور اپنی سخت جانی کا اظہار مقصود ہے۔

کفن اے گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے

مردہ کو نیا کفن پہنانا عام قاعدہ ہے۔ شاعر اپنی خاکِ لحد کو ہدایت کرتا ہے کہ کہیں یہ کپڑے میلے نہ ہو جائیں۔ ذرا خیال رکھنا۔ شعر میں لکھنوی تکلف کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں۔

عشق اللہ بچائے وہ مرض ہے فانیؔ
زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

مرضِ عشق سے خدا پناہ میں رکھے۔ یہ وہ مرض ہے جس کی دوا سوائے موت کے اور کچھ نہیں۔

(۲۹۶)

دمِ نزع آ دیکھ انجامِ فرقت
جُدا ہو رہے ہیں جدا ہونے والے

تمھاری جُدائی نے ہمیں موت کے منھ میں پہنچا دیا ہے اور ہم دنیا سے جُدا ہو رہے ہیں۔ تم بھی آ کر جدائی کا یہ انجام دیکھ جاؤ۔

خدائی کے سر جھک گئے ان کے در پر
یہ کافر ہیں کیا جانے کیا ہونے والے

حسینوں کے در پر ساری خُدائی کے سر جھک گئے ہیں۔ خدا جانے یہ حسین اب کیا بننے والے ہیں۔ شاعر کو اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ اب خدا نہ بن جائیں۔ شعر کے سوالیہ انداز نے اس میں حسن اور معنویت پیدا کر دی ہے۔

کبھی تو مرے دردِ دل کی خبر لے
مرے درد سے آشنا ہونے والے

اگر تو ہمارے حال سے واقف ہے تو کبھی تو ہم پر توجہ کر اور ہماری خبر لے۔

مجھے موت کا آسرا دے رہے ہیں   مری زیست کا مدعا ہونے والے

محبوب جو ہماری زندگی کا مقصد و مدعا ہے وہ ہم سے اس قدر بیزار ہے کہ ہمیں موت کا آسرا دے رہا ہے۔

کوئی بے نیازی کی حد بندہ پرور   کسی کے ہو شاید خدا ہونے والے

بے نیازی خدا کی شان ہے۔ محبوب نے بھی یہی شان بے نیازی اختیار کر لی ہے۔ شاعر اس سے مخاطب ہے کہ بندہ پرور بے نیازی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عاشقوں کی پرستش پر مغرور ہو کر تم خدا بن بیٹھے ہو۔ "بندہ پرور" میں بھی یہ پہلو پوشیدہ ہے کہ یہ بھی خدا کی صفت ہے۔

(۲۹۷)

وہ میری لاش پہ تہمت سی کچھ اُٹھا کے چلے
مجھے قرار سے دیکھا تو مسکرا کے چلے

محبوب عاشق کی لاش پر آ کر اسے سکون سے سوتا دیکھتا ہے تو بدگمانی سے یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بے چینی ختم ہو گئی ہے اور محبت کا شعلہ بُجھ گیا ہے چنانچہ وہ طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا چل دیتا ہے لیکن اس کا یہ گمان عاشق پر محض ایک تہمت اور الزام ہے۔

یہ دل حریفِ تجلّی ہی کیوں بنایا تھا
کہ جب یہ نقشِ دوئی بن گیا مٹا کے چلے

صوفیہ کے عقیدے کے مطابق ابتداً ہستیٔ انسان ذاتِ الٰہی کا ہی حصّہ تھی اور دونوں کے درمیان کوئی دوئی نہ تھی۔ پھر جب حسنِ مطلق کو اپنے جلووں کے اظہار کی خواہش ہوئی تو اس نے جلوہ گاہ (کائنات) اور انسان کو تخلیق کیا۔ اس طرح انسان کی ہستی اس سے الگ اور اس کی تجلّی کی شاہد بنی۔ لیکن دوسری طرف یہ تجلّیات ہی اس کو فنا کی تعلیم بھی دیتی ہیں۔

عاشق اس سے کہتا ہے کہ اگر تم نے میرے دل کو اپنے جلووں کا مدِمقابل یا حریف بنایا ہی کیوں تھا۔ اب جب یہ تمھارے جلووں سے حریفانہ مقابل ہونے لگا تو اسے مٹائے دیتے ہو۔ اور چاہتے ہو کہ میں اس دوئی کو مٹا کر پھر تمھاری ذات میں گم ہو جاؤں۔

ادائے دعوتِ نظّارہ دیدنی ہے کہ وہ
مری نگاہ سے نظریں بچا بچا کے چلے

محبوب عاشق سے اس طرح بچ بچ کر چلتا ہے کہ عاشق اور بھی اس کی طرف متوجہ ہو۔ گویا اس کی ادائے تغافل دراصل عاشق کی نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ شعر میں نفسیاتی نکتہ ہے۔

مگر نمودِ مشیت وجود تھا اپنا
رضائے دوست کو ہم آئینہ دکھا کے چلے

صوفیہ کے نزدیک انسان کا وجود ایک آئینہ ہے جس میں حسنِ ازل نے اپنا عکس ڈالا ہے اور اپنے جلووں کو نمایاں کیا ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ ہماری ہستی مشیت الٰہی کے ظہور کا ذریعہ ہے۔ گویا ہم نے آئینہ بن کر رضائے دوست کو اس کا جلوہ دکھایا ہے۔

بلاکشوں کا تمھاری بلا کرے ماتم
جو غم اُٹھانے کو آئے تھے غم اُٹھا کے چلے

عاشقوں کے نصیب میں جو غم اٹھانا تھا وہ اٹھا چلے۔ ان بدنصیبوں کی موت کا غم تم کیوں کرو۔

کرم کیا تو بہ اندازۂ تبسّمِ برق
وہ کچھ خیال میں آئے ہی تھے کہ آ کے چلے

اول تو محبوب ہمارے خیال میں آنے کی زحمت ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی ہم پر مہربان ہو کر تصور میں آتا بھی ہے تو ایسے جیسے بجلی کوند جائے۔

یہ لطف عام ہے فانی یہ کچھ نہیں موقوف
جدھر حضور گئے بجلیاں گرا کے چلے

محبوب کے حسن نے صرف فانی کو ہی نہیں جلایا ہے۔ وہ تو جدھر جاتا ہے دیکھنے والوں کے دل و نگاہ پر بجلیاں گراتا چلتا ہے۔

(۲۹۸)

کیا چاہتے ہو منھ سے "اللہ" بھی نہ نکلے
ارمانِ دل بقدرِ یک آہ بھی نہ نکلے

محبوب کو گوارا نہیں کہ عاشق کا کوئی ارمان بھی پورا ہو۔ یہاں تک کہ وہ ایک آہ کا بھی روادار نہیں اور اگر شدتِ تکلیف سے عاشق کے لبوں سے "اللہ" نکل جاتا ہے تو اس پر بھی وہ خفا ہوتا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ اتنا ظلم تو نہ کرو کہ وقتِ آخر خدا کا نام بھی منھ سے نہ نکلے۔

چاہوں بھی اور یہ ضد ہے چاہا انھی کا چاہوں
دل سے دعا بھی نکلے، دل خواہ بھی نہ نکلے

محبوب کا مطالبہ ہے کہ ہم خواہش سے دستبردار بھی نہ ہوں لیکن ساتھ ہی یہ ضد بھی ہے کہ ہم وہی چاہیں جو وہ چاہتا ہے اور دل سے دعا تو نکلے مگر وہ دعا بھی ہماری مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اس کے حسب منشاء ہو۔ اس شعر کو حقیقی معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ یعنی خدا ایک طرف تو بندوں کی دعا کو پسند کرتا ہے لیکن ان کی دعا اس کی مرضی کی پابند بھی ہے۔

اللہ رے سخت جانی شبہائے غم کے نالے
تاثیر کیا دکھاتے جاں کاہ بھی نہ نکلے

جاں کاہ = جان لیوا

ہمارے نالے محبوب پر تو کیا اثر کرتے اتنا بھی نہ کر سکے کہ ہمیں زندگی کی اذیت سے نجات دلا دیتے۔ اس سخت جانی کو کیا کہیں۔

ہر راہ سے گذر کر دل کی طرف چلا ہوں
کیا ہو جو ان کے گھر کی یہ راہ بھی نہ نکلے

محبوب (اللہ) تک پہنچنے کے ہر راستے کو آزما کر دیکھ لیا اور مایوسی ہوئی۔ اب تمام راستوں کو چھوڑ کر دل کی (محبت کی) راہ اختیار کی ہے۔ اگر یہ راہ بھی منزل محبوب تک نہ پہنچا سکی تو ہم کدھر جائیں گے۔ مراد یہ کہ خدا کو مندر و مسجد میں تلاش کرنے کی بجائے اپنے دل میں ڈھونڈھنا چاہیے۔

کیا وصف جور بھی ہے اب ناگوارِ خاطر
دل سے شکست دل پر اب واہ بھی نہ نکلے

ہم ان وفا پرستوں میں ہیں کہ دل ٹوٹنے پر شکایت کی جگہ شکر کرتے ہیں اور محبوب کو اس کی جفا کی داد دیتے ہیں مگر اسے یہ بھی ناگوار ہے۔ یعنی اس کے دل میں چور ہے اس لیے وہ تعریف اور "واہ" کو بھی شکایت پر محمول کرتا ہے۔

شکوہ نہ کر فغاں کا وہ دن خدا نہ لائے
تیری جفا پہ دل سے جب آہ بھی نہ نکلے

عاشق محبوب کی جفا پر جو آہ و فغاں کرتا ہے وہ اس کی زندگی کی دلیل ہے۔ محبوب کو اس کی آہ کرنے پر خفا نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کو غنیمت خیال کرنا چاہیے کہ ایک دن ایسا بھی ہوگا جب اس کے لب خاموش ہو جائیں گے اور کوئی آہ بھی نہ نکل سکے گی۔ بقول غالب:

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے   بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اے جان و دل کے دشمن یہ کیا کہ جانِ فانیؔ
نکلے بھی اور دل کے ہمراہ بھی نہ نکلے

محبوب عاشق کی زندگی کا دشمن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی جان تو نکلے مگر جان کے ساتھ دل کا خاتمہ نہ ہو۔ یعنی وہ عشق میں اس طرح تڑپتا بھی رہے۔

گریۂ جوشِ ندامت بس اب تھمنے کا تو نام نہ لے
جب تک رحمت کا ہر پہلو دل کا دامن تھام نہ لے

شاعر اپنے ندامت کے آنسوؤں سے کہتا ہے کہ تم اس وقت تک نہ تھمنا جب تک شانِ رحمت ہمارے دل کو تسلی دینے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ مراد یہ کہ گناہ گار کی ندامت خدا کی رحمت کا سبب بن جائے گی۔

دل کی لامحدود فضا میں گم ہو جا یوں آپ کو ڈھونڈھ
ہوش کے بس کا روگ نہیں ہے، ہوش سے تو یہ کام نہ لے

اپنی ہستی کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان عقل اور ہوش کی جگہ عشق کا راستہ اختیار کرے اور ہوش سے کام لینے کی بجائے دل کی لامحدود وسعتوں میں گم ہو کر اپنی جستجو کرے۔ یعنی عشق عرفانِ حقیقت کا ذریعہ بھی ہے اور عرفانِ ذات کا بھی۔

راحت کا مفہوم یہی ہے جہدِ طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی، تڑپے جا آرام نہ لے

جہد = کوشش۔

ذاتی کے نزدیک راحت کا مطلب مقصد کا حصول نہیں بلکہ مقصد کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ اسی لیے وہ محبت میں تڑپنا اور بے چین رہنا چاہتے ہیں اور اسے ہر عیش اور راحت سے بڑھ کر جانتے ہیں۔ غم کا یہ فلسفہ ناکامیوں کو گوارا بنا دیتا ہے اور انھیں قنوطیت سے بچا لیتا ہے۔

لغزشِ توبہ کے ہاتھوں رندوں کا ٹھکانہ تھا کوئی
مستیٔ چشم اگر تو بڑھ کر گرتے ہوؤں کو تھام نہ لے

شاعر عام لوگوں کے برعکس نشۂ عشق سے تائب ہونے کو گمراہی خیال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی اس لغزش کی وجہ سے ہم برباد ہو گئے ہوتے مگر بھلا ہو محبوب کی مست نگاہوں کا

کہ انھوں نے ہمیں سہارا دے کر توبہ سے باز رکھا۔ یعنی عشق کا انکار سب سے بڑی گمراہی ہے۔ محبوب کی نگاہوں نے ہمیں اس گمراہی سے بچا لیا۔

ننگ ہے سعیٔ عرضِ محبت فرضِ محبت پورا کر
اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے

عرضِ محبت فانیؔ کے نزدیک عشق کی توہین اور اس کے لیے باعثِ رسوائی ہے۔ محبت کا فرض یہ ہے کہ محبوب کے سوا کوئی دوسرا خیال عاشق کے ذہن میں نہ آنے پائے اور عرضِ حال یا اثر کی آرزو بھولے سے بھی دل میں نہ آئے۔

دل تو آخر دل ہے، دل کو چین آنا آسان نہیں
درد وہ ہے جو دل میں اُٹھ کر آپ بھی پھر آرام نہ لے

دل کی فطرت میں بے چینی ہے اور اس کو چین آنا آسان بات نہیں۔ اسی طرح دردِ محبت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ دل کو ہی بے چین نہیں کرتا، خود بھی کبھی مائل بہ سکون نہیں ہوتا۔

جو ہونا ہے ہو کے رہے گا مجبوری کی حد سے نہ بڑھ
بیٹھے بٹھائے اپنے سر آزادی کا الزام نہ لے

فانیؔ مسئلہ جبر پر اس قدر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی کوششیں ان کے نزدیک بیکارِ محض ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان مجبور ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنی مجبوریوں کو قبول کر لے اور اپنی حد سے نہ بڑھے۔ ہوگا وہی جو قسمت کو منظور ہے اس لیے کوشش کر کے آزادی کا الزام اپنے سر لینے سے بہتر ہے کہ انسان اپنی قسمت پر قانع رہے۔ اُردو شاعری کا یہ وہ پہلو ہے جو ہمیں عمل سے متنفر کرتا ہے۔ اس کے خلاف اقبالؔ نے [illegible] تحا [illegible] لیا ہے۔

کافر صورت دیکھ کے منھ سے آہ نکل ہی جاتی ہے
کہتے کیا ہو اب کوئی یوں بھی اللہ کا نام نہ لے

کافر ادا محبوب کو یہ گوارا نہیں کہ عاشق اس کے سامنے اللہ کا نام بھی لے کیونکہ

اس سے محبوب کے غرورِ حسن کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اس کی حسین صورت دیکھ کر عاشق کے منھ سے بے ساختہ آہ نکل گئی ہے جو ایک طرح کا کلمۂ تحسین یا اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کا اعتراف ہے۔ شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ کیا تم کو یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی اس بہانے اللہ کا نام لے۔

حسنِ پشیماں کو فانیؔ میت پہ نہ دے تکلیفِ کرم
وضعِ شکستِ عشق نبھا دے، دیکھ کوئی الزام نہ لے

عاشق اپنے سر یہ الزام نہیں لینا چاہتا کہ اس کے مرنے سے محبوب کو اپنی جفاؤں پر ندامت ہوئی ہے اور وہ پشیمان ہو کر اس کی لاش پر آ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے عشق کی شکست کو قبول کرنا بہتر خیال کرتا ہے کیونکہ عشق کی وضعداری کا یہی تقاضا ہے۔

(۳۰۰)

موت کی رسم نہ تھی ان کی ادا سے پہلے
زندگی درد بنانی تھی دوا سے پہلے

جب تک محبوب میں یہ ادائیں نہ تھیں اس وقت تک عاشقوں کی دنیا میں جان دینے کا رواج نہ تھا۔ اس کی قاتل اداؤں نے پہلے عاشقوں کو ایک درد عطا کر دیا پھر اس کے علاج کے لیے موت کو بنایا گیا۔ ظاہر ہے کہ پہلے مرض پیدا ہوتا ہے پھر دوا۔ ایک اور شعر میں بھی اس خیال کو یوں ادا کیا ہے:

عشق نے دل میں جگہ کی تو قضا بھی آئی
درد دنیا میں جب آیا تو دوا بھی آئی

کیوں رہے بیچ میں یہ واسطۂ حسنِ قبول
بند کر بابِ اثر میری دعا سے پہلے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم دعا کرو میں اسے قبولیت بخشوں گا لیکن شاعر جو مسئلۂ جبر پر اعتقاد رکھتا ہے اس کے نزدیک قبولیت کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ کیونکہ ہوگا وہی جو مشیت الٰہی ہے۔ پھر بھی غم میں دعا کرنا انسان کی فطرت یا مجبوری ہے۔ فانیؔ چاہتے ہیں کہ حسنِ قبول کا جو واسطہ ان کے اور مشیت کے درمیان ہے وہ ختم ہو جائے اور اس

کی دعا سے قبل بابِ اثر ہی بند ہو جایا کرے۔

کاٹ ہی گے قیامت کا دن اک اور سہی
دن گذارے ہیں محبّت میں قضا سے پہلے

جو لوگ محبت کی تکلیفوں کو سہ چکے ہیں ان کے لیے قیامت کا دن گذارنا بھی کوئی مشکل بات نہیں کیونکہ اس طرح کے تکلیف دہ دن تو انھوں نے زندگی میں بہت گذارے ہیں۔

میری عادت ہے وفا، ان پہ کچھ احسان نہیں
تھا مجھے ذوقِ وفا ان کی جفا سے پہلے

عاشق محبوب پر اپنی وفاؤں کا احسان نہیں رکھنا چاہتا اور کہتا ہے کہ وفا تو ہماری سرشت میں داخل ہے۔ وفا کا ذوق ہمیں تمھاری جفاؤں سے بہت پہلے سے تھا۔ اس لیے تمھیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

دو گھڑی کے لیے میزانِ عدالت ٹھہرے
کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

میزانِ عدالت = انصاف کی ترازو۔

شاعر کو احساس ہے کہ اگر اس کے اعمال کو تولا گیا تو گناہوں کا پلّہ بھاری نکلے گا اور بخشش کی اُمید نہیں۔ اس لیے اعمال کو تولے جانے سے پہلے وہ خدا سے کچھ کہنا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ یہ عرض عذرِ مجبوری اور التجائے رحم و کرم کے سوا کیا ہوگی۔

کچھ ادائیں ہیں جنھیں قتل عبث ہے منظور
کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

محبت کا دستور نرالا ہے۔ اس میں قتل ہونے کے لیے مجرم ہونا ضروری نہیں اور خطا سے پہلے سزا دی جاتی ہے۔ محبوب کی ادائیں عاشق کو بے جرم قتل کرتی ہیں۔ ”قتلِ عبث“ کی ترکیب نامانوس ہے۔

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

شرارت، معصومیت اور لڑکپن کی ایک ادا ہے لیکن جیسے جیسے حسن اور جوانی کا احساس پیدا ہوتا ہے شرارت کی جگہ شرم کا انداز آجاتا ہے۔ شاعر محبوب سے دریافت کرتا ہے کہ تمھاری وہ معصوم شوخیاں کہاں گئیں جو جوانی کی حیا پرور اداؤں سے قبل تمھارے اندر تھیں۔

ہائے ان کا مری میّت پہ یہ عذرِ تاخیر
سو گئے تم مرے دامن کی ہوا سے پہلے

عاشق کے مرنے کے بعد محبوب اس کی لاش پر آیا ہے اور اپنے تاخیر سے آنے کا عذر پیش کرنے کی بجائے اُلٹی عاشق سے شکایت کر رہا ہے کہ تم میرے دامن کی ہوا ملنے سے پہلے ہی موت کی نیند کیوں سو گئے۔ اس شکایت میں جو اپنائیت ہے وہ عاشق کے لیے بہت ہے۔

دارِ فانی میں یہ کیا ڈھونڈھ رہا ہے فانؔی
زندگی بھی کہیں ملتی ہے فنا سے پہلے

جو لوگ زندگی کی حقیقت سے واقف ہیں وہ موت کو اصل زندگی جانتے ہیں۔ فانؔی کے خیال میں بھی اس دارِ فانی کی زندگی زندگی نہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک زندگی فنا ہو کر ملتی ہے۔ "دارِ فانی" "فانی" اور "فنا" کے الفاظ کی مناسبت قابلِ غور ہے۔

(۳۰۱)

وعدہ پھر اب کے بار کر کے چلے
پھر تم امیدوار کر کے چلے

محبوب جب بھی جاتا ہے پھر آنے کا وعدہ کر کے عاشق کے دل میں امیدوں کو بیدار کر جاتا ہے۔

دل کو کس دن قرار آیا تھا
تم کسے بے قرار کر کے چلے

دل کی بے قراری کچھ محبوب کے رخصت ہونے سے نہیں۔ دل کو تو کبھی قرار آیا ہی

نہیں اور یہ ہمیشہ تڑپتا ہی رہا ہے اس لیے اس کی بے قراری کا الزام محبوب پر نہیں۔

دردِ دل کو جگانے آئے تھے   درد کو ہوشیار کر کے چلے

محبوب کے آنے سے دل میں سویا ہوا درد جاگ گیا۔ گویا وہ اس درد کو جگانے ہی آیا تھا۔ مراد یہ کہ محبت کا لطف بجائے درد کو دور کرنے کے اسے اور بڑھا دیتا ہے۔ حسرت کا شعر ہے:

سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں   دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

اٹھ رہا حشر پر ترا دیدار   لے ترا اعتبار کر کے چلے

محبوب نے دیدار کو حشر کے وعدے پر ٹال دیا ہے۔ عاشق اس کے وعدے پر اعتبار کر کے حشر تک کے لیے موت کی نیند سو گیا ہے۔ محبوب کی وعدہ خلافی پر عاشق کے تاب نہ لا کر ختم ہو جانے کو بڑے انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔

دل پہ کچھ اختیار تھا فانیؔ   دل کو بے اختیار کر کے چلے

محبوب کے آنے سے پہلے اتنا تو تھا کہ دل ہمارے قابو میں تھا لیکن اس کے آ کر چلے جانے سے اب دل بالکل قابو سے باہر ہو گیا ہے۔

(۳۰۲)

توبہ نہ کرو ستم سے پہلے   اتنا تو کرو کرم سے پہلے

محبوب عاشق پر ستم کرنے سے توبہ اور مہربانی کا وعدہ کر رہا ہے مگر عاشق کو ترکِ ستم گوارا نہیں وہ کہتا ہے کہ کرم کرنا ہے تو ستم سے توبہ نہ کرو۔ ہم اسی کو تمھارا کرم سمجھیں گے۔

اچھا کوئی عذر بھی نہ سننا   کچھ منہ سے تو کہیے ہم سے پہلے

محبوب عاشق سے خفا ہے اور اس کا کوئی عذر سننے کو تیار نہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ اچھا ہمارا عذر نہ سنو مگر تم منھ سے بول کر ہمیں ہمارے قصور اور ناراضگی کی وجہ تو بتا دو۔

تیری ہی خوشی ہے آج غم بھی　　تیری ہی خوشی تھی غم سے پہلے

ہماری تمام زندگی دوست کی مرضی اور خوشی پر ہے۔ آج جو غم ملے ہیں یہ بھی اسی کی دین ہیں اور غموں سے پہلے جو خوشیاں تھیں وہ بھی اسی کا تحفہ۔ فانی غموں کو اسی لیے عزیز رکھتے ہیں کہ یہ ان کے محبوب کی خوشی ہے۔

کچھ اور حسین ہو گئے آپ　　یہ بات نہ تھی ستم سے پہلے

ستم سے پہلے محبوب کے حسن کا یہ عالم نہ تھا۔ غصہ نے اس کو اور حسین بنا دیا ہے۔

ع : لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

مشکل ہے کہ وعدہ اب وفا ہو　　کچھ کہہ کے رکے قسم سے پہلے

محبوب نے پھر ملنے کی قسم کھائی ہے مگر قسم کھانے میں وہ ذرا سا رک گیا تھا جس سے عاشق کو یقین ہو گیا ہے کہ اس کے دماغ میں ضرور کچھ اور بات تھی اور وہ جھوٹی قسم کھا رہا تھا جس کی وجہ سے زبان جھجھک رہی تھی۔

منزل پہ ٹھہر گیا ہوں تھک کر　　بت خانہ پڑا حرم سے پہلے

بت خانہ اور حرم دونوں ہی تلاش حق کی راہیں ہیں۔ لیکن بت خانہ کی راہ زیادہ آسان اور قریب ہے (کیونکہ وہاں بیٹھنے والے ظاہری صورت میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں حرم کا راستہ زیادہ لمبا اور دشوار ہے)۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم منزل کی تلاش میں چلے تھے مگر حرم تک پہنچنے کی بجائے بت خانہ ہی میں رک گئے ہیں کیونکہ بت خانہ حرم سے پہلے راستہ میں پڑا اور ہماری ہمت کی کمی نے ہمیں آگے جانے سے روک دیا ہے۔

فانیؔ غمِ روزگار کب تک　　کچھ فکرِ عدم، عدم سے پہلے

شاعر اپنے سے مخاطب ہے کہ کب تک دنیا کی فکروں میں گرفتار رہو گے۔ موت کے آنے سے پہلے کچھ عالم آخرت کی فکر بھی کر لو۔

(۳۰۳)

جنسِ دل مفت پھنسا کر کوئی دیوانہ بنے
زلفِ جاناں سے بنا ہے کوئی سودا نہ بنے

محبوب کی زلفوں سے دل کا سودا کرنا (زلفوں سے محبت کرنا) نادانی ہے کیونکہ اس سودے میں عاشق ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے۔ ان سے کوئی معاملہ طے ہونا ممکن نہیں۔ ناحق دل جیسی قیمتی شے کو ضائع کر کے دیوانہ بن جاتا ہے۔

اے تری شان کہ بت خانہ تو کعبہ بن جائے
دل کہ مسکن ہے ترا کعبہ سے بت خانہ بنے

کعبہ اسلام سے قبل بت پرستوں کا معبد تھا اور اس میں بت آراستہ تھے۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ اس نے بت خانہ کو تو کعبہ بنا دیا لیکن دل جو خود خدا کا مسکن تھا وہ حسینوں کے عشق کے سبب بت خانہ بن گیا ہے۔

لب تک آجائے غمِ ہجر تو شکوہ ہو جائے
آپ سُن لیں تو عجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

ہم کسی سے اپنے غم کی روداد بیان نہیں کرتے کہ کہیں محبوب اس کو شکایت نہ سمجھ لے۔ لیکن اگر محبوب اس تذکرہ کو توجہ سے سننے پر تیار ہو جائے تو یہ افسانہ بھی بن سکتا ہے۔ افسانہ بننے میں دلچسپی اور رنگینی کا اشارا ہے۔

(۳۰۴)

چمکا دیا ہے رنگِ چمن لالہ زار نے
شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

باغ میں پھولوں کی کثرت سے روشنی سی ہو گئی ہے اور گل و لالہ کی رنگینی سے خزاں کے سالے اثرات مٹ گئے ہیں گویا بہار نے خزاں کو آگ لگا دی ہے۔ ایک فلسفی ہونے کے تعلق سے

فانی ہر اثبات کے پیچھے چھپی ہوئی نفی کو بھی محسوس کر لیتے ہیں۔ روشنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اندھیرا مٹ جاتا ہے۔ وجود اس وقت ہوتا ہے جب عدم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بہاریں اس وقت جلوہ دکھاتی ہیں جب خزاں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔

ہر شام شامِ گور ہے ہر صبح، صبحِ حشر
کیا دن دکھائے گردشِ لیل و نہار نے

زمانہ کی گردش نے ہم پر وہ ستم ڈھائے ہیں کہ ہماری ہر رات قبر کی رات کی طرح پُر ہول اور تاریک ہے اور ہر صبح صبحِ محشر کی طرح قیامت خیز۔ شامِ گور کی ترکیب نامانوس اور گراں ہے۔

تربت کے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے
رو رو کے صبح کی مری شمعِ مزار نے

مرنے والے کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے احباب مزار پر پھول چڑھاتے ہیں اور شمع روشن کرتے ہیں۔ عاشق کی قبر کی بے کسی اس سامان آرائش کی بھی متحمل نہیں۔ اس کی قبر پر جو پھول چڑھائے جاتے ہیں وہ سرِ شام ہی مرجھا جاتے ہیں اور شمع مزار رات بھر اس کی بے کسی پر آنسو بہا کر صبح کرتی ہے۔

ہاں ہم نہ تھے فریبِ تمنّا سے بے خبر
کیا کہیے کیا کیا دلِ امیدوار نے

ایسا نہیں ہے کہ ہم محبت کے انجام سے بے خبر تھے لیکن کیا کہیں کہ ہمارے دلِ امیدوار نے ہمیں جانتے بوجھتے یہ فریب کھانے پر مجبور کر دیا۔

اپنی تو ساری عمر ہی فانیؔ گذار دی
اک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار نے

ہماری ساری عمر اسی انتظار میں گذری کہ مرگِ ناگہاں آکر ہمیں زندگی کی قید سے آزاد کر دے۔ بقول غالب: منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ؎ نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

کترے ہیں یہ گل تیری اک جنبشِ دامن نے
یوں کر نہ لیے پیدا دو پھول بھی گلشن نے

باغ میں پھول اور پھولوں کا حسن سب تیرے قدموں کا صدقہ ہے ورنہ زمین چمن میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ دو پھول بھی اُگا سکے۔

بخشا جو شرف ان کے اُڑتے ہوئے دامن نے
اُٹھ اُٹھ کے بلائیں لیں خاک سر مدفن نے

محبوب کے چلنے سے عاشق کے مدفن کی خاک منتشر ہو کر اُڑ رہی ہے۔ اس کی توجیہ شاعر اس طرح کرتا ہے کہ عاشق کے مدفن کی خاک محبوب کی بلائیں لے رہی ہے اور اس کی نوازش پر اظہار تشکر کر رہی ہے کہ اس نے اس خاک کو یہ شرف بخشا۔

جو مجھ پہ ہوئی ایسی بے داد نہ کی ہوگی
اللہ کے بندوں پر اللہ کے دشمن نے

محبوب نے ہم پر جو ظلم وستم کیے ہیں وہ دنیا میں کسی دشمنِ خدا نے کسی بندۂ خدا پر نہ کیے ہوں گے۔ محبوب چونکہ دشمن ایماں ہے اس لیے وہ دشمن خدا بھی ہوا۔

وہ قصۂ موسیٰ پھر اے سوزِ جگر کہنا
کس آگ کی چنگاری دی وادیٔ ایمن نے

وادیٔ ایمن = وہ وادی جہاں کوہ طور واقع ہے۔

حضرت موسیٰ کوہ طور پر آگ لینے گئے تھے اور وہاں انھوں نے جلوۂ الٰہی کو دیکھنے کی تمنا کی تھی لیکن تابش کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے اور کوہ طور جل کر سیاہ ہو گیا۔ شاعر اپنے سوزِ جگر یا تاب وتب عشق سے دریافت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو وادیٔ ایمن میں کس آگ کی چنگاری ملی تھی۔ اشارا یہ ہے کہ وہ چنگاری سوز عشق کی تھی۔ اپنے سوز جگر سے اس سوال کا جواب مانگا

بہت معنی خیز اور بلیغ ہے۔

یہ سوختہ سامانی کس کس کے نہ کام آئی
لی ایک نہ اک بجلی ہر دانۂ خرمن نے

سوختہ سامانی = بدنصیبی۔ سامان جل جانا

ہماری سوختہ سامانی کا یہ حال ہے کہ دنیا کی تمام بلائیں ہمارے ہی حصہ میں آگئی ہیں۔ ہر بجلی ہمارے خرمن کا رخ کرتی ہے اور خرمن کے ایک ایک دانہ کے حصے میں ایک نہ ایک بجلی آجاتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں کوئی دانہ بجلیوں سے محفوظ نہیں۔

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

جب تک گلشن میں ہم نے آشیاں کی بنیاد نہیں رکھی تھی اس وقت تک صیاد اور بجلیوں کی موجودگی کے باوجود بھی گلشن گلشن تھا اور اس میں رونق تھی لیکن ہمارے نشیمن کے تعمیر ہوتے ہی وہ انقلاب آیا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ یہاں بھی اپنی حرماں نصیبی کا ذکر ہے۔

یہ رشک و محبت کی روداد ہے اے فانیؔ
اک دوست کے پردے میں مارا غمِ دشمن نے

رشک اور محبت میں فرق یہ ہے کہ وہ غمِ دشمن ہے اور یہ غمِ دوست اور دونوں ہی عاشق کے دشمن ہیں۔ شاعر اپنی تباہی کا ذمہ دار رقیب کو ٹھہراتا ہے اور کہتا ہے کہ دوست کی محبت کے پردے میں رقیب کے رشک نے ہماری جان لی ہے۔

(۳۰۶)

لبیک کہا کس کو حیاتِ ابدی نے
دم توڑ دیا کیا ترے قدموں پہ کسی نے

آج کس نے تیرے قدموں پر جان دی ہے کہ ابدی زندگی اس کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کے قدموں پر جان دینا موت نہیں بلکہ عاشق کے لیے

حیات ابدی کے مترادف ہے۔

مجموعۂ آداب دو عالم ہے محبت
مرنے کے سلیقے ہیں نہ جینے کے قرینے

یونانی فلسفیوں کے نزدیک یہ کل کائنات محبت اور نفرت کا مجموعہ ہے اور اس عالم میں جو واقعات و حادثات (زندگی یا موت) رونما ہوتے ہیں انہی دونوں کا اظہار ہیں۔ لیکن صوفیہ کے خیال میں یہی عالم نہیں بلکہ دونوں عالم محبت کے جذبے کے زیرِ نگیں ہیں۔ فانی کا بھی کہنا ہے کہ جینے اور مرنے میں امتیاز یا ان کو الگ جاننا عاشق کے مسلک کے خلاف ہے۔ اسی کی نظر میں محبت ہی ان دونوں کی اصل ہے۔

مرتے ہی بن آتی ہے نہ جیتے ہی بن آتی
مارا مجھے قاتل کی مسیحا نفسی نے

مسیحا نفسی = حضرت عیسیٰ کی طرح زندگی بخش ہونا۔

محبوب قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی یعنی وہ عاشقوں کو قتل بھی کرتا ہے اور اس کا اعجاز مسیحائی مردوں کو زندہ بھی کر دیتا ہے۔ اس کی اس دو رنگی نے ہمیں مار رکھا ہے کہ نہ ہم جی سکتے ہیں نہ مر سکتے ہیں۔

پڑتا نہیں اس آئینہ میں عکس کوئی اور
دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے

ہمارے دل کے آئینہ میں تیرا تصور اس طرح جاگزیں ہے کہ اب اس میں کسی اور کا خیال آ ہی نہیں سکتا۔ آئینہ میں اگر ایک شخص کا عکس پڑ رہا ہے تو کوئی دوسری تصویر اس میں نہیں آ سکتی۔

آئینہ بصد جلوہ و ہر جلوہ بصد رنگ
کیا کیا نہ کیا تیری تماشا طلبی نے

صوفیہ کے نزدیک یہ کائنات اور اس کی ہر شے ایک آئینہ ہے جس میں حسنِ ازل نے اپنا

عکس ڈال دیا ہے۔ حسن کا ذوق خود نمائی اس تماشہ کا سبب ہے۔ شاعر محبوب (اللہ تعالیٰ) سے مخاطب ہے کہ تیری تماشا طلبی (خود نمائی) نے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں کہ ہر طرف تیرے سیکڑوں جلوے ظاہر ہیں اور ہر جلوہ میں سیکڑوں رنگ اور پہلو ہیں۔

دو نام ہیں ہستی و فنا ایک ہی دل کے
مارا ہے اسی دل نے جِلایا ہے اسی نے

ہستی اور فنا یا موت اور زندگی دل ہی کی دو مختلف کیفیات ہیں۔ دل ہی موت کا سبب بنتا ہے اور دل ہی زندگی بھی بخشتا ہے۔

امید بھی کیا شے ہے کہ ہر سانس میں فانیؔ
کچھ زندگیٔ خضر کے پاتا ہوں قرینے

زندگیٔ خضر = حضرت خضر کی سی زندگی یعنی ابدی۔

اُمید پر حیات انسانی کا دار و مدار ہے۔ جب تک اُمید زندہ رہتی ہے انسان کو زندگی کی بے ثباتی اور ناپائداری کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر سانس میں عمر خضر کا سا انداز محسوس ہوتا ہے۔

(۳۰۷)

ادا سے آڑ میں خنجر کی منھ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

محبوب عاشق کو قتل کرنے آیا ہے اور اس ادا سے کہ خنجر کی آڑ میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی حسین اداؤں نے موت کو بھی دلہن کی طرح حسین بنا دیا ہے۔

الٰہی کیوں نہیں ہوتی کوئی بلا نازل
اثر ہے دیر سے دست دعا اُٹھائے ہوئے

عاشق کی بدنصیبی کا یہ حال ہے کہ جب بھی وہ کوئی دعا کرتا ہے، دعا کا اثر ہونے کی

بجائے کوئی تازہ آفت اس پر نازل ہو جاتی ہے۔ آج جب عاشق دعا کر رہا ہے تو اثر نے بھی اس کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہیں۔ یعنی اثر بھی اس کے حال پر مہربان ہوا ہے۔ لیکن عاشق کو تعجب ہے کہ آج اس کی دعا کے بدلے کوئی بلا کیوں نازل نہیں ہو رہی ہے۔

تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی
ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے ترے جلائے ہوئے

تمھارے عشق کی آگ جس کے دل میں لگے پھر حشر تک نہیں بجھتی اور مر کر بھی اس کی سوزش میں کمی نہیں آتی۔

بلائے جاں ہے مگر پھر بھی آرزو ہے تری
ہم اس کو اپنے کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

محبوب کی آرزو میں چاہے ہمیں لاکھ ستم سہنے پڑیں مگر ہم اسے کلیجے سے لگائے رکھیں گے کیونکہ یہ بہر حال محبوب کی آرزو ہے۔

سحر ہوئی کہ وہ یادش بخیر آتا ہے
چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے

یادش بخیر = خدا اس کی یاد کو سلامت رکھے۔

صبح کی روشنی میں چراغوں کی روشنی ماند ہونے لگتی ہے اور محبوب کے حسن کے سامنے بھی چراغ جھلملانے لگتے ہیں اور مدھم پڑ جاتے ہیں۔ عاشق کی قبر پر جلنے والا چراغ جھلملا رہا ہے جس سے اس کو خیال ہوتا ہے کہ یا تو صبح قریب ہے یا محبوب آ رہا ہے۔ مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ مر کر بھی عاشق کو محبوب کا انتظار ہے۔

تمھیں کہو تمھیں اپنا بنا کے کیا پایا
مگر یہی کہ جو اپنے تھے سب پرائے ہوئے

تمھاری محبت سے ہمیں بس یہی ملا ہے کہ ہمارے دوست بیگانے ہو گئے۔ تمھاری

خاطر ہم نے دنیا سے دشمنی مول لے لی ہے مگر اس کا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا
نظر بچائے ہوئے، آستیں چڑھائے ہوئے

عاشق کے قتل کے لیے محبوب آستین چڑھا کر مقتل میں آیا ہے لیکن وہ نظریں بھی بچا رہا ہے کیونکہ اسے عاشق کی وفا اور مظلومی کا احساس ہے۔ عاشق کو اپنے قتل کا غم نہیں بلکہ وہ محبوب کی اس ادا پر قربان ہونے کو تیار ہے۔

اجل کو مژدۂ فرصت کہ آج فانیٔ زار
امیدِ وصل سے بیٹھا ہے لو لگائے ہوئے

محبوب کا وصل عاشق کی ہستی کو پیغامِ فنا بھی ہے کیونکہ وہ پھر اس سے الگ نہیں رہتا بلکہ اس میں گم ہو جاتا ہے۔ فانی جو وصل کے امیدوار ہیں موت سے کہتے ہیں کہ اب تجھے زحمت کی ضرورت نہیں ہمیں مٹانے کے لیے محبوب کا وصال کافی ہے۔ شعر میں لطیف اشارا یہ بھی ہے کہ جو عشق میں فنا فی المحبوب ہو جاتا ہے موت کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

(۳۰۸)

جاتا ہے صبر بے سر و ساماں کیے ہوئے
ناموسِ عشق ہدیۂ مژگاں کیے ہوئے

عشق کی راہ میں صبر ہی ہمارا ساتھی تھا لیکن آج یہ ساتھی بھی ہم کو اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہے اور عشق کی عزت جو صبر کی وجہ سے قائم تھی آج پلکوں کے حوالے ہو رہی ہے۔ یعنی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے اور آنسوؤں کی وجہ سے رازِ عشق افشا ہوا جا رہا ہے۔

افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں
پھرتا ہوں دھجیوں کو گریباں کیے ہوئے

ہم کو دیوانگی میں بھی اتنا ہوش ہے کہ اپنے رازِ دل کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے اور

گریبان کی دھجیوں کو بکھرنے نہیں دیتے بلکہ ان کو گریبان بنائے رہتے ہیں تاکہ رازِ محبت فاش نہ ہو۔

پھر لے چلا ہے گریۂ بے تاب خطِ شوق
دل کے لہو کو زینتِ عنواں کیے ہوئے

عشق کی بے تابی نے ہمیں محبوب سے عرضِ حال پر مجبور کر دیا ہے چنانچہ ہم اپنے آنسوؤں کے ذریعہ اسے نامۂ شوق بھیج رہے ہیں اور آنسوؤں میں خونِ دل کی جو سرخی ہے وہ گویا ہمارے نامۂ شوق کا عنوان ہے۔ محبوب کا یہ احترام ملاحظہ ہو کہ دل خون ہونے کے باوجود لبوں پر حرفِ تمنا نہیں آیا۔

پھر ناوکِ نگاہ کا رخ پھیر سوئے دل
سامانِ صد جراحتِ پنہاں کیے ہوئے

جراحتِ پنہاں = پوشیدہ زخم۔

ہماری تمنا ہے کہ محبوب اپنی نگاہوں کے تیر کا رخ پھر ہماری جانب کر کے ہمارے دل کو زخمی کر دے۔

دل کی لحد پہ خاک اُڑانے چلا ہے عشق
ذرے سے اکتسابِ بیاباں کیے ہوئے

ہمارا دل محبت میں خاک ہو چکا ہے اور عشق اس کا ماتم کر رہا ہے۔ وہ دل کے مزار پر خاک اُڑانے جا رہا ہے (سر پہ خاک ڈالنا ماتم کی شکل ہے) اور اس نے خاک کے ذرّوں میں صحرا کی سی وسعت و پہنائی پیدا کر دی ہے۔ مراد یہ کہ عاشق کا ماتم خود عشق کرتا ہے اور جس خاک میں عاشق دفن ہوتا ہے اس کے ذرّوں میں ایک لامحدود وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر گوشہ گیرِ حلقۂ زنجیر ہے جنوں
صحرا کو نذرِ تنگیٔ زنداں کیے ہوئے

گوشہ گیر ہونا = گوشہ میں بیٹھ جانا۔

عاشق کا جنون اسے ایک جگہ نہیں رکنے دیتا۔ کبھی وہ صحرا کی وسعتوں کی خاک اُڑاتا ہے اور کبھی زنداں کی چار دیواری میں گوشہ گیر ہو جاتا ہے۔ ان دنوں پھر دیوانے نے صحرا کی

وسعتِ پرِ زنداں کی تنگی کو ترجیح دی ہے اور زنجیر کے حلقوں کی پابندی قبول کر لی ہے۔

اور اک دردِ دل بھی رہا ہر نفس کے ساتھ
دشوارئ حیات کو آساں کیے ہوئے

زندگی کی مشکلات کو جھیلنا آسان نہیں تھا۔ مگر دردِ محبت کی موجودگی اور اس کے احساس نے اس منزلِ دشوار کو بھی آسان کر دیا۔

تمھاری یاد سہارا دیے رہی ورنہ
غمِ جہاں نے قدم ڈگمگا دیے ہوتے

طوفانِ اضطرابِ جنوں اُٹھ کہ دیر سے
بیٹھا ہوں جمع خاطرِ داماں کیے ہوئے

خاطر جمع = سکون، تسلّی

دیر سے عاشق کا دامن جنوں کی دست درازی سے محفوظ ہے۔ عاشق بے چینیِ جنوں کو دعوت دیتا ہے کہ پھر طوفان اُٹھا اور دامن کی دھجیاں بکھیر دے۔

اے عقلِ غم فروش فراغت نما ٹھہر
آتا ہے عشق درد کو درماں کیے ہوئے

غم فروش فراغت نما = عقل جو فراغت اور آسائش کے نام پر فریب دے کر غم دیتی ہے۔
یہ ترکیب فانیؔ کی اپنی اختراع ہے جو "گندم نما جَو فروش" کے قیاس پر بنائی گئی ہے۔

عقل فریب دے کر عاشق کو غمِ دُنیا میں پھنسانا چاہتی ہے۔ وہ اس کو تنبیہ کرتا ہے کہ ذرا ٹھہر جا۔ عشق تیرے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے آ رہا ہے اور ایسا غم لے کر آ رہا ہے جو ہر درد کا علاج بھی ہے۔ مراد یہ کہ اہلِ عقل جو بظاہر مطمئن ہیں وہ ہزاروں غموں میں گرفتار ہیں۔ عشق جو بظاہر ایک غم یا مرض ہے وہ دوسرے تمام دکھوں سے نجات دے کر عاشق کو اصلی خوشی عطا کر سکتا ہے۔

کیوں اہلِ حشر! ہے کوئی نقّادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

قیامت میں میں اس امید پر اپنے دل کے داغوں کو دکھانے لایا ہوں کہ دنیا میں تو ان کی داد نہ مل سکی۔ شاید یہاں کوئی ایسا نقاد ملے جو ان کی قدر و قیمت پہچان سکے شعر میں چیلنج کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کو یہاں بھی امید نہیں کہ اس کے درد و غم کا سمجھنے والا ہو۔ "نقادِ سوزِ دل" کی ترکیب نے شعر کے حسن میں اضافہ کر دیا۔

فانی اب اُن کی یاد پہ کیا کیجئے نثار
مدّت ہوئی وداعِ دل و جاں کیے ہوئے

ہمارا دل اور جان تو ابتدا میں ہی دردِ عشق کی نذر ہو چکا ہے۔ اب محبوب کی یاد آئی ہے تو اس پر نثار کرنے کے لیے کیا چیز لائیں۔

(۳۰۹)

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لیے ہوئے
ذرّے ہیں اک جہانِ حقیقت لیے ہوئے

اگرچہ انسان کو خدا سے وہ ہی نسبت ہے جو ذرّہ کو آفتاب سے لیکن غمِ محبت کی جو امانت انسان کے دل میں ہے اس کی بدولت ان ذرّوں میں حقیقت کی ایک دنیا سما گئی ہے غم کی امانت سے اشارا اس امانت کی طرف ہے جس کو اُٹھانے کے ارض و سما متحمل نہ ہوئے لیکن انسان نے اُسے اٹھا لیا۔

دے اذنِ عام عشق کو تاراج ہوش کا
بیٹھا ہوں دل میں صبر کی دولت لیے ہوئے

اذنِ عام = عام اجازت تاراج = بربادی

ہم عشق میں صبر کو اپنے سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں کیونکہ محبوب کی یہی مرضی ہے۔ کاش وہ اشارا کر دے اور عشق کو اجازت دیدے کہ وہ ہمارے ہوش اور صبر کو لوٹ کر ہمیں بے خود بنا دے۔ عاشق کا ہوش اور بیخودی دونوں محبوب کی مرضی کے پابند ہیں۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

انسان مشیتِ الٰہی کا پابند ہے لیکن دنیا میں اس کو اعمال کا ذمہ دار بنا کر برائے نام مختار قرار دے دیا گیا ہے جو اس پر ایک تہمت سے کم نہیں۔ شاعر محشر میں اپنے دوست (اللہ تعالیٰ) کے جبر سے اس ہمّت کی داد چاہتا ہے کہ زندگی بھر اس تہمت کو اُٹھائے رکھا اور اُف بھی نہ کی۔ میر نے تو "ہم کو عبث بدنام کیا" کہہ کر خدا سے شکایت بھی کر لی مگر فانی کی احتیاط ملاحظہ ہو کہ شکایت نہیں کرتے بلکہ اپنی ہمّت کی داد طلب کرتے ہیں۔

اس خاکدانِ تیرہ میں کیا ڈھونڈھتا ہوں میں
پھرتا ہوں شمع داغِ محبّت لیے ہوئے

دنیا کی ظلمتوں اور تاریکیوں میں محبت کے داغ ایک شمع کی مانند ہیں۔ ہم نے اپنے دل میں یہ شمع جلائی ہے اور اس کی روشنی میں کسی شے کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کی تلاش ہے وہ محبوب کی ذات ہے۔ مراد یہ ہے کہ محبت زندگی کی تاریکیوں میں بھٹکنے سے بھی بچاتی ہے اور محبوب (حقیقی) تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ہے۔

کافر ہوں گر یقیں نہ ہو کافر کی بات کا
وعدے ہیں اعتبارِ قیامت لیے ہوئے

اگر ہم کو اُس بت کافر (محبوب) کی بات کا یقین نہ ہو تو ہمیں مسلمان نہیں کافر سمجھو۔ ہم اس کے وعدوں پر اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جیسے ایک مسلمان قیامت پر۔ شعر میں حسن یہ ہے کہ قیامت سے تشبیہ دے کر محبوب کے وعدوں کا غیر معین اور دور دراز ہونا بخوبی ظاہر کر دیا ہے۔ رعایت لفظی و معنوی کی اچھی مثال ہے۔

روشن ہوئی وہ گورِ غریباں میں شمعِ طور
آغوشِ نور میں مری تربت لیے ہوئے

عاشق کی قبر پر محبوب کے حسن کی روشنی اس طرح ضوفشاں ہے جس طرح وادیٔ ایمن میں تجلیٔ طور تھی۔

(۳۱۰)

اُٹھ اے نگاہِ شوق اُٹھ متاعِ جاں لیے ہوئے
وہ دامنِ نگاہ میں ہیں بجلیاں لیے ہوئے

محبوب اپنی برق پاش نگاہوں سے عاشق کی جانب دیکھ رہا ہے۔ عاشق اپنی نگاہِ شوق کو دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنا سرمایۂ زندگی اس کی نگاہوں کو نذر کر دے۔

فلک کی ساری پستیاں سپردِ قلبِ خاک ہیں
زمیں کی ساری رفعتیں ہیں آسماں لیے ہوئے

عالم میں اضداد کا وجود اعتباری ہے۔ آسمان کی بلندی یا زمین کی پستی ہمارے اندازِ نظریہ منحصر ہے ورنہ درحقیقت ان دونوں میں وہ دوری یا تناقص نہیں جو ہم نے فرض کر لیا ہے۔ آسمان بھی اپنے اندر پستیاں رکھتا ہے اور اس کی یہ پستی زمیں کے سینہ میں پناہ ڈھونڈھ لیتی ہے۔ اسی طرح زمین کی پستی میں بھی بلندیوں تک پہنچنے کا رجحان موجود ہے۔

حجابِ روزگار میں جھلک ہے یادِ یار کی
نشاط آشکار ہے غمِ نہاں لیے ہوئے

صوفیہ کے نزدیک کائنات کی ہر شے کی حقیقت ایک ہے۔ بظاہر کائنات ایک پردہ ہے جس کے پیچھے حسنِ ازل پوشیدہ ہے۔ فانی بھی اسی عقیدہ کے پیرو ہیں اس لیے یہ حجاباتِ ظاہری انھیں محبوب سے دور نہیں کر پاتے بلکہ اس کی یاد میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور یہ درد جو انھیں غمِ محبت کے سبب سے حاصل ہوا ہے۔ گویا محبت کا غمِ نہاں ان کے لیے نشاط کا سبب بن گیا ہے۔

وصال ہو کہ ہجر ہو حیات ہو کہ موت ہو
ہر اعتبارِ عشق ہے پیامِ جاں لیے ہوئے

ہجر وصل اور موت و زندگی جو بظاہر متضاد کیفیتیں ہیں لیکن عاشق کی نظر میں یہ تمام اعتبارات حقیقت میں زندگی کا پیام دیتے ہیں یعنی عشق میں مرنا بھی عین زندگی ہے اور ہجر بھی محبوب کے تعلق سے جاں فزا ہے۔

بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہ واپسیں
چلی ہے دل کی وادیوں سے آندھیاں لیے ہوئے

آہِ واپسیں = آخر وقت کی آہ

مرتے دم عاشق کے لبوں سے جو آہ نکلی ہے وہ اس قدر طوفان خیز اور پُر درد ہے کہ ڈر ہے کہیں یہ غم کی بنیاد کو ہی نہ منہدم کر دے۔

نہ پوچھ عہدِ ہوش کہ کہ دامنوں کی آڑ میں
پھرا کیا ہوں دامنوں کی دھجیاں لیے ہوئے

اپنے عالم ہوش کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ ہمارا دامن سلامت رہا لیکن اس کے پردہ میں جو اضطراب اور شورش چھپی تھی وہ کتنے ہی تار تار دامنوں سے بڑھ کر تھی۔ مراد یہ کہ ہمارا عالم ہوش بھی دراصل جنون کا ہی ایک پردہ تھا۔

قبائے ذات نام ہے لطافتِ حیات کا
غبارِ راہِ کارواں ہے کارواں لیے ہوئے

قبائے ذات = یہ مادی عالم جو ذات مطلق کو اپنے پردہ میں چھپائے ہے۔

جس طرح کارواں کی راہ کا غبار کارواں کو چھپا لیتا ہے لیکن اسی سے کارواں کی موجودگی کی شہادت بھی ملتی ہے۔ اسی طرح مظاہر کائنات وہ غبار ہیں جن میں کاروانِ وجود چھپا ہوا ہے۔ اس کائنات کی تمام دل کشی اور لطافت ذات مطلق کا لباس یا قبا ہے۔ فانی زندگی کے حسن و لطافت کی نفی نہیں کرتے بلکہ اسے حسنِ ازل کا ایک حصہ مان کر اس کا اثبات کر رہے ہیں۔

ترے کرم سے کیا سماں ہے عالمِ گناہ کا
سیاہیاں امید کی تجلیاں لیے ہوئے

اللہ تعالیٰ نے گناہگاروں پر رحمت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کی اس عنایت سے گناہگاروں کی دنیا بدل گئی ہے اور اب گناہوں کی سیاہی کی بجائے ان کی دنیا اُمید کی روشنی سے جگمگا گئی ہے۔

وہی ہوں میں جو تو نہیں وہی ہے تو جو میں نہیں
ترا ہر ایک نام ہے مرا نشاں لیے ہوئے

اگرچہ انسان کی ہستی اعتباری اور موہوم ہے پھر بھی اس کا وجود ذاتِ مطلق کے اظہار کا ذریعہ ہے اور اس لیے اہم ہے۔ فشتے مشہور فلسفی کا نظریہ ہے کہ پہلے کائنات میں صرف Ego (انائے مطلق) کا وجود تھا۔ اس نے اپنے اظہار کے لیے Non Ego (ماسوا) کو وجود دیا تاکہ اس کا ہونا ثابت ہو جائے۔ گویا ماسوا بھی اس سے الگ نہیں۔ فانی اسی خیال کو شاعرانہ انداز میں یوں پیش کرتے ہیں کہ تو وہ ہے جو میں نہیں ہوں اور میں وہ ہوں جو تو نہیں ہے۔ یعنی تیری ہستی ہی سے میرا وجود بھی ثابت ہے۔

ع: پستی ہے تو بلندی ہے، رازِ بلندی پستی ہے

دلیلِ فتحِ عاشقی نویدِ صد شکست ہے
امانتِ بہار ہے میری خزاں لیے ہوئے

عشق کی ناکامیاں اور شکستِ عاشق کے لیے کامیابی و فتح کا مژدہ ہیں اور عشق کے آلام و مصائب ایک ایسی خزاں کی مانند ہیں جو بہاروں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ چونکہ عاشق کی ناکامی و بدحالی محبوب کی عنایت کا سبب بن جاتی ہے اس لیے وہ اس کی ہار نہیں، جیت ہے۔

(۳۱۱)

آیا ہوں حشر میں دلِ شیدا لیے ہوئے
آشوبِ صد جہانِ تماشا لیے ہوئے

آشوب = ہنگامہ

قیامت میں ہم اپنے پہلو میں الفت بھرا دل لے کر آئے ہیں جو قیامت کے سے سینکڑوں ہنگامے اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

ہنگامِ نزع راہ تری دیکھتا ہوں میں
آنکھوں میں زندگی کا تقاضا لیے ہوئے

دمِ نزع عاشق کی ساری جان سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی ہے اور وہ محبوب کا انتظار کر رہا ہے۔ گویا موت سامنے ہے مگر وہ زندگی (محبوب کا دیدار) کا منتظر ہے۔

دیکھی ہیں ہم نے گورِ غریباں کی راہ میں
آبادیاں خرابیٔ صحرا لیے ہوئے

گورِ غریباں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہر آبادی اپنے اندر صحرا کی ویرانی لیے ہے یعنی ہر آبادی کا انجام ویرانی ہے۔

دیکھا نہ اہلِ دل نے کسی دن اُٹھا کے آنکھ
دنیا گذر گئی غمِ دنیا لیے ہوئے

دنیا اور اس کے غم ہمارے سامنے آئے اور گذر گئے مگر ہم اپنے عالمِ دل کی لہر میں اس طرح ڈوبے تھے کہ ہم نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مراد یہ کہ جو غمِ عشق کی لذت سے آشنا ہو گیا اس کو دنیا کے غم اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتے۔

ہر آئنہ ہے دعوتِ سعیٔ نظر مجھے
ہر سعیٔ اعتبار تماشا لیے ہوئے

اس کائنات کی تمام اشیا وہ آئینہ ہیں جس میں جلوۂ حسنِ ازل چھپا ہوا ہے۔ یہ آئینے طالب کو دعوت دیتے ہیں کہ ہمارے اندر چھپے ہوئے حسن کو دیکھنے کی کوشش کرو۔ اور یہ کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔ بلکہ ہر کوشش نظارہ کی قائم مقام ہے۔ یعنی طلب ہو تو ہر چیز میں اس کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اٹھنا وہ تیرے در سے کسی نامراد کا
اک آہ زیرِ لب کا سہارا لیے ہوئے

جب عاشق محبوب کے در سے مایوس ہو کر اُٹھا ہے تو ایک دبی ہوئی آہ اس کے لبوں پر آ گئی۔

فانیؔ مری لحد پہ وہ آئے تو کس طرح
کچھ تیوروں میں شکوۂ بے جا لیے ہوئے

محبوب عاشق کے مزار پر آیا تو ہے مگر اب بھی پشیمانی کی جگہ اس کے انداز سے شکایت نمایاں ہے۔

(۳۱۲)

فلک دشمن ہے نالے بے اثر ہیں یار بے پروا
تری مشکل ہو آساں اے دلِ ناداں یہ مشکل ہے

دل کی بگڑی کا بننا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے کیونکہ تمام حالات ہی اس کے خلاف ہیں۔ آسمان دشمنی پر آمادہ ہے، نالے بے اثر اور محبوب تغافل شعار۔

الٰہی قطع ہو گی روح سے راہِ عدم کیوں کر
مجھے جب سانس لینا ضعف سے قطعِ منازل ہے

ضعف سے ہمارا یہ حال ہے کہ سانس لینا بھی منزل سر کرنے کے برابر دشوار ہے۔ ایسی ناتوانی کی حالت میں ہماری روح عدم کی دشوار گزار راہوں کو کیوں کر طے کر سکے گی۔

بقائے جذبۂ الفت اسے کہتے ہیں اے فانیؔ
کہ اب تک گردبادِ خاکِ مجنوں شکلِ محمل ہے

گردباد = بگولہ

الفت کا جذبہ مر کر بھی فنا نہیں ہوتا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ مجنوں کی خاک سے جو بگولے

اٹھتے ہیں وہ محمل کی شکل ہوتے ہیں۔ بگولے میں گرد کے جو دائرہ ہوتے ہیں ان میں اور محمل میں مشابہت ظاہری سے شاعر کا ذہن کہاں پہنچتا ہے۔

(۳۱۳)

کس قدر جذبہ الہی خنجر قاتل میں ہے
میان سے نکلے تو میں سمجھوں کہ خنجر دل میں ہے

ہماری خواہش قتل کے اثر سے خنجر میں بھی جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ ہمارے دل میں اُترنے کے لیے بے تاب ہے۔ وہ جیسے ہی میان سے باہر نکلے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا خنجر میرے دل میں اُتر گیا ہے۔

حالِ دل کب تک سنو گے تم بس اتنا جان لو
مرغِ بسمل کی سی کیفیت دلِ بسمل میں ہے

ہماری بے چینی کی تفصیل جان کر تم کیا کرو گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ کسی زخمی پرندہ کی مانند ہمارا دل تڑپتا رہتا ہے۔

منھ سے کہیے یا نہ کہیے مل گیا ہم کو جواب
آپ کے تیور کہے دیتے ہیں جو کچھ دل میں ہے

محبوب نے ہماری داستانِ غم سُن کر منھ سے تو کچھ نہیں کہا ہے مگر کچھ کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کے تیوروں سے ہم نے جواب کا اندازہ لگا لیا ہے۔ یہ جواب یوں تو نفی میں بھی ہو سکتا ہے اور اثبات میں بھی۔ مگر فانیؔ کی شاعری اور مزاج کے لحاظ سے جواب کا انکار میں ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

(۳۱۴)

رنجش بے جا تمھاری اور ہے   بخت کی ناسازگاری اور ہے

تمھاری بے سبب آزردگی کا قسمت کی ناسازگاری سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ قسمت کا

ہر ظلم عاشق ہمت سے برداشت کر سکتا ہے مگر محبوب کی بے سبب رنجشیں اس کے لیے نا قابلِ برداشت ہیں۔

کون اٹھائے بارِ احسانِ شفا
اب تمنا ہی ہماری اور ہے

ہم دوا کا احسان لینا نہیں چاہتے بلکہ کچھ اور ہی خواہش رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خواہش موت کی خواہش کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے۔

آنسوؤں پر منحصر رونا نہیں
عاشقوں کی اشکباری اور ہے

رونے کے لیے ضروری نہیں کہ آنسو ہی بہائے جائیں۔ عاشقوں کا رونا اس طرح ہوتا ہے کہ آنکھیں خشک ہوتی ہیں اور دل روتا ہے۔ بقول جگر

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

باوفاؤں پر جفا کرتے ہو تم
ورنہ رسمِ دوست داری اور ہے

تم دوستی کے آداب و رسوم سے ناواقف ہو، اسی لیے اپنے باوفا عاشقوں پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں۔

(۳۱۵)

کسی کی یادِ مژگاں دل میں جب نشتر چبھوتی ہے
خلش ہوتی ہے لیکن کس قدر پُر لطف ہوتی ہے

محبوب کی پلکوں کی یاد عاشق کے دل میں جو چبھن اور خلش پیدا کرتی ہے اس میں بھی عاشق کو لذت ملتی ہے۔

قدم آہستہ اے اُمید رکھنا خانۂ دل میں
کہ میری آرزو آغوشِ مایوسی میں سوتی ہے

مایوسی میں انسان کو وہ اذیت نہیں ہوتی جو اُمید باندھ کر ناکام ہونے میں ہوتی ہے۔ عاشق جس کی آرزوئیں مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے مایوسی کی گود میں جا سوئی ہیں۔ اس کو ڈر ہے

کہ کہیں امید پھر سے اس کی سوئی ہوئی آرزوؤں کو بیدار کر کے اسے پہلے کی سی اذیت میں نہ مبتلا کر دے۔ اسی لیے وہ امید سے کہتا ہے کہ میرے سینہ میں ذرا آہستہ داخل ہونا۔

تصنع سے نہیں خالی ضیائے حسنِ قدرت بھی
کہ شبنم رات بھر گلشن میں منھ پھولوں کا دھوتی ہے

تصنع یہاں لفظی معنوں میں یعنی سجاوٹ و آرائش کے معنوں میں لیا گیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ قدرتی حسن کو بھی ظاہری سجاوٹ اور نکھار کی ضرورت ہے۔ اسی لیے پھولوں کا حسن نکھارنے کے لیے شبنم رات بھر پھولوں کا مُنھ دھوتی رہتی ہے۔

مبارک جذبۂ دل اشکِ پیہم کا گہر ہونا
کسی کی یاد انھیں تارِ تصوّر میں پروتی ہے

عاشق محبوب کی یاد میں جو آنسو بہاتا ہے وہ آنسو نہیں ہوتے بلکہ موتی کی مانند قیمتی ہو جاتے ہیں۔ موتیوں کا حسن ہار کی لڑیوں میں پروئے جانے سے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح آنسوؤں کی قیمت محبوب کی یاد سے بڑھ جاتی ہے۔

کلیجہ تھام لو تم تابِ شیون لا نہیں سکتے
کہ میری موت میری بے کسی سے مل کے روتی ہے

بے کسی کی انتہا یہ ہے کہ عاشق کی موت پر رونے والا بھی کوئی نہیں۔ اگر کوئی اس کی لاش پر رو رہا ہے تو اس کی اپنی بے کسی۔ یہ منظر اس قدر غم ناک ہے کہ محبوب اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ یعنی ہماری بے کسی کی موت نے محبوب کو بھی متاثر کر دیا ہے۔

جو پہلے نم کیا کرتی تھی ظالم تیرے دامن کو
وہ چشمِ خوں فشاں اب رختِ ہستی کو بھگوتی ہے

رختِ ہستی۔ زندگی کا سامان

ہماری خونبار آنکھیں جو پہلے تمھارے دامن کو بھگویا کرتی تھیں اب تمھاری بے رُخی

اور بے گوہی کے سبب اپنے رخت ہستی کو غرق کرنے پر آمادہ ہیں۔ بقول جگر:

عجب انقلاب زمانہ ہے میرا مختصر یہ فسانہ ہے
وہی سر وبال ہے دوش پر جو کبھی تھا زانوئے یار پر

نہ چھوڑا نخلِ غم کی آبیاری نے لہو باقی
سرشت عشق دل میں کس بلا کا بیج بوتی ہے

آبیاری = سینچنا
سرشت = فطرت

جس دل میں عشق کا بیج بویا گیا وہ دل خون سے یکسر خالی ہو جاتا ہے کیونکہ یہ وہ پودا ہے جس کی آبیاری صرف خونِ دل سے ہی ہوتی ہے۔

مری حسرت کو فانیؔ کاش اتنا کوئی سمجھا دے
کہاں تک سوگواری، صبر کر، کیوں جان کھوتی ہے

کاش ہماری آرزوؤں اور حسرتوں کو کوئی یہ بتا دے کہ عشق میں ناکامی عاشق کا مقدر ہوتی ہے۔ اس کے لیے جان کھونا اور تڑپنا فضول ہے اور صبر کرنا ہی بہتر ہے۔ شعر میں تکلف ہے۔

(۳۱۶)

تم نے جانا ہی نہیں دردِ جگر کیا چیز ہے
دل کا آجانا کسی بے درد پر کیا چیز ہے

جس نے کبھی کسی ظالم سے دل نہ لگایا ہو اور درد دل کا مزہ ہی نہ چکھا ہو وہ دوسروں کی محبت کی قدر اور ان کے دُکھ کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

کس کو دیکھوں کس کو سمجھوں دونوں عالم میں حسیں
حور بھی قرباں ہے تم پر اور بشر کیا چیز ہے

محبوب کو دیکھنے کے بعد زمین و آسمان میں کسی کا حسن عاشق کی نظر میں نہیں سما سکتا اور انسان تو انسان وہ حوروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

کاش میں واقف نہ ہوتا رسم و راہِ عشق سے
کاش تم سمجھو کہ عشقِ فتنہ گر کیا چیز ہے

عاشق کی تمنا ہے کہ یا تو وہ محبت کی راہوں سے واقف نہ ہوا ہوتا یا پھر محبوب کو ہی عاشقی کے دشوار گذار راستوں سے گزرنا پڑتا تاکہ اسے معلوم ہو جاتا کہ عشق کسے کہتے ہیں۔

کیا کہو گے گر وہ فانی حالِ دل سن کر کہے
ہم نے مانا دردِ دل کچھ ہے مگر کیا چیز ہے

عاشق محبوب کے روبرو حالِ دل سنانے چلا ہے مگر ساتھ میں ڈر بھی رہا ہے کہ اگر اس نے پوچھا کہ دردِ جگر کسے کہتے ہیں تو کیا بتائیں گے۔ یعنی محبوب اس قدر بھولا ہے کہ دردِ دل کے نام سے بھی ناواقف ہے۔

(۳۱۷)

تو شمع آئینہ خانہ ہے، آئینہ کیا ہے
تری خدائی کے قربان ماسوا کیا ہے

ماسوا = خدا کے سوا دوسری اشیا

وحدت الشہود کے نظریہ کے ماننے والوں کے نزدیک دنیا آئینہ خانہ ہے جس میں ہر سمت حسنِ ازل کا جلوہ ہے لیکن جو لوگ وحدت الوجود کے نظریہ کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز یہاں تک کہ خود ان کی ہستی بھی ذاتِ الٰہی سے الگ نہیں۔ منصور بھی اسی نظریے کا ماننے والا تھا اور یہ درجہ اس کو عشقِ الٰہی سے حاصل ہوا تھا۔ شاعر کو بھی دنیا میں محبوب کے علاوہ کوئی اور شے نظر ہی نہیں آتی۔ وہ محبوب ہی سے پوچھتا ہے کہ وہ آئینے یا مظاہرِ کائنات جن کو لوگ ماسوا سے تعبیر کرتے ہیں کدھر اور کہاں ہیں۔ ہمیں تو تیرے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔ خود فانیؔ کا شعر ہے۔

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسّم کیا

اٹھا بھی دے نگہ ماسوا نگر کا حجاب
یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے، دیکھتا کیا ہے

محبوب کے اور عاشق کے درمیان اگر کوئی پردہ ہے تو وہ اس کی اپنی ظاہر بین نگاہیں ہیں۔ عاشق اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اگر تو محبوب کے جلوہ کو دیکھنا چاہتا ہے تو دیر نہ کر اور اس پردہ کو درمیان سے اُٹھا دے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں صرف دیکھنے کا پردہ ہے۔

کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

اللہ تعالیٰ خبیر و علیم ہے۔ اس کو علم تھا کہ انسان دنیا میں آکر گناہ کرے گا پھر بھی اس نے اس کو دنیا میں آنے کی اجازت دی جو اس کی شانِ کریمی کا ثبوت ہے۔ جب کرم کی ابتدا یہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی انتہا کیا ہو گی۔

(۳۱۸)

بشر میں عکس موجودات عالم ہم نے دیکھا ہے
وہ دریا ہے یہ قطرہ، لیکن اس قطرہ میں دریا ہے

تمام موجودات عالم کی اصل ایک ہے اور انسان کی ہستی جسے اس کی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے "عالم اصغر" کہا گیا ہے۔ اس میں تمام موجودات کا عکس موجود ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق قطرہ و دریا کا سا ہے لیکن نگاہِ حقیقت بیں ہو تو اس قطرہ میں دریا کو چھپا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ بنیادی خیال انسان کی عظمت و اہمیت۔

مری میت یہ ان کا طرز ماتم کس بلا کا ہے
دل بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے

عاشق زندگی کی قید سے آزاد ہو کر اپنی تمام آرزوؤں کو مٹا چکا تو محبوب اس کی لاش پر آکر اظہارِ غم کر رہا ہے اور اس سے اس کی آرزو دریافت کر رہا ہے۔ اس کی یہ پشیمانی اور ماتم

کا انداز عاشق کے لیے قیامت سے کم نہیں۔ ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے

غمِ عشق میں جو آنسو عاشق کی آنکھوں سے رواں ہیں وہ اگر دل میں رہیں تو انگاروں کی طرح دل کو جلا دیتے ہیں اور باہر آجائیں تو دریا کی طرح جو چیز سامنے آجائے اسے بہالے جاتے ہیں۔

کوئی دل میں نہیں آتا تو پھر یہ داغِ دل کیا ہے
بتا اے عشق یہ کس چور کا نقشِ کفِ پا ہے

دل میں عشق کی بدولت جو داغ پڑ گئے ہیں ان کو شاعر کسی کے پاؤں کے نشانات سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ عشق ہی سے کہتا ہے کہ ضرور ہمارے دل میں چوری چھپے کوئی (مراد عشق) آیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ داغ دل کہاں سے آتے۔ غالب نے داغِ دل کو نالوں کے نقش پا کہا ہے۔

مری محرومیوں کا فیض جاری ہے رگ و پے میں
بدن میں جو لہو کی بوند ہے خونِ تمنا ہے

ناکامیوں نے صرف ہمارے دل کو ہی متاثر نہیں کیا ہے بلکہ رگ رگ میں ان کا اثر جاری و ساری ہے اور ہمارے بدن میں جو خون ہے وہ تمناؤں کا خون ہے ہمارا نہیں مراد یہ کہ مسلسل ناکامیوں نے ہمارا خون نچوڑ لیا ہے۔

غبارِ رشک، خارستانِ حسرت، یاس کے منظر
ہمارے دل کی دنیا بھی کوئی دنیا میں دنیا ہے

ہمارے دل کی دنیا کا کوئی منظر ایسا نہیں جو ویران اور غم انگیز نہ ہو۔ اس میں حسرتوں کے کانٹوں اور رشک کے غبار کے سوا اب کوئی چیز باقی نہیں۔

تمہارے ظلم، طعنے غیر کے، لوگوں کے آوازے
محبت میں دلِ مجبور کو سب کچھ گوارا ہے

محبت کی خاطر ہم نے کیا کچھ گوارا کیا ہے۔ محبوب کے ظلم، رقیب کے طعنے اور لوگوں کی فقرہ بازیاں ہمیں برداشت کرنا پڑی ہیں۔

نظر آتے ہیں دل میں آج پھر آثارِ بے تابی
ہم اے امید سمجھے اس میں کچھ تیرا اشارا ہے

بہت دن سے دلِ مایوس پر خاموشی اور سکوت کا عالم طاری تھا لیکن آج پھر اس میں کچھ ہل چل اور بے تابی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ یقیناً امید نے دل کو بہلاوا دے کر اسے پھر سے مضطرب کر دیا ہے۔

محبّت ہی نہیں تو پاسِ آدابِ محبّت کیا
وفا کی یا جفا کی، جانے دو یہ ذکر ہی کیا ہے

محبوب ایک طرف تو عاشق سے بے تعلقی کا دعویٰ اور محبت سے انکار کرتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی جفاؤں کی تاویل بھی پیش کر رہا ہے۔ اس پر عاشق کہتا ہے کہ جب تم کو محبت کا ہی اقرار نہیں تو پھر بات ہی ختم ہو گئی اب اس ذکر سے کیا حاصل کہ محبت کے آداب کیا ہوتے ہیں اور وفا کے بدلے میں وفا ضروری ہے یا نہیں۔

اسی کو تم مگر اے اہلِ دنیا جان کہتے ہو
وہ کانٹا جو مری رگ رگ میں رہ رہ کر کھٹکتا ہے

زندگی جو دنیا والوں کی نظر میں ایک عزیز شے ہے ہمارے لیے ایک وبال ہے اور کانٹے کی طرح ہماری رگ رگ میں کھٹکتی رہتی ہے۔

نہ بن انجان ظالم لاکھ بے تاثیر ہوں نالے
خبر دل کی نہ ہو دل کو کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

کہا جاتا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ محبوب جو ہمارے حال سے لاعلمی کا اظہار کرتا ہے یہ سب اس کی بناوٹ ہے ورنہ حقیقت میں اس کو ہماری حالت کی پوری خبر ہے۔ ہمارے نالے لاکھ بے اثر سہی مگر یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ جس کی خاطر ہم تڑپ رہے ہیں اسے ہمارے تڑپنے کا علم ہی نہ ہو۔

شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے

جدائی میں ہم اس طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ہر سانس پر آخری سانس کا گمان ہوتا ہے اور ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں کہ دل و جگر ابھی بخیر تو ہیں۔

یہ کیا کہتے ہو فانیؔ سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

محبوب عاشق سے خفا ہو کر دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا تیری موت آئی ہے۔ عاشق جو زندگی سے بے زار ہے اور موت کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے محبوب سے کہتا ہے کہ تم مجھے موت سے کیا ڈراتے ہو۔ تمھیں کیا خبر کہ میری زندگی موت سے بدتر ہے۔ حسرت و ناکامی کی بڑی موثر تصویر ہے۔

(۳۱۹)

متاعِ جلوہ تحیر ہے۔ مجھ کو سکتا ہے   دل آئینہ ہے کہ منھ آئینہ کا تکتا ہے

عاشق کا دل ایک آئینہ ہے جس میں محبوب کا عکس جلوہ فگن ہے اور صوفیہ کے نزدیک یہ کائنات بھی ایک آئینہ ہے جس میں حسنِ ازل کے ہی جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے جلووں نے میرے دل کو بھی متحیر و ساکت کر دیا ہے اور کائنات کو بھی تحیر کی دولت عطا کر دی ہے (آئینہ کی خاصیت حیرانی ہے) گویا ہمارا دل آئینہ ہے جو دوسرے آئینے کا منھ تک رہا ہے۔

اگر "متاع جلوہ" کو ہم کائنات کے معنی میں نہ لے کر خود جلوۂ حسن کے معنی میں لیں تو شعر سے یہ معنی نکلیں گے کہ "میں جلوۂ دوست کے سامنے حیرت زدہ ہو کر سکتہ میں ہوں۔ ادھر وہ جلوہ بھی میری نظروں کے اثر سے عالمِ حیرت میں ہے گویا دو آئینے ایک دوسرے کے مقابل

ہیں اور یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ کون کس کو دیکھ رہا ہے۔“

حجابِ زعمِ تماشا اٹھا تو کچھ دیکھوں رہی نگاہ، یہ پردہ تو اُٹھ بھی سکتا ہے

زعمِ تماشا = یہ گمان کہ ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

اس عالم میں سوائے جلوۂ الٰہی کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ پھر بھی اس کے جلوے حجاب میں ہیں۔ جو چیزیں اس کے اور عاشق کے درمیان حجاب بنی ہوئی ہیں وہ ایک تو خود عاشق کے ظاہری حواس (نگاہیں) ہیں اور دوسرے یہ زعم کہ ہم کو اس کا جلوہ میسر ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ میرے ظاہری وجود کا پردہ تو کوئی بڑی چیز نہیں۔ اس کو تو میں جب چاہوں چاک کر سکتا ہوں لیکن تو نے اپنے حسن پر جو زعمِ تماشا کے پردے ڈال رکھے ہیں ان پردوں کو بھی ہٹا دے تب میں تیرا دیدار کر سکتا ہوں۔ غالب کی طرح فانی بھی ”شہود و شاہد و مشہود“ کی اصل کو ایک قرار دیتے ہیں اور ”مشاہدہ“ کو ایک حجاب سمجھتے ہیں۔

وہ دل میں ہوک سی اُٹھی وہ مجھ کو ہوش آیا وہ درد جس کی دوا تو ہے پھر چمکتا ہے

جب تک بے ہوشی رہتی ہے عاشق کا درد دبا رہتا ہے اور جہاں ہوش آیا درد بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ اس درد کا درماں اگر ہے تو دیدارِ محبوب۔

اُمید و بیم یہ ہے ہستیٔ بشر موقوف کہ جا کے دم پلٹ آتا ہے دل دھڑکتا ہے

بیم = خوف

کہا جاتا ہے کہ زندگی کا انحصار امیدوں اور خوف پر ہے یعنی زندگی امید و بیم کا نام ہے۔ فانی اس نظریہ کی تائید تو کرتے ہیں مگر ان کے یہاں امید و بیم کا مفہوم عام لوگوں سے برعکس ہے۔ امید کا مطلب ان کے نزدیک موت کی امید ہے اور خوف زندگی کا خوف ہے۔ سانس جب باہر نکلتی ہے تو انھیں امید پیدا ہوتی ہے لیکن جب وہ پلٹ کر سینہ میں آتی ہے تو خوف سے دل دھڑکتا ہے۔

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے،

اگر محبوب خفا نہ ہو تو ہم اس سے صرف اتنا پوچھیں کہ کیا اس کے ہجر کے ماروں کو مرنے کی اجازت ہے۔ "تیری جان سے دور" کے فقرہ کی اپنائیت اور محبوب کی مرضی کا احترام قابلِ داد ہے۔ اس ٹکڑے نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔

اجل بس ایک ہی کانٹا نکال کر چل دی
ٹھہر کہ خارِ تمنّا ابھی کھٹکتا ہے

موت نے زندگی کی مشکل کو تو آسان کر دیا مگر محبت کی خلش کو وہ بھی دور نہ کر سکی۔

ع: ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے ترے لئے

حدودِ غم سے غمِ عشق بڑھ چلا فانیؔ
وہ جامِ عمر کہ لبریز تھا چھلکتا ہے

غمِ عشق اب برداشت کی حد سے نکل گیا ہے اور زندگی کا پیمانہ جو کب کا لبریز ہو چکا تھا اب چھلکنے کو ہے۔

(۳۲۰)

دل جو عالم میں فرد رہتا ہے
نذرِ اربابِ درد رہتا ہے

فرد = یکتا

اس کائنات میں کوئی چیز دل کے برابر قیمتی نہیں اور یہ قیمتی تحفہ صرف عاشقوں ہی کے حصہ میں آتا ہے۔

جانے دل کے لہو پہ کیا گذری
رنگ اشکوں کا زرد رہتا ہے

شاید دل کا لہو اب ختم ہو چکا ہے جو آنسوؤں میں سرخی کی جگہ زردی دکھائی دیتی ہے۔ رنگت کی زردی خون کی کمی کے سبب ہوتی ہے

سوزِ غم کی نہ پوچھ ضبط کو دیکھ
یہ جہنم بھی سرد رہتا ہے

عشق کی آگ جہنم سے کم نہیں لیکن ہمارے ضبط کو دیکھو کہ اس کے آگے یہ جہنم بھی سرد ہو گیا ہے۔

مژدہ انجامِ غم کہ پہلو میں   دل بہ عنوانِ درد رہتا ہے

عاشق اپنے کو مبارکباد دیتا ہے کہ اب غم کی آخری منزل آن پہنچی ہے اور پہلو میں دل کی جگہ درد باقی رہ گیا ہے۔ ایک اور جگہ بھی انھوں نے یہی بات کہی ہے :

ابتدائے عشق تھی جب دل سراپا درد تھا   انتہا یہ ہے کہ فانیؔ درد اب دل بن گیا

ذرّہ ذرّہ کے روپ میں فانیؔ   کوئی صحرا نورد رہتا ہے

صحرا میں جو خاک اُڑتی ہے دراصل یہ عاشق کی بے چین خاک ہے جس کی وحشت خاک میں مل کر بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔

(۳۲۱)

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشمِ بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے

شباب کے ساتھ ساتھ محبوب میں احساسِ حسن بھی جاگ گیا اور وہ خود اپنی اداؤں سے شرمانے لگا ہے جس سے اس کا حسن اور بڑھ گیا ہے۔ حسن کی اداؤں کی بڑی دل کش عکاسی کی ہے۔

ہجر میں بھی مجھے امدادِ اجل تھی درکار
میری تربت پہ نہ آ تجھ سے حجاب آتا ہے

ہجر کی تکلیفوں سے نجات پانے کے لیے عاشق کو موت کا سہارا لینا پڑا۔ یہ بات آدابِ عشق کے خلاف تھی اس لیے عاشق محبوب سے شرمندہ ہے اور نہیں چاہتا کہ وہ اس کی قبر پہ آئے۔

دید آخر ہے الٹ دیجے چہرہ سے نقاب
آج مشتاق کے چہرہ پہ نقاب آتا ہے

عاشق کا جنازہ اُٹھتے وقت محبوب عاشق کی بالیں پر آیا ہے مگر اب بھی اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہے۔ عاشق التجا کرتا ہے کہ اب تو چہرہ سے نقاب ہٹا کر اپنے طالب دیدار کی حسرت

پوری کر دیجئے کیونکہ یہ آخری دیدار ہے۔ اس کے بعد تو آپ کے مشتاق کے چہرہ کو ڈھانپ دیا جائے گا۔

کس طرف جوشِ کرم تیری نگاہیں اٹھیں
کون محشر میں سزاوارِ عتاب آتا ہے

روزِ محشر اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے اُمیدوار وہ لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے نیکیوں میں عمر گزاری ہے لیکن اس کی رحمتِ خاص گناہگاروں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کسی کی طرف متوجہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص سزاوارِ عتاب ہے۔

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کہ جنازے پہ وہ غارتگرِ خواب آتا ہے

ہمیں اُمید نہیں کہ مرنے کے بعد بھی آرام سے سو سکیں گے کیونکہ ہمارے جنازے پر محبوب آرہا ہے جس کا تصوّر زندگی بھر ہماری نیندیں حرام کیے رہا۔

دل کو اس طرح ٹھہر جانے کی عادت تو نہ تھی
کیوں اجل کیا مرے نامہ کا جواب آتا ہے

موت نے عاشق کے بے چین دل کو خاموش کر دیا۔ دل جس کی سرشت میں بے چینی داخل تھی اس کو یوں خاموش دیکھ کر عاشق کو گمان ہوتا ہے کہ کہیں محبوب کی طرف سے اس کے خط کا جواب تو نہیں آرہا ہے ورنہ یہ سکون کیا معنی رکھتا ہے۔ عشق کی سادہ لوحی قابلِ لحاظ ہے۔

جلوۂ رنگ ہے نیرنگ تقاضائے نگاہ
کوئی مجبورِ تماشائے سراب آتا ہے

جلوۂ رنگ = دنیا کے رنگا رنگ جلوے   نیرنگ = جادو   سراب = ریگِ صحرا جس پر پانی کا دھوکہ ہوتا ہے۔

دنیا کے یہ رنگا رنگ جلوے صرف نگاہوں کا دھوکا ہیں جنھیں خود ہماری حسرتِ دید نے

تخلیق کر لیا ہے۔ ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس دنیا میں آنے والا ہر شخص اس سراب کو حقیقت خیال کرتا ہے۔

ہو گیا خون ترے ہجر میں دل کا شاید
اب تصور بھی ترا نقش بر آب آتا ہے

نقش بر آب = پانی پر بنی ہوئی تصویر۔ ناپائدار

محبوب کا تصور آتا تو اب بھی ہے مگر پانی کے نقش کی طرح صرف چند لمحہ کے لیے اُبھرتا ہے پھر مٹ جاتا ہے۔ اس سے عاشق کو گمان ہوتا ہے کہ شاید اس کے دل کا خون ہو چکا ہے۔ اس سیلِ خون میں محبوب کا تصور بھی پانی کے نقش کی طرح ابھرتا ہے پھر مٹتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ غموں نے دل کو اس طرح تباہ کیا ہے کہ یادِ محبوب بھی باقی نہیں رہی۔ بقول غالب

دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں   آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

ملتی جلتی ہے مری عمر دو روزہ فانی
جی بھر آتا ہے اگر ذکر حباب آتا ہے

بلبلہ کے ذکر پر ہمارا دل بھر آتا ہے اور اسی کے ساتھ ہمیں اپنی ناپائدار زندگی کا دھیان آجاتا ہے جو اسی کی طرح عارضی ہے۔ خیال میں کوئی ندرت نہیں اور اندازِ بیان بھی نامکمل ہے۔

(۳۲۲)

جلوہ بے چشم آشنا کیا ہے   میں ہی میں ہوں مرے سوا کیا ہے

جب تک عشق کی مشتاق نگاہیں نہ ہوں حسن کے جلووں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اس کائنات میں حسنِ ازل کے جو جلوے ہیں وہ میری خاطر ظاہر کیے گئے ہیں اس لیے میں ہی اس کائنات کی اصل ہوں۔ اس شعر میں انسان کی عظمت کو نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

شغل ہے زندگی کی فرصت کا   اور مجبور کی دعا کیا ہے

دعائیں تو محض وقت گذارنے کا مشغلہ ہیں ورنہ ہم جانتے ہیں کہ دعاؤں سے تقدیر بدل نہیں سکتی اور ان کا حاصل کچھ نہیں۔ بقول میکشؔ بدایونی

پھیلائے ہوئے دستِ دعا اب بھی ہیں لیکن
جی جانتا ہے جو بھی دعاؤں سے ملا ہے

تیری تدبیر ہے مری تقدیر
ابتدا یہ ہے، انتہا کیا ہے

میری تقدیر پر میرا کوئی بس نہیں۔ یہ تیری (اللہ تعالیٰ کی) تدبیر یا عمل کی پابند ہے۔ جب ہماری ابتدا اس مجبوری سے ہوئی ہے تو انجام تو نہ جانے کیا ہوگا۔

دل سراپا نظر، وہ حسن تمام
بند کر آنکھ، دیکھتا کیا ہے

محبوب حسنِ مجسم ہے۔ اس کے جمال کے دیدار کے لیے نگاہیں کام نہیں دے سکتیں بلکہ عاشق کا دل سراپا نظر ہوتا ہے۔ اگر تم اپنے محبوب کا دیدار کرنا چاہتے ہو تو آنکھیں بند کر کے خلوتِ دل میں جھانکو۔ اس کی دید ہو جائے گی۔

مدعا ہے کہ مدعا نہ کہوں
پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے

محبوب رسماً عاشق سے پرسشِ احوال تو کرتا ہے مگر خواہش یہ رکھتا ہے کہ عاشق اس کو اپنا مدعا نہ بتلائے۔

گلہ مند جفا تو ہو فانیؔ
یہ بھی معلوم ہے جفا کیا ہے

عاشق کو محبوب کی جفاؤں کی شکایت ہے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ جفائیں بھی اس کی عنایت کا اظہار ہیں اور اس کا غم دینا بھی "منجملۂ آدابِ غمخواری" ہے۔

(۳۲۳)

رگ رگ میں اب اندازِ بسمل نظر آتا ہے
ہر سانس کے پردے میں قاتل نظر آتا ہے

ہم درد کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جب ہمارے جسم کی ہر ہر رگ ایک بسمل کی طرح

تڑپ رہی ہے اور ہر ہر سانس قاتل اور جان لیوا ہو گئی ہے۔

وہ وعدۂ آساں پہ مائل نظر آتا ہے
اب کارِ تمنّا بھی مشکل نظر آتا ہے

محبوب کی عنایتیں عشق کی آگ کو سرد کر دیتی ہیں اور اس کی دوری تمنّاؤں میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے جب محبوب ملنے کے وعدہ پر مائل ہوتا ہے تو عاشق کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب ہماری تمنّا کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایک معنی یہ بھی نکل سکتے ہیں کہ محبوب کے وعدہ پر یقین کرنے کے بعد کاروبارِ تمنّا اور مشکل ہو جائے گا۔

تو دشنہ و پہلو میں حائل نظر آتا ہے
جیتے ہیں کہ مر جانا مشکل نظر آتا ہے

دشنہ = خنجر

ہم عشق میں جی رہے ہیں اس کا یہ سبب نہیں کہ زندگی ہمیں عزیز ہے۔ ہم تو کب کا اپنے پہلو میں خنجر اتار چکے ہوتے مگر تیری مرضی کا خیال ہمیں اس سے باز رکھتا ہے گویا تو ہمارے پہلو اور خنجر کے بیچ میں حائل ہو گیا ہے۔ بقول فانی:

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جیے جانے سے کچھ حاصل نہیں

ترکِ غمِ ساحل کا حاصل نظر آتا ہے
لے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے

انسان کو اپنا مدعا اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ ترکِ مدعا کر لے۔ عشق میں ڈوبنے والے جب تک کامیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں کامیابی نہیں ملتی۔ لیکن جب وہ کامیابی کی امید اور اس کا غم دل سے نکال دیتے ہیں اور عشق میں خود کو مٹا دیتے ہیں تو انھیں ساحلِ مراد مل جاتا ہے۔

دل کھوئے ہوئے برسوں گذرے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے

محبت میں دل کو گنوائے ہوئے مدتیں گزر چلیں مگر جب بھی کسی کا دل دیکھتے ہیں تو اپنے دل کو یاد کر کے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

آغازِ محبّت میں جینے ہی کے لالے تھے
اب خیر سے مرنا بھی مشکل نظر آتا ہے

محبت کی ابتدا یہ تھی کہ زندگی دوبھر تھی۔ اب یہ حال ہے کہ مرنا بھی اپنے بس میں نہیں۔

تو مست خود آرائی ہم حُسن کے متوالے
جو ہے تیری محفل میں غافل نظر آتا ہے

محبوب کی محفل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہر شخص بے خود اور مست دکھائی دیتا ہے۔ محبوب ہے تو اپنی آرائش میں محو اور عاشق ہے تو وہ اس کے حُسن کے اثر سے بے خود۔

رودادِ محبّت کی تصویر ہے ہر آنسو
ہر قطرۂ خوں میں اک دل نظر آتا ہے

آلامِ عشق نے ہمارے دل کو خون کر دیا ہے اور یہ خون آنسوؤں میں شامل ہو کر باہر آ رہا ہے۔ گویا ہمارا ہر آنسو ہماری داستانِ محبت کی تفسیر اور دلِ پُرخوں کی تصویر بن گیا ہے۔

بے تابیٔ بے صرفہ بے وجہ نہیں یعنی
دل دردِ محبّت کے قابل نظر آتا ہے

بے صرفہ = بے کار

دل کی بے تابی بظاہر بے کار معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت میں دل کا تڑپنا بے سبب نہیں۔ اس طرح دل درد محبت کی پذیرائی کے قابل بنتا جا رہا ہے۔

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

مصائب کے سیلاب سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طوفان میں ڈوب کر انسان کو ساحل ملتا ہے۔ فانی کے عام رجحان کے برخلاف اس شعر میں رجائیت کا انداز نمایاں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گرداب محض مصائب کا ہی پیش خیمہ نہیں ہوتا بلکہ تلاش کیا جائے تو گرداب ساحل کا کام بھی کر سکتا ہے۔

(۳۲۴)

جب پرسشِ حال وہ فرماتے ہیں کیا جانیئے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے

محبوب جب کرم پر مائل ہو کر ہمارا حال پوچھتا ہے تو زبان ہمارا ساتھ نہیں دیتی اور دردِ دل میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسی کو غیر متوقع طور پر ہمدرد پا کر انسان کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کو بڑے فطری انداز سے پیش کیا ہے۔

اب خیر سے ان کی بزم کا اتنا رنگ تو بدلا میرے بعد
جب نام مرا آجاتا ہے کچھ ذکرِ وفا ہو جاتا ہے

محبت میں ہمارے جان دینے سے اتنا تو ہوا کہ محبوب جو وفا کا دشمن تھا اب وفا کا قائل ہو گیا اور اس کو ہماری وفاؤں کا احساس بھی ہو گیا۔ چنانچہ اس کی محفل میں ہمارے ذکر کے ساتھ وفا کے تذکرے بھی ہونے لگے ہیں۔

یکتائے زمانہ ہونے پر صاحب یہ غرورِ خدائی کا
سب کچھ ہو مگر خاکم بدہن کیا کوئی خدا ہو جاتا ہے

مانا کہ تم حسن میں اپنی مثال آپ ہو مگر ایسا بھی کیا غرور کہ اپنے کو خدا ہی سمجھنے لگے۔ تم لاکھ حسین سہی مگر کوئی انسان خدا تو نہیں ہو سکتا۔

قطرہ قطرہ رہتا ہے دریا سے جدا رہ سکنے تک
جو تابِ جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

قطرہ کی ہستی اور اس کا وجود اسی وقت تک ہے جب تک وہ دریا سے الگ رہتا ہے جہاں وہ دریا میں ملا دریا کی وسعتیں اسے اپنے اندر گم کر لیتی ہیں۔ عاشق کو محبوب کی ذات سے بھی وہی نسبت ہے جو قطرہ کو دریا سے۔ جب تک وہ محبوب سے دور ہے اس کی ہستی قائم ہے جہاں یہ دوری ختم ہوئی، وہ ہی اس کے لیے فنا کا پیغام ہے۔

پھر دل سے فانی سارے کے سارے نقشِ جفا مٹ جاتے ہیں
جس وقت وہ ظالم سامنے آکر جانِ حیا ہو جاتا ہے

محبوب ظالم و جفا کار سہی لیکن جس وقت وہ ہمارے سامنے شرمندگی کا اظہار کرتا ہے اور شرم و حیا کی اداؤں کا نمونہ بن جاتا ہے تو اس کی اس ادا پر نثار ہو کر ہم اس کے تمام مظالم کو بھول جاتے ہیں۔

(۳۲۵)

دل کو نہ کیوں کہوں جو ازل سے خراب ہے
یہ کیوں کہوں کہ اُن کی تمنّا عذاب ہے

عاشق اپنی بربادی کا الزام محبوب کو نہیں دیتا بلکہ وہ اپنے حرماں نصیب دل کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے جو ازل ہی سے بربادی کا نشانہ بنا رہا ہے۔ غالب کا یہ شعر بھی اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

یہ اس نگاہِ ہوش رُبا کی خطا نہیں
دنیا بقدرِ ذوقِ خرابی خراب ہے

دنیا کی بربادی و خرابی کی ذمہ دار محبوب کی نگاہِ ہوش ربا نہیں بلکہ ذوقِ خرابی تو دنیا کی سرشت میں موجود ہے جتنی کسی میں مست ہونے کی صلاحیت ہے اتنا ہی وہ محبوب کی نگاہِ ہوشربا کے سحر سے مسحور ہے۔

اب کیا کہیں کہ شکوۂ بے داد دوست کا
ہلکی سی ایک موجِ تبسّم جواب ہے

ہماری شکایت جفا پر محبوب متاثر یا محجوب ہونے کی بجائے صرف زیرِ لب مسکرا دیتا ہے۔ گویا اس کی یہ موجِ تبسّم ہمارے شکوۂ بیداد کا جواب ہے۔ اب اس ستم ظریفی کو کیا کہیں۔

کچھ اضطرابِ شوق کی لذّت نہ پوچھیے
کہنے کو اضطراب فقط اضطراب ہے

عشق کی بے چینی بھی اضطراب کی دوسری صورتوں سے زیادہ مختلف نہیں مگر اس بے چینی میں عاشق کو جو لذّت ملتی ہے وہ بیان میں نہیں آسکتی۔

میری نظر بھی اب مجھے پہچانتی نہیں
دل کا بھی انقلاب عجب انقلاب ہے

عشق کی بدولت عالمِ دل میں عجیب انقلاب آیا ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو بھول گئے ہیں اور ہماری نظر بھی ہمیں نہیں پہچانتی۔

جب تو یہ تھا کہ ہے وہ تجلّی حجاب میں
اب کچھ نہیں تو ان کی تجلّی حجاب ہے

جب تک محبوب کا حسن پردے میں تھا ہم یہ سوچ کر چپ رہتے کہ وہ حجاب کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتا۔ مگر اب جب کہ سب پردے اُٹھ چکے ہیں تو خود اس کا حسن پردہ بن گیا ہے۔ یعنی اس کے جمال کی تابش دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے اور کوئی اسے دیکھ نہیں پاتا۔ بقولِ غالب:

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

فانی خیالِ دوست سے پیدا ہے شانِ دوست
دل کا یہ فیض ہے کہ نظر کامیاب ہے

میری نظروں کی یہ کامیابی میرے جذبۂ دل کی مرہونِ منت ہے کہ خیالِ دوست میں حسنِ دوست کا لطف اور انداز پیدا ہو گیا ہے اور وہ ہر دم میری نگاہوں کے سامنے رہتا

(۳۲۶)

کم دردِ جگر ہے یا بہت ہے
جو آپ سے مل گیا، بہت ہے

ہم راضی برضائے محبوب ہیں۔ اس نے جو غم دیا ہے خواہ وہ ہماری خواہش سے کم ہو یا زیادہ ہمارے لیے کافی ہے کیونکہ یہ دوست کا عطیہ ہے اشارہ یہ ہے کہ ہم تو اور غم کے طالب تھے مگر اس نے جتنا بھی دے دیا اس کی مہربانی۔

پچھتائیں گے آپ دل کو لے کر
کم بخت غم آشنا بہت ہے

عاشق محبوب سے مخاطب ہے کہ میرے دل کو لے کر آپ پچھتائیں گے۔ یہ دل اس قدر غم پسند ہے کہ اگر اس کا اثر آپ کی طبیعت پر ہو گیا تو آپ کو بھی ہماری طرح غموں سے ربط پیدا ہو جائے گا۔

تکلیفِ جفا بھی کیوں کریں آپ
احسانِ غمِ وفا بہت ہے

محبوب نے وفا کا بدلہ وفا سے نہیں دیا۔ عاشق کے لیے یہی غم کافی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا غم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اب محبوب کو جفا کی زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

کیا چاہیے اور زندگی کو
مر رہنے کا آسرا بہت ہے

زندگی کی پریشانیوں اور تلخیوں میں موت کا خیال بہت بڑا سہارا ہے۔ اب اس کے علاوہ زندگی کو اور کون سا سہارا چاہیے۔

فانیؔ غمِ ناخدا نہ کرنا
کشتی کو تری خدا بہت ہے

اگر ہماری کشتی کو ناخدا کا سہارا نہیں تو کوئی غم نہیں خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ جوہر بدایونی کا شعر ہے،

میری کشتی کا قلق یارانِ ساحل کیوں کریں
ناخدا ان کو مبارک ہو خدا رکھتا ہوں میں

(۳۲۷)

رابطۂ جسم و جاں دیکھئے کب تک رہے
زیست کا ہم پر گماں دیکھئے کب تک رہے

ہماری زندگی زندگی نہیں بلکہ صرف زندگی کا دھوکا ہے اور صرف جسم و جاں کا ایک تعلق ہے۔ دیکھئے کب اس تعلق کا خاتمہ ہو اور ہمیں اس سے نجات ملے۔ فانیؔ اکثر اشعار میں زندگی کی شکایت اور موت کی تمنّا کا اظہار کرتے ہیں۔

میری گراں جانیاں مجھ سے جدا ہوں نہ ہوں
سعیٔ الم رائگاں دیکھئے کب تک رہے

غم کی یہ کوشش ہے کہ زندگی کو ختم کر دے مگر ہماری سخت جانی اس کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ دیکھئے کب تک ہماری سخت جانی غم کی کوششوں کو بیکار کرتی ہے۔

دیکھئے کب تک مٹے سینۂ فانیؔ کا داغ
تربتِ دل کا نشاں دیکھئے کب تک رہے

ہمارا دل تو کبھی کا آلام کی نذر ہو چکا ہے۔ اب اس کی نشانی ایک داغ ہے جو گویا دل کی قبر ہے۔ دیکھئے یہ داغ بھی کب مٹتا ہے۔ مراد یہ کہ دل کے خاتمہ کے بعد زندگی نہیں بلکہ صرف زندگی کا دھوکا ہے۔

(۳۲۸)

ستم ایجاد رہو گے ستم ایجاد رہے
اس میں اب شاد رہے یا کوئی ناشاد رہے

محبوب نے ہمیشہ عاشقوں پر نت نئے ستم کیے ہیں اور کرتا رہے گا۔ اسے اس کی پروا نہیں کہ اس کے ظلم و ستم سے عاشقوں پر کیا گذرتی ہے۔ یا یہ کہ عاشق اس کی اس جفا کو خوشی سے قبول کرے یا ناخوشی سے۔ وہ اپنی عادت نہیں بدلے گا۔

آپ نے عہد کیا ہے میری غم خواری کا
اب اجازت ہو تو یہ عہد مجھے یاد رہے

محبوب نے عاشق پر مہربانی کا وعدہ کیا ہے۔ عاشق جانتا ہے کہ وہ ایسے وعدہ یاد نہیں رکھا کرتا لیکن پاسِ ادب سے یہ بھی نہیں دریافت کر سکتا کہ تم اس وعدہ کو بھی پچھلے وعدوں کی طرح فراموش تو نہیں کر دو گے بلکہ صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس وعدہ کو یاد رکھوں اور اس پر یقین کر لوں۔ بڑا لطیف طنز ہے۔

کو مری توبہ کو مقبولِ شکست تو یہ
میری تدبیر میں تقدیر کی افتاد رہے

جو لوگ نظریہ جبر کو مانتے ہیں ان کے نزدیک نہ گناہ کرنا انسان کے بس میں ہے نہ توبہ کرنا۔ وہ جو بھی کرتے ہیں تقدیر یا مشیت کے اشارہ پر ہوتا ہے۔ شاعر نے توبہ تو کی ہے مگر وہ خواہش کرتا ہے کہ اس کی تدبیر (توبہ) تقدیر کے زیرِ اثر پاش پاش ہو جائے۔ اشارہ یہ کہ ہم گناہوں سے بچنا بھی چاہیں لیکن ہماری تقدیر میں گناہ کرنا لکھا جا چکا ہے تو ان سے بچ نہیں سکتے۔ توبہ کرنا چونکہ انسان کا اپنا فعل ہے اس لیے اسے تدبیر مانا ہے اور توبہ کا ٹوٹنا اس کے اختیار سے باہر ہے اس لیے اسے تقدیر کا قائم مقام کہا ہے۔

قیدِ ہستی سے بہت تم نے کیے ہیں آزاد
کوئی اس قیدِ محبت کی بھی میعاد رہے

محبوب نے بہت سے عاشقوں کی جان لے کر انھیں قیدِ ہستی سے رہائی دلائی ہے۔ عاشق بھی اس سے ملتجی ہے کہ تمھاری عنایت ہوگی۔ اگر تم ہمیں اس قیدِ محبت سے آزاد کرا دو۔ اشارہ یہ ہے کہ عشق کی زنجیر جو مر کر بھی نہیں ٹوٹتی۔ اس سے رہا کرا سکتے ہو تو ہم کو کرا دو۔

وہ خدائی ہو تو ہو، شانِ تجلی تو نہیں
جس تجلی میں نگاہوں کو خدا یاد رہے

اگر محبوب (اللہ تعالیٰ) کے جلوہ کو دیکھ کر یہ احساس باقی رہے کہ یہ خدا کا جلوہ ہے تو یہ تجلّی نہیں کہلائے گی۔ ہاں اس کو خدائی کہا جا سکتا ہے۔ حقیقی تجلّی تو وہ ہے جو عاشق کے وجود کو ختم کر دے اور من و تو کا فرق مٹا دے۔

ظلم ہے تجھ سے یہ تقریبِ تکلّف منسوب
ورنہ تقدیرِ وفا یہ ہے کہ برباد رہے

عاشق کی قسمت میں بربادی و ناکامی تو ازل سے لکھی گئی ہے۔ لوگوں نے محبوب کو اس کی بربادی کا ذمہ دار سمجھ لیا ہے یہ تو صرف ان کا ایک تکلفانہ انداز ہے۔

دلِ آباد کا فانیؔ کوئی مفہوم نہیں
ہاں مگر جس میں کوئی حسرت برباد رہے

دل کی قسمت میں آبادی ہے ہی نہیں۔ شاعر کے نزدیک دل آباد کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس میں ناکام تمنائیں اور حسرتیں بسی ہوں۔

(۳۲۹)

وہ مشقِ خوئے تغافل پھر ایک بار رہے
بہت دنوں میرے ماتم میں سوگوار رہے

تم کب تک ہماری موت کے غم میں سوگوار رہو گے۔ اس سوگ کو اب ختم کر دو اور اپنی بے نیازی اور طرزِ تغافل کو پھر سے اپنا لو۔

خدا کی مار جو اب دل پہ اختیار رہے
بہت قرار کے پردہ میں بے قرار رہے

ہم نے بہت دنوں اپنے اضطراب و بے چینی کو چھپایا ہے اور ظاہری اطمینان کا سوانگ رچا کر اپنے آپ کو اذیت دی ہے۔ مگر اب ہم نے سوچ لیا ہے کہ دل کو قابو میں رکھنے کی ناکام سعی نہیں کریں گے۔

کسی نے وعدۂ صبر آزما کیا تو ہے
خدا کرے کہ مجھے تابِ انتظار رہے

محبوب نے آنے کا وعدہ کیا تو ہے۔ خدا ہمیں اتنی طاقت دے کہ اس کے صبر آزما وعدہ کے ایفا تک انتظار کر سکیں۔

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ارے توبہ
کوئی مزار میں، کوئی سرِ مزار رہے

عاشق زندگی بھر محبوب سے ملاقات کی حسرت میں تڑپتا رہا۔ مرنے پر وہ عاشق کی قبر کے سرہانے آیا ہے تو عاشق اس قدر مجبور ہے کہ اس کے قریب بھی نہیں آ سکتا۔ اس سے بڑھ کر محرومی و مجبوری کیا ہو گی۔

سکون موت میری لاش کو نصیب نہیں
رہے مگر کوئی اتنا نہ بے قرار رہے

خدا کسی کو ہماری سی بے چینی و بے قراری نہ دے کہ مر کر بھی ہمیں سکون نہیں اور ہماری لاش اسی طرح تڑپ رہی ہے۔

میں کب سے موت کے اس آسرے پہ جیتا ہوں
کہ زندگی مری مرنے کی یادگار رہے

ہم زندگی کے غم و آلام کو صرف اس خیال سے برداشت کر رہے ہیں کہ یہ زندگی بھی موت سے مشابہ ہے۔ یعنی موت کی تمنا تھی، وہ تو ملی نہیں۔ زندگی موت کی تصویر بن گئی۔

جو دل بچا نہ سکے جان کیا بچا لیں گے
نہ اختیار رہا ہے، نہ اختیار رہے

ہمارا نہ اپنے دل پر قابو تھا نہ جان پر۔ دل چلا گیا تو ہم نے کیا کر لیا۔ اسی طرح جان بھی

جائے گی تو کیا کر لیں گے۔

میں غم نصیب وہ مجبورِ شوق ہوں فانیؔ
جو نامراد جیے اور اُمیدوار رہے

ہم دل میں آرزوؤں کو قائم کرنے پر مجبور ہیں اور ہماری مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے جو مسلسل نامراد و ناکام ہونے کے بعد بھی توقعات قائم کرتا ہے۔ مومن نے کہا ہے: آہ طولِ امل ہے روز افزوں   گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا

(۳۳۰)

گردشیں جام و سبو کرتے رہے   زند مشقِ ہائے و ہو کرتے رہے

زندگی کے میخانہ کی رونق ازل سے باقی ہے۔ جام و سبو کی گردش میں کوئی فرق آیا نہ زندوں کی ہائے و ہو میں۔

ان کی آواز آ رہی تھی دل کے پاس   دیر تک کچھ گفتگو کرتے رہے

عشق کی ایک منزل وہ بھی ہے جہاں خیال کی مدد سے دوریاں قربتوں میں بدل جاتی ہیں۔ عاشق کو اپنے دل کے قریب سے محبوب کی آواز آتی محسوس ہوتی ہے اور وہ جتنی دیر چاہے محبوب سے گفتگو کرتا ہے۔

روز بڑھتی ہی رہی اک آرزو   روز ترکِ آرزو کرتے رہے

زندگی میں خواہشات کو ترک کرنا ممکن نہیں۔ جتنا ہم نے دل سے آرزوؤں کو نکالنے کی کوشش کی اتنا ہی نت نئی آرزوئیں دل میں پیدا ہوتی رہیں۔

یہ بھی وحشت تھی کہ دامن کرکے چاک   ہم تکلّف سے رفو کرتے رہے

دیوانہ کے ہر کام میں وحشت اور بے معنی پن ہوتا ہے۔ وہ خود ہی اول دامن کو چاک کرتا ہے پھر بڑے اہتمام سے اسے رفو کرتا ہے۔

دل میں رہتے تھے وہ فانیؔ اور ہم
جستجو سی جستجو کرتے رہے

ہم نے محبوب کی تلاش میں سارا عالم چھان مارا اور وہ خود ہمارے ہی دل میں مکین تھا۔

میرؔ کا شعر ہے:

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(۳۳۱)

اے موت تجھ پہ عمرِ ابد کا مدار ہے
تو اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار ہے

زندگی میں موت کے سوا کوئی چیز یقینی نہیں اور موت ہی کے ذریعہ انسان کو ابدی زندگی ملتی ہے۔ گویا موت ہی اس بے اعتبار زندگی کو بھروسہ کے قابل بناتی ہے۔

عہدِ ازل پہ زندگیوں کا مدار ہے
عالم تمام غم کدۂ اعتبار ہے

روزِ ازل اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح سے "اَلَستُ بِرَبِّکُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) کا خطاب کیا تھا۔ جواب میں اس نے کہا تھا "ہاں"۔ یہ ایک عہد تھا جو روحِ انسانی نے خدا سے کیا تھا۔ عبدیت کا یہ تعلق ہی انسان کے دنیاوی وجود کی بنیاد ہے۔ اور دنیا کا یہ غم کدہ اسی اعتبار پر قائم ہے۔ مراد یہ کہ اگر انسان نے خدا سے یہ عہد نہ کیا ہوتا تو دنیا بھی وجود میں نہ آتی جہاں اگر اسے اپنے وعدہ پر قائم رہنے کا امتحان دینا پڑتا ہے

ذراتِ چشمِ شوق ہیں آمادۂ نگاہ
محرومیوں کو اب بھی ترا انتظار ہے

عاشق دید سے محرومی کا غم لیے ہوئے خاک میں مل گئے مگر ان کی حسرت بھری آنکھیں مٹی میں مل کر بھی محبوب کو دیکھنے کے انتظار میں سراپا نگاہ بنی ہوئی ہیں۔

بے داد کا گلہ تو کرو اور جو وہ کہیں
"یہ کہئے امتحانِ وفا ناگوار ہے"

میں محبوب کے ظلم و ستم کی شکایت اس ڈر سے نہیں کرتا کہ کہیں اس کو یہ بدگمانی نہ پیدا

ہو جائے کہ میں عشق کے امتحان سے گذرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ اس کی جفا بھی عاشق کے امتحان کے لیے ہے۔

اک یہ وفا کہ ننگِ غمِ دوست ہے ہنوز
اک وہ ستم کہ حسن کا آئینہ دار ہے

محبت کا غم ہماری وفا کو بھی اپنے لیے باعثِ ننگ اور نامعتبر تصور کرتا ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ اس کے ستم اور جفا کو بھی اس کی اداؤں کا ایک حصہ تصور کرتے ہیں اور اسے عزیز رکھتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔

تمیزِ حسن و عشق نہ عرفانِ غم مگر
اک تیرِ بے پناہ کلیجہ کے پار ہے

ہمیں نہ تو غم محبت کا ہی عرفان ابھی حاصل ہو سکا ہے اور نہ ہم حسن و عشق کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں۔ بس ایک خلش سینہ میں محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی بے پناہ تیر چبھ گیا ہو۔ شیفتہ کا شعر ہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

دیکھیں خرامِ ناز کی محشر طرازیاں
ہر ذرہ پرسکونِ فنا بے قرار ہے

محبوب کی فتنہ پرور رفتار سے خاکِ عاشق کا ہر ذرہ سکونِ فنا سے بیدار ہو کر بے قراری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی چال بھی قیامت کی طرح مردوں کو جگاتی ہے۔

مختار ہوں کہ معترفِ جبرِ دوست ہوں
مجبور ہوں کہ یہ بھی کوئی اختیار ہے

ہم اس لحاظ سے تو زندگی میں مختار کہے جا سکتے ہیں کہ ہم اپنے محبوب (اللہ تعالیٰ) کے دیے ہوئے جبر کو قبول کر کے اس کا شکر ادا کر سکتے ہیں لیکن ہم اپنی مرضی سے کوئی کام کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ گویا ہمارا اختیار بھی مجبوری کی شکل ہے۔

اب کس کو اعتبار کہ تو بے وفا نہیں
اب کس کو انتظار، مگر انتظار ہے

عاشق کی مجبوری ملاحظہ ہو کہ محبوب کی بے وفائی کا یقین اور اس کے آنے کی امید

نہ ہونے کے باوجود اس سے اُلفت کرنے اور اس کا انتظار کرنے پر مجبور ہے۔

باقی نہیں کسی کو نشاطِ جنوں کا ہوش
کس جوش پر شبابِ غمِ روزگار ہے

دنیا کے غم و الم اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اب کسی کو جنون (محبت) کی نشاط و سرمستی بھی یاد نہیں۔ ے دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

آدابِ عاشقی کا تقاضا ہے اور بات
تو ورنہ دل کی آڑ میں خود بیقرار ہے

عشق صادق ہو تو محبوب پر بھی اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے دل کی بے قراری اس بات کی علامت ہے کہ تو بھی اس طرح بے چین ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عشق کے آداب اور رسوم کی وجہ سے تو اس کا اظہار نہ کرے۔

ہوگی کسی کو فرصتِ نظارۂ جمال
فانی خرابِ حسنِ تماشائے یار ہے

فانی تماشائے حسنِ یار سے اس قدر مست اور وارفتہ ہو گئے ہیں کہ اب اس کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ وہ اور لوگ ہوں گے جنھیں اس کے جلووں کو دیکھنے کی طاقت و حوصلہ ہوگا۔

(۳۳۲)

جلوہ تیرا طلسمِ حجاباتِ نور ہے
جو جس قدر قریب ہے اتنا ہی دور ہے

محبوب کے حُسن پر کوئی پردہ نہیں۔ اس کے جلووں کی ضیا اور حُسن ہی اس کا پردہ بن گیا ہے اور یہ ایسا طلسماتی پردہ ہے کہ قریب ہو کر بھی کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا بلکہ جتنا بھی قریب جاؤ اس کو سمجھنا اور مشکل ہوتا جاتا ہے۔ ع معلوم یہ ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا

صرفِ دلِ شکستہ نہ کر نشۂ حیات
اب ظرفِ مئے اُٹھا کہ یہ پیمانہ چور ہے

ہمارا دل جو ایک ٹوٹے ہوئے پیمانہ کی طرح ہے، اس قابل نہیں کہ زندگی کے نشہ کا متحمل ہو سکے۔ اور جب دل کا پیمانہ ہی چور ہو چکا ہے تو پھر شراب کی محفل سجانے سے کیا

حاصل۔ بہتر ہے کہ اب اس محفل کو ہی خیرباد کہہ دیا جائے۔ مراد یہ کہ دل کے ٹوٹ جانے کے بعد زندگی کا لطف نہیں رہتا۔ اس لیے کہ اس سے دستکش ہونا ہی بہتر ہے۔ فانی کا سوچنے کا انداز غالب سے بالکل مختلف ہے جو پیمانہ کو اس وقت تک سامنے دیکھنا چاہتے ہیں جب تک آنکھوں میں ذرا سا بھی دم باقی ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

تسلیم ہیں مجھے بھی تری بے نیازیاں   یہ کیا کہوں کہ میری تمنّا غیور ہے

ہم نے محبوب کی بے نیازی کو تسلیم کر لیا ہے اور اس سے کوئی التجا نہیں کرتے۔ بظاہر اس کی وجہ محبوب کی بے نیازی اور غرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمنائیں اتنی غیور ہیں کہ اس سے کوئی سوال نہیں کرتیں۔ اب یہ بات اس کے سامنے کیا کہیں۔

وہ دیکھ سامنے ہیں نشیب و فراز شوق   بڑھ اور دو قدم کہ یہ ایمن وہ طور ہے

طور = وہ پہاڑ جس پہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھا۔
ایمن = وہ وادی جہاں طور واقع ہے۔

شاعر خود سے کہتا ہے کہ وادیٔ ایمن اور کوہ طور کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ یہ راہِ عشق کے نشیب و فراز ہیں۔ تو بھی آگے قدم بڑھا کر ان سے گذر جا۔ مراد یہ کہ عاشق میں حوصلہ ہو تو تو اسے ہر جگہ وادیٔ ایمن اور کوہ طور نظر آئیں گے اور وہ محبوب کے جلوؤں کو دیکھ سکتا ہے۔

گھٹنا ہی چاہتا ہے گریباں کا فاصلہ   پھر دستِ شوق دامنِ جاناں سے دور ہے

محبوب سے دوری کا احساس عاشق کو وحشت پر آمادہ کر رہا ہے اور اس کا دستِ وحشت اب گریبان پر پہنچنے ہی والا ہے۔

ہر مژدۂ نشاط سے محروم کر دیا   ارشاد ہے کہ ہجر میں جینا ضرور ہے

ہجر کی تکلیفوں میں نشاط و سکون کی بھی ایک صورت تھی کہ موت کے ذریعہ ہم سکون پا جائیں گے مگر محبوب نے چلتے وقت زندہ رہنے کی تاکید کر کے ہمیں خوشی کی اس نوید سے محروم کر دیا۔

تجدید زندگی تو محالات سے نہیں
فانی مگر یہ ان کی مروت سے دور ہے

محبوب کے لیے عاشق کو پھر سے زندہ کر دینا کوئی مشکل کام نہیں مگر محبوب اتنا بے مروت نہیں کہ اسے پھر سے زندگی کی الجھنوں میں گرفتار کر دے اور اس سے یہ مسرت چھین لے۔

(۳۳۳)

ہر تصوّر جلوۂ صورت کا کفر انگیز ہے
خاکِ دل اللہ اکبر کیا ہی کافر خیز ہے

عاشق کے دل کے آئینے میں محبوب کے جلوے بسے ہوئے ہیں اور اسی شوق یا تصوّر کی بدولت اسے ہر چیز میں محبوب کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ گویا انسان کی شدّت شوق ہی ماسوا کے جلووں یا کفر کی محرک ہے۔ حسن معنی کے پرستاروں کی نظر میں حسن صورت (ماسوا) کا تصوّر بھی کفر ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

بھر کے ساقی ایک جام زہر مے آلود لا
یعنی خاکم در دہن آج آتشِ دل تیز ہے

آج ہمارے دل کی آگ کچھ زیادہ بھڑکی ہوئی ہے۔ اس کو بجھانے کے لیے شراب بھی کافی نہ ہوگی۔ ساقی آج تو زہر کا جام بھر کر دے اور اس میں شراب کی بھی تھوڑی سی آمیزش کر دے تاکہ رسم مے نوشی بھی پوری ہو جائے۔

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں
عالم اک مجموعۂ ذراتِ صحرا خیز ہے

عالم ایسے ذرات کا مجموعہ ہے جن میں ہر ایک ذرہ سے ایک صحرا وجود میں آسکتا ہے۔ یا یہ کہ کائنات کے ہر ذرہ میں صحرا (جو کہ وحشت کی علامت ہے) کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ اس طرح عالم ہوش کا سرمایہ بھی بجز وحشت کے اور کچھ نہیں۔ یہ بات جدید سائنس نے ثابت کر دی ہے کہ

یہ کائنات ذرّوں (ATOMS) کا مجموعہ ہے۔ خیال رہے کہ "عالم" ہوش کی علامت ہے اور صحرا وحشت کی۔

تھی شکست دل مگر تا حدِ آوازِ شکست
ٹوٹ کر بھی دل طلسمِ شوق یاس آمیز ہے

ہمارے دل کی شکستگی شکستِ دل کی آواز سے آگے نہ بڑھ سکی اور کوئی اس سے آگاہ نہ ہو سکا (ظاہر ہے کہ دل کے ٹوٹنے کی آواز سُنی نہیں جا سکتی) ٹوٹنے کے بعد بھی ہمارا دل طلسمات شوق اور بے تابیٔ عشق کا تماشا گاہ بنا ہوا ہے اگرچہ اس شوق میں اب مایوسی بھی شامل ہو گئی ہے۔

ہے فنا آباد غم اک معنیٔ لفظ آفریں
صورت آباد جہاں اک لفظ معنی خیز ہے

غم کی دنیا جس میں فنا کی حکمرانی ہے ایک ایسی معنوی حقیقت ہے جو اپنے لیے الفاظ کا پیراہن یا اپنے اظہار کے وسائل خود پیدا کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس یہ ظاہری عالم جو صورتوں سے آباد ہے محض الفاظ کی طرح ہے جن کی اہمیت معنی کے بغیر کچھ نہیں ہوتی۔ مراد یہ ہے کہ اس عالم صورت کو فنا سے وہی ربط ہے جو الفاظ کو معنی سے ہوتا ہے اور جس طرح الفاظ کی اہمیت معنی سے ہوتی ہے اس کائنات کی اہمیت فنا کی وجہ سے ہے۔

شاید آ پہنچی ہے غم کی آخری منزل قریب
رخشِ ہستی کو جواب ہر سانس اک مہمیز ہے

رخش = گھوڑا   مہمیز = ایڑ۔ گھوڑے کو تیز کرنے کے لیے اس کے پیٹ پر ایڑیوں سے جو چوٹ لگائی جاتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ غم کی آخری منزل (موت) شاید اب قریب آ گئی ہے۔ ہر سانس ہم کو اس منزل کی طرف تیزی سے لے جا رہی ہے گویا یہ سانسیں ایک مہمیز ہیں جو زندگی کے تیز رفتار گھوڑے کو اور تیز کر رہی ہیں۔

جلوہ کیا دیکھے کوئی، قدرت کسے فرصت کہاں

ہاں نقابِ جلوہ خود حسنِ تماشا ریز ہے

حسن تماشا ریز = حسن کا چھن چھن کر باہر آنا

محبوب کے چہرہ کو دیکھنے کی نہ کسی کو تاب تھی نہ فرصت۔ اسی لیے اس نے چہرہ پر نقاب ڈال لی ہے۔ مگر اس کا حسن نقاب میں سے چھن چھن کر باہر آ رہا ہے اور ہم اس میں محو ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک کائنات کے مظاہر حسن الٰہی کا پردہ بھی ہیں لیکن انہی سے اس کا جلوہ آشکار بھی ہوتا ہے۔

گو نہیں جز ترکِ حسرت دردِ ہستی کا علاج

آہ وہ بیمار جو آزردۂ پرہیز ہے

دنیا کے غموں سے نجات پانے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ دنیا کی آرزو یا خواہش سے بچا جائے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی انسان خواہشوں سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ گویا انسان کی حالت اس بیمار سے مشابہ ہے جو پرہیز سے بھاگے۔

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے   پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

مایۂ ادراکِ ہستی ہوں تکلّف برطرف

زندگی میری دروغِ مصلحت آمیز ہے

میری ہستی حقیقت نہ سہی باطل ہی سہی لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میری ہی بدولت اور میرے ہی ذریعہ سے ہستی حقیقی کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ گویا میری ہستی باطل ہی سہی لیکن اس میں محبوب (حقیقی) کی یہ مصلحت بھی شامل ہے کہ میرے وسیلہ سے اس کا ادراک ممکن ہے۔ انسان کی ہستی کو دروغ مصلحت آمیز کہنا بالکل نئی بات ہے۔

مرگ فانی کو ہے یارب آہ اب کیا انتظار

دیر سے پیمانۂ عمرِ وفا لبریز ہے

ہم وفا کی آخری حد تک آ چکے ہیں۔ اب موت کا مزید انتظار ممکن نہیں۔ اے خدا اب تو موت میں دیر نہ لگا۔

(۳۳۴)

تو ہی سفر میں پاس ہے تو ہی حضر میں پاس ہے
تو ہی جنوں کا آسرا تو ہی سکوں کی آس ہے

ہم چاہے حالت جنوں میں دشت نوردی کریں یا عالم سکون میں گھر کے اندر بیٹھے رہیں تو ہی ہمارا رہنما اور سہارا ہوتا ہے۔

واہ رے شانِ یادِ ذات، واہ رے اعتمادِ ذات
غم ہے نہ اب ملال ہے، ڈر ہے نہ اب ہراس ہے

ہمارے دل میں ذاتِ الٰہی کی یاد ہے اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے اسی لیے ہمیں ہر خوف و ہراس اور غم و ملال سے نجات مل گئی ہے۔ اس شعر میں اس آیت قرآنی کی تلمیح ہو سکتی ہے۔ "لاخوفٌ علیھُمْ وَلاھُمْ یَحزَنون" (خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔)

وہم و قیاس کے سوا حاصلِ ہوش کچھ نہیں
فہم کی ابتدا ہے وہم، عقل کی حد قیاس ہے

عقل کا حاصل وہم و قیاس ہوتا ہے اور جنون کا حاصل یقین۔ انسان فہم کی کسی منزل پر کیوں نہ پہنچ جائے اس کی معلومات قیاسات و مفروضات پر ہی قائم ہوتی ہیں۔ گویا عقل کی ابتدا، وہم و شک سے ہوتی ہے اور انتہا قیاس پر۔

ہائے وہ تیرے ذکر میں یہ بھی ہے آرزو کہ کاش
کوئی کہے کہ بزمِ ناز تو جو نہیں اداس ہے

محبوب کی محفل سے آنے والے ہر شخص سے ہم بڑے اشتیاق سے محبوب کا ذکر چھیڑتے ہیں۔

اس میں در پردہ ہماری یہ آرزو بھی شامل ہوتی ہے کہ کوئی یہ بھی کہہ دے کہ تیرے آنے کے بعد سے اس کی محفل میں اداسی چھاگئی ہے۔

چل تو رہے ہیں سب مگر کوئی ہے منزل آشنا؟
مدعیانِ آرزو! دل بھی کسی کے پاس ہے

محبت کے راہی تیری تلاش میں سرگرداں تو ہیں مگر کسی کو منزل کی خبر نہیں۔ ان مدعیانِ آرزو کو یہ بھی خبر نہیں کہ جس کی تلاش میں یہ بھٹک رہے ہیں وہ تو خود ان کے دل کے پردے میں پنہاں ہے۔

جو ہے شہیدِ انتظار، جو ہے ترا امیدوار
زیست بھی اس کی زیست ہے، موت بھی اس کو راس ہے

جو تیری یاد میں زندگی گزار دے اور تیرے انتظار میں ختم ہو جائے۔ اس کی زندگی زندگی کہے جانے کے قابل ہے اور اس کی موت کامیاب ہے۔

موت اسکی ہے حیات اسکی ہے قسمت اس کی
جو ترے نام پہ سو جان سے قرباں ہو جائے

حسن ستم نواز کی ایک نگاہِ غم نواز
اجرِ ہزار صبر ہے، نازشِ صد سپاس ہے

سپاس = شکریہ
ستمگر محبوب اگر کبھی ایک نوازش کی نظر عاشق پر ڈال لیتا ہے تو وہ اس کے تمام صبر و ضبطِ غم کا بدل بن جاتی ہے اور اس پر وہ جتنا بھی شکر کرے کم ہے۔

ترکِ خودی ہے ہوشِ عشق، درکِ خودی ہے جوشِ عشق
خود نشناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

درک = ادراک، فہم
خود نشناس = خود کو بھلادینے والا۔
خود شناس = خود کو پہچاننے والا۔

عاشق اگر عشق میں اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے تو اسے عشق کا عرفان حاصل ہوتا ہے لیکن اگر وہ اپنی حقیقت کو پہچان لیتا ہے اور اپنی خودی کی حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو یہ بھی عشق ہی کا فیض اور عظمت ہے۔ گویا انسان اگر خود شناس بنے یا خود کو مٹا دے، دونوں صورتوں میں وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ اقبال کی طرح فانی بھی خودی اور بے خودی دونوں کو عشق کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ غالب کے یہاں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

فانی اس انقلاب سے وحشت عشق کی پناہ
آہ وہ بزم دل جو آج انجمنِ حواس ہے

عاشق کا دل جو جنون کی آماجگاہ تھا۔ آج اس میں ایسا انقلاب رونما ہوا ہے کہ وہ ہوش کی محفل بن گیا ہے۔ عاشق وحشت عشق سے مدد کا طالب ہے کہ وہ اسے اس ہوش کی حکمرانی سے نجات دلائے۔

(۳۳۵)

ذرّہ ذرّہ تربتِ فانی کا شیون جوش ہے
اس صفِ ماتم میں اک شمع لحد خاموش ہے

ہمارے ویران مدفن پر ماتم کا شور بپا ہے اور خاک کا ہر ہر ذرّہ شیون سے ہنگامہ برپا کیے ہوئے۔ اس ہنگامے میں صرف ایک چیز خاموش ہے، وہ ہے شمع مزار۔ شمع بجھ گئی ہے اس لیے اسے خاموش کہا ہے۔ شمع کا بجھ جانا اور ذرّوں کا ماتم کرنا دونوں سے عاشق کی بے کسی ظاہر ہے۔

پھیر لے میّت کی جانب سے نگاہِ التفات
سیکڑوں شکووں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے

محبوب عاشق کی لاش پر نگاہِ التفات ڈال رہا ہے۔ عاشق اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اس کے لبوں پر محبوب کے جو بے شمار شکوے اور گلے بند ہیں کہیں ان کو زبان نہ مل جائے۔

وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر
شوقِ وحدت آشنا بے گانۂ آغوش ہے

میرا جذبۂ شوق حسن مطلق کی یکتائی کا پرستار ہے اور قرب محبوب یا اس سے ہم آغوشی کی تمنا سے بے نیاز ہے۔ میرے مسلک میں وصل اور ہجر دونوں کفر کے مترادف ہیں۔ وصل و ہجر کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب طالب و مطلوب کے درمیان دوئی کا حجاب حائل ہو جبکہ میرا شوق وحدت آشنا محبوب کی ہستی کے علاوہ اور کسی کا قائل ہی نہیں۔

طور تو ہے "رب ارنی" کہنے والا چاہیئے
لن ترانی ہے مگر نا آشنائے گوش ہے

"رب ارنی" حضرت موسیٰ کے الفاظ جو انھوں نے تجلی کی طلب میں کہے تھے۔

لن ترانی = تم مجھے دیکھ نہیں سکو گے۔ خدا کا جواب۔

محبوب حقیقی کے جلوے بھی موجود ہیں اور اس کی جلوہ گاہ بھی مگر کوئی عاشق ایسا نہیں جو اس سے جلووں کی طلب کرے اور جب کوئی "ارنی" کہنے والا ہی نہیں تو "لن ترانی" کی صدا بھی کون سن سکتا ہے۔ صدائے لن ترانی سے یہ مراد ہے کہ اس کے جلووں کو دیکھنا آج بھی ممکن نہیں۔

اک طلسم فیض ہے سینہ میں سوزِ دل کی ذات
بے تکلف ہر نفس ایک شعلۂ خس پوش ہے

ہمارے دل میں عشق کی جو حرارت ہے اس کا فیضان ہماری تمام ہستی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس حرارت کا اثر ہماری سانسوں میں اس طرح ظاہر ہوا ہے کہ ہر سانس خس و خاشاک میں لپٹے ہوئے شعلہ کی مانند لو دینے لگی ہے۔

رازِ آزادی فقط تیرے اسیروں پر کھلا
جو ترے قدموں پہ سر ہے بے نیازِ دوش ہے

وہ لوگ آزادی کے راز سے واقف ہیں جو تیری محبت کے اسیر ہوئے ہیں۔ گویا محبت کی گرفتاری عین آزادی ہے۔ جس نے تیرے قدموں پر سر جھکا دیا وہ ہر چیز یہاں تک کہ کاندھوں کے بوجھ سے بھی بے نیاز ہو گیا۔

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

زندگی فی نفسہٖ کیا چیز ہے یہ تو بتانا ممکن نہیں لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو لوگ موت کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ زندگی کے شعور کا نام ہے۔ بقول شاعر:

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا دردِ سر جانا　　اجل کیا ہے، خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

۳۳۶)

گردشِ ایام فانیؔ شرحِ دورِ شام ہے　　صبح کہتے ہیں جسے وہ شام کا پیغام ہے

ہماری زندگی میں صرف شام کی تاریکیاں ہیں اور صبح کی روشنی کا گذر نہیں۔ دن اور رات کی گردش ہمارے نزدیک ایک مسلسل شام کا دور ہے اور صبح بھی آنے والی شام کا پیغام دیتی ہے۔ غم نصیبوں کی زندگی میں جو تاریکی ہوتی ہے اس کی وجہ سے انھیں صبح بھی تاریک لگتی ہے۔

بقول جگر: دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں　　ایک رات آئی، ایک رات گئی

عہدِ پاکِ عشق میں کل تک ہوس گمنام تھی　　آج اس دورِ ہوس میں عاشقی بدنام ہے

وہ بھی دور تھا جب عشق کی حکمرانی تھی اور کوئی ہوس کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ آج ہوس کا دور دورہ ہے اور عاشقی رسوا ہو گئی ہے۔

آہ اس معمورۂ عالم کی ویرانی نہ پوچھ　　ہم ہیں، تیری یاد ہے، آگے خدا کا نام ہے

یہ آباد دنیا ہمیں کیسی خالی اور ویران دکھائی دیتی ہے۔ اس کا بیان مشکل ہے۔ ہماری نظروں میں یہاں محبوب کی یاد کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یعنی اس کے بعد بس خدا کا نام ہے۔ اس محاورہ نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔

آنکھ پھر بھی منتظر ہے دل ہے پھر بھی مضطرب   خاص ہے تیری تمنّا اور تماشا عام ہے

تیری تمنّا کی دولت سے صرف اہلِ دل نوازے جاتے ہیں لیکن تیرے حُسن کے جلوے سب کے لیے عام ہیں مگر شاعر کا عشق ان دونوں مقامات سے آگے ہے اس لیے اس کی نگاہ محبوب کی دید کی اب بھی منتظر ہے اور اس کا دل اب بھی بے قرار ہے اور ان جلووں سے اس کی تسکین نہیں ہوتی جو عوام کے لیے ہیں۔

وعدۂ معلوم کا فانی کہاں تک انتظار   زندگی کا موت سے پہلے بھی کچھ انجام ہے

وعدۂ معلوم = موت کا وعدہ جو برحق ہے۔

فانی تم موت کی راہ کب تک دیکھو گے۔ تم چاہو تو اس زندگی کو بھی موت کا قائم مقام کرو۔ عربی کا مقولہ ہے: مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا

ع : کہ قبل از مرگ مر جانا حیاتِ جاودانی ہے

(۳۳۷)

عیشِ جہاں باعثِ نشاط نہیں ہے   خندۂ تصویر، انبساط نہیں ہے

شاعر کے نزدیک عالم کی حیثیت محض اعتباری ہے اور انسان کی ہستی ایک نقش یا تصویر کی مانند ہے جس طرح کسی تصویر کی ہنسی حقیقی انبساط و خوشی کا مظہر نہیں ہو سکتی اسی طرح اس دنیا کا عیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور بے معنی ہے۔

گریہ کے آداب کے حواس ہیں کس کو   ہائے کہ اب تاب احتیاط نہیں ہے

ہمارے ضعف کا یہ عالم ہے کہ اب احتیاطِ عشق کا پاس بھی نہیں کر سکتے اور آنسو بہانے پر مجبور ہیں۔

روح کو کیوں تن سے اختلاط ہے باقی   دہر میں اب رسم اختلاط نہیں ہے

اختلاط = دوستی، میل

دنیا سے دوستی اور محبت کی رسمیں اٹھ چکی ہیں اور کوئی اب کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ پھر نہ معلوم روح کیوں جسم کا ساتھ نبھائے جاتی ہے۔ مراد یہ کہ اس بے مہر زمانہ میں ہم کیوں زندہ ہیں۔

طاقتِ دل دے چکی جواب پر اب تک
قوتِ غم رو بہ انحطاط نہیں ہے

دل میں غم سہنے کی طاقت باقی نہیں رہی پھر بھی غمِ عشق کی قوت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔

ان کی جفا میں بھی اب وفا کا نہیں رنگ
غیر سے بھی اب وہ ارتباط نہیں ہے

ارتباط = تعلق۔

محبوب غیر پر مہربان تھا۔ اس کا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے تکلیف دہ سہی مگر ساتھ میں یہ آسرا بھی تھا کہ چلو ہم سے نہ سہی، وہ کسی سے تو وفا کرتا ہے۔ یعنی اس کی جفا میں وفا بھی شامل تھی۔ مگر اب اس نے غیر سے بھی تعلق توڑ دیا ہے اور وفا سے یکسر بیگانہ ہو گیا ہے۔

داغ بہ اندازۂ جگر نہیں فانیؔ
نقش بہ اندازۂ بساط نہیں ہے

محبت کے غم جان لیوا سہی مگر ہمارے حوصلۂ غم کے آگے کچھ بھی نہیں اور یہ داغ ہمارے دل و جگر کی وسعت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ داغِ محبت کو تصویر اور دل کو بساط (کینوس) کہنے میں ندرت اور معنویت دونوں ہیں کیونکہ جس طرح کینوس بغیر نقش کے بے حقیقت ہے اس طرح دل بغیر غم کے نقش و نگار کے بے کار۔

(۳۳۸)

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے
اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے

ہم یادِ محبوب میں اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اب غم کا احساس اور نالہ و فریاد بھی باقی نہیں۔ اب اس کی یاد کے سوا ہمیں کچھ یاد نہیں ہے۔

آتی ہے صبا سوئے لحد ان کی گلی سے
شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

محبوب کے کوچے سے جو ہوا ہماری قبر کی طرف آ رہی ہے شاید وہ اب بھی ہماری بربادی کے

در پے ہے اور چاہتی ہے کہ ہماری خاک بھی آرام سے نہ رہے بلکہ آوارہ و برباد ہو جائے۔

اللہ بچائے اثرِ ضبط سے ان کو   بیداد تو ہے شکوۂ بیداد نہیں ہے

محبوب کی بیداد پر عاشق صبر کیے ہوئے ہے۔ اس ضبط سے اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے اس کی اسے پروا نہیں۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں محبوب پر اس کا صبر نہ پڑ جائے۔

دل خوگرِ اندوہ ہے کیا وصل سے خوش ہو   ہر چند کہ ناشاد نہیں، شاد نہیں ہے

ہم غم کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ محبوب سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوتی ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم اس کے وصل سے ناخوش ہیں مگر سچ یہ ہے کہ خوش بھی نہیں۔

اپنی ہی بدولت ہے نشیمن کی خرابی   منت کشِ بیدادئ صیاد نہیں ہے

ہمارے آشیاں کی بربادی کی ذمہ داری صیاد پر نہیں خود ہماری بدنصیبی اس کی ذمہ دار ہے۔

آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستمگر   فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے

قسمت کی ستم ظریفی دیکھو کہ جب محبوب ہماری حالت سے متاثر ہو کر ہماری فریاد سننے پر آمادہ ہوا تو ہم میں فریاد کی طاقت باقی نہیں ہے۔ ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دنیا میں دیارِ دلِ فانی کے سوا ہائے   کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے

ہر بستی کبھی نہ کبھی آباد ہو جاتی ہے مگر فانی کا دل ایسا شہر ہے جس کے نصیب میں آباد ہونا نہیں۔ ع: جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

(۳۳۹)

نصیب ہو بھی تو کیا لطفِ وصلِ یار میں ہے
سوائے عیش، سو تقدیرِ انتظار میں ہے

وصلِ محبوب کی تمنّا سے کیا حاصل۔ اگر بالفرض محبوب ملنے پر آمادہ ہو بھی جائے تو بھی ہم کسی عیش و مسرت کی توقع تقدیر سے نہیں رکھتے کیونکہ وہ تاک میں لگی رہتی ہے اور اسے ہماری کوئی خوشی منظور نہیں۔

فلک نے یوں تو جو چاہا کیا، ستم تو یہ ہے
شمارِ دل بھی ستم ہائے بے شمار میں ہے

آسمان نے یوں تو بے شمار ستم ہمارے اوپر توڑے اور ہم نے کوئی شکایت نہ کی۔ لیکن اس نے سب سے بڑا ستم یہ کیا کہ ہمیں دل دے دیا۔ (دل سے مراد قوتِ احساس) مراد یہ کہ ہمارا دل ہی ساری محرومیوں اور غموں کا سرچشمہ ہے۔

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے   دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

قضا یہ اب ہے مری زندگی کا دار و مدار
سو وہ بھی ان کی اداؤں کے اختیار میں ہے

ہم موت کے انتظار میں زندگی گزار رہے ہیں کہ وہ ہی ہمارے دکھوں کے خاتمہ یا نجات کا سبب ہے لیکن کیا کریں کہ موت پر بھی اپنا اختیار نہیں۔ وہ بھی محبوب ہی کی اداؤں کی تابع اور اس کے اشارہ کی پابند ہے۔

عزیزِ خاطرِ فطرت ہے جانِ عبرت ہے
ہر ایک ذرہ جو اس عالمِ غبار میں ہے

اس دنیائے آب و گل کا ایک ایک ذرہ فطرت کو عزیز ہے اور اس کی مشیت کے کسی نہ کسی مقصد کو پورا کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر چشمِ بینا ہو تو ہر ذرّہ دیکھنے والے کے لیے سامانِ عبرت بھی ہے۔

سرشتِ برق سرِ غیر ہو خدا نہ کرے
وہ اضطراب کہ جانِ امیدوار میں ہے

شاعر محبت کی بے چینی کو بہت بڑی دولت اور صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ جو بے چینی اور اضطراب اس کا حصہ ہے۔ اس کی بجلیاں دشمن پر گریں اور وہ بھی اس کا حصہ دار بنے۔

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل
غریبِ کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

انسان کی زندگی جبر اور اختیار کی ایک کشمکش ہے ایک طرف تو وہ اپنے گناہوں اور اعمال کا جوابدہ اور ذمہ دار بھی ہے اور دوسری طرف اس کی قسمت پہلے سے لکھ دی گئی ہے۔ جبر و اختیار کے درمیان کی اس کیفیت نے اس کی حالت کو قابلِ رحم بنا دیا ہے۔

حریفِ سوزِ نہاں تو نہیں مگر پھر بھی
بلا کی آگ اس آہِ شرارہ بار میں ہے

اگرچہ ہماری آہیں ہمارے سوزِ دل کی پوری عکاس تو نہیں پھر بھی ان میں وہ گرمی اور تپش ہے کہ خدا بچائے۔

ہماری لاش مرقع ہے بے قراری کا
اک اضطراب کی صورت بھی اس قرار میں ہے

موت نے ہمیں سکون اور قرار بخش دیا ہے لیکن ہماری لاش پر جو بے کسی اور اذیت کا انداز برس رہا ہے اس نے لاش کو بے قراری کی تصویر بنا دیا ہے اور ہمارے اس ظاہری سکون سے بھی بے چینی کا اظہار ہو رہا ہے۔

چمن سے رخصتِ فانی قریب ہے شاید
کچھ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

اب کی بہار کے انداز کچھ ایسے ہیں کہ شاعر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ بہار اس کی موت کا پیغام بن جائے گی۔

وفا بے گانۂ رسمِ بیاں ہے
خموشی اہلِ دل کی داستاں ہے

محبت اظہار سے بیگانہ ہوتی ہے اور محبّت کرنے والوں کی داستان خاموشی کی زبان میں بیان ہوتی ہے۔

مرا دل ہے کسی کی یاد کا نام
محبّت میری ہستی کا نشاں ہے

ہماری ہستی محبّت کی مرہونِ منت ہے اور ہمارے دل کا وجود محبوب کی یاد کے دم سے ہے۔ گویا محبت ہی ہماری ہستی کا نشان ہے۔

تماشا چاہیے تابِ نظر دے
نگاہِ شوق ہے اور رائگاں ہے

تو نے ہمیں اپنا شوق تو دیا۔ مگر دیکھنے کی طاقت نہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اشتیاق کے باوجود تیرے جمال کے نظارہ سے محروم ہیں اور ہماری نگاہ شوق رائگاں ہو رہی ہے۔ مراد یہ کہ محبوب کے جلووں کو دیکھنے کی طاقت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ یہ اسی کی دین ہے جسے چاہے دے۔

مسلّم پرسشِ بیمار لیکن
وہ شانِ چارہ فرمائی کہاں ہے

چارہ فرمائی = بیماری کا علاج کرنا۔

محبوب اپنے بیمار کی پرسش کو آیا تو ہے مگر صرف دکھاوے کو۔ اس کی پرسش میں وہ تاثیر نہیں جو بیمار کو اچھا کر دے۔

ترا نقشِ قدم ہے ذرّہ ذرّہ
زمیں کہتے ہیں جس کو آسماں ہے

اگر انسان حقیقت کی آنکھوں سے دیکھے تو کائنات کے ہر ذرّہ میں اسے اپنے محبوب (یعنی خدا تعالیٰ) کے نشانات مل سکتے ہیں۔ خدا صرف آسمان پر ہی نہیں۔ یہ زمین بھی اسی طرح اس کے جلووں کی امین ہے جیسے کہ آسمان ہے۔

بچے گی دل کی پامالی کہاں تک
تجلّی کارواں در کارواں ہے

محبوب کے جلوے ہر ہر قدم پر دل کو پامال کرنے کے لئے موجود ہیں۔ کوئی کس طرح اپنے دل کو بچا سکتا ہے۔

مجھی پر ہیں جفائیں چشمِ بد دور
خدا رکھے وہ مجھ پر مہرباں ہے

عاشق محبوب کی جفا کو بھی اس کی عین نوازش خیال کرتا ہے اور اس پر خوش و مطمئن ہے۔

پھر اب منظور ہے ہنگامۂ برق
پھر اب قصدِ بنائے آشیاں ہے

ہم جانتے ہیں کہ بجلیاں ہمارے آشیانہ کی دشمن ہیں۔ اس لیے اب ہم نے جو آشیانہ کی بِنا ڈالنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس سے ہم کو بجلیوں کی ہنگامہ آرائی مقصود ہے۔

وہ دل کی آڑ میں رہتے ہیں فانی
تمنا میرے ان کے درمیاں ہے

محبوب کے اور عاشق کے درمیان سب سے بڑا پردہ اس کی اپنی تمنائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی خواہشات کو فنا کر دے تو درمیان سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور محبوب عاشق میں دوری ختم ہوجاتی ہے۔

(۳۴۱)

جینے کی ہے امید نہ مرنے کا یقیں ہے
اب دل کا یہ عالم ہے نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

عشق میں ہم اس عالم میں پہنچ گئے ہیں جہاں حیات اور موت دونوں بے حقیقت ہو گئے ہیں اور دین و دنیا دونوں کی فکر سے نجات مل گئی ہے۔

گم ہیں رہِ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی
سجدہ ہی درِ یار ہے سجدہ ہی جبیں ہے

ہمارا ذوق ہمیں اس منزل تک لے گیا ہے جہاں جبیں اور سنگِ در کا امتیاز بھی مٹ گیا ہے۔ جہاں نہ اپنا ہوش ہے نہ محبوب کا، صرف مکمل سپردگی باقی رہ گئی ہے اور صرف

سجدہ باقی ہے جو سنگِ درِ یار بھی ہے اور جبینِ شوق بھی۔

ایذا کے سوا لذّتِ ایذا بھی ملے گی
کیوں جلوہ گہِ ہوش یہاں دل بھی کہیں ہے

شاعر اس دنیا سے جو ہوش کی جلوہ گاہ ہے کنارہ کش ہو چکا ہے اور دل کی معیت اختیار کر چکا ہے جہاں اسے ایذاؤں سے لذّت ملتی ہے۔ ہوش کی دنیا میں داخل ہونے کو وہ صرف اس شرط پر تیار ہے کہ اسے یہ لذّتِ غم حاصل رہے۔ مراد یہ کہ غم تو ایک حقیقت ہے جو ہوش والوں اور اہلِ دل دونوں کے حصّے میں آئی ہے لیکن اہلِ دل اس کو باعثِ لذّت جانتے ہیں۔

کچھ مظہرِ باطن ہوں تو کچھ محرمِ ظاہر
میری ہی وہ ہستی ہے کہ ہے اور نہیں ہے

انسان کی ہستی بظاہر فانی اور موہوم ہے لیکن وہ ذاتِ الٰہی کا عکس یا مظہر بھی ہے اور اس کو فانی یا معدوم محض بھی نہیں کہا جا سکتا۔ گویا وہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔

مایوس ہی سہی حسرتیٔ موت ہوں فانیؔ
کس منہ سے کہوں دل میں تمنّا ہی نہیں ہے

اگرچہ ہم نے ہر آرزو کو دل سے نکال دیا ہے پھر بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ کوئی آرزو دل میں نہیں کیونکہ موت کی آرزو تو باقی ہے۔ بقول غالبؔ:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

(۳۴۲)

ساقی! یہ ابھی حاصلِ میخانہ نہیں ہے
پیمانہ بہ اندازۂ پیمانہ نہیں ہے

ساقی نے ہمیں جو جام دیا ہے اس میں ابھی وہ کیفیت نہیں ہے جو ہماری تشنگی کو ختم کر سکے اور جسے میخانہ (نشہ) کا حاصل کہا جا سکے۔ شاعر ایسا جام چاہتا ہے جو کسی کے حصّہ میں نہ آیا ہو۔

تم سے بھی ہو آگاہ پھر اپنی بھی خبر ہو
دیوانہ تمھارا کوئی دیوانہ نہیں ہے

محبوب سے عشق اور اس کے خیال کے بعد اگر عاشق کو اپنے وجود کا بھی احساس باقی ہے تو وہ عاشق نہیں، دیوانہ ہے۔ عاشق کو محبوب کا دیوانہ کہا جاتا ہے مگر وہ واقعی دیوانہ نہیں ہوتا۔ دیوانہ کے دیوانہ ہونے کا خیال بالکل نیا ہے۔

جل جانے کے انداز کوئی شمع سے سیکھے
پروانہ ہے اور کہنے کو پروانہ نہیں ہے

پروانہ کے دل میں بھی عشق کا شعلہ روشن ہے اور شمع بھی اسی آگ میں جلتی ہے لیکن پروانہ کا عشق سب پر ظاہر ہے جبکہ شمع خاموشی سے جل جاتی ہے اور کسی کو اس کے عشق کا علم نہیں ہونے پاتا۔ اس کا یہ انداز عاشقوں کو محبت کا درس دیتا ہے۔

کہتے ہو کہ دلچسپ ہے رودادِ محبت
افسانہ سمجھتے ہو، یہ افسانہ نہیں ہے

محبوب کو جب ہم اپنی روداد سناتے ہیں تو وہ بے دردی سے کہتا ہے کہ کہانی دلچسپ ہے گویا وہ ہماری زندگی کی اس حقیقت کو افسانہ خیال کرتا ہے۔

جن کے آگے غم اک فسانہ ہے
ان سے کہیے فسانۂ غم کیا

کیوں آئے یہاں کوئی تمنا ترے ہوتے
یہ کعبۂ دل ہے کوئی بتخانہ نہیں ہے

محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کے سوا کوئی آرزو دل میں نہ آنے پائے ورنہ یہ محبت نہیں بت پرستی ہو جائے گی اور دل جس کو کعبہ کہا جاتا ہے بت خانہ بن جائے گا۔ کعبہ میں صرف خدا کی پرستش ہوتی ہے اور بت خانہ میں سیکڑوں تصویروں کی۔

اُجڑا ہے تو اب یہ کبھی آباد نہ ہوگا
میرا دلِ برباد ہے ویرانہ نہیں ہے

دل دوسرے ویرانوں کی طرح نہیں جو کبھی آباد بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ایک بار اُجڑ گیا تو پھر کبھی آباد نہ ہو سکے گا۔ بقول میر

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے   پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کے

رونے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں فانیؔ
یہ ان کی گلی ہے ترا غم خانہ نہیں ہے

محبت میں آنسو بہانے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ فانیؔ اتنی بیخودی بھی اچھی نہیں کہ تجھے یہ ہوش بھی نہیں کہ یہ تیرا گھر نہیں محبوب کی گلی ہے جہاں اشک بہانا بھی بے ادبی ہے۔

(۳۴۳)

ابتدائے عشق ہے لطفِ شباب آنے کو ہے
صبر رخصت ہو رہا ہے اضطراب آنے کو ہے

ہم صبر و قرار کو خیر باد کہہ کر محبت کی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ اب زندگی کا اصلی لطف حاصل ہوگا۔

قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہے
آفتاب صبحِ محشر ہم رکاب آنے کو ہے

سُنا ہے محبوب بے پردہ ہماری قبر پر آنے والا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو صبح محشر کا سورج بھی اس کے جلو میں ہوگا۔ یعنی ہمارے لیے قیامت آجائے گی اور ہماری میت قبر سے باہر نکل پڑے گی۔ قیامت میں مُردوں کا قبروں سے باہر نکلنا مسلّمہ عقیدہ ہے۔

مجھ تک اس محفل میں پھر جامِ شراب آنے کو ہے
عمرِ رفتہ پلٹی آتی ہے، شباب آنے کو ہے

محبوب کی محفل میں شراب کا جام گردش کرتا ہوا عاشق کی جانب آ رہا ہے۔ اس خیال سے ہی اسے وہ مسرت ہے گویا اس کی گزری ہوئی زندگی اور جوانی کی کھوئی ہوئی خوشیاں اسے واپس مل رہی ہیں۔

ہائے کیسی کشمکش ہے، یاس بھی ہے آس بھی
دم نکل جانے کو ہے، خط کا جواب آنے کو ہے

نزع کا وقت ہے اور زندگی سے مایوسی ہو چکی ہے۔ مگر عاشق کو اب بھی محبوب کا خط آنے کی امید اور اس کا انتظار ہے۔ آس و ناامیدی کی یہ کشمکش کس قدر کربناک ہے۔

خط کے پُرزے نامہ بر کی لاش کے ہمراہ ہیں
کس ڈھٹائی سے مرے خط کا جواب آنے کو ہے

محبوب نے ہمارے نامۂ محبت کا جواب تو بھیجا ہے مگر کس بیدردی کا کہ ہمارے قاصد کی لاش اور خط کے پُرزے ہمارے پاس بھیجے ہیں۔ شعر کا خیال بھی کسی لطف کا حامل نہیں اور الفاظ بھی غیر شاعرانہ ہیں۔

خواب دیکھا ہے کہ میرا نامہ بر مارا گیا
کیوں خدا کیا اب مرے خط کا جواب آنے کو ہے

عاشق نے خواب میں دیکھا ہے کہ نامہ بر قتل ہو گیا۔ وہ اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔ ضرور میرے خط کا جواب آتا ہوگا۔

نا اُمیدی موت سے کہتی ہے اپنا کام کر
آس کہتی ہے ٹھہر خط کا جواب آنے کو ہے

بیمار محبت یاس و امید کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مایوسی مرنے پر آمادہ کرتی ہے مگر اُمید سہارا دیتی ہے کہ ذرا اور ٹھہر جا۔ شاید تیرے خط کا جواب آتا ہو۔

روح گھبرائی ہوئی پھرتی ہے میری لاش پر
کیا جنازے پہ مرے خط کا جواب آنے کو ہے

مرنے کے بعد بھی محبوب کے خط کا انتظار ختم نہیں ہوا ہے۔ روح جسم سے نکل گئی ہے مگر اس امید میں کہ شاید اس کے خط کا مژدہ سننے کو مل جائے وہ جسم کے قریب گھبرائی پھر رہی ہے۔ خط کے انتظار کے مضمون کو ہر جگہ نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

بھر کے ساقی جام مے اک اور لا اور جلد لا
ان نشیلی انکھڑیوں میں پھر حجاب آنے کو ہے

محبوب کی شرمگیں نگاہیں نشہ کے اثر سے بے حجاب ہو گئی ہیں۔ عاشق نہیں چاہتا کہ اس کا نشہ کم ہو اور وہ پھر سے شرما کر نگاہیں جھکا لے اس لیے وہ ساقی سے جلد ایک اور جام بھر کر لانے کو کہہ رہا ہے۔

خانۂ تصویر میں آنے کو ہے تصویرِ یار
آئینہ میں قدِ آدم آفتاب آنے کو ہے

تصورِ محبوب اب دل کے آئینہ میں تصویر کی صورت اختیار کر رہا ہے یعنی محبوب کی تصویر اس چوکھٹے میں لگ رہی ہے گویا اس خالی آئینہ میں آفتاب کا قدِ آدم عکس اُبھر رہا ہے۔ محبوب کے سراپا کو قدِ آدم آفتاب کہنے میں ندرت بھی ہے اور لطافت بھی۔

پھر حنائی ہونے والے ہیں میرے قاتل کے ہاتھ
پھر زبانِ تیغ پر رنگ شہاب آنے کو ہے

شہاب = سرخ رنگ۔ چنگاری

آج محبوب کا ارادہ پھر سے اپنے ہاتھوں کو عاشق کے خون سے رنگنے کا ہے۔ اور اس کی تلوار خون میں ڈوب کر شہاب کا رنگ اختیار کرنے کو ہے۔

اب کے سوئے کیا اُٹھیں گے فتنۂ محشر سے ہم
صبحِ محشر کے قریب آنکھوں میں خواب آنے کو ہے

عشق کے مارے ہوؤں کو اُٹھانا صبحِ قیامت کے بس سے باہر ہے جس طرح تھکا ہوا انسان جب گہری نیند سوتا ہے تو معمولی شور سے نہیں اُٹھ پاتا۔ ہم بھی ایسے تھکے ہیں کہ فتنۂ محشر بھی ہمیں جگا نہ سکے گا۔

گدگداتا ہے تصوّر، چٹکیاں لیتا ہے درد
کیا کسی بے خواب کی آنکھوں میں خواب آنے کو ہے

اگر عاشق کی بے خواب آنکھوں میں کبھی نیند آنے کو ہوتی ہے تو محبوب کا تصوّر اس کے دل کو گدگداجاتا ہے یا اس کی یاد اسے بے چین کر جاتی ہے۔

دیکھیے موت آئے فانیؔ یا کوئی فتنہ اُٹھے
میرے قابو میں دلِ بے صبر و تاب آنے کو ہے

میرا بے صبر و بے تاب دل اب کسی قدر پرسکون اور قابو میں آتا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دل کا سکون موت کا پیش خیمہ ہے یا پھر آسمان سے کوئی نیا فتنہ نازل ہونے کو ہے۔ عاشق کی قسمت میں سکون نہیں۔ دل کے ہاتھوں نہیں تو آسمان کے ہاتھوں کوئی نہ کوئی فتنہ نازل ہونا ضروری ہے۔

(۳۴۴)

ہر چند کچھ اور ہے حقیقت   کہنے کو جو میں نہیں وہ تو ہے

کہا یہ جاتا ہے کہ میری ہستی تجھ سے جدا اور مختلف ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے یعنی مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں۔ دوسرے مصرعہ کے الفاظ سے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ میں جب "میں" نہیں رہتا یعنی خودی کا احساس فنا ہوجاتا ہے تو پھر تو ہی تو رہ جاتا ہے۔

کیا کیجیے سیرِ باغِ عالم   گل پردہ نشینِ رنگ و بو ہے

ہم باغِ ہستی کی سیر کیا کریں۔ یہاں حسن کا ہر جلوہ پردہ میں پوشیدہ ہے۔ پھول کو دیکھیں تو وہ بھی رنگ و بو کے پردوں میں مستور ہے۔ یعنی رنگ و بو مظاہر ہیں۔ وہ دراصل نقاب ہیں جو حقیقت کو چھپائے ہیں۔ اسی طرح حسن حقیقی کا جلوہ بھی مظاہر کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔

اللہ رے تری فسوں نوازی جو دل ہے طلسم آرزو ہے

شاعر محبوب کی سحر کاری کی داد دیتا ہے کہ تیرے جادو نے ہر دل کو اسیر کر رکھا ہے اور کوئی دل ایسا نہیں جو تیری آرزو میں نہ گرفتار ہو۔

(۳۴۵)

درد کی دنیا بدل جانے کو ہے دم محبّت میں نکل جانے کو ہے

محبت میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ شدتِ درد سے دل سینہ سے باہر نکلنے کو ہے اور دنیائے درد میں انقلاب رونما ہونے کو ہے۔

پھر ترا غم کارفرما چاہیے پھر طبیعت کچھ سنبھل جانے کو ہے

مریضِ غم کو کچھ سکون آچلا ہے۔ وہ محبوب سے التجا کرتا ہے کہ اپنے غم کو پھر اشارا کر دے کہ دل میں کارفرمائی کر کے اس سکون کو درہم برہم کر دے۔

مختصر کرتا ہوں اب رودادِ شوق آفتابِ حشر ڈھل جانے کو ہے

قیامت کا دن ختم ہو رہا ہے۔ مجبوراً ہم بھی اپنی داستانِ غم کو مختصر کیے دیتے ہیں۔ مراد یہ کہ میری داستانِ شوق کے بیان کے لیے قیامت کا طویل دن بھی ناکافی ہے۔

کیا تری چشمِ فسوں گر کہہ گئی پھر تری حسرت مچل جانے کو ہے

محبوب کی جادو بھری نگاہوں نے جانے کیا اشارا کر دیا کہ دل میں سوئی ہوئی حسرتیں پھر سے جاگ گئیں۔ مراد یہ کہ عاشق کی بے تابی محبوب کے اشارے پر ہوتی ہے۔

فانیؔ اسرارِ غمِ فردا نہ پوچھ وعدۂ فردا بھی ٹل جانے کو ہے

فانی کی غم پسند طبیعت مستقبل سے بھی مایوس ہے۔ ان کو محبوب کے کل کے وعدہ سے بھی کوئی خوشی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ وعدہ بھی دوسرے وعدوں کی طرح ٹل جائے گا۔ یہی ان کے غم کا راز ہے۔

(۳۴۶)

شکوہ کیا کیجے نگاہِ یار خود غم دیدہ ہے
کیا تماشا ہے کہ دل کا چور بھی دزدیدہ ہے

دزدیدہ = چوری کی ہوئی۔ ترچھی نگاہوں کو دزدیدہ نگاہ کہا جاتا ہے۔

محبوب ترچھی نگاہوں سے عاشق کو دیکھ لیتا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ محبوب سے ہم اپنے غم کی شکایت کیا کریں۔ وہ تو خود ہی ہمارے حال کو دیکھے ہوئے ہے اور اس کی نگاہیں جو ہمارا دل چرا لے گئی ہیں خود بھی چوری کی ہیں۔ شعر کے معنی میں کوئی لطف نہیں۔ صرف لفظ "دزدیدہ" پر شعر کی بنیاد ہے۔

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم
بلبلہ ہے عین دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

دامن چیدہ = دامن سمیٹے ہوئے۔

ہم اگر اپنی ہستی کو خدا سے الگ تصور کرتے ہیں تو یہ محض ہمارا وہم ہے جس طرح حباب دریا میں رہ کر یہ دعویٰ کرے کہ میں دریا سے الگ ہوں تو یہ اس کی نادانی ہے۔

مائلِ پرواز ہے مقتل میں خونِ گرمِ دل
آتشِ سیال تھا اب شعلۂ بالیدہ ہے

آتشِ سیال = بہتی ہوئی آگ۔

شعلۂ بالیدہ = بھڑکتا ہوا شعلہ جو اوپر کی طرف رُخ کرتا ہے۔

عشق کی گرمی سے دل کے خون میں ایسا اُبال تھا کہ قتل کے بعد ہمارا خون زمین پر بہنے کی بجائے اوپر کی طرف اُڑنے لگا۔ گویا جب تک دل میں رہا تو آتشِ سیال تھا اور اب بھڑکتا ہوا شعلہ ہو گیا۔

وقت اتنا کب بقدرِ فرصتِ یک سجدہ ہے
ہم ہیں اور عمرِ ابد، اور حسرتِ یک سجدہ ہے

ہم کو حسرت ہے کہ کاش ہمیں اتنی فرصت ہی مل جاتی کہ محبت کا ایک سجدہ ادا کر لیتے لیکن زندگیٔ جاودانی میں بھی اس حسرت کی تکمیل کا امکان نظر نہیں آتا۔ مراد یہ کہ سجدۂ محبت ادا کرنے کے لیے عمرِ ابد بھی ناکافی ہے۔

تیری بزمِ ناز میں اُس دل کو دیکھا چاہیے
جو زِ سر تا پا خراب رخصتِ یک سجدہ ہے

محبوب کی بزمِ ناز میں دلِ عاشق کو ایک سجدہ کرنے کی اجازت بھی نہ مل سکی۔ اس محرومی نے اس کو سر سے تا بہ قدم ایک بربادی کا نمونہ بنا دیا ہے۔

وجہ پامالی ہی شاید عذرِ گستاخی بھی ہو
سنگِ در اور سر میں باہم نسبتِ یک سجدہ ہے

محبوب عاشق کے جرم سجدہ پر ناراض ہو کر اس کے سر کو پیروں سے پامال کرتا ہے لیکن زبان سے اس کا جرم نہیں بتاتا بلکہ کہتا ہے کہ چونکہ عاشق کو میرے سنگِ در سے سجدوں کی نسبت ہے اور سنگِ در کی قسمت میں پامالی ہے۔ اسی لیے اس کے سر کا پامال ہونا بھی بدیہی امر ہے۔ عاشق کو اپنی پامالی کا غم نہیں بلکہ وہ مسرور ہے کہ چلو محبوب کو اس تعلق کا اعتراف تو ہے۔ اور وہ میری گستاخی (سجدۂ در) پر بھی اب ناراض نہیں ہو سکتا کیونکہ یہی تعلق میری گستاخی کا عذر بھی ہے۔

حاصلِ خلقت ہے تعمیرِ جبینِ سجدہ ریز
شانِ تکوینِ دو عالم دعوتِ یک سجدہ ہے

جبینِ سجدہ ریز = سجدہ کرنے والی پیشانی۔

سجدہ کرنے والی پیشانی دنیا کی ہر چیز سے افضل ہے اور تخلیقِ عالم و آدم کا حاصل وہ جبینِ عبودیت ہے جو ایک سجدۂ بندگی پیش کر سکے۔

جاں فزا ہے شعلہ زارِ سوزِ فرقت کی بہار
اس جہنم کو میسر جنتِ یک سجدہ ہے

جدائی کی جو آگ دل میں روشن ہے اس کی دلکشی اور جاں فزائی کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ یہ آگ آتشِ جہنم کی طرح شدید اور بے پناہ ہے مگر ایک سجدۂ محبت اس جہنم کو بھی جنت بنا دیتا ہے۔ یعنی جب عاشق تصور میں بھی بارگاہِ حُسن میں سجدہ ریز ہوتا ہے تو وہ دوری قرب میں بدل جاتی ہے۔ اس شعر میں اُس حدیث کا اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ سجدہ کی حالت میں بندہ خدا کے حضور میں ہوتا ہے۔

(۳۴۸)

قطرہ دریائے آشنائی ہے   کیا تری شانِ کبریائی ہے

قطرہ و دریا تصوف کی اصطلاح میں انسان اور ذاتِ الٰہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شاعر اللہ تعالیٰ کی شان اور بخشش کا ممنون اور مداح ہے کہ اس نے انسان کی بے مایہ ہستی کو جس کی حیثیت ایک قطرہ کی سی ہے، محبت بخش کر ایک دریائے بے کراں بنا دیا ہے اور اپنی ذات سے نسبتِ خاص عطا فرمائی۔

تری مرضی جو دیکھ پائی ہے   خلشِ درد کی بن آئی ہے

جب سے دردِ محبت کو تیری مرضی کا اشارہ ملا ہے اس میں کچھ اور اضافہ اور خلش پیدا ہو گئی ہے۔ مراد یہ کہ عاشق کی بے چینی و اضطراب بھی محبوب کے اشارہ کے پابند ہیں۔

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا   نارسائی سی نارسائی ہے

ذاتِ الٰہی تک رسائی ممکن نہیں۔ اس کی ذات تو وہ ہے کہ عقل تو کجا، وہم یا تصوّر بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ تاباںؔ بدایونی کا شعر ہے:

عاجز ہے عقل معرفتِ ذوالجلال میں   تاباںؔ خدا وہ ہے جو نہ آئے خیال میں

کون دل ہے جو درد مند نہیں   کیا ترے درد کی خدائی ہے

دنیا میں کوئی دل غمِ محبت سے خالی نظر نہیں آتا۔ کیا ساری دنیا پر محبت کا قبضہ یا اس کی خدائی ہے۔ شعر بظاہر سوال ہے لیکن حقیقت میں اقرار ہے۔

جلوۂ یار کا بھکاری ہوں   شش جہت کاسۂ گدائی ہے

شش جہت = چھ سمتوں والا، مراد دنیا۔
میں ایک بھکاری ہوں جو دیدارِ یار کی بھیک مانگتا ہے۔ یہ شش جہت (دنیا) میرا بھیک کا پیالہ ہے جس میں محبوب نے مجھے بھیک دی ہے۔ مراد یہ کہ دنیا کی ایک ایک چیز میں اپنے محبوب کا جلوہ تلاش کر لیتا ہوں۔ بالکل نیا تصور ہے۔

موت آتی ہے تم نہ آؤ گے؟   تم نہ آئے تو موت آئی ہے

تمھارے فراق میں ہم جان سے جا رہے ہیں۔ کیا تم اب بھی نہ آؤ گے؟

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے   کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

محبت پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا راستہ ہے۔ کیا کوئی عاشق ایسا بھی جو اپنے برہنہ تلووں کو ان کانٹوں سے بچانا چاہتا ہو۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ سچا عشق راہ کی مشکلوں کی پروا نہیں کرتا اور راستے کے کانٹوں سے بچنے کے لیے عذرِ برہنہ پائی کا سہارا بھی نہیں ڈھونڈھتا۔ شعر کی روانی اور اندازِ بیان قابلِ تعریف ہے۔

ترکِ اُمید بس کی بات نہیں   ورنہ اُمید کب بر آئی ہے

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری کوئی اُمید کبھی پوری نہیں ہوئی ہم اُمیدیں باندھنے پر مجبور ہیں اور ترکِ اُمید کرنا بس سے باہر ہے۔ بقولِ میکش بدایونی

پھیلائے ہوئے دستِ دعا اب بھی ہیں لیکن
جی جانتا ہے جو بھی دعاؤں سے ملا ہے

مژدۂ جنتِ وصال ہے موت   زندگی محشرِ جدائی ہے

موت ہمیں اس لیے عزیز ہے کہ اس کے بعد ہمیں محبوب کا وصل نصیب ہوگا اور اس کی جدائی کی وجہ سے زندگی قیامت بن گئی ہے۔

آرزو پھر ہے درپئے تدبیر   سعیٔ ناکام کی دہائی ہے

اپنی تدبیروں کی ناکامی کا شاعر کو اس قدر یقین ہے کہ اگر دل میں کوئی آرزو پیدا ہونے لگتی ہے تو اپنی گذشتہ ناکام کوششوں کو یاد کر کے اسے بھی سینہ میں دبا دینا چاہتا ہے۔

موت ہی ساتھ دے تو دے فانی۔   عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

زندگی بے وفا ہے۔ اس نے کسی کا ساتھ دیا ہے نہ دے۔ اس لیے ہمیں اگر کچھ توقع ہے تو موت سے ہے کہ شاید وہ ہی ہماری کچھ مدد کرے۔

(۳۴۹)

محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خون بہا بھی ہے
وہ اک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے

عاشق نے حشر میں خدا کے حضور قاتل کی فریاد کرنا چاہی تو اس نے اس طرح شکایت بھری اور شرمگیں نگاہوں سے عاشق کی جانب دیکھا جس سے اس کی ساری شکایتیں ختم ہو گئیں اور اس نگاہ عذر خواہ سے گویا خوں بہا بھی مل گیا۔

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے
کیوں چارہ ساز تجھ کو امیدِ شفا بھی ہے

ہمارے درد کا علاج کرنے والوں کو کیا واقعی شفا کی بھی امید ہے۔ کیا ان کے خیال میں اس کا علاج موت کے سوا کچھ اور بھی ہے؟

جب عشق ابتدا ہی نہیں انتہا بھی ہے
دل میری زندگی ہی نہیں ہے قضا بھی ہے

فانی کے نزدیک زندگی کی ابتدا ہی نہیں اس کی انتہا بھی عشق ہی ہے۔ گویا دل جو عشق کا سرچشمہ ہے اس پر زندگی کا دار و مدار بھی ہے اور یہی تمام اذیتوں اور بلاؤں کا سبب بھی ہے۔

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

ناخدا کو چیلنج کرتے ہوئے فانی اس سے کہتے ہیں کہ تو ہی ہماری کشتی کی سلامتی کا ذمہ دار نہیں ہے خدا اس کا محافظ ہے۔ اگر تجھے اپنے پر اتنا بھروسہ ہے تو ذرا ہماری کشتی کو ڈبو کے تو دکھا۔ یہ قابلِ رشک ایمان ہے۔

اے حدِ ضبطِ درد نہ کر دل سے اب دریغ
اک آہ بے صدا کہ دوا بھی دعا بھی ہے

ہم ضبطِ درد کی آخری حد کو پہنچ گئے ہیں اور ضبط کی حد سے گزر کر ایک ایسی آہ بھرنا چاہتے ہیں جو اثر کو منا لائے اور ہماری تکلیفوں کا مداوا بھی بن جائے۔ آہ بھرنے سے طبیعت ہلکی ہونا اور مظلوم کی آہ کی تاثیر دونوں کی رعایت سے اسے دوا و دعا کہا ہے۔

سامانِ صد نگاہ ہے ہر ذرہ خاک کا
لیکن یہ دیکھنا ہے کوئی دیکھتا بھی ہے

اگر کوئی دیدہ ور ہو تو خاک کے ہر ذرہ میں ایک نئی دنیا چھپی ہوئی دیکھ سکتا ہے۔

ہاں دل میں درد بھی ہے زباں بھی نہیں ہے بند
کس سے کہیں، کوئی دلِ درد آشنا بھی ہے

ہماری خاموشی سے یہ مطلب نہ نکالو کہ ہمارے دل میں درد نہیں یا ہم کو بولنا نہیں آتا۔

ہم اس لیے خاموش ہیں کہ کوئی ہمدرد و دردمند نہیں ملتا۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

دل اور حکمِ ضبط سے یارائے انحراف
پردہ میں کوئی دشمنِ اہلِ وفا بھی ہے

ہم نے عشق میں ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم محبوب کے حکم کے خلاف کر رہے ہیں۔ ہماری یہ مجال ہو ہی نہیں سکتی۔ ہماری یہ بے چینی اسی دشمنِ وفا (محبوب) کے اشارہ پر ہے۔

فانیؔ سے دل کے ساتھ تقاضا ہے جان کا
ظالم اس ابتداء کی کوئی انتہا بھی ہے

محبوب کے ظلم و ستم میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور وہ دل کے ساتھ جان کا بھی طالب ہے۔ پتہ نہیں اس کے ظلم کی کوئی حد بھی ہو گی یا نہیں۔

(۳۵۰)

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

شاعر زندگی کو غیر اہم سمجھتا ہے اس لیے اس کا سودا کرنے کو کسی قیمت پر تیار نہیں۔ نہ اسے یہ معلوم ہے کہ یہ سودا مہنگا ہے یا سستا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں تو ان بے تعلق لوگوں میں ہوں کہ زندگی تو زندگی، موت بھی بے قیمت کے ملتی ہو تو اسے بھی نہ لوں۔ زندگی سے بے نیازی اور موت کو زندگی پر ترجیح دینا قابلِ غور ہے۔

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

دنیا میں بستیوں کو اُجڑتے اور ویرانوں کو آباد ہوتے دیکھا ہے مگر دل جیسی کوئی بستی نہ دیکھی جو ایک بار اُجڑا تو پھر نہ بسا۔

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں، یہ ہستی کیا ہستی ہے

نیستی (عدم) اور ہستی (وجود) ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ ایک کی شناخت کے لیے دوسرے کی موجودگی ضروری ہے۔ لیکن جو ہستی محض عدم کی نفی ہو اس کی حقیقت ہی کیا ہے اور ایسی ہستی پر کون بھروسہ کرے۔

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اجالے کی قدر اس وقت تک ہے جب تک اندھیرا ہے۔ بلندی کی عظمت اسی وقت تک ہے جب تک پستیاں موجود ہیں۔ اسی طرح اگر گناہگاروں کا اعترافِ گناہ نہ ہو تو پارسائی اور پاکیزگی کی قدر کون پہچانے۔ عصمتِ کامل سے انسان کی پاکیزگی بھی مراد ہو سکتی ہے اور خدا بھی جو خیرِ مکمل ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے انسان کی عاجزی اور گناہ بھی اپنی جگہ اہم ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ سے خدا کو سمجھنا ممکن ہوا۔

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے ہیں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

محبوب ایک نظر کے بدلے میں عاشق کی جان خرید لیتا ہے۔ ویسے تو ہم یہ سودا خریدار کی مرضی پر چھوڑے دیتے ہیں مگر اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ اس جنسِ گرانمایہ کے لیے یہ قیمت کم ہے۔ داغ نے بھی اسی بات کو اس طرح کہا ہے مگر فانی کا شعر بہت بلند ہے۔

دل کی قیمت اک نگہ ہے اے صنم   آگے جو آئے تیرے ایمان میں

وحشتِ دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

ہوش مندی بری چیز نہیں مگر اہمیت عشق سے منکر ہونا گویا خدا کا انکار کرنا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ خدا کے منکر اور ہوش کے پرستار ہیں۔ فانی کے نزدیک وحشت دل (عشق) محبوب سے الگ کوئی شے نہیں۔

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

دنیا کی رونق اور آبادی اب بھی وہی ہے مگر تیرے جانے سے ہماری آنکھوں کا یہ حال ہے کہ جیسے ہر طرف سناٹا ہے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ جذبات کی بڑی بے پناہ تصویر ہے۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے دل ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

روتے روتے آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے ہیں مگر دل کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں گویا دل پر ایسی گھٹا چھائی ہے جو نہ کھلنے کا نام لیتی ہے نہ برستی ہی ہے۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پہ گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

اے ظالم تو نے دل کو ذرا سی دیر میں اجاڑ تو دیا ہے مگر یہ بھی خبر ہے کہ اس کو پھر سے بسانا آسان نہیں۔ اس کے لیے بڑی عمر چاہیے۔

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

ہماری آنکھیں جن سے کبھی خون کی ندیاں رواں رہتی تھیں، اب ان میں آنسوؤں کی دو بوندیں بھی نہیں پائی جاتیں۔ غم کی انتہا وہ ہوتی ہے جب آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ میر نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہوا ہے مدت سے یہ دو آبہ

(۳۵۱)

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

زندگی کا سلسلہ مر کر بھی ختم نہیں ہوتا۔ بس زندگی کی شکل بدل جاتی ہے۔ گویا یہ ایک ایسی قید ہے جس سے رہائی ممکن نہیں۔ صرف زنجیر بدلنے کو تو آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ میرؔ نے حیات بعد الموت کے خیال کو بڑے بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اثرِ عشق تغافل بھی ہے بیداد بھی ہے
وہی تقصیر ہے، تعذیر بدل جاتی ہے

تعذیر = سزا۔

محبوب کے نزدیک عشق ایسا جرم ہے جس کی سزا یا تو عاشق پر ظلم و ستم ہو سکتا ہے یا تغافل۔ گویا ایک ہی تصور پر کبھی یہ سزا دی جاتی ہے کبھی وہ

کہتے کہتے میرا افسانہ گلہ ہوتا ہے
دیکھتے دیکھتے تقدیر بدل جاتی ہے

محبوب جب مہربان ہوتا ہے تو عاشق کی داستان کو فسانہ کی طرح دلچسپی اور توجہ سے سنتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ اسے شکایت پر محمول کرتا ہے اور روٹھ جاتا ہے گویا عاشق کی تقدیر اس سے روٹھ جاتی ہے یعنی محبوب کا روٹھنا قسمت کا روٹھنا ہے۔

روز ہے دردِ محبت کا نرالا انداز
روز دل میں تری تصویر بدل جاتی ہے

ہمارے دل کا درد روز نئے انداز سے اٹھتا ہے اور درد کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ دل پر نقش تیری تصویر بھی بدل جاتی ہے۔ مراد یہ کہ دردِ محبت اور حسنِ محبوب ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ان میں تفریق ممکن ہی نہیں۔

گھر میں رہتا ہے ترے دم سے اُجالا کچھ اور
مہ و خورشید کی تنویر بدل جاتی ہے

محبوب کے جلووں سے ہمارے گھر میں ہمیشہ اُجالا رہتا ہے جبکہ چاند اور سورج کی روشنی پھیکی پڑ جاتی ہے۔

غم نصیبوں میں ہے فانیؔ غمِ دنیا ہو کہ عشق　　دل کی تقدیر سے تدبیر بدل جاتی ہے

فانیؔ کی تقدیر میں ازل سے ہی غم لکھ دیا گیا ہے چاہے وہ غمِ دنیا ہو کہ غمِ عشق۔ اگر وہ کسی تدبیر سے غم سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو اس کی تقدیر کے اثر سے وہ تدبیر ناکام ہو جاتی ہے۔ بقول غالبؔ:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

(۳۵۲)

طبیعت رفتہ رفتہ غم کی خوگر ہوتی جاتی ہے
جفا کم کر، جفا اب روح پرور ہوتی جاتی ہے

ہم غم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اب غموں میں بھی لُطف آنے لگا ہے۔ اگر تو واقعی ہمیں ستانا چاہتا ہے تو ظلم و ستم میں کمی کر دے۔ اس شعر میں مکرِ شاعرانہ پایا جاتا ہے جو مومنؔ کا خاص رنگ ہے۔ یعنی اپنے فائدہ کی بات اس طرح کہنا کہ دوسرے کو اپنا فائدہ لگے۔

مری ہر معصیت ہے مطلعِ انوارِ صد رحمت
فضائے دل گناہوں سے منوّر ہوتی جاتی ہے

اللہ تعالیٰ کی رحمت گناہگاروں کے لیے ہے۔ میں جتنے گناہ کرتا ہوں اتنی ہی اس کی رحمت کے انوار میرے اوپر سایہ فگن ہوتے ہیں۔ گویا گناہوں کی وجہ سے میرے دل کی فضا منوّر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خدا چاہے تو اب ایماں پرستی کا رواج اُٹھے
وہ چشمِ سر بسر تسخیر کافر ہوتی جاتی ہے

محبوب کی آنکھیں سرتاسر تسخیر ہیں یعنی تسخیر کی بے پناہ قوت کی حامل ہیں۔ ان کا

حسن اور بڑھتا ہی جا رہا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ تمام اہلِ ایمان خدا کو چھوڑ کر ان نگاہوں کے تمنّائی بنیں گے۔

محبّت کی خلش کا دیکھیے انجام کیا ٹھہرے
تکلّف برطرف ہر سانس نشتر ہوتی جاتی ہے

دل کا یہ حال ہے کہ سانس لینا بھی دوبھر ہے اور ہر سانس نشتر کی طرح دل میں چبھتی ہے۔ جانے اس غم کی انتہا کیا ہو گی۔

زباں صرفِ دعائے مرگ ہے کوئی دعا مانگوں
مری تدبیر بھی میرا مقدّر ہوتی جاتی ہے

دعا کرنا تدبیر میں شامل ہے لیکن ہم ایسی دعا بھی نہیں مانگ سکتے جو ہماری تقدیر میں نہ ہو۔ چنانچہ ہم کوئی بھی دعا کرنے کا ارادہ کریں مگر لبوں پر موت کی ہی دعا آتی ہے۔

(۳۵۳)

جبیں صرفِ سجودِ بے جبیں معلوم ہوتی ہے
طبیعت بے نیازِ کفر و دیں معلوم ہوتی ہے

ہم کفر اور دین دونوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں اور محبت کی بدولت ہمیں ایسے سجدے میسر ہیں جن کا تعلق پیشانی سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔

نگاہِ ناز و سوزِ عشق دونوں ایک ہیں لیکن
کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے

عشق کی تپش محبوب کی نگاہوں سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ جس طرح بجلی آسمان پر چمکتی تو ہے لیکن گرتی زمین پر ہے اور چیزوں کو جلاتی ہے۔ اسی طرح محبوب کی نگاہوں کی بجلیاں ہوتی تو کہیں اور ہیں مگر ان کا اثر کہیں اور (دل پر) ہوتا ہے۔

مٹا ہی چاہتا ہے امتیازِ صبر و بے تابی
تمنّا اب تمنّا آفریں معلوم ہوتی ہے

عاشق میں بے تابی اور بے چینی تمنّاؤں کے پورا نہ ہونے سے رہتی ہے اور صبر مایوسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن شاعر محبت میں اس منزل پر آگیا ہے جہاں صبر اور بے چینی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور تمنائیں نئی تمنائیں پیدا کرنے لگی ہیں۔ فلسفیوں کے نزدیک تمناؤں کی تسکین ہی بے تابی کی بنیاد ہے۔ شاعر نے دونوں سے بے نیاز ہو کر تمنّا کو ہی اپنا مقصود بنا لیا ہے۔

نہیں معلوم راہِ شوق میں ہے کوئی منزل بھی
جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے

رہِ عشق میں شاید کوئی منزل ہے ہی نہیں۔ اس راہ کے چلنے والے جہاں تھک کر ٹھہر جاتے ہیں اسی کو منزل سمجھ لیتے ہیں۔

بحمداللہ کہ تاثیرِ فغاں بر روئے کار آئی
کہ اب ہر آہ آہِ واپسیں معلوم ہوتی ہے

شکر ہے کہ آج ہماری آہ و فغاں میں اثر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی کا سلسلہ اب ختم ہونے کو ہے اور ہر آہ موت کی ہچکی معلوم ہونے لگی ہے۔

لہو روتا ہوں اس انجام سے غافل کی حالت پر
محبّت جس کے دل میں جاگزیں معلوم ہوتی ہے

جو لوگ محبت کو دل میں جگہ دیتے ہیں ان کی ناعاقبت اندیشی پر ہم خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ شاعر خود محبت کا انجام دیکھے ہوئے ہے اس لیے وہ سر پر افسوس کر رہا ہے۔

عجب عالم ہے موجِ برق کے پہلو میں بادل کا
تری الٹی ہوئی سی آستیں معلوم ہوتی ہے

بادلوں کے درمیان بجلی چمکتی دیکھ کر ہمیں تیرا آستیں چڑھا کر مقتل میں آنا یاد آجاتا ہے۔ دونوں مناظر میں حسن کے ساتھ تباہ کاری کی مشابہت ہے۔

مری ہستی کہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے خدا رکھے
ترے پیمانِ باطل کا یقیں معلوم ہوتی ہے

جس طرح محبوب کے وعدے بے بنیاد اور فرضی ہوتے ہیں پھر بھی عاشق ان پر یقین کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہی حال ہماری ہستی کا ہے کہ اس کی اصل کچھ بھی نہیں اور یہ صرف واہمہ ہے پھر بھی ہم اسے حقیقت سمجھنے پر مجبور ہیں۔

زمینِ حشر فانی کیا قیامت ہے معاذاللہ
مجھے اپنے وطن کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

قیامت کے میدان کی پرہول اور وحشتناک سرزمین کو دیکھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے وطن کی سرزمین ہے۔ وطن میں شاعر کو جو رنج اور مصیبتیں پیش آئی ہیں اس کی مناسبت سے اسے زمین حشر سے تشبیہ دی ہے۔

(۳۵۴)

امیدِ التفات کو رسوا نہ کیجیے لازم نہیں کہ خونِ تمنّا نہ کیجیے

ہمیں تم سے یہ توقع ہے کہ تمھارے جور و ستم جاری رہیں گے اور تم ہماری تمنّاؤں کا خون کرتے رہو گے۔ تم اس توقع کا بھرم رکھ لو اور اسے رسوا نہ ہونے دو یعنی تمناؤں کا خون کرنے سے باز نہ آؤ۔ عشق کی وفا کہ وہ ظلم کو بھی کرم و التفات خیال کرتا ہے اور محبوب کی ستمگاری کہ جب دیکھا کہ عاشق ظلم کا تمنّائی ہے تو اس کو بھی ترک کر دیا۔

شرمندہ وہمِ رشک سے اتنا نہ کیجیے آئینہ دیکھ کر مجھے دیکھا نہ کیجیے

محبوب آئینہ میں اپنا حسن دیکھ رہا ہے۔ بیچ بیچ میں وہ نگاہ اٹھا کر عاشق کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے کیونکہ اس کو خیال ہے کہ عاشق آئینہ پر رشک کر رہا ہوگا کہ اس کو محبوب کا

قرب میسر ہے اور میں دور ہوں۔ لیکن اس کا یہ خیال محض وہم ہے کیونکہ عاشق کو یقین ہے کہ آئینہ لاکھ محبوب کے مقابل سہی مگر وہ میری طرح اس کے حُسن کا اداشناس تو نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ محبوب کے اس گمان سے شرمندہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم آئینہ دیکھ کر میری جانب نہ دیکھو۔

اندیشۂ عیشِ خوابِ لحد کا نہ کیجیے
ہنگامِ نزع وعدۂ فردا نہ کیجیے

محبوب نہیں چاہتا کہ عاشق قبر میں بھی آرام سے سوئے اس لیے وہ اس کے نزع کے وقت کل آنے کا وعدہ کر رہا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ تمھارا یہ اندیشہ فضول ہے۔ میری قسمت میں یوں بھی آرام نہیں ہے اس لیے اس وقت وعدہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
بقول غالب: "تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

دیکھو جو وقتِ پرسشِ جاناں نہ بھول جائیں
ٹھانی تو ہے کہ عرضِ تمنّا نہ کیجیے

محبوب کی بے اعتنائی سے بددل ہو کر عاشق نے قسم تو کھائی ہے کہ اب محبوب سے اظہارِ تمنّا نہیں کریں گے مگر یہ بھی ڈر ہے کہ اگر ذرا بھی وہ مائلِ پرسش ہوا تو یہ عہد بھول کر اسے حالِ دل نہ سنانے لگیں۔ ع: تشکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟

سرکار! پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں
یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجیے

عاشق محبوب سے وفا کا طالب نہیں، صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی وضعِ جفا پر قائم رہے مگر محبوب وفا سے اس قدر بے زار ہے کہ پاسِ وضع کو بھی وفا خیال کرتا ہے اور اس لیے اس پر بھی تیار نہیں۔ عاشق جو تسلیم و رضا کا بندہ ہے اس پر بھی راضی ہے کہ چلو جو تمھاری مرضی ہو کرو۔

کیا فرض تھی نگاہِ مکرّر ازل کے بعد
یہ جان ہے، یہ دل ہے تقاضا نہ کیجیے

ہم تو ازل کے دن ہی اپنے جان و دل پر محبوب (اللہ تعالیٰ) کو اختیار دے چکے تھے۔ اب اسے دوبارہ تقاضا کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے جان و دل اس کی امانت ہیں جب

چاہے انھیں لے لے۔ اس شعر میں عہد الست کی طرف اشارہ ہے جب انسان کی روح نے اللہ تعالیٰ سے عبدیت کا وعدہ کیا تھا۔

فانیؔ بلائے مرگ سے غم کیجیے غلط
اب جستجوئے راحتِ دنیا نہ کیجیے

دنیا میں رہ کر خوشی کی تلاش فضول ہے۔ اگر دل بہلانا ہے تو موت سے دل لگاؤ کہ وہی غموں سے نجات دلا سکتی ہے۔

(٣٥٥)

عمر بھر بیدادِ حسنِ امتحاں دیکھا کیے
مہرباں سمجھا کیے نامہرباں دیکھا کیے

ہم عمر بھر محبوب کی بیداد اور نامہربانی کے باوجود اسے مہربان ہی سمجھا کیے اور اس کی بیداد کو امتحان کا ایک حسنِ انداز سمجھتے رہے۔ انسان کی زندگی کو عام طور پر امتحان کہا جاتا ہے مگر فانیؔ کو شبہ ہے کہ یہ امتحان نہیں بلکہ محبوب کا عتاب یا سزا ہے۔

ہم تمھیں دیکھا کیے اور رائگاں دیکھا کیے
اک حجابِ بے حجابی درمیاں دیکھا کیے

محبوب ہمارے سامنے بے پردہ موجود تھا اور ہم اس کی طرف دیکھتے بھی رہے۔ مگر ہماری نگاہ اس کے جلووں سے محروم رہی اور اس کی بے حجابی ہی ہماری محرومی کا سبب بن گئی۔ یعنی آنکھ کو اس کے جلوہ کی تاب نہیں۔ بقول غالبؔ: نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا

فتنۂ دوراں کی تہ میں ایک فتنہ اور تھا
آسماں اک اور زیرِ آسماں دیکھا کیے

ہماری مصیبتوں اور بلاؤں کا ذمہ دار صرف آسمان یا زمانہ نہیں بلکہ آسمان کے علاوہ دنیا میں ہمارا ایک دشمن اور بھی ہے اور زمانہ کے پس پردہ کسی اور (محبوب) کا ہاتھ بھی شامل ہے۔

حسرت اُن حرماں نصیبوں پہ جو ہوش آنے کے بعد
خوابِ آغوشِ قفس میں آشیاں دیکھا کیے

ان غم نصیب لوگوں کی حالت افسوس کے قابل ہے جو حقیقت کا ادراک اور ہوش رکھنے

کے باوجود بھی قفس میں آشیاں کے ہی خواب دیکھتے رہتے ہیں اور اس کے تصورات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ مصیبت کے زمانہ میں اچھے دنوں کی یاد مصیبت میں اضافہ کردیتی ہے۔ شعر میں عجزِ بیان ہے اور "خواب آغوشِ قفس" کی ترکیب غیر ضروری ہے۔

جب قفس میں موسمِ گل کا تصوّر بندھ گیا
ہر طرف اُجڑا ہوا اک آشیاں دیکھا کیے

جب قفس میں ہمیں موسمِ بہار کی یاد آتی ہے تو ہر طرف اپنا اُجڑا ہوا آشیاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ بدنصیبی قابلِ غور ہے کہ بہار کا تصوّر بھی رنگینیاں لے کر نہیں آتا بلکہ آشیاں کے اُجڑنے کی غمناک یاد ساتھ آتی ہے۔

عشوۂ تاثیرِ ضبطِ شوق میں سمجھا کیا
اور میری چپ کا وہ اندازِ بیاں دیکھا کیے

محبوب سے ہماری ملاقات اس طرح ہوئی ہے کہ نہ وہ کوئی بات کرتا ہے نہ ہماری ہی زبان کھلتی ہے۔ وہ ہماری خاموشی کی زبانی ہمارا حال سنتا ہے اور ہم اس کے عشوہ و ادا میں اپنے ضبطِ شوق کی تاثیر دیکھتے ہیں۔

غمزدوں سے مژدۂ نظارۂ حاصل نہ پوچھ
بزمِ دشمن میں نگاہِ رازداں دیکھا کیے

غمزدہ عاشق کو مژدۂ دیدار ملا مگر اس سے اس کو جو کچھ حاصل ہوا اس کا ذکر بیکار ہے اس لیے کہ محبوب کو محفل میں رقیب معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ہم اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ محبوب اور دشمن کا یہ تعلق عاشق کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوسکتا۔

اُٹھ گیا پہلی نگاہوں میں حجابِ حسن و عشق
ہر نظر کہتی ہے کیا کہیے کہاں دیکھا کیے

محبوب پر نگاہ پڑتے ہی عاشق اس طرح اس میں گم ہوگیا کہ حسن اور عشق کے درمیان دوئی کا امتیاز مٹ گیا اور اس کو یہ ہوش بھی نہ رہا کہ وہ کیسے دیکھ رہا ہے۔

موت کی حسرت بھی کیا شے ہے کہ فانی عمر بھر
ہم جفا ہر بلائے آسماں دیکھا کیے

موت کے انتظار میں ہم نے نہ جانے کتنی مصیبتیں اور ناگہانی بلائیں جھیلی ہیں۔ زندگی

کی خاطر دکھ سب اُٹھاتے ہیں لیکن فانی زندگی کے ناز موت کی خاطر برداشت کرتے رہے۔ اس شعر میں بھی "جفائے ہر بلائے آسماں" کا ٹکڑا اعجازِ بیان کا ثبوت ہے۔

(۳۵۶)

کارواں گذرا کیا ہم رہ گذر دیکھا کیے
ہر قدم پر نقشِ پائے راہبر دیکھا کیے

اپنی واماندگی کا بیان کرتے ہوئے فانی کہتے ہیں کہ ہم راستہ کو دیکھنے میں ایسے محو تھے کہ قافلہ گزرتا رہا مگر ہم راہ میں قدموں کے نشان ہی تلاش کرتے رہ گئے۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا　　ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

ترکِ بیداد آہ اک تمہید تھی بیداد کی
دل جلا کر میرے نالوں کا اثر دیکھا کیے

محبوب نے جفا ترک کر دی مگر اس کی یہ ادا ہمارے لیے سب سے بڑی جفا ثابت ہوئی کیونکہ بیداد میں کوئی اپنائیت تو تھی اور ہم ہر بیداد کو صبر سے برداشت کرتے رہے مگر محبوب چونکہ ہمارے نالوں کا اثر دیکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے یہ نئی بیداد شروع کر دی ہے۔

دردمندانِ وفا کی ہائے رے مجبوریاں
دردِ دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کیے

محبت کی تکالیف اور درد کو سہنا آسان کام نہیں مگر محبت کے ماروں کی مجبوری قابلِ دید ہے کہ جس درد کو دیکھنا بھی بڑا صبر آزما کام ہے وہ اس کو دیکھتے (برداشت کرتے) ہیں۔

یاس جب چھائی اُمیدیں ہاتھ مَل کر رہ گئیں
دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کیے

جب دل پر یاس کا غلبہ ہوا تو امیدیں کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں اور مریضِ غم کی جب نبضیں چھٹ گئیں تو سارے چارہ گر اور طبیب دیکھتے رہ گئے۔ مراد یہ کہ

تقدیر کے آگے ہر تدبیر بے کار ہے۔

رُخ مری جانب، نگاہِ لطف دشمن کی طرف
یوں اُدھر دیکھا کیے گویا اِدھر دیکھا کیے

محبوب ہمیں دیکھنے کے بہانے سے رقیب کو دیکھتا ہے۔ اس کا چہرہ اگرچہ ہماری طرف ہوتا ہے مگر لگاوٹ بھری نظریں دشمن کی طرف۔

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

فانی کے نزدیک موت نا اُمیدوں کا آخری سہارا ہے۔ وہ تمام زندگی موت کی راہ تکتے رہے ہیں اس امید میں کہ موت سے ان کی تکلیفوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

زیست تھی فانی بقدرِ فرصتِ تمہیدِ شوق
عمر بھر ہم پرتوِ نورِ بشر دیکھا کیے

زندگی کی مہلت اتنی کم ہے کہ اس میں شوق کا مکمل اظہار ممکن نہیں بلکہ شوق کی تمہید ہی کی فرصت مل سکتی ہے۔ ہم انسانیت کے حُسن کے شیدائی تھے مگر زندگی اس کے لیے کافی نہ تھی اس لیے ہم تمام عمر صرف اس کے حُسن کا پرتو یا عکس ہی دیکھتے رہے اور حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

(۳۵۷)

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدّعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

عاشق کو محبوب سے شکوہ ہے کہ اگر وہ اس کی جان کا ایسا ہی دشمن تھا تو پھر اس کی آرزوؤں کا مرکز اور زندگی کا مقصد کیوں بن گیا۔ لہجہ کی اپنائیت اور بے بسی نے شعر کو نشتر بنا دیا ہے۔

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خاموشی کا ہائے
وہ جنازے پر ترا کہنا "خفا کیوں ہو گئے"

عشق کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ محبوب عاشق کے جنازے پر آکر پشیمانی کے انداز میں پوچھتا ہے کہ تم مجھ سے خفا کیوں ہو۔ لیکن عاشق اس کی عنایتوں سے بہت دور جا چکا ہے اور وہ محبوب کی اس پرسش کا جواب دینے سے مجبور ہے۔ "خفا کیوں ہو گئے" کے ٹکڑے نے شعر میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

تو مرے دل کی نہ سُن یہ آئینہ ہے اُس سے پوچھ
تیرے صورت آشنا، درد آشنا کیوں ہو گئے

تم مجھ سے میرے غم والم کی وجہ دریافت کر رہے ہو۔ میری بات مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ آئینہ سے پوچھ لو وہ تمھیں سب کچھ بتا دے گا۔ مراد یہ کہ تمھارے حسن کا دیدار ہی ہماری تباہ حالی کا سبب ہے۔

کیا تمھیں اندازۂ دردِ محبت ہو گیا
چشمِ بد دور اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

محبوب کے ظلم وستم اب حد سے بڑھ گئے ہیں۔ شاید اسے ہماری محبت کی شدت اور وفا کا اندازہ ہو گیا ہے۔ بقول سیماب:

بیگانگی بقدر اصرار والتجا ہے　　شاید ترے ستم کو اندازۂ وفا ہے

دل کی صورت آکے پہلو سے تمھیں جانا نہ تھا
اور گئے ہی تھے تو جانِ بے وفا کیوں ہو گئے

یا تو تم دل کی طرح ہمارے سینہ میں آکر نہ رہے ہوتے اور جب آ گئے تھے تو زندگی کی طرح بیوفائی نہ کی ہوتی۔ مراد یہ کہ محبوب دل کی طرح عزیز ہے اور جان کی طرح بے وفا۔

کیا سنانا چاہتا ہے اے فریب التفات
خیر سے سب آج مطلب آشنا کیوں ہو گئے

دوستوں کا لطف و کرم حقیقتاً لطف نہیں بلکہ صرف ایک دکھاوا ہے۔ شاعر جواب تک ان کی بیداد اور جفا کا عادی ہے اور ان کے التفات کو فریب جانتا ہے۔ خود ان سے ہی دریافت کرتا ہے کہ آخر اس فریب کا مقصد کیا ہے۔ سب لوگ اس قدر مطلب پرست کیوں ہو گئے کہ جھوٹی عنایتیں اور نوازشیں کرنے لگے۔

اور فانی بڑھ گئی بے تابیٔ دل بعدِ مرگ
کیا کہیں مرکر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

ہم تو سمجھے تھے کہ مرکر بے چینیوں کا خاتمہ ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمیں سکون نہ ملا اور بے تابیٔ دل بجائے ختم ہونے کے بڑھ گئی۔

(۳۵۸)

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

ہم نے محبوب کے سامنے آنسو بہا کر اسے اپنی داستانِ غم سنانا چاہی جس کو سن کر وہ مسکرا دیا۔ گویا ہماری کہانی آنسوؤں کی زبانی بیان ہوتی ہے اور اس کی مسکراہٹوں کے ذریعہ۔ محبوب کے مسکرانے میں یہ بھی پہلو ہے کہ تمہارے افسانۂ غم کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مسکرانے کا لفظ طنزیہ ہے۔

یا ترے محتاج ہیں اے خونِ دل
یا انھیں آنکھوں سے دریا بہہ گئے

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہماری آنکھوں سے دریا رواں رہتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ آنکھیں دل سے خون کے قطروں کی بھیک مانگ رہی ہیں۔ شعر میں شدتِ غم سے آنسو خشک ہو جانے کی کیفیت اور خون رونے کی حالت دونوں کا اظہار مقصود ہے۔ میر نے کہا ہے:

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہوا ہے مدت سے یہ دوآبہ

موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی
جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

تیرے ہجر میں دن گزارنے والوں کی ہمت پر موت بھی حیران ہے اور حیرت سے ان کا منہ تکتی ہے۔

تو سلامت ہے تو ہم اے دردِ دل   مر ہی جائیں گے جو جیتے رہ گئے

اگر غمِ دل کی یہی شدت رہی تو مرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ "جیتے رہے تو مر ہی جائیں گے" کی ترکیب قابلِ غور ہے۔

پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا   پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے

محبوب کی یاد نے پھر ہمیں تڑپا دیا ہے اور ہم دل پکڑ کر رہ گئے۔ شعر کی سادگی لطف دے رہی ہے۔

اُٹھ گئے دنیا سے فانی اہلِ ذوق   ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

دنیا اہلِ ذوق انسانوں سے خالی ہو چکی ہے۔ ان کی آخری یادگار یعنی فانیؔ دنیا کی مصیبتیں جھیلنے کو باقی رہ گئے ہیں۔ اس شعر میں بھی "مرنے کو زندہ رہ گئے" کی ترکیب نے شعر میں نیا پن پیدا کر دیا ہے۔

(۳۵۹)

پھر پارہ ہائے دل پہ چھڑک دیجیے نمک
پھر کوئی چھیڑ زخمِ جگر سے نکالیے

شاعر کی خواہش ہے کہ اس کے دردِ دل میں کوئی کمی نہ ہو اور محبوب پھر اس کے زخموں پر نمک چھڑکے اور نئے چرکے لگاتا رہے۔

غم وہ بلا نہیں جسے دم دے کے ٹال دوں
سودا یہ وہ نہیں جسے سر سے نکالیے

دم دینا = دھوکا دینا۔

غم سے نجات ممکن نہیں۔ یہ ایسا جنون ہے جس کا دور ہونا ممکن نہیں۔ یہ ایسی بلا ہے جسے دم دے کر ٹالنا بھی ممکن نہیں ہے۔ "دم دینے" میں حسن یہ ہے کہ اس سے یہ مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے کہ غم سے نجات جان دے کر بھی نہیں مل سکتی۔ شعر میں صنعتِ ایہام ہے۔

تاکیدِ ضبط ہے تہِ داماں نہ روئیے
مرجائیے نہ آہ جگر سے نکالیے

محبوب کا حکم ہے کہ چاہے جان پر بن جائے مگر منھ سے آہ نہ نکلنے پائے اور چپکے چپکے بھی آنسو نہ بہیں۔

(۳۶۰)

زندگی کی ہر خلش ہے یادِ جاناں کے لیے
ہر نفس اک آڑ ہے اس رنجِ پنہاں کے لیے

زندگی کا حاصل اور مقصد عشق ہے۔ انسان کی ہر سانس اسی غمِ پنہاں کی پردہ دار ہوتی ہے اور زندگی کے آلام و مصائب اس لیے ہیں کہ ہم محبوب کی یاد سے غافل نہ ہونے پائیں فانی کے یہاں غموں کی عظمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ ہر غم کو غمِ جاناں بنا لیتے ہیں۔

اشکِ رنگیں کے سوا ہے خونِ دل بھی نذرِ دوست
ان میں جو درکار ہو تزئینِ داماں کے لیے

تزئین = آرائش

محبوب کی نذر کرنے کو ہم نے آنسو بھی رکھ چھوڑے ہیں اور خونِ دل بھی۔ وہ جس کو بھی اپنے دامن کے لائق سمجھے چن لے۔ مراد یہ کہ عاشق کے آنسو کی وہ قیمت ہے کہ محبوب کے دامن کی آرائش اسی سے ہوتی ہے۔

موج کیا، گرداب کیا کیوں کسی کا نام لوں
خود سفینہ ہی مرا دعوت ہے طوفاں کے لیے

ہم اپنی کشتی کی تباہی کے لیے موج یا گرداب کسی کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔ اس کا وجود ہی طوفان کے لیے ایک دعوت تھا کیونکہ ہماری کشتی کا مقدر ہی ڈوبنا تھا۔ تقدیر پرستی کی یہ لَے یوں تو اکثر اردو شعرا کے یہاں موجود ہے مگر فانی کے یہاں کچھ زیادہ بلند ہو گئی ہے۔

کم ہے ذرّے سے بھی یہ سارا نظامِ کائنات
دل کی وسعت چاہیے تھی چشمِ حیراں کے لیے

چشمِ حیراں = عاشق کی آنکھ جو حسنِ محبوب کے جلوے کو دیکھ کر حیران ہو گئی ہے۔

اس کائنات کی وسعتیں ہماری حیران آنکھوں کے آگے ایک ذرّہ کی طرح بے حقیقت ہیں۔ ان نگاہوں کو ایسی کائنات چاہیئے جس میں دل کی سی وسعت ہو۔ بنیادی خیال دل کی وسعت کا اظہار۔ غالبؔ کے اس شعر میں بھی اسی سے ملتا جلتا خیال پیش کیا گیا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ایک مرگِ عاشقی اور لاکھ سامانِ حیات
لاکھ غم تھے اک حیات مرگ ساماں کے لیے

ہماری زندگی موت کا نمونہ تھی اور لاکھوں غموں کی آماجگاہ۔ مگر محبت میں جان دیکر ہمیں وہ زندگی ملی ہے جو دنیا کی لاکھ زندگیوں پر بھاری ہے۔

پھر ہوا گورِ غریباں میں بگولوں کا ہجوم
خاکِ دل اٹھتی ہے تنظیمِ بیاباں کے لیے

گورِ غریباں میں بگولوں کا جو ہجوم نظر آ رہا ہے یہ دراصل عاشق کے دل کی خاک کے ذرّے ہیں جو بیاباں کی تنظیم و ترتیب کرنے نکلے ہیں۔ مراد یہ کہ عاشق کی خاک بیاباں کی باغبانی کرتی ہے۔

پھر مذاقِ اہلِ دانش چاہتا ہے انقلاب
پھر مری وحشت نے توڑے بابِ زنداں کے لیے

اہلِ عقل و دانش پھر زندگی میں انقلاب کے طالب ہیں۔ اسی لیے دیوانوں نے اہلِ ہوش کی دنیا کو خیرباد کہہ کر زنداں کو آباد کیا ہے اور اس کی چوکھٹ چومی ہے۔ مراد یہ کہ اہلِ ہوش کی دنیا میں ہمیشہ تبدیلیاں اور انقلاب آتے رہتے ہیں اور ان کا مذاق بدلتا رہتا ہے مگر عشق کی دنیا کے اصولوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

دل کی یہ شوریدگی شبہائے غم اتنی دراز
اہتمام اتنے تری زلفِ پریشاں کے لیے

عاشق کے دل کی پریشانی اور جدائی کی راتوں کا طول محبوب کی زلفِ پریشاں کی مناسبت سے ہے اور اسی کے لیے وجود میں آیا ہے۔ مراد یہ کہ اس زلف کی یاد میں ہماری راتیں کاٹے نہیں کٹتیں اور ہمارا دل پریشان رہتا ہے۔ زلفوں کا پریشان اور لمبا ہونا ظاہر ہے۔

دین و دل فانی گنوائے بھی تو ناداں اس طرح
دشمنِ ایماں کی خاطر دشمنِ جاں کے لیے

ہماری نادانی تو دیکھ کہ اپنا دین اور دل ایسے شخص کی خاطر قربان کیا جو دین کا بھی دشمن ہے اور جان کا بھی۔

(۳۶۱)

ذوقِ وحشت نو بہ نو زنداں بہ زنداں چاہیے
جب گلستاں چاہیے تھا اب بیاباں چاہیے

وحشت ہمیں ایک جگہ نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کے لیے ہر روز نئی جولاں گاہ درکار ہے اور نئے زنداں کی ضرورت ہے۔ اسی لیے پہلے ہم گلستاں میں گھومتے تھے، اب جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں۔

دل لہو کر دے وہ ضبطِ رنجِ پنہاں چاہیے
ہر لہو کی بوند لیکن رہنِ طوفاں چاہیے

محبت میں اس طرح غم کو ضبط کرنا چاہیے کہ دل خون ہو جائے لیکن خونِ دل کی ہر بوند میں طوفان کی سی شورش اور بے چینی پیدا ہونی چاہیے۔

جوششِ جذبِ آرزو بے قیدِ امکاں چاہیے
ہجرِ جاناں کیا بلا ہے یادِ جاناں چاہیے

عاشق کے جذبۂ دل میں کشش اور آرزو میں جوش ہے تو ہجر کی اس کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔ محبوب کی یاد میسر ہے تو اس سے دوری کا احساس مٹ جائے گا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جذب دل کی کشش امکان کی حد سے بھی گذر جائے۔

وہ تری عہدِ کرم کی فتنہ سامانی سہی
میری بربادی کو آخر کوئی ساماں چاہیے

بربادی عاشق کا مقدر ہے۔ اس کے لیے کوئی بہانہ درکار تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تم نے لطف و کرم کا جو وعدہ کیا تھا اس کی فتنہ سامانی ہماری بربادی کا سبب بن گئی۔ بقولِ غالب: تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

(٣٦٢)

اس نورِ مجسّم کے افسانے کو کیا کہیے
ہے شمع بھی پروانہ، پروانے کو کیا کہیے

رب (اللہ) کے رُخ انور کی تابانیوں کا یہ عالم ہے کہ پروانہ تو پروانہ شمع بھی اس کی عاشق ہے اور ہر چیز اس کے حُسن کی شیدائی ہے۔

ہر در سے ترے طالب ناکام پلٹ آئے
کعبہ میں ہے سنّاٹا، بُت خانے کو کیا کہیے

صوفیہ کے نزدیک خدا کو ظاہری رسوم اور عبادات کی پابندی کر کے نہیں پایا جا سکتا۔ بلکہ عشق کے راستہ ہی سے اس تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اسی بات کو فانی نے اکثر اشعار میں پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے تیری تلاش میں کعبہ و بُت خانہ دونوں کی خاک چھانی لیکن تو نہ بتخانہ میں ملا نہ کعبہ میں۔

کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانہ کا جل بجھنا
جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہیے

پروانہ محبت میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی سہل کام نہیں۔ مگر جو عاشق (مراد اپنے سے ہے) اس آگ میں جلتا اور سلگتا ہی رہے اس کی تپشِ دل کو کون سمجھ سکتا ہے۔ محبت میں جان دینا آسان ہے مگر زندہ رہ کر اس کی اذیتوں کو برداشت کرنا مشکل۔

آغاز بھی تو جس کا انجام بھی تو جس کا
اُس دردِ محبّت کے افسانے کو کیا کہیے

عارفوں کے نزدیک انسان کی ہستی بھی حسنِ ازل ہی کا ایک عکس اور پرتو ہے اور اس کی معراج یہ ہے کہ وہ اس کی محبت میں خود کو مٹا کر اس میں خود کو گم کر دے یا اس سے وصل کر دے۔ پھر جب عاشق کی ابتدا اور انجام دونوں میں محبوب ہی کا جلوہ رہ جاتا ہے تو اس کی ہستی اور اس کے عشق کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ جو کچھ ہے وہ ہی ہے۔

عشق ہے پرتوِ حُسنِ محبوب
آپ ہی اپنی تمنّا! کیا خوب

آبادی کی آبادی، ویرانے کا ویرانہ
ارمان بھرے دل کے کاشانے کو کیا کہیے

ہمارا دل جو حسرتوں اور ارمانوں کا مسکن ہے ایک ایسے گھر کی طرح ہے جو آبادی کے باوجود ویران ہو۔ دل کو آباد اس لیے کہا ہے کہ اس میں ارمانوں کا ہجوم ہے اور ویران اس لیے کہ یہ ارمان ناکام و مردہ ہیں۔

اُجڑی ہوئی آنکھوں میں رونق ترے دم سے تھی
ویران ہے ہر بستی، ویرانے کو کیا کہیے

محبوب قریب تھا تو ہر چیز ہنستی مسکراتی نظر آتی تھی اور ہر جگہ رونق تھی۔ اب یہ عالم ہے کہ ویرانوں کا تو ذکر ہی کیا آبادیاں بھی ویران محسوس ہوتی ہیں۔

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

کس نے اسے دیکھا ہے اے حسرتِ نظارہ
فانی تو ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیے

فانی تو خیر دیوانہ ہے اس کی بات چھوڑو لیکن کیا اہلِ ہوش میں سے بھی کسی کو محبوب (اللہ تعالیٰ) کا دیدار نصیب ہو سکا ہے۔ حسرتِ نظارہ کے باوجود کوئی اسے دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔

(۳۶۳)

مجبورِ شکایت ہوں، تاثیر کو کیا کہیے
تدبیر مقدر تھی، تقدیر کو کیا کہیے

ہم شکوہ اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں تاثیر کی کوئی امید ہے۔ اسی طرح اپنی تدبیر کی کامیابی سے بھی ہم مایوس ہیں مگر اس کے باوجود شکوہ بھی کرتے ہیں اور تدبیر بھی۔ کیونکہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں اور ہمارے لیے یہی مقدر ہو چکا ہے۔

فردوس بداماں ہے ہر نقشِ خیال ان کا
یہ شانِ تصور ہے تصویر کو کیا کہیے

محبوب کا تصور بھی اس قدر حسین ہے کہ اس کی بدولت ہمیں جنت کا لطف میسر ہے۔ جب تصور کا یہ عالم ہے تو خود اس کے حسن کا کیا حال ہوگا۔

وابستۂ صد حسرت بے واسطۂ دل ہوں
اپنا ہی میں زنداں ہوں زنجیر کو کیا کہیے

عام طور پر انسان کے دل کو اس کے غموں کا ذمہ دار خیال کیا جاتا ہے اور محبت کی قید کو سب سے بڑی زنجیر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں فانی کہتے ہیں کہ میں دل کی وساطت کے بغیر ہی سیکڑوں حسرتوں میں گرفتار ہوں۔ میرے لیے کسی زنجیر کی ضرورت نہیں بلکہ میری ہستی ہی میرے لیے قید خانہ ہے۔ مراد یہ کہ زندگی نام ہی غموں اور مجبوریوں کا ہے۔ محبت کا غم نہ بھی ہو تو بھی زندگی میں غموں کی کمی نہیں۔

وہ برق کی یورش ہے، ہر شاخ میں لرزش ہے
ایسے میں نشیمن کی تعمیر کو کیا کہیے

یورش = حملہ

ہم اس باغ میں کس اُمید پر آشیانہ بنائیں جہاں ہر وقت بجلیوں کی یورش رہتی ہے اور ہر شاخ ان کے خوف سے لرزتی ہے۔ جس گلستاں کی ہر چیز تباہی کی زد میں ہو

اس میں کوئی تعبیر کرنا عبث ہے۔ غزل کی علامتوں میں اُس عہد کے سماجی انتشار کی تصویر کشی اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔

سُنتے ہیں حجاب اُن کا عرفانِ تمنّا ہے
اب حرفِ تمنّا کی تعبیر کو کیا کہیے

عرفانِ تمنّا = محبّت کا احساس یا شعور

محبت کی آخری منزل پہ پہنچ کر بھی کوئی خدا کو نہیں دیکھ سکا ہے کیونکہ اس محبت یا تمنّا کا عرفان ہی حسن کا حجاب بن جاتا ہے۔ یہ سمجھنا کہ ہم یا ہماری تمنّا محبوب کی ذات سے الگ بھی کوئی حیثیت رکھتی ہے یہی ہمیں اس سے دور کر دیتا ہے اور جب تک ہماری تمنّا درمیان میں حائل ہے ہم اس کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ لفظ تمنا کا کیا مطلب ہے تو اس سوال کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ مراد یہ کہ جب شاہد و مشہود میں کوئی فرق نہیں تو پھر یہ مشاہدہ یا تمنّائے شاہد کیا معنی رکھتی ہے۔

یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانیؔ
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے

شاعر کو یقین ہے کہ خدا رحیم ہے اور وہ اس پر بھی رحم کرے گا لیکن وہ اس بات کا شاکی ہے کہ اس پر رحم کرنے میں تاخیر کا کیا سبب ہے۔

(۳۶۴)

کہتے ہیں ذرا پھر سے افسانۂ غم کہیے
اس حسنِ تجاہل کو کس طرح کرم کہیے

محبوب عاشق کی داستانِ غم کو ایک دلچسپ کہانی کی طرح بار بار سننے کا تقاضا کر رہا ہے۔ لیکن اس کی یہ توجہ بھی تجاہل ہی کا اظہار ہے، اس لیے عاشق اسے مہربانی یا کرم ماننے پر تیار نہیں۔

غم اس کی امانت ہے انعامِ محبّت ہے
بیگانگیٔ غم کو محرومیٔ غم کہیے

غمِ عشق عاشق کے لیے محبوب کا انعام اور ایک نعمتِ عظیم ہے۔ جو لوگ غم سے بیگانہ ہیں وہ دراصل اس نعمت سے محروم ہیں۔

تھوڑی ہی بہت ہو گی فرصت ہی میں سن لینا   یہ دل کی کہانی ہے کیا کہیے جو کم کہیے

محبوب عاشق کی روداد سننے پر آمادہ تو ہے مگر ساتھ میں یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ کہانی کو مختصر کر کے سناؤ مجھے فرصت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ انداز عاشق کے لیے ہمت شکن ہے۔ وہ کہتا ہے تمھیں ابھی فرصت نہیں تو پھر کبھی سن لینا۔ ہمارے دل کی کہانی اس قدر طول طویل ہے کہ کم ہونے پر بھی بہت ہو گی۔

(۳۶۵)

عہدِ جوانی اور پھر دل میں ان کی محبت کیا کہیے
دیوانے کا خواب اور وہ بھی خوابِ قیامت کیا کہیے

ایک تو جوانی خود ہی ہنگامہ پرور۔ اور اگر اس میں انسان کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس سے بڑھ کر قیامت کیا ہو گی۔ محبت کی بے حقیقتی اور ہنگامہ خیزی کی بنا پر محبت کے زمانہ کو دیوانہ کا خواب قیامت کہنا نیا خیال ہے۔

حرفِ تمنّا بے معنی سا نقشِ وفا سو دھندلا سا
دل کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے دل کی حقیقت کیا کہیے

دل کی قدر و قیمت تمناؤں پر اور جذبۂ وفا پر منحصر ہے لیکن اس دنیا میں حرفِ تمنا ایک بے معنی لفظ ہے اور وفا ایک دھندلے نقش کی مانند ہے۔ اب ایسی صورت میں ہم دل کی حقیقت کے بارے میں کیا بتائیں کہ دل ہے کیا۔ مراد یہ کہ دنیا کی ہر چیز یہاں تک کہ دل بھی بے حقیقت اور بے بنیاد ہے۔

حشر بھی گزرا حشر میں بھی یہ سوچ کے ہم نے کچھ نہ کہا
غم کی حکایت کون سنے گا غم کی حکایت کیا کہیے

روزِ حشر ہم بھی اپنے دل کی کہانی سنا سکتے تھے مگر یہ سوچ کر ہم خاموش ہی رہے کہ ایسی دکھ بھری کہانی کون سنے گا۔ شاعر کو امید نہیں کہ قیامت کے دن بھی اس کی فریاد سنی جائے گی۔

وہ نہ سہی مغرور مگر کچھ ہمتِ عرضِ حال تو ہو
شکر کیے بھی بن نہیں پڑتا، حرفِ شکایت کیا کہیے

محبوب مغرور نہیں۔ یہ تو ہماری کم ہمتی ہے کہ ہم اس کے سامنے زبان ہی نہیں کھول سکے۔ اور شکایت تو دور رہی شکر کرنے سے بھی قاصر ہیں۔

ایک غلط انداز نظر سے دل کی تباہی سہل نہ تھی
درد سے مل کر تو نے لٹا دی صبر کی دولت کیا کہیے

محبوب کی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پر ہم نے اپنا ہوش اور تاب و تواں لٹا دیا۔ لیکن اس کی نظر کو اس کے لیے الزام دینا درست نہیں۔ اگر ہم خود ہی محبت کے جادو میں آکر اپنا سب کچھ اس کے حوالے نہ کر دیتے تو اس کی ایک نگاہ کیا کر سکتی تھی۔

مرگِ محبت سے فانی تکمیلِ وفا ہم کیا کرتے
ہم نے جینے ہی سے نہ پائی اب تک فرصت کیا کہیے

محبت میں جان دے کر ہی وفا کی تکمیل ہو سکتی تھی لیکن کیا کریں کہ ہم زندگی کے ہاتھوں ایسے مجبور تھے کہ ہمیں مرنے کی فرصت بھی نہ مل سکی۔

(۳۶۶)

آٹھ پہر کی یہ بے چینی یہ بے تابی کیا کہیے
حد سے گزری دل کی خرابی، دل کی خرابی کیا کہیے

دل کی تباہی و بربادی حد سے سوا ہو چکی ہے۔ اس کا بیان بھی امکان سے باہر ہے اور ہمیں دن رات تڑپتے ہی گزرتے ہیں۔

تم کیا جانو کیا سے ہے طوفان سرشکِ خونیں کا
تم نے چھلکتے ہی نہیں دیکھی دل کی گلابی کیا کہیے

سرشکِ خونیں = خون کے آنسو۔

خون کے آنسوؤں کا طوفان کیا چیز ہوتا ہے اور دل کا خون کس طرح آنکھوں میں آجاتا ہے یہ تم کیا جانو۔ تم نے کبھی یہ منظر دیکھا ہی نہیں۔

ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا
بحرِ بے پایانِ محبت کی پایابی کیا کہیے

پایابی = کم گہرائی

محبت ایک ایسا سمندر ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں اور جس کو پار کرنا ناممکن ہے لیکن ابتدائے عشق میں انسان کو اس کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اسے یہ بے پایاں سمندر پایاب نظر آتا ہے اور وہ موجوں کو کنارا تصوّر کرکے اس میں کود جاتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حال انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسّم یہ شادابی کیا کہیے

بہار کے موسم میں کلیوں کی رنگینی و شادابی دیکھ کر شاعر کو گزری ہوئی بہار کے پھولوں کا انجام یاد آجاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا کلیوں کو ان کا حشر نہیں معلوم جو اس طرح مسکرا رہی ہیں۔ کسی شاعر کا شعر ہے:

سمجھتی ہیں مآلِ گل مگر کیا جبرِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

ہوش جنھیں دل بن کر آیا ان کی تڑپ کا کیا کہنا
غم نے جنھیں بیدار کیا ان کی بیخوابی کیا کہیے

جو لوگ ہوش سنبھالتے ہی دل کے آزار میں مبتلا ہو گئے ہوں ان کی تڑپ کا کون اندازہ کر سکتا ہے اور جن کو آنکھ کھولتے ہی آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہو ان کی آنکھوں میں نیند کا کیا سوال۔ شاعر نے اپنی حالت کی تصویر کھینچ دی ہے۔

کتنے فتنے جمع کیے ہیں ان کی ایک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہیے

جوانی آتے ہی محبوب کی ایک ایک ادا قیامت خیز اور فتنہ پرور ہو گئی ہے۔ اس شعر میں جو مصوری کی کیفیت ہے اس نے اسے غالب کے اس شعر سے بڑھا دیا ہے:

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات   عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

خاکِ وطن ہی راس نہ آئی غربت تو پھر غربت ہے
فانی اپنی خانہ بدوشی، خانہ خرابی کیا کہیے

ہماری بدنصیبی اور خانہ خرابی کیا پوچھتے ہو۔ پردیس تو خیر پردیس ہی ہے، ہمیں تو وطن بھی راس نہ آسکا۔

(۳۶۷)

مژدۂ عیش بہ تمہیدِ پریشانی ہے   للہ الحمد کہ پھر غم کی فراوانی ہے

فراوانی = زیادتی

کہا جاتا ہے کہ غم خوشی کا پیش خیمہ ہے اور ہر غم کے بعد خوشی آتی ہے۔ شاعر اپنے دکھوں اور مصیبتوں سے دل برداشتہ ہونے کی بجائے ان پر شکر ادا کرتا ہے اور غموں کی فراوانی سے خوش ہے کہ یہ غم و پریشانی خوشیوں کی تمہید ہیں۔

حیرتِ عشق کو رکھے کوئی کیونکر نہ عزیز   تیرے آئینہ میں بھی یہ وہی حیرانی ہے

حیرانی آئینہ کی صفت کہلاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہی جاتی ہے کہ وہ محبوب کے جلووں کو دیکھ کر حیران ہو گیا ہے۔ عشق میں عاشق کے دل پر جو حیرت و مدہوشی طاری ہے وہ اس کو اپنے لیے باعثِ فخر خیال کرتا ہے اور عزیز رکھتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اسے محبوب کے آئینہ سے مشابہت حاصل ہو گئی ہے۔ مراد یہ کہ یہ حیرت محبوب کے جلووں کی پیدا کی ہوئی ہے اور اس کا دل ان جلووں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

دونوں عالم ہیں ترے سوختہ ساماں پہ نثار   چشمِ بد دور عجب بے سر و سامانی ہے

سوختہ ساماں = جس کا ساز و سامان جل چکا ہو۔

جو محبت میں اپنا سب کچھ پھونک دیتا ہے وہ اگرچہ ظاہری نگاہوں میں بے سر و سامان ہوتا ہے لیکن محبت اسے ایسی دولت دے دیتی ہے کہ وہ دونوں عالم سے غنی ہو جاتا ہے۔

قطرہ کیا، موج کسے کہتے ہیں، کیسا گرداب
ڈوب کر دیکھ، نہ دریا ہے، نہ طغیانی ہے

جب تک انسان کسی مشکل میں قدم نہیں ڈالتا اسے سیکڑوں خدشے اور خطرات لاحق رہتے ہیں لیکن ایک بار اس میں داخل ہونے کے بعد پھر یہ خطرات بے معنی لگتے ہیں اور ہر مشکل آسان ہوتی چلی جاتی ہے۔ شاعر کا یہی کہنا ہے کہ جب تک تم حوادث کے دریا میں اُترو گے نہیں گرداب اور موجیں تمھیں ڈراتی رہیں گی لیکن جب تم اس میں اُتر جاؤ گے تو نہ طغیانی رہے گی نہ طوفان۔ یہ فانیؔ کا مستقل فلسفہ اور ان کی غم پسندی کا بنیادی سبب ہے۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

اس بحرِ بیکراں میں کشتی کی جستجو کیا
ساحل کی آرزو کیا، ڈوب اور پار اُتر جا

ہاں یہ ویرانے ہی آباد بھی ہو جاتے ہیں
کوئی میرے دلِ برباد کی ویرانی ہے

اگر کوئی بستی ویران ہو جائے تو غم کی بات نہیں کیونکہ ہر ویرانہ کبھی نہ کبھی پھر آباد ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ہمارے دل کی ویرانی تو نہیں کہ ایک بار اُجڑا تو پھر کبھی آباد ہی نہ ہو۔ شعر کا انداز بہت مؤثر ہے۔

غمِ دوری اثرِ قرب سے محروم نہیں
میرے نالوں میں بھی اندازِ غزل خوانی ہے

اگرچہ ہم محبوب سے جدا ہیں مگر اس جدائی میں اس کی یاد اور اس کا تصوّر ہمارے خیالوں میں بسا ہوا ہے اسی لیے ہمارے نالوں میں بھی رنگینی اور دل کشی آ گئی ہے۔

میں کہاں اور کہاں عمرِ دو روزہ فانیؔ
زندگی اب بہ تقاضائے گراں جانی ہے

گراں جانی = سخت جانی۔

زندگی کو مختصر ہونے کے اعتبار سے دو دن کہا جاتا ہے۔ فانیؔ کہتے ہیں کہ ہم زندگی کے یہ دو دن کس طرح گزار رہے ہیں۔ یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہم صرف اپنی سخت جانی کی وجہ سے زندہ ہیں ورنہ زندگی کے الم ہمیں کب کا ختم کر چکے ہوتے۔

وہ بیخودی کے پیالے پلا دیئے تو نے
مرے حواس ٹھکانے لگا دیئے تو نے

محبوب نے ہمیں اپنی محبت میں اس طرح بے خود کیا ہے گویا ہم نے شراب کے جام کے جام چڑھا لیے ہوں اور ہم ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے ہوں۔

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر
تجلّیات کے دریا بہا دیئے تو نے

حقیقت بیں نگاہوں کو ہر حسین چیز میں محبوب حقیقی کے حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ پھولوں پر پڑا ہوا شبنم کا قطرہ بھی شاعر کے لیے ایک آئینہ ہے جو محبوب کے حسن کو نمایاں کر رہا ہے۔ قطرہ کو دریا کہنے میں صنعت بھی ہے اور یہ تصوف کی اصطلاح بھی ہے۔

بنا کے ہجر کی راتوں کو بے نیازِ سحر
تعینات کے پردے اُٹھا دیئے تو نے

محبوب (اللہ تعالیٰ) نے ہمیں جدائی کی نہ ختم ہونے والی رات دی یعنی ہمیں اپنے سے دور کر دیا۔ مگر اس دوری نے ہمیں اس سے اور قریب کر دیا۔ اب وہ تمام پردے جو ہمارے اور اس کے درمیان حائل تھے اُٹھ گئے اور ہم ہر دم اسے ہی دیکھتے ہیں۔ اس کے سوا ہر چیز ہماری نظر سے غائب ہو چکی ہے۔

دکھا کے تجزیۂ رنگ و بو کا حسنِ کمال
مشاہدات کے ٹکڑے اڑا دیئے تو نے

رنگ و بو = عالم کا ظاہری حسن جس کو مادی ذرائع سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔
یہ تیری محبت کا فیضان تھا کہ جب ہم نے رنگ و بو کا تجزیہ کیا اور اس کی حقیقت تک پہنچے تو اس میں ہمیں وہ حسن پوشیدہ نظر آیا جس نے ہمارے مشاہدات کو باطل کر کے اس کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اس شعر میں فانی فلسفۂ ویدانت کے اس نظریہ کی عکاسی کر رہا ہے جس کے مطابق ہر خیر حسن اور سچائی کی اصل خدائے تعالیٰ ہے (ستیم، شوم، سندرم)

دلوں کو دے کے فریب سکونِ بے آرام
تغیّرات کے نقشے جما دیئے تو نے

اس شعر میں فریبِ سکون بے آرام کی ترکیب میں قولِ محال ہے۔ فانیؔ نے قولِ محال سے کام لے کر قانونِ فطرت کی نیرنگی یا تغیّر ثابت کیا ہے کہ جسے سکون سمجھا وہ بھی بے آرام ہونے کی وجہ سے 'فریب سکون' نکلا۔ بقولِ اقبالؔ : ع۔ ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

یقینِ عشق کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
توہمات کے شعلے بجھا دیئے تو نے

صوفیوں اور فلسفیوں کے نزدیک ایمان کی اصل عشق ہے۔ عقل آدمی میں شکوک پیدا کرتی ہے اور اسے گمراہ کرتی ہے مگر عشق کے ذریعے وہ یقینِ کامل حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے اقبالؔ نے عقل کو "غیاب و جستجو" سے تعبیر کیا ہے اور عشق کو "حضور و اضطراب" بتایا ہے۔ فانیؔ بھی اس شعر میں خدا تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ تو نے میرے دل کو عشق کی روشنی عطا کر دی جس نے وہم و شکوک کے تمام شعلوں کو بجھا دیا اور مجھے یقین سے سرفراز کر دیا۔

عطائے نعمتِ سوز و گداز کی خاطر
اذیتوں کے خزانے لٹا دیئے تو نے

روح کا سوز اور دل کا گداز فانیؔ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے اور یہ چیزیں انسان کو غموں اور اذیتوں میں مبتلا ہو کر ہی حاصل ہوتی ہیں۔ اس لیے فانیؔ غم کو بھی بہت بڑی دولت خیال کرتے ہیں اور سپاس گزار ہیں کہ خدا نے اس نعمت کو اس قدر عام کر دیا ہے۔

سرودِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے

زندگی کے دو راستے ہیں۔ ایک عقل کا راستہ جو مادّی خوشیاں اور سرور کی راہ پر لے جاتا ہے۔ دوسرا عشق کا راستہ جس کی منزل غم ہے۔ اگرچہ سب جانتے ہیں کہ عشق کا راستہ منزل تک پہنچا دیتا ہے مگر اس کی تکلیفوں اور دشواریوں کو دیکھ کر اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ مراد یہ کہ عشق کی دشواریاں اور غم ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو صاحبِ ہمت ہوتے ہیں۔

حجابِ نطق کو معجز نمائیاں دے کر
نظر کی آڑ میں جادو جگا دیئے تو نے

فانی نے اس شعر میں نظر کو نطق کا حجاب کہہ کر اس کی معجز نمائی سے گفتگو کا جادو جگایا ہے۔ یہ بات دوسرے انداز سے جگر نے بھی کہی ہے۔

محبت جب سکونِ زندگی برباد کرتی ہے
تو لب خاموش رہتے ہیں نظر فریاد کرتی ہے

جمالِ یار کا افسانہ چھیڑ کر فانی
شعاعِ نور سے دل جگمگا دیئے تو نے

فانی کے اشعار میں محبوب کے حسن و جمال کا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل اس کی روشنی سے منور ہو گئے ہیں۔

فانی کی یہ غزل مسلسل حمد کے موضوع پر بالکل نئے انداز کی ہے۔ اس میں بیک وقت تغزل بھی ہے اور پاکیزگی بھی اور حمد بھی ہے لیکن در پردہ شکایت بھی۔

(۳۶۹)

ہے ہجر میں اور گردشِ ایام نہیں ہے
یعنی جو سحر ہو بھی گئی شام نہیں ہے

ہجر کے لمحات عاشق کو اتنے طویل محسوس ہوتے ہیں کہ جیسے وقت اپنی جگہ رک گیا ہو۔ ایسی کیفیت کو ظاہر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی جدائی میں لگتا ہے کہ وقت کا سلسلہ رک گیا ہے اور اگر ہم کسی طرح رو رو کر رات گذار دیتے ہیں تو پھر دن گذرتا نظر نہیں آتا۔

آثار ہی کچھ دردِ محبت کے برے تھے
آغاز ہی کہتا تھا کہ انجام نہیں ہے

دردِ محبت میں ابتدا ہی سے وہ شدت تھی کہ عاشق کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ درد کبھی ختم ہونے والا نہیں اور اس کے آثار اچھے نہیں۔

ارمان نکل جائیں کہ آمد ہے کسی کی
دل ہے کوئی نظارہ گہِ عام نہیں ہے

دل میں محبوب کے آنے کے بعد کسی تمنا اور خواہش کی گنجائش نہیں۔ یہ اس کی جلوہ گاہ ہے یہاں غیر کا کیا کام۔ اس لیے تمام ارمانوں سے کہہ دو کہ دل سے نکل جائیں۔

ہر نام میں اک شانِ تعیّن ہے بہرحال
جو نام ہے تیرا وہ ترا نام نہیں ہے

نام رکھنے کا مطلب ہوتا ہے کسی شخص یا چیز کو باقی دوسری چیزوں سے الگ کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود اور غیر متعین ہے اس لیے اس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہم اس کا جو بھی نام رکھیں گے اس میں بہرحال ایک حد بندی یا تعیّن ہوگا۔

محسوب ہے کیا عمر میں واعظ وہ گھڑی بھی
جو صرفِ صراحی و مے و جام نہیں ہے

محسوب = جس کا حساب کیا جائے۔

واعظ یہ کہہ کر شاعر کو شراب نوشی سے باز رکھنا چاہتا ہے کہ انسان کے ایک ایک عمل اور ایک ایک لمحہ کا خدا کے یہاں حساب ہوگا۔ اس پر شاعر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیکر اس سے پوچھتا ہے کہ کیا ان لمحات کا بھی حساب ہوگا جو ہم نے شغل مے نوشی کے بغیر گذارے ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ تو جن لمحات کو رائگاں سمجھتا ہے ہمارے نزدیک وہ ہی حاصلِ زندگی ہیں اور وہ وقت جو بغیر مے نوشی کے گزرا ہے اسے ہم اپنی زندگی میں شامل ہی نہیں سمجھتے۔

چہرہ پہ بڑھا لیجیے اتنی ہی نقاب اور
ناکام تماشا ابھی ناکام نہیں ہے

محبوب نے اپنے حُسن کو چھپانے کے لیے چہرہ پر نقاب ڈال رکھی ہے مگر اس کا حُسن عاشق کی نگاہوں سے اب بھی چھپ نہیں سکا ہے۔ اس سے کہو اس پردہ کو اور زیادہ کر دے۔ مراد یہ کہ عشق صادق ہو تو محبوب کا حسن لاکھ پردوں کے باوجود بھی عاشق کی نگاہوں سے چھپتا نہیں۔ شعر کو حقیقی معنوں میں لیں تب یہ معنی نکلیں گے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حُسن کو مظاہر کے پردوں میں چھپا رکھا ہے مگر اہلِ نظر ان پردوں کے باوجود اس کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔ بقول شاعر:

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

جیتا ہوں کہ فانی مجھے جینا نہیں منظور
اچھا ہوں کہ اب حسرتِ آرام نہیں ہے

فلسفہ کے ایک مخصوص نظریہ کے مطابق (جس کا ایک مبلغ شوپنہادر ہے) زندگی کے آرام و مصائب سے مستقلاً چھٹکارا پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دنیا اور اس کی خواہشات کو بالکل تج دیا جائے۔ فانی بھی اسی نظریہ کے حامی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے زندگی کی خواہش اور فراغت و آرام کی حسرت کو دل سے نکال دیا ہے اسی لیے ہم اب آرام سے جی رہے ہیں اور کوئی غم نہیں ہے۔

(۳۷۰)

کیا جانئے کہاں تک تمہیدِ زندگی ہے   یہ زندگی تو اب تک اُمیدِ زندگی ہے

اب تک ہم نے دنیا میں جو وقت گزارا ہے اسے زندگی کا نام تو نہیں دیا جا سکتا۔ امیدِ زندگی البتہ کہا جا سکتا ہے۔ دیکھیں یہ دور کب تک چلتا ہے اور اصل زندگی کب شروع ہوتی ہے۔ اصل زندگی سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ فانی کے یہاں موت بہت خوش آئند چیز ہے اور اس کی امید میں ہی وہ زندگی کی اذیتیں برداشت کرتا ہے۔

حرماں نصیب ہوں اور مجبورِ آرزو بھی   محرومِ زندگی کو تاکیدِ زندگی ہے

اس دنیا میں انسان کی زندگی بے بسی و مجبوری کا نمونہ ہے۔ زندگی کی خوشیوں پر اس کا اختیار نہیں مگر پھر بھی جینے پر مجبور ہے۔ اسی طرح خواہشوں کے انجام سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کا دل خواہشوں سے بچ نہیں سکتا۔

اُمید مضطرب ہے ہر آرزو کی منزل   ہر سانس شامِ وعدہ تجدیدِ زندگی ہے

آرزوؤں کا حاصل فانی کے نزدیک اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ دل میں مسلسل بے چینی اور اضطراب رہے۔ اسی طرح وعدہ کی شام محبوب کے انتظار میں جو سانسیں آتی ہیں وہ گویا زندگی کی تجدید ہیں۔ یعنی ہر سانس پر ہم مرتے ہیں اور پھر سے جی جاتے ہیں۔ انتظار کی اذیت کے اظہار کے لیے بالکل نیا انداز اختیار کیا ہے۔

کچھ شرحِ بیخودی ہے کچھ ہوش کا فسانہ   یہ بیکسی جو شاید تنقیدِ زندگی ہے

زندگی کے آلام و مصائب کے بارے میں ہم منھ سے کچھ نہیں کہتے مگر اس پر ہم نے جو بے حسی کا رویہ اور بے تعلقی کا انداز اختیار کر لیا ہے وہ ہی اس پر بہت سچی تنقید بھی ہے۔ ہماری یہ بے حسی اگر ایک طرف بے خودی کی علامت ہے تو دوسری طرف ہماری ہوش مندی کا ثبوت بھی ہے۔ مراد یہ کہ زندگی کے مصائب کا مداوا ممکن نہیں تو ان سے بے تعلق و بے پروا ہو جانا ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے۔

مرنے کی آرزو میں عمریں گذار دی ہیں
اربابِ دل کی ہستی تقلیدِ زندگی ہے

تقلید = نقل، سوانگ

محبت کرنے والوں کو زندگی سے کوئی لگاؤ یا انس نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی تو صرف زندگی کی نقل ہوتی ہے اور وہ محض موت کے انتظار میں زندگی کے طول طویل وقفہ کو برداشت کرتے ہیں۔ موت اہلِ دل کے نزدیک محبوب کا وصال ہے اور زندگی اس سے جدائی۔

اسرارِ زندگی کو سمجھوں تو کیا سمجھ لوں
جس زندگی کو دیکھا تردیدِ زندگی ہے

ہمیں تو کوئی شخص ایسا نہیں نظر آیا جسے حقیقی معنوں میں زندہ کہا جا سکے بلکہ جس کو دیکھا اس کی ضد ہی نظر آیا۔ ایسی زندگی کو کوئی کس طرح سمجھے اور کیا سمجھے۔

احساسِ زندگی ہے مرہونِ عشقِ فانی
پیغامِ موت گویا تائیدِ زندگی ہے

عشق اگرچہ عاشق کے لیے پیغامِ موت ہوتا ہے لیکن اسی کے فیض سے زندگی زندگی کہلائی جانے کی مستحق ہوتی ہے۔ گویا زندگی کے وجود کا ثبوت موت ہی مہیا کرتی ہے۔ فلسفہ کی رو سے ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ چنانچہ موت زندگی کی ضد بھی ہے اور اس کے اثبات کا ذریعہ بھی۔

(۳۷۱)

تیرے غم میں تباہ ہوتی ہے
زندگی رو براہ ہوتی ہے

رو براہ = صحیح راستہ کی طرف جانا۔

تیرے غم میں زندگی تباہ ضرور ہوگئی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہماری زندگی کو منزل کا نشان مل گیا ہے اور وہ صحیح راستہ پر جا رہی ہے۔ عشق میں برباد ہونا زندگی کا ماحصل و مقصد ہے۔

دل میں آ کر جو آہ ہوتی ہے
سخت کافر نگاہ ہوتی ہے

محبوب کی نگاہیں ایسی قاتل ہیں کہ جب وہ کسی پر نگاہ کرتا ہے تو اس کے سینے سے بے اختیار آہ نکل جاتی ہے۔

تجھ سے انکار بن نہیں پڑتا
اپنی ہستی گواہ ہوتی ہے

اس کائنات کی ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کے وجود کی شاہد اور اس پر دلیل ہے سب سے بڑھ کر خود انسان کی ہستی اس کا سب سے بڑا مظہر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ کافروں سے کہیے کہ کیا تم نے زمین و آسمان کی بناوٹ اور خود اپنے اوپر غور نہیں کیا کہ یہ کس طرح بنے۔ فانی بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت خود اپنی ہستی کو خیال کرتے ہیں اور اس کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا انکار ناممکن سمجھتے ہیں۔ شعر میں "تجھ سے انکار" کا جملہ زیادہ موزوں نہیں۔ اس کی جگہ "تیرا انکار" بہتر ہوتا۔

طاقتِ ضبط کا سوال نہیں
اب تو ہر سانس آہ ہوتی ہے

جب یہ حال ہو کہ سانس کی جگہ آہیں سینہ سے نکلیں تو ضبط اور صبر کا سوال ہی نہیں رہتا۔

ہم کہاں اور نگاہِ شوق کہاں
وہ بھی تیری نگاہ ہوتی ہے

شاعر کے نزدیک عشق اور حُسن کوئی الگ الگ چیز نہیں بلکہ حسن ہی کا دوسرا رُخ عشق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کہاں ہم اور کہاں جذبۂ عشق۔ یہ تیرے حُسن ہی کا فیضان ہے جس نے ہماری نگاہ کو شوق عطا کیا ہے۔ گویا ہماری آنکھوں میں نگاہ تیری ہے۔

(۳۷۲)

گلچیں کے لیے اور نہ گلشن کے لیے ہے
جو گل ہے ترے گوشۂ دامن کے لیے ہے

دنیا کی ہر حسین چیز ہمارے محبوب کی خاطر بنائی گئی ہے۔ پھولوں کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ محبوب انھیں اپنے دامن میں بھر لے۔

امیدِ وفا تجھ سے اور امیدِ نوازش
تو دوست کے بس کا ہے نہ دشمن کے لیے ہے

تجھ جیسے بے مہر سے کسی مہربانی یا کرم کی توقع رکھنا فضول ہے۔ تو نہ دوستوں کا دوست ہے نہ دشمنوں کا۔

چل گورِ غریباں میں نہ اس خاک سے بچکر
تیرے ہی جو سمٹے ہوئے دامن کے لیے ہے

عاشق کی قبر کی خاک محبوب کے دامن تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہے۔ مگر اسے یہ بھی منظور نہیں اس لیے وہ گورِ غریباں سے اپنا دامن سمیٹ کر گزر رہا ہے۔ عاشق اس سے التجا کرتا ہے کہ اب تو ہماری یہ خواہش پوری کر دے اور ہماری خاک سے اس طرح دامن بچا کر نہ جا۔ ہم اسی آرزو میں خاک ہوئے ہیں کہ تیرے دامن تک رسائی نصیب ہو جائے۔

مدفن جو سرِ رہ گذرِ دوست ہے فانیؔ
روز ایک قیامت ترے مدفن کے لیے ہے

مر کر ہماری قبر محبوب کی راہ گزر میں بنائی گئی ہے مگر جب بھی وہ ادھر سے گذرتا ہے، ہمارے اوپر قیامت گزر جاتی ہے۔ محبوب کی چال کو قیامت سے تشبیہ دینا عام ہے۔ قیامت کا تصور یہ ہے کہ اس روز تمام مردے قبروں سے نکل جائیں گے۔ عاشق پر روزانہ یہ قیامت محبوب کی وجہ سے نازل ہوتی ہے۔

(٣٧٣)

سوالِ دید پہ تیوری چڑھائی جاتی ہے
مجالِ دید پہ بجلی گرائی جاتی ہے

عاشق محبوب سے دیدار کی تمنا کرتا ہے تو کبھی تو وہ اس پر خفا ہو کر تیوری چڑھا لیتا ہے لیکن کبھی اپنے جلوؤں کی تجلیوں سے اس کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

خدا بخیر کرے ضبطِ شوق کا انجام
نقاب میری نظر سے اُٹھائی جاتی ہے

اب تک تو ہم اپنی محبت کو چھپائے رہے اور ضبط کرتے رہے مگر اب محبوب وہ پردہ اٹھا رہا ہے جو ہمارے اور اس کے درمیان حائل تھا۔ اب خدا ہی ہماری طاقتِ ضبط کا حافظ ہے۔ نظر سے نقاب اٹھانے میں ایک لطیف اشارہ یہ ہے کہ محبوب کا حسن تو ہمیشہ سے ظاہر اور بے نقاب ہے۔ یہ عاشق کی نگاہوں کی نارسائی ہوتی ہے جو اس کے دیدار میں حائل رہتی ہے اور اس نقاب کا اُٹھنا بھی محبوب (خدا) کی توجہ پر منحصر ہے۔

اسی کو جلوۂ ایمانِ عشق کہتے ہیں
ہجومِ یاس میں بھی آس پائی جاتی ہے

مایوسی کو اسلام میں کفر کہا گیا ہے اور خدا سے اچھی اُمید رکھنا ایمان کا جزو ہے۔ اسی طرح فانیؔ کے نزدیک عشق میں بھی مایوسی گناہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایمانِ عشق کی بدولت ہمیں یہ درجہ ملا ہے کہ مایوسیوں میں بھی آس کی کرن جھلکتی رہتی ہے اور ہم کبھی نااُمید نہیں ہوتے۔

اب آگئے ہو تو اور اک ذرا ٹھہر جاؤ
ابھی ابھی میری میت اُٹھائی جاتی ہے

محبوب عاشق کے جنازے پر آ تو گیا ہے لیکن جانے کی بھی جلدی کر رہا ہے۔ عاشق اس سے ملتجی ہے کہ اتنی دیر اور رُک جاؤ کہ احباب جنازہ اُٹھالیں۔

مرے قیاس کو اپنی تلاش میں کھو کر
مرے حواس کو دنیا دکھائی جاتی ہے

محبوب نے اپنے عشق میں مبتلا کر کے ہمارے خیالات کو اپنے میں جذب کر لیا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ ہم دنیا کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ یہ اس کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔ مراد یہ کہ جو عشق میں اپنے آپ کو گم کر چکا اسے دنیا کے مناظر اور دلکشیوں سے کیا واسطہ۔

متفرقات

نہ آؤ سامنے لیکن تصوّر میں تو آؤ گے
یہ آنکھوں کا ہے پردہ، دل سے پردہ ہو نہیں سکتا

ہماری آنکھوں سے تمھارا چھپنا ممکن ہے لیکن دل سے چھپنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ تم ہمارے تصوّر میں بسے رہتے ہو۔

وہ میری عیادت کو آئے ہیں دمِ آخر
ہاں اور ابھی دم بھر اے عمر وفا کرنا

محبوب آخری وقت میں عاشق کی عیادت کو آیا ہے۔ عاشق کی تمنا ہے کہ اس کو اتنی مہلت مل جائے کہ ایک گھڑی وہ محبوب کو دیکھ لے۔

آپ کا حُسن کہ پردہ میں بھی تھا عالمگیر
آپ کا عشق کہ پنہاں بھی نہ تھا، راز بھی تھا

حُسنِ الٰہی پردے میں پنہاں ہوتے ہوئے بھی آشکارا ہے اور سارے عالم میں چھایا ہوا ہے۔ عشق بھی کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں۔ اس کا بھی ہر چیز میں ظہور ہے مگر اس کی حقیقت پردۂ راز میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ کوئی اس کی اصلیت کو نہ پہچان سکا۔ شاعر کا اشارہ یہ ہے کہ عشق کی اصل بھی حُسن ہی ہے۔ وحدت الشہود کے مسٔلہ کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

بیمار ترے جی سے گزر جائیں تو اچھا
جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، یہ مر جائیں تو اچھا

بیمارِ محبت موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ مر جائے اور اس اذیت سے نجات مل جائے۔

کب کہہ گیا تھا آنے کو، کیا وقت ہو گیا
اللہ! نامہ بر بھی گیا وقت ہو گیا

جو وقت گذر جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔ عاشق کو نامہ بر کا انتظار ہے جو محبوب کے پاس اس کا خط لے کر گیا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نامہ بر بھی گزرا وقت ہو گیا جو ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔

آہ بتوں پر دل کیا آیا، ہاتھ سے ہی نادان گیا
خیر بَلا سے دل ہی جاتا، جان گئی، ایمان گیا

دل تو نادان تھا۔ حسینوں کی محبت میں اگر گرفتار ہوا تھا تو اس کا غم نہیں۔ غم اس بات کا ہے دل کے ساتھ جان و ایمان بھی رخصت ہو گئے۔

کیا ادا تھی ادائے پرسشِ یار   مجھ سے اظہارِ مدّعا نہ ہوا

محبوب کی پرسشِ حال کی ادا کس قیامت کی تھی کہ ہمیں اظہارِ مدّعا کی جرأت نہ ہوئی۔ میر کا شعر ہے۔

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا   ہم سے ہی حالِ تبہ اپنا دکھایا نہ گیا

وہ قیامت اٹھائے پھرتے ہیں   آسماں آج زیرِ پا نہ ہوا

محبوب کی رفتار سے جو فتنے اُٹھ رہے ہیں اگر یہ آسمان پر بھی نازل ہوتے تو لطف آ جاتا۔ یعنی آسمان جو فتنہ پردازی میں مشہور ہے محبوب کی رفتار کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

دل ہی پھر تیر ہے جو دل میں نہیں   تیر ان کا خطا نہیں ہوتا

محبوب کا نشانہ ایسا بے خطا ہے کہ اس کا تیر کبھی خالی نہیں جاتا۔ اس نے ہمارے

دل کو نشانہ بنایا تھا مگر دل میں تیر کا کہیں پتا نہیں ملتا۔ تو پھر تیر ہی دل بن گیا ہوگا۔ مراد یہ کہ محبت کا درد دل میں اس طرح بس جاتا ہے کہ دل میں اور درد میں کوئی فرق نہیں باقی رہتا۔

دلِ برباد کیا ہوا آخر   کوئی ذرّہ فنا نہیں ہوتا

کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ اپنی شکل بدل لیتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر ہمارا دل مٹ کر کہاں گیا۔ اس میں پھر وہی اشارا ہے کہ دل محبت میں فنا نہیں ہوتا بلکہ حسن میں ضم ہو جاتا ہے۔

ہے شانِ عبودیت مصروفِ دعا ہونا   منظورِ مشیت تھا ہر نالہ رسا ہونا

ہم بندے ہیں اور دعا کرنا ہماری سرشت میں شامل ہے مگر دعا کی قبولیت کا انحصار خدا کی مرضی و مشیت پر ہے۔

بنیادِ جہاں کیا ہے مجبورِ فنا ہونا   سرمایۂ ہستی ہے محرومِ بقا ہونا

صوفیہ کا کہنا ہے کہ یہ عالم وجود میں آنے سے قبل ذہنِ الٰہی میں موجود تھا گویا اسی کا حصّہ یا جزو تھا اور اسے بھی ابدیت حاصل تھی لیکن جب اس نے یہ مادّی وجود اختیار کیا تو اس ابدیت سے محروم ہو گیا اور فنا اس کا انجام قرار پائی۔ گویا موت ہی اس کائنات اور ہستئ انسان کی اصل بنیاد ہے۔ بقولِ غالبؔ۔

ع : ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

حشر میں آؤ تو دو ہو جائیں باہم آفتاب
اک سوا نیزہ پہ ہو، اک قدِ آدم آفتاب

کہا جاتا ہے کہ قیامت کے روز سورج زمین سے سوا نیزہ کے فاصلہ پر آجائے گا۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر میدانِ حشر میں میرا محبوب بھی آجائے تو کیسا لطف ہو کہ دو سورج آمنے سامنے ہوں گے بلکہ وہ تو کسی قدر فاصلہ پر ہوگا اور یہ صرف قدِ آدم بلندی پر۔

وہ سخت جاں ہیں ہم کہ شبِ غم بھی کاٹ دی
فانیؔ ہمیں تو نیند نہ آئی تمام رات

ہم ایسے سخت جان ہیں کہ جدائی کی سخت رات بھی کاٹ دی اور موت (جو نیند سے مشابہ ہوتی ہے) بھی ہم سے نیند کی طرح دور رہی۔

باز آ فکرِ دوا سے اے طبیب   ہے علاجِ دردِ بے درماں عبث

دردِ بے درماں = جس درد کا کوئی علاج نہ ہو۔

محبت لاعلاج مرض ہے۔ اس کے علاج کی فکر بے کار ہے اس لیے طبیبوں کو دوا کی فکر چھوڑ دینا ہی مناسب ہے۔

اب یہ حالت ہے ترے بیمار کی   یا عبث گریاں ہے یا خنداں عبث

بیمارِ محبت ہوش و حواس کھو چکا ہے اور کبھی بے وجہ روتا ہے تو کبھی بلا سبب ہنستا ہے۔

اے فانیؔ سخت جاں مبارک   تلواروں کی دیکھ بھال ہے آج

فانیؔ کو مژدہ ہو کہ آج محبوب اپنی تلواروں کو تیز کروا رہا ہے۔ مراد یہ کہ آج اس کی آرزوئے قتل پوری ہو جائے گی۔

اے شبِ وصل کوئی دم تو ٹھہر   عمرِ دو روزہ کا شباب ہے آج

محبوب سے ملاقات کے لمحات زندگی کے حسین ترین لمحے ہوتے ہیں مگر مختصر بھی۔ عاشق کی تمنا ہے کہ کاش یہ گھڑیاں کچھ طویل ہو جائیں۔

نفرت ہے ان کو حسرت و ارماں کے ذکر سے   ان کو نہیں پسند دلِ آرزو پسند

محبوب کو اس دل سے نفرت ہے جو محبت کا دعویٰ کرتا ہو اور وہ محبت کے ذکر سے بھی بیزار ہے۔

دل اس کو دے دیا ہے جو دشمن ہے جان کا　　اس دوست پر فدا ہوں جسے ہے عدو پسند

ہم نے ایسے شخص کو دل دیا ہے جو ہمارا دشمن ہے اور ہمارے دشمنوں کو عزیز رکھتا ہے۔

جاں فدا کرنا ہے کیا مشکل اگر　　ہو قبولِ خاطرِ مشکل پسند

ہم محبوب کو اپنی جان کا نذرانہ دینے کو خوشی سے تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی مغرور و مشکل پسند طبیعت اس تحفہ کو قبول کرلے۔

جی گیا دیکھ کے اُن ہاتھوں کا لکھا کاغذ　　کر گیا حق میں مرے کارِ مسیحا کاغذ

محبوب کے ہاتھ کا لکھا کاغذ دیکھ کر ہم کو زندگی مل گئی۔ گویا کاغذ کے ایک ٹکڑے نے ہمارے ساتھ مسیحائی کی۔ "جی گیا" میں ایہام بھی ہو سکتا ہے اور اس سے مراد جان جاتی رہی بھی نکل سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ کاغذ دیکھ کر عاشق کو شادیٔ مرگ ہو گئی اور اسے زندگی کی تکلیفوں سے نجات مل گئی۔ گویا کاغذ اس کے لیے نسخۂ شفا بن گیا۔

پھر زندہ ایک جنبشِ لب نے کیا مجھے　　قربان معجزے لبِ معجز نظام پر

معجز نظام = اعجاز رکھنے والے۔

محبوب کے لبوں میں وہ تاثیر ہے کہ معجزے بھی اس پر قربان۔ وہ اپنے بیماروں میں ایک جنبشِ لب سے جان ڈال دیتا ہے۔

شامِ وصال، شامِ خطِ یار، شامِ زلف　　کیجیے فدا ہزار سحر ایسی شام پر

ویسے تو صبح کو شام پر ہر طرح فوقیت حاصل ہے لیکن کچھ شامیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ہزار صبحوں پر بھاری ہوتی ہیں جیسے کہ شامِ وصال یا پھر محبوب کی زلفوں کی اور خط (چہرہ کا خط) کی شام۔ سیاہی کے اعتبار سے زلف اور خط کو شام کہا ہے۔

کیوں نہ دلِ زار کو ہو ترا پیکاں عزیز　　رسمِ جہاں ہے یہی خاطرِ مہماں عزیز

پیکاں = تیر کی نوک۔

اگر ہمارے دل کو تیرا پیکاں عزیز ہے تو کیا تعجب ہے۔ مہمان کی خاطر کرنا عام طریقہ ہے۔

جو دل غنی ہے تو فاقہ غنی ہے مفلس بھی
نہیں گدا کو میسر وہ کیا ہے شاہ کے پاس

انسان کا دل غنی (بے نیاز) ہو تو وہ مفلسی میں بھی مسرور و مطمئن رہ سکتا ہے اور خود کو بادشاہ تصور کر سکتا ہے۔

گلِ تر، سروِ رواں، نرگسِ شہلائے چمن
صدقہ آنکھوں کے، فدا قد پہ، نثار عارض

محبوب کے رخساروں کے آگے پھولوں کی تازگی ہیچ ہے۔ اس کا قد سرو سے بلند اور آنکھیں نرگس کو شرمندہ کرنے والی ہیں۔ اس شعر میں لف و نشر غیر مرتب ہے۔ یعنی آنکھوں قد اور عارض کی مناسبت سے نرگس، سرو اور گل لائے ہیں مگر ترتیب بدل گئی ہے۔

جب یہ کہا کہ بے وفا کیا نہیں تجھ پہ میں فدا
کیا ہے یہ ماجرا غلط، کہنے لگا کہ ہاں غلط

محبوب وفا کا منکر ہے اور ہمارے منھ پر بڑی بے باکی سے ہمیں جھٹلاتا ہے۔

شکوۂ ظلم افترا، حالِ شبِ فراق جھوٹ
نالۂ غم فزا دروغ، آہِ شرر فشاں غلط

افترا = بہتان۔ دروغ = جھوٹ

محبوب کے نزدیک ہماری آہ و نالہ سب جھوٹ ہیں اور ہم اس کے ظلم کی شکایت کریں تو وہ اسے اپنے اوپر تہمت کہتا ہے۔

ہے سوزِ غم ہجومِ تمنا میں اس طرح جیسے کہ جل رہی ہو کسی انجمن میں شمع

دوسرے غموں اور آرزوؤں کے ہجوم میں غمِ محبت کی وہ اہمیت ہے جو کسی محفل

میں شمع کی ہوتی ہے۔ یعنی دل میں اس کے دم سے روشنی ہے۔

وفا کر ہو سکے تجھ سے جہاں تک
وہ آتے ہیں یہاں اے آخری دم

عاشق کو دمِ آخر بھی محبوب کے آنے کی اُمید ہے اس لیے چاہتا ہے کہ اس کی آخری سانسیں جہاں تک ممکن ہو طویل ہو جائیں۔ شوقِ ملاقات کا یہ حال ہے کہ اس کی خاطر جاں کنی کی ایذا بھی گوارا ہے۔

کہاں تک فانیٔ محزوں کہاں تک
یہ رونا رات دن، یہ غم میں گھُلنا

فانی تو کب تک اس طرح دن رات آنسو بہاتا اور غم سے گھُلتا رہے گا۔

ہم چلے دامانِ محشر کی طرف
پھاڑ کر فانی گریبانِ لحد

جنون نے ہمیں قبر میں بھی چین نہیں لینے دیا اور ہم قبر پھاڑ کر دامنِ محشر میں پہنچ گئے۔ گریبان و دامن کی رعایت مقصود ہے۔ شعر میں کوئی لطف نہیں۔

ابھی عشق اپنا جماتا ہے رنگ
جو اُٹھا تو میٹھا سا اٹھتا ہے درد

محبوب کے اُٹھتے ہی پہلو میں میٹھا میٹھا سا درد ہونے لگتا ہے۔ شاید یہی عشق کی ابتدا ہے۔

یہ دل ہے کیا جو دے مجھے پروردگار دل
دل مانگنے پہ آپ کے قرباں ہزار دل

محبوب عاشق سے اس کے دل کا طالب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک دل کیا ہمارے پاس ہزار دل بھی ہوتے تو آپ پر سے قربان کر دیتے۔

وہ قتل کر کے مجھے یوں جتا گئے احساں
کہ تیری خاک ٹھکانے لگائے دیتے ہیں

محبوب عاشق کے قتل پر پشیمان و شرمندہ ہونے کی بجائے یہ احسان رکھتا ہے کہ میں نے

تو تمھاری مسی ٹھکانے لگا دی۔

دونوں فتنے ہیں عشق اور محشر
ایک دنیا میں، ایک عقبیٰ میں

عشق کی تکلیفوں کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو روزِ محشر کی اذیتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

نگہِ ناز کو گھونگھٹ کے ہی اندر رکھیے
گھر میں رہتے نہیں جب پاؤں نکل جاتے ہیں

محبوب کی شوخ نگاہیں نقاب کے اندر ہی رہیں تو بہتر ہے۔ یہ بے حجاب ہو گئیں تو پھر روکنا محال ہے۔ جس طرح کوئی سیلانی ایک بار گھر سے باہر نکل جائے تو گھر میں بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔

میرے مرنے کی خبر سُن کے خفا ہو جانا
بدگمانی یہ نہیں تو اسے کیا کہتے ہیں

محبوب کی بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ عاشق کی موت کی خبر پا کر وہ اس سے خفا ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس نے جفا سے تنگ آکر وفا ترک کر دی ہے۔

آ کے تماشا گاہِ جہاں میں دادِ تماشا کیا چاہوں
یاں ہر ذرّہ کہتا ہے میں ذرّہ نہیں اک دنیا ہوں

دنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ اگر انسان کی نگاہیں حقیقت بیں ہیں تو اسے ہر ذرّہ میں ایک دنیا چھپی ہوئی نظر آسکتی ہے۔ یہاں ہر ذرّہ سورج اور ہر قطرہ سمندر ہونے کا دعویدار ہے۔ جب ہر چیز کی اصل ایک ہی ہے تو پھر کون کس کو دیکھے اور کون کسی کو دادِ تماشا دے۔

محوِ تماشا ہوں میں یارب یا مدہوشِ تماشا ہوں
اُس نے کب کا پھیر لیا منھ اب کس کا منھ تکتا ہوں

حُسن کے جلووں نے ہمیں ایسا مدہوش و بے خود کر دیا ہے کہ ہمیں یہ خبر بھی نہیں ہوئی کہ محبوب کب کا سامنے سے ہٹ چکا ہے اور ہم اب بھی اسی سمت دیکھے جا رہے ہیں گویا وہ اب بھی روبرو ہے۔ اس شعر کو حقیقی معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے اور مجازی میں بھی۔

شب گریۂ غم کے طوفاں کا وہ جوش اٹھے توبہ
ہر اشک امنڈ کر کہتا ہے میں دل کے لہو کا دریا ہوں

رات غم کا وہ جوش تھا اور آنسوؤں کا وہ طوفان امڈا تھا کہ خدا کی پناہ۔ ہر آنسو میں ایسی طغیانی تھی گویا دل کا سارا خون اسی میں سمٹ آیا ہے اور وہ خون کا دریا بن گیا ہے۔

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

دنیا کے غم و آلام انسان کی غفلت کو دُور کرنے آتے ہیں۔ لیکن اس کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ ہر مصیبت پر وہ تھوڑی دیر کو چونکتا ہے لیکن جلد ہی سب کچھ بھول کر پھر اسی طرح غفلت میں ڈوب جاتا ہے۔

سازِ ہستی کو بھی اب "قُم" کے اشارے سے نہ چھیڑ
اس میں ٹوٹے ہوئے دل کی نہ ہو آواز کہیں

قُم (اُٹھ کھڑا ہو) وہ کلمہ ہے جس سے حضرت عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ اب ہمارے سازِ ہستی کو خاموش ہی ہو لینے دے۔ اسے قم کے اشارے سے نئی زندگی نہ دے کیونکہ اگر یہ ساز جاگ اُٹھا تو اس سے جو نغمے اٹھیں گے وہ دل کے ٹوٹنے کی آواز کی طرح دلخراش ہوں گے۔ مراد یہ کہ ایک بار دل ٹوٹ جائے تو پھر اس سے نغمۂ طرب کی امید نہیں کی جاسکتی۔

دل ہی وہ خانماں خراب نہیں   جس کو توفیقِ اضطراب نہیں

جس دل میں تڑپنے کا ذوق نہیں اس بدنصیب کو دل کہنا بھی درست نہیں۔ مراد یہ کہ دل کی ہستی تڑپنے پر منحصر ہے۔

میں ہی اپنا حجاب ہوں ورنہ   تیرے منہ پر کوئی نقاب نہیں

صوفیہ کے نزدیک انسان کی خودی ہی اس کے اور محبوب کے درمیان حجاب ہے۔ اگر یہ حجاب ہٹ جائے تو دوری مٹ جائے اور اس کے جلوے بے نقاب نظر آنے لگیں۔

رازِ حقیقت جاننے والے دیکھیے اب کیا کہتے ہیں
دل کو ہم اپنا دل نہیں کہتے، تیری تمنا کہتے ہیں

محبت میں ہم اس منزل پر آ چکے ہیں کہ اب ہمیں اپنے دل اور محبوب کے جلووں میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ اب دیکھیں کہ اہلِ حقیقت ہمارے اس رویہ کو کیا نام دیتے ہیں اور ہمارے لیے کون سی سزا تجویز کرتے ہیں۔

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار
زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

انفاس = نفس کی جمع۔ سانسیں۔

انسان کی زندگی کا مدار سانسوں کے سلسلہ پر ہے اور سانسوں کی اصل آہیں ہیں۔ گویا انسانی زندگی صرف ایک مسلسل آہ ہے۔

ہجر میں نامرادِ زیست جی سے گزر نہ جائے کیوں
ہو جنھیں زندگی نصیب موت انھی کو آئے کیوں

عاشقِ نامراد جدائی کی تکلیفوں سے تنگ آ کر مر نہ جائے تو اور کیا کرے۔ موت پہ صرف انھی لوگوں کا تو اجارہ نہیں جو زندگی میں بھی کامیاب ہیں۔ عاشق بھی تو اس کے مستحق ہیں۔

حسن سے راہ چاہیے، ذوقِ نگاہ چاہیے
جب کوئی روبرو نہ ہو، سامنے کوئی آئے کیوں

حسن کے جلووں کو دیکھنے کے لیے ذوقِ طلب اور نگاہوں کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی دیدار کا طالب ہی نہ ہو تو وہ کیوں اپنے جلوے کو نمایاں کرے

کہتے ہیں یہاں حضرت فانی بھی نہیں ہیں
اس انجمنِ ناز میں کیا ہم بھی کہیں ہیں

محبوب اپنی انجمنِ ناز میں فانی کو تلاش کر رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ کیا فانی موجود ہیں۔ فانی کو اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا ہے اور وہ خود سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ ہم اس کی محفل میں موجود ہیں اور وہ ہمیں آوازیں دے رہا ہے۔

وہ مایوسِ شفا ہیں ہوں وہ جینے سے خفا ہیں ہوں
کہ جس کی زندگی فانی دمِ شمشیرِ قاتل ہو

میں زندگی اور شفا سے اس قدر مایوس ہوں کہ اب میری ساری اُمیدیں محبوب کی تلوار سے وابستہ ہیں اور اسی کو میں اپنی زندگی سمجھتا ہوں۔ "دم" کا لفظ ذو معنی ہے جس کے معنی دھار بھی ہیں اور سانس بھی جس پر زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے۔

کشتیٔ اعتبار توڑ کے دیکھ
کہ خدا بھی ہے ناخدا ہی نہیں

کشتی کی حفاظت ناخدا کے نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ ہے۔ وہ چاہے تو ٹوٹی ہوئی کشتی کو بھی پار لگا سکتا ہے۔

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

میری ہستی گواہ ہے کہ مجھے
تو کسی وقت بھولتا ہی نہیں

میری تو زندگی محبوب کی یاد سے قائم ہے۔ میرا زندہ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی یاد ہر لمحہ میرے دل میں رہتی ہے۔

رہِ ظلمات کی اے خضر نہیں ہم کو تلاش
ہم ہیں غربت زدۂ حدِ دیارِ گیسو

ظلمات = وہ جگہ جہاں آبِ حیات کا چشمہ پوشیدہ ہے اور جس سے صرف حضرت خضر واقف ہیں۔ شاعر خضر علیہ السلام سے کہتا ہے کہ ہمیں آبِ حیات کی تلاش نہیں بلکہ ہمیں محبوب

کی زلفوں کے سایہ کی تلاش ہے۔ اگر وہاں تک آپ رہ نمائی کر سکیں تو کر دیجیے۔ زلف اور ظلمات میں مناسبت ظاہر ہے۔ اشارا یہ ہے کہ راہ محبت کے بھٹکنے والوں کی رہ نمائی خضر کے بس میں بھی نہیں۔

ہے مرا بخت سیہ آئینہ دار گیسو
طالع بد بھی میرا طالع اسکندر ہے

اسکندر۔ دنیا کا مشہور فاتح۔ اس کی خوش قسمتی مسلّم ہے۔

میری تقدیر کی سیاہی میں محبوب کی زلفوں کا رنگ جھلکتا ہے (اس کی زلفیں میری سیہ بختی کا سبب ہیں) اس لیے مجھے اپنی بدبختی بھی عزیز ہے اور میں اپنے کو سکندر سے کم خوش نصیب نہیں خیال کرتا۔

تیرے فراق میں حالت تباہ سی ہے تباہ
نہ دل پہ ہاتھ نہ اب سوئے آسماں ہے نگاہ

جدائی کے مصائب نے ہمیں اس طرح برباد کیا ہے کہ اب نہ تڑپنے کی طاقت ہے دعا کا حوصلہ۔ مکمل بے کسی طاری ہے۔

سرورِ وعدہ کہیں اور کہیں غمِ ناگاہ
خیالِ دوست کی رنگینیاں خدا کی پناہ

محبوب کا تصور بہ یک وقت عاشق کے لیے خوشی و غم دونوں کا سبب ہے۔ کبھی تو اس وعدہ کی یاد عاشق پر سرور کا عالم طاری کر دیتی ہے اور کبھی اس کی بے وفائی کی یاد اسے و آلام میں مبتلا کر جاتی ہے۔

کیوں پسِ مرگ یہ احسان اُٹھائے کوئی
بے کسی کہہ دے جنازہ پہ نہ آئے کوئی

محبوب نے زندگی بھر تو عاشق کو تڑپایا اب وہ اس کے جنازہ پر آنے کی تکلیف بھی ارا کرے۔ کیونکہ عاشق مرنے کے بعد اس کا یہ احسان اٹھا کر اپنی بے کسی کو رسوا نہیں

کرنا چاہتا۔ اس کے جنازہ پر ماتم کرنے کو اس کی بے کسی کافی ہے۔

وہ بھی دن ہو کہ میری خاک کو کرنے پامال
قبر پر حشر اُٹھاتا ہوا آئے کوئی

عاشق کی تمنا ہے کہ کسی روز محبوب اس کی قبر کو ٹھوکروں سے پامال کرنے چلا آئے چاہے اس کے آنے سے عاشق پر قیامت ہی کیوں نہ ٹوٹے۔ محبوب کی چال کو قیامت کہنا شاعری میں عام ہے

جادو جگا گئی ہے جب سے نظر کی مستی
بے ہوش مستقل ہے اس رہ گزر کی بستی

جب سے محبوب کی مست نظروں نے دل میں گذر کیا ہے اس پر ایک مسلسل بے خودی طاری ہے۔

مجھے آہ کا ہے رونا جو یہ بے اثر نہ ہوتی
مری بیقراریوں کی تمھیں کیوں خبر نہ ہوتی

ہمیں محبوب سے گلہ نہیں بلکہ صرف اپنی آہوں کی بے اثری کی شکایت ہے۔ اگر ان میں ذرا سا بھی اثر ہوتا تو محبوب یوں ہمارے حال سے بے خبر نہ ہوتا۔

مری زندگی کی گھڑیاں تری دھن میں خوب گزریں
مری عمر کیسے کٹتی تری یاد اگر نہ ہوتی

اگر محبت نہ ہوتی تو زندگی اجیرن ہو جاتی۔ یہ محبت ہی کا فیض ہے کہ زندگی دلکش ہو گئی ہے۔ تیری یاد نے زندگی کو آسان کر دیا۔

تمھاری یاد سہارا دیئے رہی ورنہ   غم جہاں نے قدم ڈگمگا دیئے ہوتے

جینے کی ہوس بھی ہے مر جانے کی حسرت بھی   وہ ایک تری مرضی جو غم بھی ہے راحت بھی

محبوب کا خیال اور اس کی چاہت عاشق کو غم بھی دیتی ہے خوشی بھی۔ اس کا اشارا عاشق کے لیے زندگی بھی ہے اور موت بھی۔

اس مشغلۂ غم میں کیا لطفِ حیات آئے
ملتی ہے کہیں فانی مرجانے کی فرصت بھی

غم نے ہمیں اس طرح الجھا رکھا ہے کہ مرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ اس الجھن میں زندگی کا لطف کیا خاک اٹھاتے۔ شعر میں نکتہ یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک زندگی کا لطف جینے میں نہیں مرنے میں ہے مگر محبت کے غم نے اسے موت و زندگی دونوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

رسمِ بے دادِ دوست عام ہوئی
تلخیٔ زیست بھی حرام ہوئی

ہم زندگی کی تلخیوں اور غموں کو محبوب کا خاص عطیہ اور انعام سمجھ کر سینہ سے لگائے ہوئے تھے لیکن جب سے اس نے غم کو عام کر دیا ہے اور ہر ایک کو اس سے نوازنا شروع کیا ہے غموں میں بھی ہمیں لذت نہیں ملتی۔

گو ہستی تھی خوابِ پریشاں، نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

زمانہ کے حادثات انسان کو غفلت سے بار بار چونکا دیتے ہیں مگر پھر بھی وہ ایسا مست ہے کہ ہوشیار نہیں ہوتا اور تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی طرح غافل ہو جاتا ہے۔ اس بات کو بڑے مکمل اثر کے ساتھ نیند کے استعارہ میں بیان کیا ہے۔

کیا کرے زندگیٔ خضر کو لیکر وہ شہید
لاش پہ جس کی پسِ مرگ وہ دامن ڈالے

اگر محبوب مرنے کے بعد ہماری میت پر اپنا دامن ڈال دے تو اس موت پر ہم زندگیٔ ابد کو قربان کر دیں۔

اک عمر سے ہوں ناصیہ فرسا تیرے در پر
اتنا تو کبھی پوچھ کہ تو کون ہے کیا ہے

ناصیہ فرسا = پیشانی رگڑنا

ہم مدتوں سے محبوب کے در پر سجدے کر رہے ہیں لیکن اس کی بے نیازی کا یہ حال ہے کہ کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ ہے کون اور کیا چاہتا ہے۔

ٹالا ہے مجھے وصل کو محشر پہ اٹھا کر   آجائے اگر کل ہی قیامت تو مزا ہے

محبوب نے عاشق سے روز قیامت ملاقات کا وعدہ کیا ہے۔ عاشق کی تمنا ہے کہ کاش قیامت کل ہی آجائے۔ اشارا یہ ہے کہ قیامت کا آنا آسان ہے مگر اس کے وعدے کا وفا ہونا مشکل ہے۔

ازل میں اشنائے شوق کیا کوئی نہ تھا یا رب
ہماری ہی زباں دنیا میں وقف التجا کیوں ہے

اس دنیا میں ایک ہم (انسان) ہی ایسے ہیں کہ آرزوؤں اور التجاؤں کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں اور دنیا کی ہر شے مطمئن اور آزاد ہے۔ کیا روز ازل محبت کے بوجھ کو اٹھانے والا اور کوئی نہ تھا جو صرف ہم ہی اس کے مستحق ٹھہرے۔ بظاہر شعر سوالیہ ہے مگر درحقیقت اس بات پر زور ہے کہ بقول میر؛

سب پہ جس بار نے گرانی کی   اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

شکایت سے کرتے ہیں عذر شکایت   گلہ کیوں کیا یہ گلہ ہو رہا ہے

عاشق نے محبوب کے ظلم و ستم کی شکایت کی۔ اس پر معذرت پیش کرنے کی بجائے محبوب الٹا عاشق کا شکایت گزار ہے کہ تم نے میری جفاؤں کا گلہ کیوں کیا۔ گویا

ع : الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ

ہے ایک میرے پاس بھی کہتے ہیں دل
جام جہاں نما کوئی جاگیر جم کی ہے

جام جہاں نما = وہ پیالہ جس میں دنیا کے تمام حالات دکھائی دیے جاتے تھے اور جو جمشید کے قبضہ میں تھا۔   جم = جمشید، ایران کا بادشاہ

جامِ جہاں نما صرف جمشید ہی کو نہیں ملا تھا۔ ہمارے پاس جو دل ہے وہ بھی اس جام سے کم نہیں۔ مراد یہ کہ دلِ روشن جامِ جمشید سے کم نہیں۔ اس میں بھی دنیا کے تمام اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

تاثیر دکھا کر ہی رہی غم کی کہانی   کہنا کسی ہم راز سے راز غضب ہے

محبت کی روداد ایسی نہ تھی کہ سن کر کوئی تاب لا سکتا۔ ہم نے اپنے ہمراز کو یہ کہانی سنا کر بڑا غضب کیا اور وہ اس سے ایسا متاثر ہوا کہ ضبط نہ کر سکا اور ہماری داستان عام ہو گئی۔

گو ایک ہی فتنہ ہے قامت بھی قیامت بھی
کم ہو تو قیامت ہے بڑھ جائے تو قامت ہے

محبوب کا قد اور فتنۂ قیامت دونوں عاشق کے نزدیک یکساں ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ قیامت کا فتنہ اس سے کسی قدر کم ہے۔ بقولِ غالب

تیرے سروِ قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

ارمان کہاں ضعف میں تاثیرِ الم کے   لالے ہیں پڑے اب تو ہمیں آہ کے دم کے

ناتوانی میں آہ کی تاثیر کا ارمان کیا کریں۔ اب تو خود آہ کے ہی لالے پڑ رہے ہیں۔ یعنی ناتوانی سے آہ بھرنا بھی دشوار ہے۔

خیر ہے کیوں مرے رونے کی ہنسی ہوتی ہے   دل لگی کیا ہے لگی دل کی بری ہوتی ہے

لوگ عاشق کے رونے پر ہنس رہے ہیں۔ وہ کیا جانیں دل کی لگی (محبت) کیا چیز ہے۔ وہ تو اسے صرف دل لگی (ہنسی) سمجھتے ہیں۔

گریۂ ضبط کی تہمت نہ لگے آنکھوں کو   خونِ دل اب ترے آنے میں کمی ہوتی ہے

دل کا سارا خون بہہ چکا اور اب اشکوں میں خون کی وہ روانی باقی نہیں رہی۔ عاشق کو

ڈر ہے کہ کہیں محبوب اس کی آنکھوں پر ضبطِ گریہ کا الزام نہ لگا دے۔ یعنی یہ نہ سوچے کہ اس کی محبت میں کمی آ گئی ہے۔

مجھے مرنے کی حسرت کارِ مشکل کی تمنا ہے
مرادم بھی کسی ناکام کے دل کی تمنا ہے

ہم نے موت کی آرزو کی ہے مگر یہ حسرت پوری ہونا بھی ایسا دشوار ہو رہا ہے جیسے کسی عاشق کی تمنا کا بر آنا۔

اجل سے ہے دلِ مایوس کو اُمیدِ آسایش
مری ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل کی تمنا ہے

دل جو ہر طرف سے مایوس ہو چکا اب اس کو موت سے امیدِ نجات ہے لیکن یہ امید پوری ہونا بھی ایسا ہی دشوار ہے جیسا کسی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ساحل تک پہنچنا۔ غالب نے کہا ہے:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

دیکھ فانی وہ کوئی حشر اٹھاتا آیا   چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے

محبوب اپنی رفتار سے قیامت اٹھاتا عاشق کے مرقد کی سمت آ رہا ہے۔ عاشق کو لازم ہے کہ خوابِ عدم سے بیدار ہو کر اس کا استقبال کرے۔ مراد یہ کہ عاشق کو خوابِ فنا سے جگانے کو قیامت کافی نہیں۔ محبوب کی آمد ہی اسے اٹھا سکتی ہے۔

ہے جو اس کانِ ملاحت سے طلبگارِ نمک
زخمِ دل شاید تبسم آفریں ہونے کو ہے

کانِ نمک = نمک، دلکشی یا ملاحت کو کہتے ہیں۔ محبوب کے چہرے کو جو ملاحت کا خزانہ ہے، کانِ نمک کہا ہے۔

ہم نے محبوب کے ملیح چہرے کا تصور کیا ہے۔ شاید ہمارے دل کے زخم پھر سے ہرے ہوا چاہتے ہیں۔ نمکین حسن کا تصور زخمِ دل کی خلش کا باعث بنے گا۔ نمک چھڑکنے سے زخم

کی تکلیف بڑھ جانا امر واقعہ ہے۔

اللہ اللہ سرخیِ رنگِ شفق کیوں اے جنوں
آسماں کیا کوئے قاتل کی زمیں ہونے کو ہے

آسمان پر پھیلی ہوئی شفق کی سرخی دیکھ کر عاشق کو خیال آتا ہے کہ محبوب کی گلی بھی عاشقوں کے خون سے اسی طرح گلنار ہے۔ وہ سوچتا ہے کیا آسمان پر بھی عاشقوں کا خون بہایا جائے گا۔

مطلب ہے ضبطِ عشق سے تاثیرِ دردِ عشق
اخفائے حال سے غرضِ افشائے حال ہے

اخفا = چھپانا۔ افشا = ظاہر کرنا۔

غم کو جتنا ضبط کیا جائے وہ اتنا ہی دل پر اپنا اثر زیادہ دکھاتا ہے۔ ہم جو محبت میں ضبطِ غم کرتے ہیں، اس سے مدعا یہ ہے کہ ہماری حالت اور زار ہوتی جائے اور محبوب کو بغیر کہے ہماری حالت کا علم ہو جائے۔

رودادِ مرگ و زیست یہ ہے قصّہ مختصر
مجبورِ زندگی کو بھی جینا محال ہے

موت و زندگی کا فسانہ مختصراً یہ ہے کہ انسان ایک طرف تو جینے کے لیے مجبور ہے اور دوسری طرف زندگی اتنی تکلیف دہ ہے کہ جینا بھی دوبھر ہے۔

کچھ آگہی سی اپنی حقیقت سے ہے مجھے
امید بے سبب تری رحمت سے ہے مجھے

میں اپنی حقیقت کو کچھ کچھ پہچاننے لگا ہوں۔ اس لیے گناہوں کے باوجود بھی تیری رحمت کا امیدوار ہوں۔ حقیقت پہچاننے میں اشارا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیری ہستی سے جدا نہیں اس لیے تیری رحمت کا حقدار ہوں اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ میں مجبورِ محض ہوں۔ پھر گناہوں کی سزا کیا معنی۔

آٹھ پہر کسی کی آنکھ بند نہ کیوں رہا کرے
دید ہو یا اُمید ہو، کچھ بھی نہ ہو تو کیا کرے

عاشق کو یا تو دیدارِ محبوب میسّر ہو یا اس کی اُمید ہو تب تو وہ آنکھیں کھولے۔ لیکن جب دونوں میسّر نہ ہوں تو پھر وہ دنیا سے آنکھیں بند نہ کرے تو کیا کرے۔

ہے تری بارگاہ میں حرفِ غلط ہر آرزو
کوئی دعا نہیں قبول، لاکھ کوئی دعا کرے

آرزوئیں انسان کی زندگی کی حقیقت کو بدل نہیں سکتیں۔ محبوب (خدا تعالیٰ) کی مرضی کے سامنے عاشق کی ہر آرزو حرفِ غلط کی مانند ہے۔ لاکھ دعا کی جائے مگر ہوگا وہی جو ہونا ہے۔

تو بھی تو، ماسوا بھی تو ہی ہے رنگ و بو رنگ ہے نہ بو ہی ہے

دنیا کے موجودات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہاں کے رنگ و بو صرف نگاہوں کا دھوکہ ہیں۔ ظاہر و باطن جو کچھ ہے خدا ہی ہے۔

پاسِ وضعِ حیات کیا کہنا آرزو ہے تو آرزو ہی ہے

یہ جانتے ہوئے کہ آرزوئیں پوری نہیں ہوں گی، ہم آرزو کیے جاتے ہیں۔ ہماری یہ وضعداری اور قانونِ حیات کی پابندی بھی قابلِ داد ہے۔

اے داغِ دل، اے کھوئے ہوئے دل کی نشانی
آ فانیٔ بے دل تجھے سینہ سے لگا لے

عاشق کو اپنے دل کے داغ بھی عزیز ہوتے ہیں اور وہ انھیں اپنے گم شدہ دل کی یادگار جان کر سینہ سے لگائے رہتا ہے۔

روح کا آنسوؤں بھری آنکھوں میں پاتراب ہے
آ کہ حیات مستعار نقش برآب ہے

پاتراب = پانی پر قدم رکھنا
نقش برآب = پانی پر بنی تصویر یعنی فانی و عارضی

ہماری روح جسم سے نکل کر اب صرف آنکھوں میں اٹکی ہوئی ہے اور زندگی کا خاتمہ ہے۔ اب بھی تجھے آنا ہو تو آجا۔ جان کے اشکوں بھری آنکھوں میں پہنچ جانے کی بناپر اسے نقش برآب کہا ہے۔ شعر میں لفظی مناسبت بھی ہے اور حقیقت کا بیان بھی۔

قاعدہ دانِ ضبط ہے شعلۂ غم کی داد دے
برق کی وضع پر نہ جا بندۂ اضطراب ہے

عاشق ضبط کے اصولوں پر عامل ہے۔ اسی لیے اس کے شعلۂ غم میں بجلیوں کی سی تڑپ نہیں۔ محبوب اس کو تپشِ غم کی کمی پر محمول کر رہا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ برق کی تڑپ کو تم پسندیدہ چیز خیال کرتے ہو حالانکہ وہ تو تڑپنے پر مجبور ہے کیونکہ اضطراب اس کی فطرت ہے۔ میرے دل کے ضبط کی تم کو داد دینا چاہیے کہ وہ غم کے شعلہ کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔

عالمِ ہستی یارب کیا آباد نما ویرانہ ہے
جس نے یہاں کچھ ہوش سنبھالا آپ ہی وہ دیوانہ ہے

دنیا کی یہ بستی اگرچہ آباد نظر آتی ہے مگر اس کی تہ میں (انجام میں) ویرانی چھپی ہوئی ہے جو لوگ اس حقیقت سے ذرا بھی واقف ہیں، وہ دیوانگی اختیار کر لیتے ہیں۔

کس کو یہاں امیدِ اثر ہم دل کو سمجھا لیتے ہیں
حالِ دل اس سے یوں کہتے ہیں گویا اک افسانہ ہے

محبوب سے یہ امید رکھنا کہ اس پر ہماری محبت کا اثر ہوگا، فضول ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس سے اظہارِ تمنا اس طرح بے تعلق بن کر کیا جائے گویا کوئی کہانی سنا رہے ہیں۔ اس طرح سے کم سے کم اپنی سبکی تو نہ ہوگی اور پشیمانی تو نہ ہوگی۔

میں بھی اک پرتوِ ہستی ہوں مگر کیا کہیے
قطرہ دریا سہی، کس قطرہ کو دریا کہیے

مانا کہ ہم ذاتِ حقیقی کا ایک عکس یا اس کا جزو ہیں مگر ہم فخر کس بات پر کریں کیونکہ یہاں جو بھی ہے اسی کا حصّہ ہے۔ مراد یہ کہ یہاں بلندی اور پستی کے دعوے فضول ہیں۔

تھی نظر صرفِ تماشا وہ زمانہ گزرا
اب کوئی دن مری آنکھوں کو تماشا کہیے

ابتدائے محبت میں ایک وہ دور تھا جب ہماری آنکھیں ہر وقت محبوب کے جلووں کی تماشائی تھیں لیکن اب اس کے جلووں کی بدولت یہ آنکھیں خود تماشا بن گئی ہیں یعنی حسن کے جلووں کی امین ہو گئی ہیں۔

خاص خاص مطبوعات

اقبالیات

لیات اقبال (اردو) صدی ایڈیشن		۲۵/-
قبال معاصرین کی نظر میں	وقار عظیم	۵۰/-
قبال بحیثیت شاعر	رفیع الدین ہاشمی	۴۵/-
اقبال کی اردو نثر	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۰/-
اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم	۲۰/-
کر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۴۰/-
اقبال فن اور فلسفہ	ڈاکٹر نور الحسن نقوی	۷/۵۰
تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۵/-
بانگِ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۱۲/-
بالِ جبریل (″)	″	۱۰/-
ضرب کلیم (″)	″	۱۰/-
ارمغان حجاز (اردو) (عکسی)	″	۴/۵۰

غالبیات

غالب: تقلید اور اجتہاد	خورشید الاسلام	۳۰/-
غالب: شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۵/-
دیوان غالب (عکسی)	مقدمہ نور الحسن نقوی	۱۳/-
خطوط غالب کا فنی تجزیہ	حامدہ مسعود	۲۰/-
فلسفی غالب	احمد رضا	۱۰/-

فیض

کلام فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	۲۰/-
نقشِ فریادی (عکسی)	″	۶/-
دستِ صبا (″)	″	۶/-
زنداں نامہ (″)		۷/۵۰
دستِ تہ سنگ (″)		۶/-

ڈرامے

اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	۴۰/-
اردو ڈراما، تاریخ و تنقید	″	۲۰/-
یونانی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	۲۰/-
آغا حشر اور اردو ڈراما	انجمن آرا	۳۰/-
آگرہ بازار	حبیب تنویر	۵/-
شطرنج کے مہرے	″	۶/-

انارکلی	مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن	۹/-

لسانیات و جمالیات

اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۱۲/-
اردو زبان اور ادب	مسعود حسین خاں	۱۲/۵۰
جمالیات شرق و غرب	پروفیسر ثریا حسین	۲۰/-
ادب میں جمالیاتی اقدار	ظہیر احمد صدیقی	۱۰/-

مثنوی

اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری	۱۲/۵۰
انتخاب مثنویات اردو	مغیث الدین فریدی	۶/-
مثنوی گلزار نسیم	ظہیر احمد صدیقی	۶/-
مثنوی سحر البیان	″	۶/-

افسانے اور ناول

آنگن (ناول)	خدیجہ مستور	۳۰/-
خدا کی بستی (ناول)	شوکت صدیقی	۴۵/-
چار ناولٹ	قرۃ العین حیدر	۳۰/-
آخر شب کے ہمسفر (ناول)	″	۴۵/-
روشنی کی رفتار	″	۳۰/-
چوٹیں	عصمت چغتائی	۲۰/-
ضدی	″	۱۲/-
ہمارے پسندیدہ افسانے	مرتبہ اطہر پرویز	۱۵/-
راجندر سنگھ بیدی اور انکے افسانے	″	۲۰/-
اردو کے تیرہ افسانے	″	۱۲/-
منٹو کے نمائندہ افسانے	″	۱۲/-
پریم چند کے نمائندہ افسانے	مرتبہ قمر رئیس	۱۲/-
نمائندہ مختصر افسانے	مرتبہ محمد طاہر فاروقی	۷/-

سرسید

سرسید ایک تعارف	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۲/-
سرسید اور علی گڑھ تحریک	″	۴۵/-
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نور الحسن نقوی	۲۰/-
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۶/-
مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	۱۵/-

ادب و تنقید

تنقیدیں	پروفیسر خورشید الاسلام	۳۰/-
شناسا چہرے	محمد حسن	۱۵/-
ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ	رشید حسن خاں	۲۵/-
تنقیدی تناظر	پروفیسر قمر رئیس	۲۰/-
پریم چند شخصیت اور کارنامے	"	۳۵/-
احساس و ادراک	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۲۲/
انیس شناسی	ڈاکٹر فضل امام	۱۶/-
چہرہ پس چہرہ	ڈاکٹر ابن فرید	۲۵/-
میں ہم اور ادب	"	۲۰/-
غزل کا نیا منظر نامہ	شمیم حنفی	۱۰/-
اردو قصیدہ نگاری	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	۳۵/-
کلاسیکیت و رومانیت	"	۱۲/-
نثر، نظم اور شعر	منظر عباس نقوی	۷/۵۰
ناول کا فن	ابو الکلام قاسمی	۱۵/-
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۱۰/-
ماثر عجم	"	۲۰/-
موازنۂ انیس و دبیر	مقدمہ ڈاکٹر فضل امام	۱۲/-
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی	۱۲/-
امراؤ جان ادا	مقدمہ تمکین کاظمی	۱۲/-
باغ و بہار	مقدمہ سلیم اختر	۱۲/-
مجموعہ نظم حالی	مقدمہ ظہیر احمد صدیقی	۷/۵۰
مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۳/۷۵
آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	۱۶/-
جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۴۰/-
غزل اور مطالعۂ غزل	"	۳۰/-
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۲۰/-
نیا افسانہ	"	۲۰/-
شہرت کی خاطر	نظیر صدیقی	۱۵/-
تنقید اور احتساب	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۵/-
ستارہ یا بادبان	محمد حسن عسکری	۱۵/-
انسان اور آدمی	"	۱۰/-
قرۃ العین حیدر اور ناول	پروفیسر عبد السلام	۱۲/-
مرزا رسوا اور تہذیبی ناول	"	۴/-
تنقیدی دبستان	سلیم اختر	۱۵/-
تحقیقی و تنقیدی مطالعہ باغ و بہار	"	۱۵/-
ادب کا مطالعہ	ڈاکٹر اطہر پرویز	۲۵/-
منٹو کا فن	وقار عظیم	۵/-
آب حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ	سید سجاد	۱۰/-
مقدمہ آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	۶/۵۰
تنقید و تبصرہ امراؤ جان ادا	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	۴/-
ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	۲۰/-
حسرت موہانی	طلعت سلطانہ	۱۵/-

متفرق

ایڈوانسڈ اکاؤنٹس	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۲۵/-
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۱۲/-
اصول تعلیم	"	۱۵/-
عام معلومات	"	۶/-
ایجادات کی کہانی	"	۵/-
جدید علم سائنس	وزارت حسین	۱۵/-
رہبر صحت	مسرت زمانی	۷/-
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	"	۱۵/-
علم خانہ داری	"	۱۵/-
بچوں کی تربیت		۸/-
گلدستۂ مضامین و انشاپردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۸/-
اردو صرف	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۳/۷۵
اردو نحو	"	۲/۷۵
فیروز اللغات (جیبی) (عکسی)		۷/۵۰
فیروز اللغات اردو جدید (ریگزین)		۲۵/-
اردو شکشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھیے)		۲/-
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم۔ اے۔ شہید	۸/-
جمہوریۂ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	محمد ہاشم قدوائی	۱۵/-
تاریخ و تہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری)	اے۔ اے ہاشمی	۲۰/-
اسلامی تاریخ	"	۵/-

ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ